Done #

Cat by

علی
انا مدینۃ العلم و علی بابہا
ع
OSMANIA UNIVERSITY
جامعۂ عثمانیہ

معاشی حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب

اشی حالات ہند 1931

8785
8755
12 | 8

سلسلۂ مصطلحاتِ علمیہ جامعۂ عثمانیہ

معاشی حالاتِ ہند

از اکبر تا اورنگ زیب

تصنیف

ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ

ترجمہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۰ھ م سنہ ۱۳۴۰ف م سنہ ۱۹۳۱ء

از مطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب میکملن اینڈ کمپنی کی اجازت سے جن کو حق اشاعت
حاصل ہے اردو میں ترجمہ کر کے
طبع و شائع کی گئی ہے۔

330.9
م 78

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 456022
24-5-03
SRINAGAR

سلسلہ نشان	ابواب	مضامین	از صفحہ تا صفحہ
۱	۲	۳	۴
۱۱	باب ۲	〃 〃 (۲) مغربی کوٹھیاں۔	۴۹ تا ۶۲
۱۲		〃 〃 (۳) بنگالے میں کاروبار کا پھیلنا۔	۶۲ تا ۷۰
۱۳	〃	باب دوم کے ماخذ (فصل اول)	۷۱ تا ۷۲
۱۴	〃	〃 〃 (فصل دوم)	۷۲ تا ۷۴
۱۵	〃	〃 〃 (فصل سوم)	۷۵ تا ۷۶
۱۶	باب ۳	ہندوستان کی تجارت خارجہ کے تغیرات۔ 〃 (۱) سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کا تجارتی مرتبہ	۷۷ تا ۸۶
۱۷	〃	〃 〃 (۲) قوت خرید کا مہیا ہونا۔	۸۶ تا ۹۱
۱۸	〃	〃 〃 (۳) کمپنیوں کی ایشیائی تجارت۔	۹۱ تا ۹۷
۱۹	〃	〃 〃 (۴) تجارت درآمد کی رفتار میں تغیر۔	۹۷ تا ۱۰۳
۲۰	〃	〃 〃 (۵) ہندوستان کی ایشیائی تجارت کے تغیرات۔	۱۰۴ تا ۱۱۶
۲۱	〃	〃 〃 (۶) ہندوستان کی صنعت جہازسازی۔	۱۱۶ تا ۱۲۷
۲۲	〃	باب سوم کے ماخذ (فصل اول)	۱۲۸
۲۳	〃	〃 〃 (فصل دوم)	۱۲۸ تا ۱۲۹
۲۴	〃	〃 〃 (فصل سوم)	۱۲۹ تا ۱۳۰
۲۵	〃	〃 〃 (فصل چہارم)	۱۳۰
۲۶	〃	〃 〃 (فصل پنجم)	۱۳۰ تا ۱۳۱

سلسلہ نشان	باب	مضامین	از صفحہ تا صفحہ
۱	۲	۳	۴
۲۷	باب ۳	〃 (فصل ششم-	۱۳۱ تا ۱۳۲
۲۸	باب ۴	مغربی یورپ میں نئی منڈیوں کا قیام-	
۲۹	〃	〃 (۱- مغربی یورپ سے تجارت، سترھویں صدی کے آغاز میں-	۱۳۳ تا ۱۴۱
۳۰	〃	〃 〃 ۲- مغربی یورپ کی دساور کی مقدار-	۱۴۱ تا ۱۵۸
۳۱	〃	〃 〃 〃 ۳- نیل	۱۵۸ تا ۱۷۱
۳۲	〃	〃 〃 ۴- شورہ-	۱۷۱ تا ۱۷۷
۳۳	〃	〃 〃 〃 ۵- سوتی مال-	۱۷۷ تا ۱۹۵
۳۴	〃	〃 ۶- دیگر اشیا اور عام رائے-	۱۹۵ تا ۲۰۳
۳۵	〃	باب چہارم کے ماخذ (فصل اول-	۲۰۴
۳۶	〃	〃 〃 〃 (فصل دوم)	۲۰۴ تا ۲۰۵
۳۷	〃	〃 〃 〃 (فصل سوم)	۲۰۵ تا ۲۰۷
۳۸	〃	〃 〃 〃 (فصل چہارم)	۲۰۷ تا ۲۰۸
۳۹	〃	〃 〃 〃 (فصل پنجم)	۲۰۸ تا ۲۰۹
۴۰	〃	〃 〃 〃 (فصل ششم)	۲۰۹ تا ۲۱۰
۴۱	باب ۵	ہندوستانی منڈیوں کی کیفیت-	
	〃	〃 〃 ۱- عام حالات-	۲۱۱ تا ۲۲۰
۴۲	〃	〃 〃 ۲- ہندوستان کے سوداگر اور تجارتی تنظیم-	۲۲۰ تا ۲۲۹
۴۳	〃	〃 〃 ۳- گجرات کی تجارت نیل-	۲۲۹ تا ۲۳۷

نمبر شمار	ابواب	مضامین	از صفحہ تا صفحہ
۱	۲	۳	۴
۴۴	باب ۵	〃 ۴۔ درآمد کی منڈیاں۔	۲۳۷ تا ۲۴۴
۴۵	〃	〃 ۵۔ اجناس خوردنی اور چاندی۔	۲۴۴ تا ۲۵۹
۴۶	〃	〃 ۶۔ سونا اور تانبہ۔	۲۵۹ تا ۲۶۳
۴۷	〃	باب پنجم کے ماخذ (فصل اول)	۲۶۴ تا ۲۶۵
۴۸	〃	〃 (فصل دوم)	۲۶۵ تا ۲۶۶
۴۹	〃	〃 (فصل سوم)	۲۶۶
۵۰	〃	〃 (فصل چہارم)	۲۶۶ تا ۲۶۷
۵۱	〃	〃 (فصل پنجم)	۲۶۷
۵۲	〃	〃 (فصل ششم)	۲۶۸
۵۳	باب ۶	پیدائش و خرچ۔	
		۱۔ پیدائش کے تغیرات۔	۲۶۹ تا ۲۸۱
۵۴		۲۔ خرچ۔	۲۸۱ تا ۲۹۰
۵۵	〃	باب ششم کے ماخذ (فصل اول)	۲۹۱ تا ۲۹۲
۵۶	〃	〃 (فصل دوم)	۲۹۲
۵۷	باب ۷	قحط کے معاشی نتائج۔	
		۱۔ قحط کی نوعیت اور تواتر۔	۲۹۳ تا ۳۰۰
۵۸	〃	〃 ۲۔ ۱۶۳۰-۳۱ء کا قحط	۳۰۰ تا ۳۱۱
۵۹		باب ہفتم کے ماخذ۔	۳۱۲ تا ۳۱۳
۶۰	باب ۸	نظم و نسق کے اقتصادی اثرات۔	
		۱۔ ہندوستانی ممالک میں بیرونی تاجروں کی حیثیت۔	۳۱۴ تا ۳۳۰

سلسلہ نشان	ابواب	مضامین	از صفحہ تا صفحہ
۱	۲	۳	۴
۸۰	ضمیمہ (ج)	سلطنت مغلیہ کی رقوم مالگزاری	۴۵۳ تا ۴۶۱
۸۱	ضمیمہ (د)	سکہ، اوزان اور پیمانے۔	۴۶۳ تا ۴۸۰
۸۲	،	ضمیمہ د کے ماخذ	۴۸۱ تا ۴۸۳
۸۳	ضمیمہ (ہ)	فہرست ماخذ۔	۴۸۴ تا ۴۹۲

تمت

دیباچۂ مترجم

"اکبر ٹو اورنگ زیب" کے فاضل مصنّف نے اپنی پہلی کتاب "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" کی طرح اس کتاب کے لکھنے میں بھی بڑی محنت اور جگر کاوی کی ہے۔ فرنگی تاجروں کے ابتدائی مکاتیب و مراسلات اور کہنہ و فرسودہ کاغذات و اشلہ کو جس اہتمام کے ساتھ اُنھوں نے مطالعہ کیا، یہ اُنھیں کا حصّہ ہے اور اس میں بھی شبہہ نہیں کہ فرنگیوں کی ہندوستان کے ساتھ ابتدائی تجارت اور خود ہندوستان کے قدیم تجارتی حالات کے متعلّق وہ بہت سی دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان سب خوبیوں کے باوجود اُن کی کتابیں، خاصکر پیشِ نظر کتاب کے آخری ابواب کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے سے فاضل مصنّف کی ایک غرض یہ ہے کہ سولھویں سترھویں صدی عیسوی کی ہندوستانی حکومتوں کو ظلم و زرستانی اور جبر و جور کا بدترین نمونہ ثابت کیا جائے اور اس زمانے میں جو لوگ انگریزی حکومت کی زرکشی اور اُس کے باعث اہل ہند کے افلاس اور شکستہ حالی کے ثبوت پیش کرتے ہیں، گویا اُن کے جواب میں یہ بتایا جائے کہ مغل بادشاہوں کے

عہد میں عام اہل ہند کی مالی اور معاشری حالت آج کل کی نسبت بھی خراب و بدتر تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان حیرت انگیز بلکہ خوف انگیز نتائج کی بنیاد فاضل مصنّف نے فرنگی سیّاحوں اور تاجروں کے ایسے بیانات پر رکھی ہے، جن میں سے اکثر بداہتہً مبالغہ آمیز اور فاسد الاعتبار ہیں اور یا تو اُن میں اہل وطن کی دلچسپی اور تعجّب افزائی کے لئے رنگ آرائی سے کام لیا ہے اور یا محض بازاری گپ شپ کو صحیح اور چشم دید واقعات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ یہی مصنّفین جب ہندوستان کی سرسبزی اور زرخیزی کا تذکرہ کرتے ہیں، تو ہمارا فاضل مصنّف ان بیانات کو سطحی اور ناقابل اعتبار قرار دیتا ہے اور جہاں کہیں وہ ہندوستان یا حکّام ہند کی مذمت کرتے ہیں، وہاں اُن کے ایک ایک قول اور ادنی ادنی امثال سے وسیع و ہمہ گیر کلّیات مرتّب کرنے میں تامّل نہیں کرتا۔ ممکن ہے اس کا یہ طرز استدلال خود اُس کے وطن میں پسندیدہ اور مقبول ہو جائے لیکن ہندوستان میں تو ایسی تحریر مصنّف سے لوگوں کو بدگمان اور ناراض کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دو چار جگہ جہاں مصنّف کا تعصب حد سے گزر گیا ہے، مترجم سے تعریض کئے بغیر نہیں رہا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے غلط استدلال اور کثیر اغراق کی اس طرح کافی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ یہ بات مترجم کے فرائض میں داخل تھی۔ البتہ ابتدائے کتاب میں مجھے مناسب معلوم ہوا کہ ناظرین کو اجمالی طور پر فاضل مصنّف کی اس خصوصیت سے آگاہ و متنبہ کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے فاضل اساتذہ جنہوں نے اس کتاب کو نصاب کے واسطے منتخب فرمایا ہے، درس دیتے وقت اُس کے تمام نامعتبر بیانات کی خود ہی تفصیلی طور پر تردید و اصلاح کر دیں گے اور اپنے طالب علموں کو اُن تاریخی غلط فہمیوں میں پڑنے سے بچائیں گے، جو سرسری طور پر اس کتاب کے مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہیں فقط

خاکسار
سیّد ہاشمی فرید آبادی
(رکن دار الترجمہ۔ مترجم کتاب ہذا)

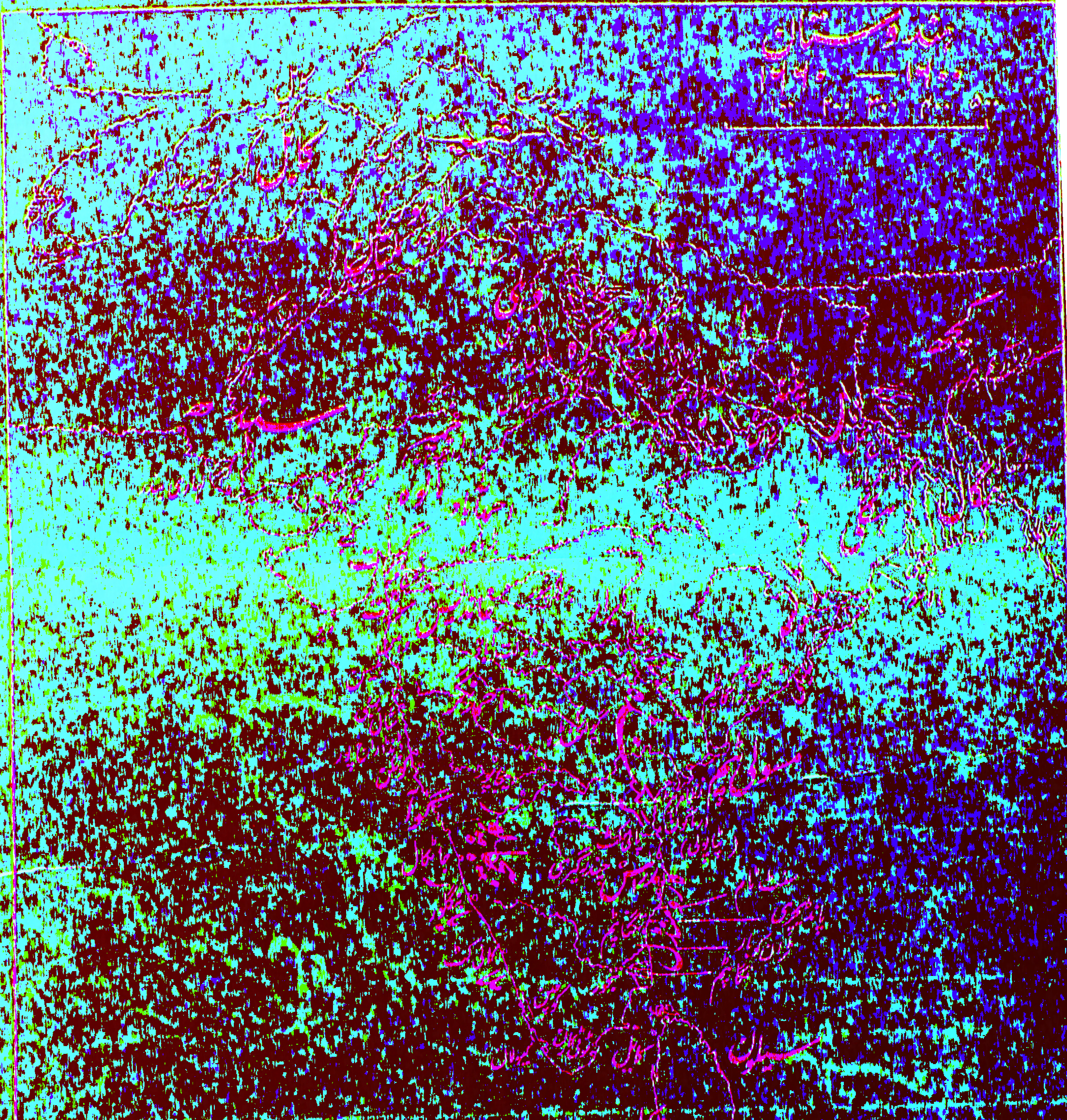

ہندوستان
کابل
سیلون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشی حالات ہند

از اکبر تا اورنگ زیب

باب اوّل

ممالک ایشیا کی کیفیت

(۱) سیاسی حالت

اس کتاب کا موضوع ان اقتصادی اسباب و محرکات کو جانچنا ہے جو ہندوستان پر سترھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں اثر انداز تھے۔ لیکن شروع میں بطور تمہید، خود ہندوستان اور نیز اُن ممالک کی سیاسی حالت کے متعلق چند کلمے لکھنا مناسب ہوگا جو اُس زمانے میں ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلّقات رکھتے تھے۔ اپنی پہلی کتاب موسومہ "ہندوستان بزمانۂ وفات اکبر" کی طرح اس کتاب میں لفظ ہندوستان یا ہند سے، میری مراد وہ تمام رقبۂ زمین ہے جو صوبۂ برما کو چھوڑ کر اس وقت بھی تمام برطانی سلطنتِ ہند اور دیسی ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اور برما کو

چھوڑ دینے کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان سے اس کا سیاسی الحاق بہت زمانے بعد کی بات ہے؛

مذکورۂ بالا رقبے کے بڑے بڑے حصّے تین ہوں گے: شمال میں **سلطنتِ مغلیہ**۔ وسط میں ممالکِ دکن اور جنوب میں وہ علاقہ جو مختلف ہندو رئیسوں کے ہاتھ میں تھا؛ جہاں تک سلطنتِ مغلیہ کا تعلّق ہے، یہ زمانہ جسے میں نے انتخاب کیا، جہانگیر و شاہجہاں کی فرماں روائی کا زمانہ تھا اور ان دونوں بادشاہوں کے زمانے کی سیاسی تاریخ میں اہلِ اقتصادیات کو بہت کم کوئی دلچسپی کی بات نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی شورش و سرکشی، تخت نشینی کے لئے جدّوجہد، اہلِ دربار کی نامختتم ریشہ دوانیاں وغیرہ، یہ سب ایسے معاملات ہیں کہ ہمیں ان سے کوئی خاص تعلّق نہیں ہو سکتا۔ البتّہ یہ ظاہر ہے کہ شورش و فساد کے بار بار بپا ہونے سے نہ صرف اُس وقت نقصان ہوتا تھا بلکہ آئندہ کاروبار پھیلانے سے بھی لوگوں کی ہمّت پست ہوتی تھی۔ دوسرے، سرکاری اخراجات میں اضافہ ہونے کے معنیٰ یہ تھے کہ محصول دینے والے کا سینا پر اسی نسبت سے نظم ونسق کا بار زیادہ ہو جائے؛

جہاں تک حدودِ سلطنت کا تعلّق ہے، شمال کی طرف تو کوئی خاص اور اہم واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مغرب کی سرحد پر قبضۂ قندھار کے لئے ایران سے کشمکش کا ذکر کر دینا کافی ہے جس سے نہ صرف اُن ہر دو ممالک کی باہمی تجارت پر اثر پڑا بلکہ خلیج کھمبائت کی تجارت بھی متاثر ہوئی؛ مشرق میں مغلوں کا پورا پورا تسلط دریائے میگھنا کے قریب یادہانے تک پہنچ کے رُک گیا۔ اور مشرقی بنگال کے بعض اقطاع پر ارکان کا راجہ سنہ ۱۶۶۶ء تک حکومت کرتا رہا۔ مگر اس سال بادشاہی فوجوں نے چاٹ گام اور بیچ کا علاقہ فتح کیا اور وہ سلطنت کے حوزۂ تصرّف میں لے لیا گیا؛ لیکن اس سے زیادہ اہم تغیّرات جنوبی سرحد کی طرف واقع ہوئے جہاں ممالکِ دکن کی فتح کا آغاز پہلے سے ہو چکا تھا۔ دکن کی آزاد مملکتوں میں عموماً پانچ ریاستیں شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیدر (کی برید شاہی) کو اُس کے ہمسایے

آپس میں بانٹ کے ہضم کر چکے تھے اور اس کا نام تاریخ کے صفحات سے غائب ہو چکا تھا۔ اسی طرح خاندیس پہلے سے مغلیہ سلطنت کا صوبہ بنا لیا گیا تھا۔ احمد نگر پر اکبر نے ہاتھ ڈال دیا تھا لیکن فتح کی تکمیل کچھ عرصے بعد، ۱۶۳۵ء میں ہو سکی جب کہ اس کا بہت سا علاقہ سلطنت میں ضم کر لیا گیا اور اسی زمانے میں بیجاپور و گولکنڈہ کی باقیماندہ دونوں سلطنتوں کو بھی جبراً باج گزار بنا لیا گیا اگرچہ ان کے اندرونی انتظامات قریب قریب علیٰ حالہا رہے تھے۔

ان سے آگے، جنوب کے ہندو اقطاع کی کسی مفصل تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۵۶۵ء میں بیجے نگر (وجیا نگر) کا تختہ الٹا تو یہ ملک چند رئیسوں کے ہاتھ میں رہ گیا جو نائک کہلاتے تھے اور اصولاً ہمیشہ، نیز کبھی کبھی عملاً خاندان بیجے نگر کے کسی فرد کی سیادت تسلیم کرتے تھے جو چندرگیری یا عوام کی زبان میں کرناٹک کا راجہ موسوم ہوتا تھا۔ انگریزی یا ولندیزی تحریروں میں جو کچھ تھوڑے بہت حالات کہیں کہیں ملتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نائک برابر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور ان کا راجہ کبھی تو ان کے ہاتھ میں محض شاہ شطرنج اور کبھی خود بھی شریک جنگ وجدال ہوتا تھا۔ لڑنے والوں کے جتھے جلد جلد ادلتے بدلتے رہتے اور اس بارے میں اسی قدر کہنا کافی سمجھیے کہ ملک شاذونادر ہی امن سے بہرہ مند ہوتا اور رہتا تو زیادہ عرصے اس نعمت سے مستفید نہ رہ سکتا تھا۔ ادھر اسی اثنا میں گولکنڈہ اور بیجاپور بھی اپنا حلقۂ حکومت ان علاقوں میں وسیع کرتے جاتے تھے اور کبھی ایک نائک کو حلیف بنا لیتے کبھی دوسرے کو۔ کوئی ایسی بات، جسے آج کل بھی معقول وجہ جنگ قرار دیا جا سکے، کہیں میری نظر نہیں پڑی۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا کہ محض حصول مال و زر کی امید عموماً جنگ کی کافی وجہ تحریک ہو جاتی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے خورد تر اقطاع میں، پرتگیزی مقبوضات کے متعلق تو ہم آیندہ فصول میں گفتگو کریں گے۔ باقی ماندہ کے احوال میں

اہل اقتصادیات کے لئے بہت کم دلچسپی کا سامان ہے اور ان میں صرف کالی کٹ کی چھوٹی سی ریاست قابل ذکر ہے جو اس وقت تک عملاً آزاد تھی اور ملیبار کے ساحل پر ہونے کے باعث، جہاں مرچوں کی پیداوار مشہور ہے، اُس عہد کی تجارتی سیاسیات میں خاص وقعت رکھتی تھی؛

جنوبی ہندوستان کا جو حال اوپر ہم نے لکھا، یہ قریب قریب بجنسہ ایشیا کے اکثر ممالک پر صادق آتا تھا۔ ہندوستان کے جن ملکوں سے تعلقات تھے، اُن سب میں جنگ اگر معمول نہ تھی، تو کم سے کم اس کا احتمال ہمیشہ اتنا غالب ضرور رہتا تھا کہ کسی سوداگر یا صاحب اجناس کا ذہن اُس کے فکر سے خالی نہ ہو سکتا تھا اور چونکہ خفیف سے خفیف حیلوں پر جنگ ٹھن جایا کرتی تھی، لہذا اُس کے آغاز کی نسبت پہلے سے کوئی عقلی قیاس بھی نہ کرسکتا تھا۔ اور سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ جیسی کچھ صورت حال پیش آئے، اُسی کے مطابق آدمی صبر شکر سے خود بھی گزر کرتا رہے؛

ہندوستان کے مغرب کی جانب، سب سے زیادہ باوقعت ملک ایران اور ترکی تھے۔ یہ دونوں اکثر باہم برسرپیکار رہتے اور اُن کی جدال و قتال کا تجارت کی رفتار پر نمایاں اثر پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں سلطنت ترکی کو بحر قلزم کے ساحل پر عرب قبائل کے فتنہ و فساد سے بھی گہ بہ گہ سابقہ رہتا تھا؛

ہندوستان کے مشرق میں، ارکان، پیگو، آوا اور سیام کا ایک مجموعۂ ممالک تھا، اور اس کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ان ملکوں میں کسی وقت بھی جنگ بھڑک سکتی تھی۔ نیز یہ کہ سیام کا اُس علاقے سے دست و گریباں ہو جانا بھی خلاف قیاس نہ تھا، جسے آج کل ہند چینی کہنے لگے ہیں اور جہاں خود بھی خانہ جنگیوں کی کچھ کمی نہ رہتی تھی؛ چین پر ان دنوں بیرونی حملہ آور تسلط جماتے جاتے تھے اور اُدھر اسی زمانے میں جاپان نے کوریا پر ہاتھ مارا تھا اور خود بھی طویل خانہ جنگی کا گھر بنا رہا تھا؛

جنوبی جزائر کی حالت ان بڑی ممالک سے بھی شاید بدتر تھی۔ کیونکہ یہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اور اس لئے نزاع و فساد کے اسباب

تعداد میں زیادہ تھے۔ سماترا میں سب سے بڑی حکومت، اچین کے شخصی فرماں روا کی تھی، اور اس خاندان کی بادشاہی کا، قدیم تر بادشاہی کے استیصال کے بعد، سولھویں صدی عیسوی میں آغاز ہوا تھا۔ مغربی ساحل کا مرچ کا علاقہ بہت کچھ ریاست اچین کے قبضے میں تھا اور یہاں کا حاکم وقتاً فوقتاً مشرق کے چھوٹے چھوٹے خود مختار رئیسوں کے علاقوں پر دست تغلب دراز کرتا رہتا تھا لیکن اس کی جنگ آرائی کا اصلی مرجع ملکا کے پرتگیز تھے جن کے (۴) علاقے پر اُسے کوئی خاص دعویٰ نہ تھا، مگر اس مقام کے تجارتی فوائد اُسے اپنی طرف کھینچتے تھے؛ مغربی جاوا میں بنتم و جکاترا کی ساحلی اور ہمسایہ ریاستیں، کسی وقت بھی، آپس میں یا دوسرے ہمسایوں کے ساتھ مصروف جنگ پائی جاسکتی تھیں اور ولندیزوں کا بٹاویہ یا بٹیویا پر تسلط بھی شروع شروع میں کچھ امن و صلح کی فال نہ تھا؛ جزیرۂ سلی بس کا صدر مقام مکاسر تھا اور وہاں کے خود مختار رئیس کو مشرقی جاوا فتح کرنے کے ارمان تھے اور ادھر اُس کی تجارتی حکمت عملی گہ بہ گہ ولندیزوں کے ساتھ بھی لڑائی کی نوبت پہنچا دیتی تھی؛ مصالحوں کے جزیروں[1] کی سولھویں صدی کے اواخر میں بڑی مٹی خراب تھی۔ اُن دنوں جزائر بندا کے باشندوں نے پرتگیزوں کو اپنے علاقے سے اکھاڑ دیا تھا اور فی الوقت ایک مخدوش سی

---

[1] اُس زمانے کی کتابوں میں ان جزیروں کے ناموں میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہم نے "مصالحوں کے جزیروں" کو وسیع معنیٰ میں استعمال کیا ہے جن میں ملکا، سیرم، امبوینا، اور بندا کے جزائر کے مجموعے شامل ہیں۔ غور و توازن کے بعد، سہولت اسی میں نظر آتی ہے کہ جزائر ملکا کو گیلولو کے مغرب کی طرف کے چھوٹے جزیروں تک محدود کر دیا جائے۔ ان میں اور امبوینا میں لونگ پیدا ہوتی تھی بحالیکہ جوز، جوتری صرف جزائر بندا سے آتے تھے۔ سیرم میں بھی لونگ ہوتی تھی لیکن ہمارے زیر نظر عہد میں یہ جزیرہ شہرت نہ رکھتا تھا؛ ان جزائر کے محل وقوع کو ہم نے صفحہ 16 کے مقابل کے نقشے میں دکھا دیا ہے؛

باب اوّل آزادی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ لیکن امبوینا میں ہنوز پرتگیز اڑے ہوئے تھے جس کا بڑا سبب یہی تھا کہ ان کے مقامی دشمنوں میں باہم نزاع تھی۔ جزائر ملکّا میں جتنے جزیرے تھے، اتنے ہی جتھے بن گئے تھے اور چونکہ ایشیا میں کامیابی سے تجارت کرنا بجز اس کے ممکن نہ تھا کہ ان جزیروں کے وساور مال پر اقتدار حاصل ہو، پس انگریز و ولندیز بھی یہاں نمودار ہوئے اور ان کے پہنچنے سے اوّل اوّل اور بھی زیادہ فتور برپا ہوا۔ بالآخر ولندیز غالب آ گئے اور انھوں نے قیام امن کے لئے اپنے جابرانہ طریقوں سے کام لیا اگرچہ اس کے باوجود بھی پوری طرح امن و سکون قائم ہونے میں مدت دراز صرف ہوئی۔

اقتصادیات کے طالب علم کو ان قضیوں کی جزئیات میں الجھنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے یہ ذہن نشین رہنا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ بجز چین کے، دول ایشیائی میں سے اور کسی سلطنت نے اس وقت تک وہ ساز و سامان بہم نہ پہنچایا تھا جس پر "بحری قوت" کا صحیح معنیٰ میں ذرا بھی اطلاق ہو سکے۔ بے شبہ ہم پرانے وقائع میں "بیڑوں" کا ذکر پڑھتے ہیں کہ پیگو، اچین یا مکاسر سے روانہ کئے گئے لیکن ان کی کارگزاریوں کے حالات سن کر ظاہر ہوتا ہے کہ ان جہازوں کو جنگی سمجھنے کی نسبت محض حمل و نقل کے جہاز سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً اچین والوں نے ملکّا پر چڑھائی کی تو اس کے معنیٰ یہ تھے کہ مختلف وضع کی چند صد کشتیوں پر ایک فوج چڑھا کے بھیج دی گئی اور یہ کشتیاں بادبانوں کی مدد سے بیچ کا سمندر (۵) عبور کر کے دشمن کے ساحل پر جا پہنچیں اور فوج اتار دی۔ اب اگر اس قسم کی مہم کو اصطلاحی معنیٰ میں کسی واقعی پرتگیزی بیڑے سے سابقہ پڑ گیا تو اس کے جہاز ایسے غائب ہوئے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ خود سلطنت مغلیہ کے پاس کوئی بحری طاقت نہ تھی اور بعض دفعہ یہ پڑھ کر خاصا تاسف ہونے لگتا ہے کہ سورت کے حکام ایک دو ولندیزی یا انگریزی جہازوں کے بھیجنے کا تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کی لنگرگاہوں کی

حفاظت کی جا سکے؛ [۱] علیٰ ہذا، جیسا کہ ہم آگے بڑھیں گے، صرف چند توپ برداروں (گن بوٹس) نے حکومت گولکنڈہ کو مجبور کر دیا کہ صلح کی درخواست کرے۔ ایک موقع پر شاہ ایران کے عرض بیگی نے کہا، اور بالکل سچ کہا کہ ہمارا بادشاہ زمین کا بادشاہ ہے۔ سمندر کا بادشاہ نہیں ہے۔ ترکی سلطنت کا جو "بیڑا" مُخہ میں تعینات رہتا تھا، اُس کا ہم آگے چل کے تذکرہ کریں گے۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہے کہ سولھویں صدی کے آخری سنین میں ہندوستان کے سمندروں پر پرتگیزوں کی مسلّمہ فرماں روائی تھی جس کا سبب خود اُن کی قوت کا زیادہ ہونا نہ تھا بلکہ اصل یہ ہے کہ اقوام ایشیا بحری قوت کے فوائد و نوعیت سے باخبر نہ تھیں؛ اب چونکہ ہمارے پیش نظر عہد کی ہندوستان سے تجارت کی تاریخ تمام تر پرتگیزوں کے زوال اور موزنبیق و جزائر ملکا کے مابین تمام بحری علاقوں پر اُن کی بجائے ولندیزوں کے چھا جانے سے وابستہ ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس انتقال قوت کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے؛

۲۔ پرتگیزوں کی بحری سلطنت

ہندوستان کے سمندروں میں پرتگیزوں کے سب سے پہلے جہاز، پندرھویں صدی کے آخر میں نمودار ہوئے لیکن چند ہی سال کے اندر

---

[۱] مثال کے لئے ملاحظہ ہوں "انگلش فیکٹریز" میں میتھوولڈ کے روزنامچے کی یادداشتیں۔۔ جلد پنجم ورق ۳۱۰؛ سورت کی لنگرگاہ جس وقت ملیبار کے بحری قزاقوں کی زد میں تھی اور انگریز اس کی مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو مغل صوبہ دار نے دو تین کشتیاں تیار کیں اور غریب ناتجربہ کار دھینیے پکڑ کے ملاح مقرر کئے جنھوں نے کبھی سمندر نہ دیکھا تھا اور اس لئے صوبہ دار کے کچھ زیادہ مفید مطلب نہ ہو سکتے تھے۔ تاہم وہ کبھی کبھی کشتیاں کھیتے ہوئے ندی کے آگے بھی چلے جاتے اور پھر ہمارے جہاز کی حفاظت میں، بلکہ کہنا چاہئے کہ اسی پر سوار ہو کر وہ رات کے وقت ندی میں واپس آجاتے تھے؛

ایک ایسی سلطنت کا تخیّل قائم ہوگیا جس کا ممالک ایشیا کو قریبی زمانے میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ سمندروں پر بزور اقتدار رکھا جائے اور حکمرانوں کے نفع کے لئے بحری تجارت پر قابو رہے۔ ایک چھوٹی سی قوم کے واسطے جو ہزاروں میل دور کی رہنے والی تھی، اس کام کا بیڑا اُٹھانا کچھ کم دشوار نہ تھا اور درحقیقت اس کا عمل میں آنا محض اس لئے ممکن ہوگیا کہ دول ایشیا کی اس بارے میں بے خبری کی کیفیت وہ تھی جو اوپر (۶) بیان کی گئی۔ اس منصوبے کی کامیابی کے لوازم دو تھے: بیڑے اتنے قوی ہوں کہ سمندر میں حریف پر غالب آجائیں۔ اور دوسرے کچھ بحری مستقر ایسے ہوں کہ خشکی اور تری کی طرف سے اُن کی مدافعت کی جاسکے اور وہ جہازوں کی رسد رسانی اور پناہ دہی کرسکیں، نیز کچھ زمانے کے بعد وہاں سے ملاح اور کمک کے لئے جنگ جو فراہم ہونے لگیں؛ چونکہ کوئی بڑا حریف اور شدید مزاحمت موجود نہ تھی، لہذا سمندروں پر معمولی قوّت کے بیڑوں سے اقتدار رکھنا تو ممکن ہوگیا۔ البتہ، ابتدا ہی میں پرتگیزوں کو اصلی کام یہ درپیش تھا کہ بحری مرکز اور قلعہ بند مقامات حاصل کئے جائیں۔ ان کے سب سے پہلے مرکز تعداد میں تین تھے: ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوآ، مشرق اقصیٰ کے دروازے پر، ملکّا اور خلیج فارس کے دہانے پر ہرمز؛ ابتدائی منصوبے میں بندر عدن کا قبضہ بھی داخل تھا کہ بحر قلزم کی تجارت قابو میں رہے۔ لیکن سواحل عرب پر ترکوں کا تسلّط پھیلنے کے باعث یہ بندرگاہ ہاتھ نہ آسکی۔ البتہ مذکورۂ بالا تین مقامات کا قبضہ ہی تقریباً ایک صدی تک کافی ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں خاص خاص اغراض کے لئے پرتگیزوں نے اور بھی کئی قلعوں کو لے رکھا تھا، جن میں موزنبیق، دیو، دمان (دمن)، کوچین اور کولمبو سب سے بڑے تھے۔ موزنبیق، افریقہ کے مشرقی ساحل پر یورپ سے ہر سال آنے والے بیڑوں کی منزل، اور اُسی کے ساتھ تجارتی مرکز کا کام دیتا تھا۔ دیو اور دمان سے خلیج کمبے (کھنبایت) کی نگرانی کی جاتی تھی اور

یہ خلیج ہندوستان کی تجارت کے مختلف بحری مخارج میں سب سے اہم تھی۔ کوچین، ملیبار کی مرچ باہر بھیجنے کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا اور یورپ جانے والے مال میں سب سے زیادہ مقدار اسی جنس کی ہوتی تھی۔ اسی طرح کولمبو سے، وہاں کی سب سے بڑی دساور کی جنس یعنی دارچینی کی تجارت قابو میں رہتی تھی۔ مزید براں، مصالحوں کے جزیروں میں، لونگ، جوز، اور جوتری کی تجارت قبضے میں رکھنے کی غرض سے اِدھر اُدھر کئی چھوٹے قلعے اور بھی پرتگیزوں کے پاس تھے گو اُن کے قرب وجوار کے باشندے اُن کے دشمن تھے۔ نیز مشرقی افریقہ کے ساحل پر اُنھوں نے چند اچھے اچھے مقامات چن لئے تھے۔ اسی سلسلے میں بعض مقامات کے اندر یا قریب، تھوڑا بہت علاقہ بھی، خصوصاً مغربی ہندوستان میں، وقتاً فوقتاً پرتگیزوں کے زیر حکومت آتا رہا۔

صدی کے جس قدر سال گزرتے گئے، پرتگیزی نوآبادیاں بھی جابجا وجود میں آتی گئیں جو ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھیں۔ ان میں سے بعض قلعہ بند تھیں اور گوآ سے اُن کے لئے قلعہ دار مقرر ہوتے تھے۔ بعض محض غیر علاقوں میں بستیوں یا محلوں کی طرح آباد تھیں اگرچہ ان سب کی یہ خصوصیت ضرور تھی کہ فوجی قوت کا مرکز ہونے کی بجائے وہ اصلاً تجارتی کاروبار کا مرکز ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے مشرقی جانب ایسی نوآبادیاں، جنوب میں تو سنیٹ تھومے اور نگاپٹم میں آباد ہوئیں اور بنگالے (۷) کے علاقے میں چاٹگام وہگلی کے مقام پر۔ اس کے آگے مشرق میں کانٹن کی بندرگاہ کے دہانے پر مکاو تھا جہاں سوداگروں پر شدید قیود عائد کی گئی تھیں تاکہ چین کے اندرونی علاقوں کی تجارت میں بھی ساجھا رہے۔ دور دست جزیرہ تمور میں ایک چھوٹی سی بستی سفید صندل کی جو ان علاقوں میں ہوتا تھا، بہم رسانی میں مصروف رہتی تھی۔ اور کچھ عرصے بعد مکاسر میں بھی ایک وسیع نوآبادی بن گئی تھی۔ لیکن ان سے یا اور کئی چھوٹے چھوٹے مقامات سے، پرتگیزوں کی سیاسی قوت میں کوئی

معقول اضافہ نہ ہوتا تھا اگرچہ قومی تموّل کی افزائش میں ان کا بھی بہت خاصا حصّہ تھا۔ سیاسی قوّت کا مرکز گوآ ہی تھا۔ یہی اُن کے بڑے بڑے بیڑوں کا مستقر تھا اور یہیں سے ضرورت کے وقت مشرق یا مغرب میں کمک روانہ کی جاتی تھی۔ چھوٹے جہاز، اور بعض بڑے جہاز بھی ہندوستان میں، یا خود گوآ یا بسین میں تیار کر لئے جاتے تھے اور گوآ کی گودی ایسی اعلےٰ درجے کی بنائی گئی تھی کہ شاید ملک بھر میں اتنے وسیع پیمانے کا منظم صنعتی کام دوسرا نہ ہو گا۔

بحری تجارت کو قابو میں رکھنے کے لئے جو طریقے پرتگیزوں نے اختیار کئے، وہ اجمالاً حسب ذیل تھے: اوّل تو خاص خاص تجارتی راستوں کی نسبت اعلان کر دیا گیا کہ یہ بادشاہ پرتگال کے بلاشرکت قبضے میں ہیں، اور ان راستوں سے کسی دوسری قوم کے جہاز کو جانے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ ان راستوں میں گہ بہ گہ تبدیلیاں بھی کر دی جاتی تھیں لیکن مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ سولھویں صدی کے آخر میں ہندوستان کا کوئی جہاز، مشرقی افریقہ، چین، جاپان یا مصالحوں کے جزیروں کی طرف نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ اپنے آپ کو اس جوکھوں میں ڈالنے پر آمادہ نہ ہو کہ پرتگیز اُسے گرفتار یا غرقاب کر دیں گے۔ اور خود پرتگیزوں کی طرف سے ان ملکوں کے ساتھ تجارت یا تو سرکاری طور پر کی جاتی تھی اور بطور انعام خاص خاص افراد کو اس کی اجازت مل جاتی تھی ورنہ اس کا ٹھیکہ دے کر روپیہ خزانۂ شاہی میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ ثانیاً، مال کی بعض قسمیں، خصوصاً سامان جنگ اور مرچ کی کسی غیر قوم کے آدمی کو لانے لے جانے کی اجازت نہ تھی اور اس قاعدے کی جو خلاف ورزی کرتا، اس جہاز کو پرتگیز (جہاں تک بس چلتا) ضبط کر لیتے یا ڈبو دیتے تھے۔ ثالثاً، کوئی ایشیائی جہاز، محصول بھرے اور اجازت نامہ ("کارٹز") حاصل کئے بغیر ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک نہ جا سکتا تھا نہ تجارتی مال لے جا سکتا تھا۔ اور اس اجازت نامے کے محصول کے علاوہ، ہرمز و ملکا جیسی بڑی بندرگاہوں پر

کروڑگیری الگ وصول کی جاتی تھی۔ اس طرح ادّعائی طور پر تو بحری تجارت پر سرکاری اقتدار کامل تھا، لیکن واقعی حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی غرض سے، یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ پرتگیز عمّال حد درجے کے (۸) رشوت خوار ہوتے تھے۔ مختلف مقامات کے قلعہ داروں کی آمدنیاں عام طور پر سرکاری تنخواہوں کے حساب سے نہیں لگائی جاتی تھیں بلکہ رشوت اور ناجائز بالائی ملا کر ان کا تخمینہ کیا جاتا تھا۔ اور جیسا کہ پیارڈ نے بندر ہرمز کی نسبت تحریر کیا ہے، حکام "روپے لے کے ہر چیز گزر جانے دیتے تھے"۔ یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ پرتگیز سوداگر اکثر اوقات ایسے (ناجائز) کاروبار میں ہندوستانیوں کے شریک وسہیم رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کے لئے بھی یہ تدبیر گرانی سے بچنے میں بہت مفید مطلب ہوتی ہوگی۔ اسی طرح معافی محصول کے جو اجازت نامے سیاسی وجوہ سے مختلف ہندی رؤسا کو دیئے گئے تھے، اُن سے بھی اسی قسم کے کام لئے جاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس طریق انتظام کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ گو ہندوستان کے سمندروں میں تجارت کی گرم بازاری میں فرق نہ آیا، لیکن اُس کے منافع میں ایک بڑے حصّے کے شریک پرتگیز ہو گئے اور "جہاں تک تجارتی آمد و رفت برداشت کر سکتی تھی" وہاں تک جائز و ناجائز محصول کا روپیہ اُن کی جیب میں پہنچنے لگا۔ کوئی پرتگیز قلعہ دار یہ تو چاہ نہ سکتا تھا کہ اُس کی بندرگاہ سے مال کی آمد برآمد کم ہو جائے کہ اس میں خود اُس کا نقصان تھا لیکن اس کے علاوہ اُس کی طمع اور جابرانہ زرستانی کی اور کوئی حد نہ تھی۔

شاید کوئی پوچھے کہ ہندوستان کے سمندروں پر ایسے بادشاہی اقتدار جمانے کا پرتگیزوں کو کیا حق تھا؟ اس کے جواب دو ہو سکتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ دونوں شافی اور مُسکت ہیں۔ خود پرتگیزوں کے لئے تو اتنا ہی کافی تھا کہ ان کی یہ کارروائی پاپائے رومہ کی منظوری اور دعائے خیر سے

مشترف ہو چکی ہے۔ کیونکہ، یاد رہے کہ اُن دنوں پاپائے روم کو دُنیاوی معاملات میں فوق الاقوام مرتبہ حاصل تھا اور اس کے "امانت نامے" (Mandates) تمام لاطینی ممالک مسیحی میں واجب العمل تسلیم کئے جاتے تھے۔ پس جو قومیں پاپائی اختیارات کے اس نظریے کی معتقد تھیں، انھیں پرتگیزوں کے دعاوی کے متعلق کوئی قیل وقال نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ ولندیز و انگریز وغیرہ بعض قومیں ایسی تھیں کہ جنھوں نے سولھویں صدی کے اواخر میں پاپائی منصب و اقتدار کے اس نظریے کو قطعاً مسترد کر دیا تھا اور ایشیائی ممالک کے بارے میں تو صریحاً وہ بالکل خلاف محل تھا لیکن خود ایشیائی نقطۂ نظر کو لیجئے تو اُس کی رُو سے پرتگیزی سلطنت پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا کیونکہ وہ تلوار کے زور پر مبنی تھی اور اس برّ اعظم میں حق حکمرانی کی بنا عملاً صرف یہی شے تسلیم کی جاتی تھی۔ شاہ پرتگال ہندوستان کے سمندروں کا اس واسطے فرماں روا تھا کہ اُس میں ان پر قبضہ جمانے کی کافی قوت تھی۔ اور کوئی دوسری سلطنت اتنی طاقتور نہ تھی کہ اُن سے (۹) یہ اقتدار چھین لے۔ اگر شہنشاہ اکبر کا ہندوستان کے میدانوں پر حکم رواں تھا، تو اُس کی بنیادی وجوہ بھی بجنسہٖ یہی تھیں۔ بلکہ سبقت و دیرینگی کا ایشیا کو لحاظ ہوتا، تو پرتگیزی سلطنت، اکبری سلطنت سے زیادہ واجب التسلیم تھی کہ جس وقت بابر نے اپنی سب سے بڑی قسمت آزمائی کے لئے کمر باندھی تو پرتگیز اس سے پہلے سے ہندوستان میں پوری طرح قدم جما چکے تھے۔ لیکن دوسرے حقوق یعنی زور و قوت کے سامنے، قبضے کا زیادہ پُرانا ہونا بھی ایشیا میں کوئی رکاوٹ نہ سمجھا جاتا تھا؛

اکبر نے اصولاً پرتگال کے حق فرماں روائی کو گویا مان لیا تھا کہ بحر قلزم کی طرف جو جہاز وہ روانہ کرتا، اُن کے لئے پرتگیزوں سے اجازت نامہ لے لیتا تھا اور کوئی اور کوشش بھی مغلوں نے سمندروں کو آزاد یا اپنے زیر تسلّط لانے کی نہیں کی۔ بیجاپور نے ایک دفعہ سے زیادہ گوآ پر چڑھائی کی اور ۱۵۷۰ء کے قریب کئی اسلامی

ریاستوں نے مل کر جو کارروائی کی تھی، اُس کو پوری پرتگیزی سلطنت پر ایک زد تصور کیا جا سکتا ہے، سو وہ بھی اس معاملے میں بے اثر ثابت ہوئی۔ چند سال بعد ترکوں نے بھی دوبارہ یہ کوشش کی، جیسی کہ صدی کے شروع میں کی تھی کہ ہندوستان کے سمندروں پر اُن کا تسلّط ہو جائے اور یہ دیکھ کر کہ اُن کے عربی علاقوں میں جہاز سازی کے لئے شہتیر میسّر نہیں آتے، اُنھوں نے مشرقی افریقہ کے اُن سواحل پر بھی قبضہ جما لیا جہاں چوبینے کے جنگل تھے۔ لیکن اُن کا دو جنگی جہازوں کا "بیڑا" کہ اُن میں بھی ایک بحر نوردی کے قابل نہ تھا اور کمک کے لئے صرف ادنیٰ جنگی قوّت کی چھوٹی کشتیاں تھیں، اس مقصد کے واسطے کسی طرح کافی نہ ہو سکتا تھا اور پرتگیزوں کو اپنا گیا ہوا علاقہ واپس لے لینے میں کچھ بہت دشواری پیش نہیں آئی۔ البتّہ اُن کی بحری سلطنت کا صرف ایک حریف رہ گیا جو ملیبار کے بحری قزّاقوں کا بادشاہ "کُنیل" تھا[۱]۔ اس شخص کے اقتدار و قوّت کی داستان اہم تو نہیں، البتہ عجیب ہے اسے کالی کٹ (کے رئیس) کی خفیہ مدد اور پناہ میسّر تھی اور وہ رفتہ رفتہ پرتگیزوں کی جہازرانی کے حق میں بلائے بے درماں بن گیا تھا۔ سولھویں صدی کے اخیر میں اُس نے "امیر بحور ہندوستان" کا لقب اختیار کیا اور انھیں طریق پر جو اُس کے حریفوں نے رائج کر رکھے تھے، خود بھی جہازرانی کے واسطے اجازت نامے جاری کرنے شروع کئے۔ اُس کے خلاف ایک پرتگیزی مہم بھیجی گئی مگر اُس نے شکست کھائی اور اب کُنیل نے "حامیٔ اسلام، قامعِ پرتگیز" کا لقب اختیار کیا۔

---

[۱] اس شاہ قزاقاں کا نام کئی کئی طرح لکھا ملتا ہے اور میں اُس کی صحت تلفّظ کی تحقیق نہ کر سکا۔ لیکن بظاہر اصل نام کُنہ علی ہے۔ ایک ولندیزی روایت میں لکھا ہے کہ وہ جہازوں میں بھیج دیا گیا (Renneville, iii ۔ صفحہ ۱۵۴) یہ بیان کہ وہ قتل کیا گیا، پرتگیزی روایات پر مبنی ہے (دیکھو کیلنڈر، ۱۵۱۳ء تا ۱۶۱۶ء ۔ صفحہ ۲۸۰)۔

باب اوّل (۱۰)

نگران القاب کی نازش و مسرت کچھ زیادہ دیرپا نہ تھی کیونکہ دوسری مہم جو اُس کے خلاف روانہ کی گئی، بالکل کامیاب ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ امیر بحور ہند بالآخر گوآ میں جان سے مار دیا گیا۔ اس طرح پرتگیزوں نے اس صدی کے ختم تک ہر حریف کا مقابلہ کیا اور ایشیا میں ایسی سلطنتیں کچھ زیادہ نہ تھیں جو اپنے وجود کی اس سے بہتر توجیہ پیش کر سکتیں۔

الغرض، جہاں تک ظاہری حالات کا تعلق ہے، پرتگیزی سلطنت مستقیم و محکم نظر آتی تھی، لیکن حقیقت میں اُس کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور وہ ایسی حالت میں نہ تھی کہ کسی مصمم حملے کی مدافعت کر سکے۔ اُس کے زوال کی کہانی سیاسی تاریخ لکھنے والے کے لئے چھوڑ دینی چاہیئے۔ اس سلطنت میں اُصولِ عمل اور نظم و نسق کی بہت سی نمایاں خامیاں موجود تھیں لیکن سب سے بڑی اور اہم بات تو یہ ہے کہ وقت واحد میں ایشیا، افریقہ اور برازیل میں ہمت آزمائیاں کرنے سے پرتگال پر اُس کی قوت سے زیادہ بوجھ پڑ گیا تھا۔ سولھویں صدی میں اس مُلک کی آبادی میں خاصی اندیشہ ناک کمی ہونے لگی تھی اور جب یہ صدی ختم ہوئی تو وہاں کے باشندوں کی کُل تعداد شاید قریب قریب اتنی تھی جتنی آج کل شہر کلکتہ کی ہے۔ چنانچہ ایسا وقت بھی آ گیا کہ ان سب کاموں کے واسطے سال بہ سال جس قدر آدمی درکار ہوتے تھے، اُن کا فراہم کرنا غیر ممکن ہو گیا کہ جو بھیجے جاتے تھے اُن میں سے بہت تھوڑے واپس وطن آتے تھے۔ اور جنگی جہازوں کی جمعیت، ایشیائی مقبوضات کی مدافعت کے ساتھ، زیادہ تر اسی مخلوط قوم پر منحصر ہوتی گئی، جو مختلف نوآبادیوں میں پل کر بڑھی تھی۔ اور یہ کہنا ان لوگوں میں کوئی عیب نکالنا نہیں ہے، کہ وہ اپنے اجداد جیسے نہ تھے۔ بعض بعض مواقع پر وہ خوب لڑ سکتے تھے لیکن ان میں ایسے غیر معمولی اوصاف کی، جن کی بدولت زمانۂ قدیم میں پرتگیزوں نے ایشیا میں یہ شہرت پائی کہ برّ و بحر پر اُنھیں مغلوب کرنے والا کوئی نہیں، بہت کمی تھی۔ مخلوط نسل کے لوگ ایسے مغلوب

نہ ہونے والے نہ تھے، دوسرے خود اُن کی تعداد ملا کر بھی بہم جارحانہ اور مدافعانہ محاربات کے لئے کافی نہ تھی۔ گوآ جہاز تیار کرنے کی ابھی تک قابلیت رکھتا تھا لیکن ہر موقع پر ضروری سپاہی اور ملّاح مہیا کرنے کی اُس میں گنجائش نہ تھی[۱]

یہ بنیادی کمزوری اس وقت اور زیادہ بڑھی جب کہ سنہ ۱۵۸۰ء (۱۱) کے آخر میں پرتگال و اسپین دونوں کی بادشاہیاں مل کر ایک ہو گئیں اور اسپین کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بھی پرتگال کو تھوڑا بہت اپنے وسائل سے کام لینا پڑا۔ واضح رہے کہ مذکورۂ بالا اتحاد محض شخصی یا خاندانی تھا۔ ورنہ پرتگال پہلے کی مثل ایک علیحدہ مُلک و قوم رہا۔ البتہ ساٹھ سال تک اُس کی حکمت عملی کی باگ بادشاہ اسپین کے ہاتھ میں آگئی اور پرتگیزوں کی چھوٹی سی قوم میں جو کچھ قوّت موجود تھی، ممالک یورپ پر ہسپانی سیادت قائم کرنے کی سعی میں اُس کا اسراف ہونے لگا۔ اور سنہ ۱۶۴۰ء میں دوبارہ پرتگال آزادی سے بہرہ یاب ہوا تو ایشیا کے معاملات گویا قابو سے باہر ہو چکے تھے، دوسرے اس "غلامانہ وابستگی" سے (محبّانِ وطن پرتگیز مذکورۂ بالا اتحادِ بادشاہی کو اسی طرح یاد کرتے تھے) صرف یہی نقصان نہ ہوا کہ مادّی وسائل دوسری طرف خرچ ہوئے، بلکہ وہ قومی جوش بھی قریب قریب بالکل دب کے رہ گیا جو ایشیائی اولوالعزمی کا بہت کچھ سبب اور محرّک تھا۔ چنانچہ اُس زمانے

---

[۱] پرتگال کی اُس زمانے کی ٹھیک آبادی بتانا، ظاہر ہے کہ ممکن نہیں۔ میں نے ایک تخمینہ دیکھا ہے کہ سنہ ۱۵۰۰ء میں پرتگیزوں کی تعداد بیس لاکھ سے گھٹ کر ایک صدی بعد اُس کی نصف رہ گئی لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس تخمینے کی بنا کیا ہے۔ البتہ ہمارے پیش نظر عہد میں قابل جنگ مردوں کی تعداد کا کم ہو جانا بہت سی ضمنی اطّلاعات سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے: ملاحظہ ہو لنزچن ٹریولس کے حواشی، جلد اوّل وغیرہ وغیرہ۔ لن شوٹن تحریر کرتا ہے کہ سنہ ۱۵۹۰ء کے قریب ہر سال پندرہ سو یا کچھ زیادہ سپاہی پرتگال سے گوآ بھیجے جاتے تھے لیکن واپس آنے والوں کی تعداد سو بھی شاذ و نادر ہی کبھی ہوتی ہوگی۔

باب اول

کی ساری پرتگیزی تصانیف میں، قوتِ بازو پر اعتماد اور حوصلہ مندی کی بجائے توکل بیجا کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ایشیا کے پرتگیزوں کو بھی یہ بات تو بہت جلد معلوم ہو گئی تھی کہ اپنے ہمسایوں سے جنگ و جدال میں، ہمیں یورپ سے بہت کم مدد ملنے کی توقع ہو سکتی ہے لیکن یہ علم ہونا ہنوز باقی تھا کہ پرتگال کے اسپین سے تعلق وارتباط کی بدولت، اُن کے نئے دشمن بھی پیدا ہو گئے ہیں اور یہ کہ ان کی بحری سیادت کو وہی ولندیز یہاں بھی ٹوک کر شکست دینے والے ہیں جو یورپ میں دولت ہسپانیہ کے جانی دشمن تھے۔

۳۔ ولندیز اور انگریز کا ورود

سولھویں صدی کے آخری حصے میں، یورپی سیاسیات کا ایک سب سے نمایاں واقعہ ہسپانیہ اور ہالینڈ کی باہمی عداوت ہے۔ وہ ملک جسے ہم ہالینڈ کے نام سے جانتے ہیں، اصل میں نیدرلینڈز کے ان متحدہ صوبوں کا نام ہے جنھوں نے بادشاہ اسپین سے بغاوت کی اور اپنی قومی آزادی کے لئے اُس کے ساتھ برسر جنگ ہو گئے۔ یہ صوبے ل کر بھی بہت چھوٹا سا مُلک بنا جس کے مداخل بہت حقیر تھے۔ ملک کی آمدنی کا بڑا حصہ ماہی گیری اور بحری باربرداری سے حاصل ہوتا تھا اور ولندیزی کشتیاں تعداد کثیر میں، مغربی یورپ کے سارے سمندروں میں اِدھر سے اُدھر آتی جاتی رہتی تھیں۔ لیکن جہاز سازی صرف قومی آمدنی کا ایک وسیلہ ہی نہ تھی بلکہ اُس کا وجود قومی ہستی کے تحفظ کے واسطے (۱۲) بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ہالینڈ، اسپین کا مقابلہ صرف بحری قوت کی مدد سے کر سکتا تھا اور اس کی کوشش کی کامیابی کا سارا انحصار، کامل اور صحیح معنیٰ میں بحری طاقت پر تھا جس میں کشتیوں کا پانی پر تیرا دینا ہی داخل نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے سفائن و جہاز کے ماسوا اس قسم کی گودیاں، جن میں جہازوں کی

ساخت اور مرمت کا پورا سامان مہیّا ہو۔ ماہرِ فن ملّاح و جہازراں اشخاص کی مستقل فراہمی کا انتظام۔ اور ضروری سرمایہ، کہ ان وسائل سے بہترین طریق پر کام لیا جا سکے، یہ جملہ لوازم شامل تھے۔ خلاصہ یہ کہ ایک بحریۂ تجارتی کا جملہ ادوات و آلات سے آراستہ ہونا، اس ملک کی سب سے مقدم قومی ضرورت تھا؛

اب جو شاہِ ہسپانیہ تختِ پرتگال کا وارث ہوا، تو ولندیزوں کی یہ قومی دولت بھی معرضِ خطر میں پڑ گئی کیونکہ ان دنوں ولندیزی جہاز جو مال یورپ کے جنوبی ملکوں میں لے جاتے تھے، اس کی بڑی منڈیاں لزبن اور اس کے قریب کے ساحلی مقامات ہی میں تھیں۔ یہیں زیادہ مقدار میں وہ غلّہ، شہتیر جہازوں کے بنانے اور آراستہ کرنے کا سامان فروخت کرتے تھے جسے بالٹک سے لاتے اور اسی طرح خود اپنے ملک کی کھاری مچھلی اور دوسری پیداواریں لاتے تھے۔ دوسرے شمال کی طرف واپسی میں ان ملکوں کا مال لے جاتے تھے۔ خاص کر نمک، جو مچھلی کے محفوظ کرنے کے لئے درکار ہوتا تھا۔ کھانے کے مصالحے اور دیگر ایشیائی اجناس و مصنوعات، جن کی وساطت کا بڑا مرکز اینٹ ورپ اور بعد میں ایمسٹرڈم ہو گیا تھا۔ پس پرتگال کی بندرگاہوں کا پوری طرح مسدود ہو جانا، ماہی گیری اور جہازرانی دونوں پیشوں کے درہم برہم کر دینے کے مرادف تھا اور ہالینڈ کی زندگی انھیں پر تھی کیونکہ اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھیئے تو یہ امر کم سے کم مشکوک ضرور ہے کہ ہالینڈ کے جہازوں کو یورپ کے دوسرے سمندروں میں اجرت پر کافی کام مل جانا ممکن تھا۔ یہ قول جسے عام طور پر لوگوں نے نقل کیا ہے کہ پرتگال کے ساتھ ولندیزی تجارت ہی بالکل روک دی گئی، اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ (اسپین کی طرف سے) اس قسم کے احکام بار بار جاری کئے گئے۔ لیکن پرتگیز، اسپین کا ساتھ دینے میں کچھ بہت سرگرم نہ تھے اور ممانعت کے باوجود وہ ولندیزوں سے برابر لین دین کرتے رہے اور ادھر ولندیزوں کو یہ حکمت عملی کہ دشمن سے لڑنے کے لئے دشمن ہی کے ملک سے روپیہ،

باب اول جس کی انھیں احتیاج تھی، فراہم کیا جائے، عین صائب معلوم ہوتی تھی غرض باہمی تجارت جاری رہی اگرچہ اُس میں اکثر دست اندازیاں ہوتی رہتی تھیں یعنی پرتگال کی بندرگاہوں میں ولندیزی جہاز گرفتار کر لئے جاتے اور اُن سے بحری خدمت لی جاتی۔ ملاح و سوداگر بھی گرفتار کرکے محکمۂ احتساب کے حوالے کر دئے جاتے۔ مال اسباب ضبط کر لیا جاتا اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا یہ
۱۳ خطرات بڑھتے گئے حتّٰی کہ ولندیزوں کو چار و ناچار اس امکان کا سامنا کرنا پڑا کہ عجب نہیں پرتگال سے اُن کی تجارت قطعاً رک جائے۔ اسکی تلافی کی جو ممکن صورتیں نظر آئیں، اُن میں سب سے زیادہ فائدے کی شکل یہ تھی کہ وہ اپنے کاروبار کا میدان وسیع کر دیں اور براہ راست اُن ملکوں سے تجارتی تعلق قائم کریں، جہاں اسپین و پرتگال، اُس وقت تک گویا اجارہ دار بنے ہوئے تھے یہ منصوبہ اُن نئے خیالات سے بھی ہم آہنگ تھا جو اُن دنوں سرعت کے ساتھ ہالینڈ میں پھیل رہے تھے۔ اینٹ ورپ سے تجارتی مرکز کے ایمسٹرڈم میں منتقل ہونے سے مُلک کے مالی وسائل و مداخل میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا تھا اور ادھر حُبِ وطن کا قومی جوش نشو و نما پا رہا تھا اور دس برس پہلے جو ارادے ناقابل عمل دکھائی دیتے، اب فی الفور تجارت کی معقول صورتیں سمجھے جانے لگتے تھے؛

یہی زمانہ ہے جس کے قریب انگریز سوداگروں کو بھی شوق چرایا کہ مشرقی تجارت میں اپنا حصّہ لگائیں اور وہ بحر متوسط کے راستے کے امکانات پر خاص طور سے غور و تجسّس کرنے لگے کیونکہ راس امید کے گرد کا راستہ اسپین و پرتگال کے دعاوی اجارہ داری نے اُن پر مسدود کر رکھا تھا۔ اس کوشش کا قابل ذکر نتیجہ اسی قدر نکلا کہ جون نیوبری کی اطّلاعات سے جو رالف فِنش کے ساتھ خشکی کے راستے ہندوستان پہنچا تھا، انگریزوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ بحر متوسط کے راستے میں زیادہ نفع کی شکل نظر نہ آئی لیکن ۱۵۸۸ء میں اسپین کے بڑے بیڑے کی ہزیمت سے راس امید کا راستہ کام کے قابل ہو گیا اور اسی بحری ہزیمت نے ولندیزوں کو بھی اپنی فوری سیاسی پریشانیوں سے انگریزوں سے

کچھ کم نجات نہ بخشی۔ اس کے تین سال بعد جوسج رے منڈ کے ماتحت ایک مہم مشرق کی طرف روانہ ہوئی لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور غالباً دانشمندی اسی میں تھی جو ولندیزوں نے کیا کہ جب تک ایشیا میں کاروبار پھیلانے کے سارے نشیب و فراز کا تفصیل سے علم نہ ہو گیا، وہ صبر سے بیٹھے رہے۔ انھیں جو کچھ معلومات بہم پہنچی، اس کے ماخذ دو تھے۔ یعنی اول تو **فان لنشوٹن** سنہ ۱۵۹۲ میں پانچ سال سے زیادہ گوآ رہ کر ہالینڈ آیا اور دوسرے اسی زمانے میں سوداگروں کے ایک گروہ نے **کورنیلیس ہوٹ مین** کو لزبن بھیجا کہ خفیہ طور پر واقفیت بہم پہنچائے۔ چنانچہ یہ شخص دو سال وہاں رہ کے واپس آیا تو ولندیزوں کو موقع ملا کہ ایشیائی تجارت میں حصہ لینے کی ایک حتمی کوشش کریں؎۱ ۱۴

ان کی یہ ابتدائی قسمت آزمائیاں خالص تجارتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ سنہ ۱۶۰۳ کے قریب زمانے سے ولندیزی بیڑے، تجارت کی طرح جنگ کے لئے بھی تیار ہو کر نکلنے لگے لیکن اس سے پہلے تقریباً دس سال تک اُن کی خاص غایت یہی رہی کہ اسپین یا پرتگال والوں سے سامنا کئے بغیر ایشیا پہنچ جائیں اور ان مشرقی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کریں جو پرتگیزوں کے اثر یا نگرانی میں نہیں آئے تھے۔ علمی اعتبار سے، مشرق جانے کے لئے تین بحری راستوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ یعنی ایک تو شمال ایشیا کے گرد سے،

؎۱ فان لنشوٹن کو جو کچھ معلومات حاصل ہوئی، اُس کا ایک حصہ فی الواقع سنہ ۱۵۹۶ تک شائع نہیں ہوا تھا لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ خبریں لایا وہ ہوٹ مین کے اُسی وقت علم میں تھیں جبکہ اس نے پہلی مرتبہ راس امید کے گرد بحری سفر کیا۔ (ملاحظہ ہو: "ہوٹ مین" جلد اوّل، وغیرہ) چونکہ وہ سنہ ۱۵۹۴ و سنہ ۱۵۹۵ کی شمالی مہمات میں شریک تھا، اُس کی واقفیت سے لازماً مہم تیار کرنے والے فائدہ اُٹھا سکے ہوں گے۔ لزبن جا کے ہوٹ مین نے جو کچھ کارروائیاں کیں وہ مشکوک و مبہم ہیں (فان ڈر چیئر، ۲۹) اور ایسا ہونا قابل تعجب نہیں کیونکہ وہ تلاش ہی میں ایسی معلومات کی گیا تھا جسے پرتگیز قطعی طور پر مخفی رکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے جانے کے واقعے میں کوئی شک نہیں ہے (ہوٹ مین اوّل ۳۱ n.)

دوسرے جنوبی امریکہ کے گرد سے اور تیسرے راس امید کا چکر کھا کے۔
ان میں سب سے پہلے راستے میں سب سے بڑھ کر اسباب کشش نظر
آتے تھے اور اس کی بڑی وجہ بھی وہی تھی کہ ان شمالی سمندروں پر
اسپین و پرتگال کا کوئی اثر قائم نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۵۹۴ء اور ۱۵۹۵ء میں
جہاز شمال کی طرف روانہ بھی کئے گئے لیکن جہازرانی کی مشکلات
ناقابل حل ثابت ہوئیں۔ جنوبی امریکہ کے گرد کا راستہ بھی آزمایا گیا
اور سنہ ۱۶۰۰ء میں ولندیزی جہاز اس طرف سے ہوتے ہوئے، منزل مقصود
یعنی ایشیائی منڈیوں تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گئے مگر تجارت کے واسطے
یہ بھی ناموزوں تھا جس کا بڑا سبب یہ کہ ہسپانوی ایک طرف تو جنوبی امریکہ
کے مغربی ساحل پر قابض تھے اور ادھر جزائر فلپائن پر جہاں بحر اوقیانوس
عبور کرنے کے بعد، جہازوں کا تازہ دم ہونا ضروری تھا، انھیں کا
عمل دخل تھا۔ اب افریقہ کا راستہ رہ گیا اور اسی سے گزرنے کی پہلی دفعہ
سنہ ۱۵۹۵ء میں کوشش عمل میں آئی جب کہ چار جہاز ایمسٹرڈم سے روانہ ہوئے
کہ مصالحے، ادویہ وغیرہ جو مال ایشیا میں دست یاب ہوتا تھا، اُسے
براہ راست مغربی یورپ تک پہنچائیں۔ اس حقیر ابتدا سے آگے چل کر
جو عظیم سیاسی تغیرات رونما ہوئے، اُن کے لحاظ سے غالباً اس بات پر
زور دینا ضروری ہے کہ شروع شروع میں مُلک ستانی یا اس قسم کے
مقبوضات حاصل کرنے کا جنھیں آج کل مستعمرات یا نوآبادیاں کہنے لگے
ہیں، مطلق کوئی ارادہ نہیں پایا جاتا۔ یہاں تک کہ اس پہلے بحری سفر کا تہیہ
کرنے والوں نے مشرقی منڈیوں میں اپنے "کارخانے" یا گماشتے مقرر
کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ ان کی نیت بس اسی قدر تھی کہ ولندیزی
۱۵ جہاز مشرقی بندرگاہوں پر پہنچیں، اپنا مال فروخت کریں اور وہاں سے مناسب
اور کافی مال فراہم ہوتے ہی واپس روانہ ہو جائیں۔ یہ تدریجی تغیر کہ تجارتی سفر
سے کارخانے، اور کارخانے سے قلعے اور قلعے سے باقاعدہ مقبوضات
بن گئے، اصل میں زیادہ تر اُن حالات کا نتیجہ تھا جو مشرقی شہروں میں

پائے جاتے تھے اور جن کی نسبت واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کام کی ابتدا کرنے والوں کو اُن حالات کا علم بہت ناقص تھا۔ تجربے سے بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ افریقہ والے راستے کی دشواریاں ناقابل حل نہ تھیں۔ بے شبہ سفر کے پہلے حصے میں دشمن کے جہازوں سے مٹھ بھیڑ ہونے کا اندیشہ تھا، لیکن اس قسم کے اتفاقی مقابلوں کے لئے ولندیزی بیڑے پہلے سے تیار رہتے تھے۔ باقی راس امید سے ایک دفعہ پار ہو جانے کے بعد پھر محفوظ راستے کا ڈھونڈ لینا غیر ممکن نہ تھا بشرطیکہ منزل مقصود صحیح طور پر انتخاب کی گئی ہوتی ان ابتدائی تجارتی مہمات کے بانیوں کے لئے ہندوستان کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔ جن اشیا کی مانگ سب سے زیادہ تھی، اُن میں مرچ کے سوا اور کوئی شے ہندوستان سے فراہم نہ ہوتی تھی اور مرچ کے لئے ساحل ملیبار کا سفر کرنا گویا پرتگیزوں کو اُن کی قوت کے صدر مرکز پر جا کر للکارنا تھا۔ بخلاف اس کے، شروع میں جو کچھ معلومات میسر آئی، اُس سے پتا چلتا تھا کہ سب سے موزوں ٹھکانا مغربی جاوا اور سماترا میں اچین ہو سکتا ہے اور ولندیز قسمت آزماؤں کو بھی انھیں مقامات میں بڑا فائدہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ سماترا کے مغربی ساحل پر مرچ کی بہت کچھ فراہمی اچین کے زیر اقتدار تھی اور لنکا کے مشرقی ساحل پر جہاں سے دارچینی ملنے کی امید تھی، یہاں سے پہنچ جانا بھی کچھ دشوار نہ تھا۔

۱؎ ان مقامات کے فوائد لنشوٹن نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دئے تھے۔ چنانچہ اُنیسویں باب میں مصنف نے جتایا ہے کہ سماترا میں پرتگیزوں کی کوئی آبادی نہیں ہے اور شاہ اچین اُن کا دشمن ہے۔ اسی طرح اگلے باب میں مغربی جاوا میں مرچ کی تجارت کے متعلق اُس نے تفصیلی گفتگو کی ہے کہ اس بندرگاہ سے پرتگیزوں کی مداخلت کے بغیر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ آچین ایسی مرکزی منڈی تھی کہ ایشیا کی اور بہت سی
اجناس یہاں مل سکتی تھیں۔ یہاں کے رئیس کی وعدہ شکنی مشہور تھی
مگر اُس کی حکمت عملی کا سب سے غالب پہلو پرتگیزوں سے عداوت
تھا، اور اس لئے توقع کی جا سکتی تھی (گو یہ پوری طرح بر نہ آئی) کہ
وہ پرتگیزوں کے مسلمہ دشمنوں کی آؤ بھگت کرے گا۔ رہا مغربی جاوا
سو وہاں کے دو مقام، بنٹم اور جکاترا، اور بھی زیادہ کشش رکھتے تھے۔
یہاں پرتگیزوں کے صرف چند آدمی کاروبار کرتے تھے۔ مرچ اور
دوسری ایشیائی اجناس مل سکتی تھیں۔ اور یہ فرض کر کے کہ ان میں سے
کسی بندرگاہ میں کاروبار جم جائے گا، آگے مصالحوں کے جزائر کا
راستہ کھل جاتا تھا۔ رودبار ملکّا کے راستے بنٹم آنے جانے سے تو
۱۶ خواہ مخواہ بچنا منظور تھا کہ اس تنگ بحری گزرگاہ میں پرتگیزوں
کے جنگی جہازوں کا مستقر تھا۔ لیکن اس رکاوٹ سے بچنے
کی شکل یہ ہو سکتی تھی کہ سماترا کے باہر باہر اور آبنائے سنڈا سے گزر کر
مسافت طے کی جائے کیونکہ اس آبنائے کا قابل جہاز رانی ہونا،
اُسی زمانے کے قریب معلوم ہو گیا تھا۔ اس طرح ولندیزوں کے
سب سے پہلے سفروں کا راستہ راس امید کا چکر لگانے کے بعد
یہ تھا کہ موزمبیق سے بچتے ہوئے اور ضرورت ہو تو مدغاسکر یا اس سے
بھی بہتر یہ کہ موری شس میں[1] تازہ دم ہو کر، کھلے سمندر میں سیدھا سماترا
کا رُخ کر لیا جائے؛

ان راستوں سے اوّل اوّل جو بحری سفر کئے گئے، وہ بحیثیت مجموعی پُر منفعت بھی تھے۔ بعض خاص خاص حوصلہ مندیوں

---

[1] بظاہر راس امید پر تازہ دم ہونے کا اُس زمانے میں خیال کسی کو نہیں سوجھا۔ اور ولندیزوں کے قدم جاوا میں جم چکے تھے جب کہ انھوں نے یہاں نوآبادی قائم کی؛

کا انجام تباہ کن ہوا۔ لیکن عام طور پر ان میں اکثر اور خصوصاً فان نیک کی ۱۵۹۸ء کی قسمت آزمائی نہایت کامیاب و بامراد ہوئی۔ اس کاروبار میں کثیر منافع کے امکانات تسلیم کئے جانے لگے اور ۱۶۰۲ء تک ولندیزی سوداگر نہ صرف بنتم و اچین، بلکہ لنکا کے مشرقی ساحل، مصالحوں کے جزائر اور سیام کی بڑی اور باوقعت منڈی پتانی میں بھی خاصی روشناسی حاصل کر چکے تھے۔ لیکن تشویش کے تازہ اسباب بھی اس کامیابی کے جلو میں تھے۔ ہالینڈ کی قریب قریب ہر بندرگاہ سے اپنے اپنے بیڑے الگ بھیجے گئے تو ادھر تو ایشیا میں ان کا تجارتی مقابلہ شروع ہو گیا جس سے وہاں مال کی قیمتیں چڑھ گئیں اور ادھر یورپ میں مصالحوں کی وہ بھرمار ہوئی کہ اندیشہ ہونے لگا کہ نکاسی کی منڈیوں میں اُن کے رکھنے کی گنجائش باقی نہ رہیگی۔ یہ جدید تجارت مُلک کے واسطے اس قدر اہمیت رکھتی تھی کہ اس مُضر رقابت اور تجارتی مقابلے کا جاری رہنا گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہذا **مجلس طبقات** نے جو ہالینڈ کی سب سے مقتدر سیاسی جماعت تھی، مداخلت کی اور بالآخر مقابلہ کرنے والے ایک قومی شرکت تجارتی کی صورت میں متحد ہو گئے اور اس جماعت کو ایشیا میں تجارت کی بلا شرکت مراعات، بہت ہی ہمہ گیر منشور اور ایک ایسا آئین عطا ہوا جسے قریب قریب ہمہ مُلکی کہہ سکتے ہیں۔ منشور یافتہ نئی شرکت کا پہلا بیڑا جو ماہ جون ۱۶۰۲ء میں روانہ ہوا، ۱۵ جہازوں پر مشتمل تھا اور اُن کی مجموعی گنجائش وزن سات ہزار ٹن تھی۔[1]

---

[1] اُن وجوہ سے جن کی صراحت میں نے "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" میں کر دی ہے (صفحہ ۲۳۰ اور ضمیمہ D) میں ٹن کو حرف "یو" سے (Tun) لکھتا ہوں تا کہ اُس زمانے کے جہازی پیمانے سے، جو زمانہ حال کے نمبری ٹن (Ton) سے بہت مختلف ہوتا تھا، حساب کیا جائے۔ یہ قدیم ٹن تخمیناً ساٹھ مکعب فیٹ میں جس قدر مال بھرا جا سکتا ہے، اُس کے ہم وزن تھا۔

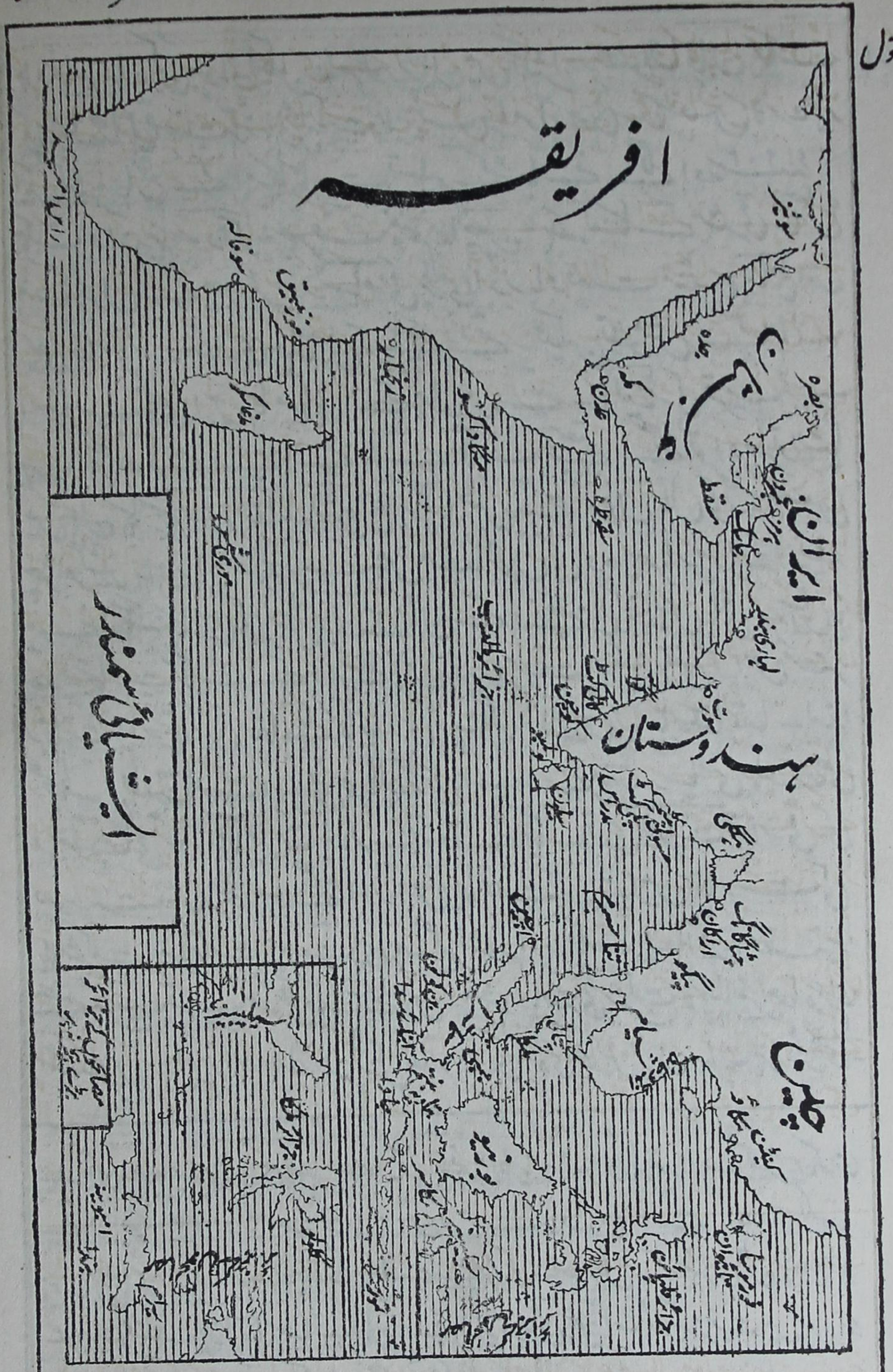
افریقہ
عرب
ایران
ہندوستان
چین
ایشیائی سمندر

مگر ولندیزوں کی تیز ترقی کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کا پہلا تجارتی بیڑا جو ۱۵۹۵ء میں چلا صرف چار کشتیوں پر مشتمل تھا جن کی مجموعی گنجائش وزن صرف ایک ہزار ٹن تھی۔[1]

مگر ولندیزی تجارت کو فقط باہمی مقابلے ہی سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ اب یورپ کی دوسری قومیں بھی ممالک ایشیا سے داد و ستد کے امکانات سمجھنے لگی تھیں۔ اور ولندیزوں نے جو شروع میں قیمتیں بہت چڑھا چڑھا کے طلب کیں، تو جوش میں آ کے وہ بھی تیار ہو رہی تھیں کہ اُن کی طرح خود جائیں اور اپنی ضرورت کے مطابق مصالحے لے آئیں۔ انگلستان والوں نے ۱۵۹۶ء میں دوسری مرتبہ ایشیا پہنچنے کی کوشش کی لیکن یہ پورا بیڑا غارت ہو گیا۔[2] تین سال بعد پھر یہ منصوبہ تازہ ہوا اور "مختلف سوداگر، ولندیزی قوم کے بحری سفروں کی کامیابی سُن کر ادھر راغب ہوئے اور اپنے وطن کی تجارت کو ترقی دینے کے شوق نے بھی انھیں تحریک دلائی"۔ اسی تحریک کا نتیجہ **شرکت انگریزیہ** کی تاسیس تھا۔

لندن کے بیوپاری سنہ ۱۶۰۰ء مسیحی میں باہم شریک ہوئے اور بہتر ہزار اشرفیاں (پونڈ) جمع کیں کہ شرق الہند میں تجارتی وسائل کی تحقیقات کرنے اور اُس ملک میں مصالحے اور دوسری اجناس لانے کے لئے جہاز اور تجارتی مال فراہم کیا جائے۔ اس بحری سفر کے واسطے انھوں نے چار جہاز خرید کئے...... ان جہازوں کے ملّاح و ملازم اور بیس مہینے کا سامان خورونوش اور گولی باروت مہیا کر دیا اور کُل ۲۷ ہزار پونڈ مالیت کا مال اور ہسپانوی سکے اُن کے ساتھ کئے۔ مشترکہ سرمایے میں سے جو رقم باقی رہی وہ بھی ان ہی جہازوں اور اُن کی ضروریات میں صرف ہو گئی۔

---

[1] ولندیزی اور انگریزی شرکتوں کے آئین اور عمل کی نسبت بعض جزئیات ضمیمۂ الف میں ملیں گی۔

[2] ۱۵۹۶ء کے بحری سفر کی "ذلیل و مصیبت انگیز کامیابی" کا جو کچھ حال معلوم ہے اُس کے لئے

یہ بیڑا ۱۶۰۱ء کی فروری میں، جیمس لینکاسٹر کی زیر قیادت روانہ ہوا اور اگلے سال آچین پہنچ کر اگست سنہ ۱۶۰۳ء میں بامراد واپس آگیا، مگر ولندیزوں کے مقابلے میں یہ اولوالعزمی کچھ وقعت نہ رکھتی تھی۔ انگریزی جہازوں کی کل گنجائش وزن پوری پندرہ ۱۵ سو ٹن بھی نہ تھی اور جو مال بھیجا گیا تھا اس کی قیمت اتنی بھی وصول نہ ہوئی کہ واپسی کے لئے کافی مال خرید کر بھر لیا جاتا۔ چنانچہ لینکاسٹر کو ضروری معلوم ہوا کہ سرمایہ بہم پہنچانے کی غرض سے پرتگیزی غنیمت مل جانے کی خاطر بحری گشت لگائے[1] بہرحال اس وقت سے انگریزی کمپنی یا شرکت نے باقاعدہ جہاز بھیجنے شروع کئے گو اس کے وسائل محدود تھے اور ان ابتدائی سنین میں، ولندیزوں کو بلا شک و شبہ فوقیت حاصل تھی[2]

ولندیزوں کی متحدہ شرکت یا کمپنی کے قیام کے ساتھ ساتھ ان کی حکمت عملی میں ایک بنیادی تغیر بھی پیدا ہوا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اول اول بیڑے روانہ کرنے میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ پرتگیزوں کا کہیں سامنا ہونے نہ پائے لیکن انھیں ابتدائی سفروں میں دو سبق یہ حاصل ہوئے کہ ایک تو ہر جگہ اس قوم نے دشمنی اور دراندازی کی اور دوسرے یہ کہ ان کی بحری کمزوری ولندیزوں پر منکشف ہو گئی۔ ہر بندرگاہ میں جہاں ولندیز پہنچے، پرتگیز سوداگر یا مذہبی داعی پہلے سے موجود پائے گئے اور انھوں نے سیاسی طور پر پوری کوشش صرف کی کہ ولندیز، منڈیوں اور درباروں میں کسی جگہ رسوخ و اثر

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ ملاحظہ ہو (Purchas, I. iii, 110. ff.) [1] ہم نے اوپر جو فقرہ سب سے پہلے نقل کیا وہ شرق الہند کے بحری سفر میں قسمت آزمائی کرنے والوں کی عرضی سے لیا ہے جو ستمبر سنہ ۱۵۹۹ء میں پیش کی گئی تھی۔ (Calendar S. P. 1513-1616. No. 258) ولندیزوں کے جس کامیاب سفر کا اشارہ آتا ہے وہ ظاہراً وان نیک کا سفر تھا کہ یہ جہاز راں اس سے پہلے ماہ جون میں واپس آیا اور ایمسٹرڈم میں اس کا دھوم دھام کے ساتھ استقبال ہوا۔ دوسرا فقرہ پرچاس میں لینکاسٹر کے سفر کا جو بیان درج ہے، اس کے پہلے فقرے سے لیا گیا ہے (I. iii 147) سرمائے کی جو رقم بتائی گئی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ مبالغہ آمیز ہے، لیکن اس میں اختلاف کچھ زیادہ نہیں ہے[2]

حاصل نہ کر سکیں۔ اسی بنا پر لامحالہ یہ خیال ترک کرنا پڑا کہ صرف اُن مقامات میں خرید و فروخت کی جائے جہاں پرتگیزوں کا اثر نہ ہو۔ (کیونکہ ایسا کوئی مقام نہ تھا) اور ادھر جا بہ جا اُن کے جہازوں سے جو جھپٹے ہوئے، اُن سے حالتِ جنگ میں پرتگیزوں کی کمزوری کا راز فاش ہو گیا۔ نظر بر ایں، ولندیزوں نے قصد کر لیا کہ پرتگیزوں کو اُن سمندروں سے نکال باہر کیا جائے، جہاں پہلے وہ صرف حصّہ مل جانے کے آرزو مند تھے۔ اور سنہ ۱۶۰۳ء کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ کئی سال تک جو بیڑے[۱] بھیجے گئے انھوں نے کہیں نہ کہیں کوئی خاص قسم کی دراز دستی ضرور کی ہے۔ خشکی پر تو جلد کوئی کامیابی میسر نہ آئی اور مصالحوں کے جزائر میں چند چھوٹی گڑھیاں مسخر کرنے کے سوا، موزنبیق، ملکا اور مکاؤ میں نوبت بہ نوبت سب جگہ ولندیزی حملے رد کر دئے گئے۔ جس سے اُنھیں نظر آ گیا کہ اگر ان دلیرانہ کوششوں سے کوئی معقول نتیجہ حاصل کرنا مقصود ہے تو مشرقی سمندروں میں بحری مستقر کا ہونا لازمی ہے۔ البتہ خالص بحری مقابلوں میں اُنھیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ پرتگیزی بیڑوں نے شکستیں کھائیں۔ اُن کے تجارتی جہاز کثیر تعداد میں پکڑے گئے اور وہ بہت جلد

---

[۱] ولندیزی کتاب (Van der Chijs) صفحہ ۸۳۰ کی ایک یادداشت سے مترشح ہوتا ہے کہ فان ڈر ہیگین، جو ۱۵۹۹ء میں جہاز لے کے چلا، اسے حکم تھا کہ امبوینا کو فتح کر لے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم نے جو سال اوپر لکھا، اس سے بھی کچھ مدت پہلے تغلب و تصرف کی حکمت عملی کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ولندیزوں نے ۱۶۰۰ء میں امبوینا کا ایک قلعہ فتح کرنے کی کوشش کی لیکن حالات سفر ورہیگن، (Begin ende Voortgangh) صفحہ ۱۱) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر جنگ کی دعوت خود وہاں کے باشندوں کی طرف سے دی گئی تھی۔ ولندیز امداد کی درخواستوں کو بار بار مسترد کرتے رہے لیکن آخر دیسی سرداروں کے پیچھے پڑ جانے سے مجبور ہو گئے۔ بہرحال، کسی بیرونی چوکی پر حملہ کرنا، جہاں پرتگیزوں کی حالت پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، اُس مرتبے کی جنگی کارروائی نہیں ہو سکتی جیسی موزنبیق یا ملکا جیسے مضبوط قلعوں کو فتح کرنے کے ارادے تھے

۲۰ باب اول

اتنے مجبور ہو گئے کہ فقط مدافعت کرنے لگے۔ گویا پانی پر پرتگیزی سیادت کا دور گزر گیا۔

ولندیزوں نے جو مرتبہ اس طرح حاصل کیا، اُس کے مطابق تجارتی حکمت عملی مرتب کرنے میں بھی سستی نہ کی۔ اس حکمت عملی کے بارے میں سب سے پہلا منصوبہ جو مجھے مل سکا، وہ ایک یادداشت ہے جسے بظاہر امیر البحر میٹ لیف کے حکم سے، جو سنہ ۱۶۰۵ میں ولندیزی بیڑے کا سردار تھا، قلمبند کیا گیا ہے[1]۔ کاتب مشرقی سمندروں میں بحری مرکز کی ضرورت پر زور دینے کے بعد، ایشیائی تجارت پر ایک عام نظر ڈالتا ہے اور اس پر پانچ عنوانوں کے ماتحت غور کرتا ہے: (۱) مرچ (۲) دوسرے مصالحے (۳) گجرات (۴) کورومنڈل (۵) چین و جاپان۔ وہ جس طریق عمل کا حامی ہے اُس کی بنیاد یہ اُصول ہے کہ لونگ، جوز، اور جوتری کی تجارت اجارہ داری کے طریق پر کی جائے ورنہ عام مقابلے کی صورت میں سب کا شدید نقصان ہوگا اور دوسرے انگریزوں کو جس طرح بن پڑے مصالحے کے جزیروں میں نہ گھسنے دیا جائے۔ مرچ کی تجارت سے اُنھیں قطعی طور پر خارج کر دینا سر دست ناقابل عمل ہوگا کیونکہ وہ جاوا اور سماترا کی منڈیوں میں پہلے سے قدم جما چکے ہیں۔ لیکن کاتب خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر ولندیزی تجار چند سال تک مصالحوں کی تجارت میں جو نفع ہو اُس پر قناعت کریں اور مرچ کو (بغیر نفع لئے) یورپ میں اتنا سستا بیچتے رہیں کہ انگریزوں کو کوئی گھسنے نہ دے تو پھر یہ دشواری بھی باقی نہ رہے گی۔ پھر جب یہ کام ہو جائے تو پرتگیزوں پر غلبہ حاصل کر کے تمام مصالحوں کی تجارت پر

---

[1] یہ یادداشت میٹ لیف کے سفر بحری کے رسالے (Begin ende Voortgangh) مندرجہ کے صفحہ ۳۰۷ سے شروع ہوتی ہے۔ اُس کا فرانسیسی ترجمہ رین ویل، جلد چہارم صفحہ ۲۳۵ تا ۲۴۷ میں ملے گا۔ تاریخ درج نہیں لیکن ترتیب رسالہ کے لحاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ سنہ ۱۶۰۷ کے بعد کی تحریر ہے۔

بلاشرکت قبضہ کیا جاسکے گا اور اسی طرح چین و جاپان کی تجارت ہاتھ
میں آجائے گی۔ ہندوستان کی تجارت کو وہ محض ضمنی سمجھتا ہے۔
اس میں بھی گجرات کی نسبت اُس کی رائے تھی کہ توقف کیا جاسکتا ہے
البتہ کورومنڈل کی تجارت کو ترقی دینا لازم تھا کیونکہ اُس کا سوتی مال،
مشرق کے بعید تر ممالک میں سب سے بڑا وسیلۂ تجارت تھا؛ غرض
یادداشت کا خلاصہ یہ تھا کہ جاوا کے آگے مشرق میں، اور ممکن ہو تو جاوا
اور سماترا میں بھی تجارت پر بلاشرکت قبضہ کیا جائے اور ضمنی طور پر
ہندوستان کے کاروبار کو بھی ترقی دی جاتی رہے؛ انھیں عنوانوں کے
تحت، اُس عہد کی تاریخ کو سہولت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے اور
میں کوشش کروں گا کہ پہلے مشرق اقصیٰ کے واقعات کو باختصار پیش
کردوں کہ ولندیزی جدّوجہد کا اصلی میدان یہی ملک تھے اور اس کے بعد 21
ہندوستان، نیز اسی سلسلے میں ایران و عرب سے اُن کی تجارت کے
نشوونما پانے کا تذکرہ کیا جائے۔ آخر الذکر ملک وہ ہیں، جو اُن کے
ابتدائی منصوبوں میں شامل نہ تھے؛

زمانۂ حال کے لوگوں کو یہ پڑھ کر بے حد تعجب ہوگا کہ مصالحوں
کی تجارت کو اُن دنوں اس قدر اہمیت دی جاتی تھی حالانکہ آج کل اس کا
ایشیا میں کوئی چرچا سننے میں نہیں آتا؛ اصل یہ ہے کہ مرچ، لونگ،
دارچینی، جوز، جوتری کی بہم ضرورت ایک حد تک تو اس واسطے پڑتی تھی
کہ جاڑوں میں کام آنے کے لئے گوشت کو مصالحے لگا کے محفوظ رکھنا
پڑتا تھا اور دوسرے اُس زمانے کے ذوق کا بھی تقاضا یہی تھا۔ چنانچہ
اس مانگ کے بتدریج کم ہوجانے کا سبب یہی ہوا کہ ایک تو یورپ کے
فنون فلاحت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اُن کے باعث یہ ممکن ہوگیا
کہ جاڑوں بھر تازہ گوشت بلادقّت فراہم ہوتا رہے اور دوسرے پکانے
کے فن میں بہت کچھ فرق ہوگیا۔ خصوصاً اس معاملے میں کہ مصالحہ دار
کھانوں کی بجائے سادہ (یا میٹھے) کھانے زیادہ پکنے لگے۔ اٹھارھویں صدی

کے مصنف عام طور پر ولندیزی تاجروں کے نفع میں کمی آجانے کا سبب ذوق کی اس تبدیلی کو قرار دیتے ہیں جس نے مصالحوں کے اجارے کی قدر و قیمت بالکل گھٹا دی۔ لیکن جہاں تک ہمارے زیرِ نظر عہد نیز کچھ بعد کے زمانے کا تعلق ہے، یہ اجارہ داری دُنیا کی تجارت کے سب سے اہم اُمور میں داخل تھی اور اس کے حصول کے لئے جو زرِ کثیر خرچ کیا گیا وہ گویا سرمائے کا نہایت صحیح اُصول پر استعمال تھا۔ آئندہ ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ خود ایشیائی تجارت کے بعض شعبوں میں مصالحوں کا اسی قدر دخل تھا اور اس ایشیائی تجارت میں بھی ولندیز بہت بڑا حصہ لینے لگے تھے۔ پس مجموعی طور پر اُس عہد کی تجارتی ضروریات پر نظر کیجیے تو محولہ بالا یادداشت میں جس حکمتِ عملی کا خاکہ کھینچا گیا ہے وہ بالکل بجا معلوم ہوگی۔

۴۔ ولندیزوں کا عروج اور پرتگیزوں کا انحطاط

ولندیزوں کا پہلا مقصد کہ مشرقِ اقصیٰ میں تجارت پر بلا شرکت قبضہ کیا جائے، اُن واقعات کا نتیجہ تھا جو زیادہ تر سترھویں صدی کے دوسرے عشرہ میں رونما ہوئے۔ ۱۶۲۰ء میں ولندیزوں کو مصالحوں کے کاروبار میں بہت کچھ غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور ادھر ہندوستان میں ساحلِ کورومنڈل پر اُن کے گماشتے متعین ہو گئے تھے۔ پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ایشیا میں اُن کا مرتبہ مسلّم ہو گیا اس لئے کہ پرتگیز اُن کے علانیہ دشمن اور دوسری طرف انگریز خطرناک تجارتی رقیب تھے۔ پرتگال کی بحری قوت میں ضعف آیا تاہم اُس کا ڈھانچ ابھی تک سلامت تھا۔ مصالحوں کے جزائر کے چھوٹے قلعے ہاتھ سے ضرور نکل گئے لیکن وہ ہر وقت سب سے طاقتور بیڑے کے پنجے میں آسکتے تھے۔ اور جب تک گوآ اور ملکا مستقیم تھے، پرتگال کے گزشتہ صدی کے بحری تسلط کو بحال کرنے میں صرف کافی کمک ملنے کی احتیاج تھی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ ضروری کمک پرتگال کو میسر نہ آئی اور ادھر انگریز (جنھوں نے شدومد سے مقابلہ کیا اور اگر زیادہ سرمایہ ممکن ہوتا تو شاید وہی بازی لیجاتے) کچھ تو سرمایے کی کمی اور کچھ حکومت انگلستان کے طرزِ عمل کے طفیل تھوڑی دُور چل کے رُک رہے اور اس طرح عام حالات قطعی طور پر ولندیزوں کے موافق و مساعد ہو گئے۔

اس نازک زمانے کی تاریخ اس لیئے اور پیچیدہ ہو گئی ہے کہ یورپ میں ان قوموں کے جو سرکاری تعلقات تھے، ایشیائی بحور و سواحل کے حادثات اُن سے کچھ مطابقت نہ کھاتے تھے۔ انگلستان کا یورپ میں پرتگال سے کچھ جھگڑا نہ تھا اور سنہ ۱۶۰۴ کے بعد سے ہسپانیہ کے ساتھ بھی اس کی صلح رہی۔ لیکن پرتگیزوں کے بیڑے سورت کے سامنے سال بہ سال انگریزی جہازوں پر حملہ کرتے رہتے تھے اور سنہ ۱۶۱۴ میں شاہ ہسپانیہ نے گوآ کے نائب الممالک (وائسرائے) کو حکم بھیجا تھا کہ انگریزوں کو جبراً ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ آیندہ سنین میں بھی گاہ بہ گاہ ہندوستان کے سمندروں میں جھڑپ ہوتی رہی اور سنہ ۱۶۲۲ میں ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز ہرمز کی تسخیر میں ایران کے پہلو بہ پہلو شریکِ جنگ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب سنہ ۱۶۳۵ میں ولیم میتھولڈ نے گوآ کے پرتگیز حکّام کے ساتھ باضابطہ عہد و پیمان کیا، اُس وقت ان قوموں میں دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ اسی طرح انگلستان کی سنہ ۱۶۵۲ تک ہالینڈ سے کوئی جنگ نہ تھی لیکن ولندیز اور انگریز سوداگر بنٹم سے لے کے آگے مشرقی سمندروں میں برابر چھُری کٹار ہو رہے تھے۔ اسپین و ہالینڈ کی جنگ بھی سنہ ۱۶۰۹ کے ہنگامی صلح نامہ سے بند و ملتوی ہو گئی اور سال آئندہ سے ایشیا میں بھی قانوناً اُس کا نفاذ ہو گیا۔ لیکن عملاً پرتگیزوں سے ولندیزوں کی جنگ و جدال برابر جاری رہی خلاصہ یہ کہ تینوں قومیں جو مصالحوں کی تجارت کے لئے ایک دوسرے کی دشمنی میں سرگرم تھیں، اُن کی کسی وقت بھی اپنے ایک یا دوسرے رقیب سے جنگ چھڑ سکتی تھی۔ باایں ہمہ سوائے ہندوستان کے مغربی پہلو کے،

دوسرے سمندروں میں پرتگیزی سرگرمیاں نسبتہً زیادہ باوقعت نہ تھیں اور اصلی معرکہ انگریز و ولندیزی کے درمیان پیش آیا۔ اس کے تفصیلی حوادث ۲۳ کو بیان کرنا ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے غیر ضروری ہوگا۔ اجمالاً یہ لکھنا کافی ہے کہ مصالحے کے جزیروں اور مشرق اقصیٰ کی تجارت پر قبضہ کرنے کی کوشش میں دونوں ملکوں کی شرکتوں کے کارندے سرگرم کار تھے، سیام، ہند چینی اور جاپان کی منڈیوں کے متعلق بینابانہ سرگرمی سے تجسس و دریافت کی جا رہی تھی اور جیساکہ ابھی مذکور ہوا اسی مقابلے اور مسابقے سے جنگ تک نوبت پہنچی تھی۔ اس لڑائی کا سنہ ۱۶۱۹ کی قرارداد کی رو سے جو یورپ میں مرتب ہوئی تھی، خاتمہ ہوا اور طے پایا کہ متنازعہ فیہا تجارت میں دونوں شرکتیں حصہ دار رہیں گی اور ان کے سوداگر صلح صفائی سے اس طرح کام کریں گے کہ ہر دو فریقین کا مشترکہ فائدہ ہو۔ لیکن یورپ کے ارباب سیاست جس اتحاد کو وطن میں اس قدر مناسب و پسندیدہ سمجھتے تھے، ایشیا میں اُن پر عملدرآمد ہونا غیر ممکن نکلا۔ اور آیندہ چند سال کے واقعات سے بجز اس کے کچھ ثابت نہ ہو سکا کہ فریقین کے مطمح نظر میں اُصولی اختلاف ہے اور در اصل انگریز اُس تجارت میں حصہ بٹانا چاہتے ہیں جس کو ولندیز خالصتہً اپنے قبضے میں رکھنے کے آرزومند ہیں۔ انگریزی کمپنی اپنے حلقۂ عمل کو پہلے ہی محدود کرتی جاتی تھی کہ اتنے میں سنہ ۱۶۲۳ میں امبوینا کا غم افزا معاملہ[1] پیش آیا اور پھر

---

[1] اس معاملے کے متعلق "امبوینا کا قتل عام" انگلستان میں ضرب المثل ہوگیا ہے جس سے عام طور پر غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سنہ ۱۶۱۹ کے معاہدے کی رو سے جو انگریز ولندیزی قلعے کے اندر سکونت رکھتے تھے، اُن پر الزام لگایا گیا کہ وہ قلعے پر خود قبضہ جما لینے کی سازش کر رہے ہیں۔ ان کو شدید ایذا دے کر اقبال جرم کرایا گیا اور ان میں سے اکثر جان سے مار ڈالے گئے۔ ولندیزوں کو بھی اقرار تھا کہ یہ کارروائی بعض اعتبار سے بے ضابطہ ہوئی ہے اور اس بنا پر یہ "قتل عام" یا تو عدالت کا قتل سمجھا جا سکتا ہے یا محض بے انصافی۔ اور یہ فیصلہ کرنے والے حاکموں کی نیت کے متعلق جیسی کچھ کسی کی رائے ہو، اس پر منحصر ہے۔

سخت قضیہ پیدا ہوگیا۔ تب انگریزی کمپنی نے مصالحوں کے جزائر اور مشرقِ اقصیٰ
کی تجارت میں حصہ لینے کے دعوے کو بزور منوانے سے ہاتھ اٹھا لیا
اور مکاسر کے مشرق میں جس قدر اُس کے گماشتے تھے، اُن سب کی
دُکانیں بند کر دی گئیں۔ اس عرصے میں ولندیزوں کا یہ مقصد کہ مشرقی
سمندروں میں ایک مستقل مرکز قائم کیا جائے، بر آیا۔ جاوا میں جکاترا
کی بندرگاہ اُن کے ہاتھ پڑ گئی اور ۱۶۱۹ء میں وہاں اُنھوں نے بتاویہ کے
نئے شہر کی بنا ڈالی جو آج تک اُن کے ایشیائی مقبوضات کا صدر مقام ہے۔
اب ولندیز انگریز رقیبوں کو اس تجارت سے نکال باہر کرنے میں
کامیاب ہوگئے، جو اُن کے نزدیک سب سے گراں بہا تھی اور کچھ عرصے
بعد ہی جزیرۂ فارموسا کے ساحل پر تائے وان میں اُن کی بستی بسنے سے
مشرق اقصیٰ کی تنظیم جیسی وہ چاہتے تھے مکمل ہوگئی۔ تائے وان چین[۱] کی
تجارت کا مقام اساسی قرار دیدیا گیا۔ ولندیزوں کے سامنے دوسرا مرحلہ ۲۴

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ اس قضئے کے بارے میں طول طویل تحریریں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں
ہمعصر ضروری دستاویزوں کا پتا کیلنڈر، ایس، پی۔ سنہ ۱۶۲۲-۲۴ء سے چل سکتا ہے۔

[۱] اکثر دوسری قوموں کی مثل، ولندیزوں کو بھی چین میں تجارت کی امیدیں بہت کچھ اپنی طرف
کھینچتی تھیں اور بالکل ابتدا یعنی سنہ ۱۶۰۱ء ہی سے جاوا سے اس سمت میں جہاز بھیجے جانے لگے
تھے۔ تین سال بعد ہم سنتے ہیں کہ ایک ولندیزا امیر البحر ساحل چین کی کسی بندرگاہ میں داخل
ہونے کے لئے رسل و رسائل کر رہا ہے اور غیر سرکاری طور پہ اُسے مشورہ دیا جاتا ہے کہ کسی
جزیرے پر جو چین کی ملکیت نہ ہو، مگر اتنا قریب ہو کہ آسانی کے ساتھ وہاں سے تجارت کی جا سکے،
قبضہ کر لے۔ اس مشورے پر فوراً تو عمل نہیں ہوا مگر چند سال گزرے تھے کہ جزائر پسکادور
میں سے ایک جزیرے پر جو چین و فارموسا کے مابین تھا، ولندیزوں نے اپنی جنگی چوکی قائم کر لی۔
چینیوں نے اس پر اعتراض کیا اور اس کی بجائے خود فارموسا میں مقام تائے وان کا خیال دلایا۔
چونکہ اُن کے پاس ولندیزوں کو اپنی بات منوا دینے کی بھی کافی قوت تھی، لہٰذا یہ تبدیلی بلا تاخیر عمل میں آ گئی۔
ملاحظہ ہو فان نیک وغیرہ وغیرہ کے سفر بحری کا حال کتاب (Begin ...... Vooztgangh) میں تا

باب اوّل یہ تھا کہ پرتگیزوں کی باقی ساتی طاقت کو توڑ کر اس خطّے میں اپنی اجارہ داری کو بالکل مستحکم کردیا جائے۔ اس غرض کے لئے چند سال تک انھوں نے ناکہ بندی کے اصول پر اکتفا کی لیکن بالآخر ۱۶۴۱ء میں وہ ملکّا کے مالک ہوگئے اور اس بحری مستقر کے قبضے میں آجانے سے مشرق کے تمام ملکوں کی تجارت بلا خرخشہ اُن کے زیر اثر آگئی۔ مکاؤ اور تمور پر پرتگال کا قبضہ رہا لیکن ملکّا کے بغیر ان بستیوں سے کچھ زیادہ کام نہ نکل سکتا تھا البتہ مکاسر میں اُن کی تجارتی بستی کئی سال تک ولندیزوں کو دِق کرتی رہی اور بالآخر ۱۶۶۱ء میں جبراً اُس کا ڈیرا ڈنڈا اکھڑوا دیا گیا۔

ولندیزوں کا دوسرا مقصد، کہ جاوا اور سماترا کی مرچ کی منڈیوں سے انگریزی مقابلے کا ازالہ کردیا جائے، پورا ہونا نہ لکھا تھا۔ جب ولندیزوں کے ساتھ صلح صفائی سے گزارا نہ ہوسکا تو انگریزی کمپنی نے اپنا مشرقی صدر مقام بنتم میں قائم کیا اور ساحل سماترا پر جامبی میں ایک کوٹھی رکھی نیز اُس کے گماشتے وقتاً فوقتاً ان جزیروں کے دوسرے علاقوں میں بھی خرید و فروخت کرتے رہتے تھے۔ ۱۶۵۲ء میں انگلستان و ہالینڈ کے درمیان جنگ چھڑی تو ایشیا میں ہالینڈ کی قوت اپنے حریف سے کہیں زیادہ تھی۔ انگریز سوداگروں کو بنتم چھوڑ کر مدراس آنا پڑا۔ بہت سے انگریزی جہاز پکڑے گئے اور برسر موقع جو ولندیز موجود تھے، انھیں تو ضرور یہ نظر آنے لگا ہوگا کہ مرچ اور اسی طرح ہندوستان کی تجارت بھی بلا شرکت غیر اُن کی مٹھی میں آیا چاہتی ہے۔ لیکن ان متنازعہ امور کا بحرِ ہند میں نہیں، بحرِ شمال میں فیصلہ ہوا اور انگریزوں کی کامیابی کے عواقب میں اُن کی ایشیائی تجارت کی بحالی بھی تھی۔ مگر اس اثنا میں دوسرے سبب پیدا ہوگئے جن کے باعث انگریزوں کے قدم ان مشرقی جزیروں میں ڈگمگانے لگے ۲۵
کیونکہ ولندیز اچین میں سیاسی غلبہ حاصل کر رہے تھے اور مغربی جاوا میں مرچ کی جگہ نیشکر لیتی جاتی تھی۔ حالانکہ بلا مرچ کے ان جزیروں کے کارخانوں میں کچھ نفع نہ ملتا۔ پس ہمارے پیش نظر زمانے کے اخیر میں یہ خیال ہونے لگا تھا کہ انگریز ان کارخانوں کو چھوڑ دیں گے[1]

---

[1] چنانچہ ۱۶۸۳ء میں، جب ولندیزوں کا بنتم پر قبضہ ہوا تو انگریزوں نے وہاں کا کارخانہ بند کر دیا

انگلستان کے ساتھ جنگ سے قطع نظر، ہالینڈ کے حق میں ۱۶۲۴ء سے ۱۶۶۰ء تک کا زمانہ تجارتی اور انتظامی کامیابی کا زمانہ تھا۔ ان کا ایشیائی دار الحکومت، بٹاویہ کبھی کبھی مقامی دشمنوں کی زد میں آجاتا تھا لیکن مجموعی طور پر یہ پھلتا پھولتا اور برابر وسیع ہوتا رہا۔ مصالحے کے جزیروں کے باشندے رفتہ رفتہ اس آہنی انضباط کے پابند ہو گئے جو ولندیزوں نے جبراً اُن پر عائد کیا تھا اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ وہاں کی پیداوار کو پوری پوری طرح اجارہ داری کے طریق پر منضبط کر لیا جائے۔ جاپان میں جو سیاسی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں، وہ رفع ہو گئیں اور اصل کاروبار کی شاخ کی طور پر اس مُلک کے ساتھ بھی تجارت ترقی کرنے لگی۔ ادھر تائے وان ولندیزی مقبوضات میں شاید سب سے زیادہ پُرامید مقام بن گیا اور ہم چین کے اندرونی اقطاع سے اُس کی وسیع تجارت کے ساتھ ساتھ، نہایت اہم زرعی ترقی کا حال بھی پڑھتے ہیں جو ولندیزی سوداگروں کے زیر ہدایت عمل میں لائی جا رہی تھی۔ ۱۶۶۱ء میں اس نوآبادی کا ولندیزوں کے ہاتھ سے چھن جانا، پہلی سخت ضرب تھی، جو اُن کے فروغ پذیر کاروبار کو لگی لیکن اُس کے عواقب و اثرات ہمارے پیش نظر عہد سے جس کے میں حالات لکھنے بیٹھا ہوں، باہر ہیں۔ یہ زمانہ تو دراصل وہ ہے جس میں ولندیز ایشیائی سمندروں میں داخل ہوتے ہیں اور ایشیائی تجارت میں اُن کے غلبہ و برتری حاصل کر لینے ہی پر یہ عہد ختم ہو جاتا ہے؛

(حاکم) مکاسر کا اُس زمانے میں جو مرتبہ رہا، اُس کے بارے میں چند کلمے لکھنے ضروری ہیں۔ سولھویں صدی میں یہ بندرگاہ کوئی خاص قدر و منزلت نہ رکھتی تھی لیکن مصالحے کے جزیروں پر پرتگیزوں کا اقتدار زائل ہوا، تو اس مقام کو لونگ، جوز، جوتری کی منڈی بن جانے کی بدولت خاص امتیاز حاصل ہونے لگا۔ مکاسر سے ان جزیروں تک پہنچ جانا، مقامی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ البتہ سماترا کے مغربی ساحل پر بمقام بن کولن انگریزوں کی مورچہ بندی قائم ہو جانے سے انگریزی کمپنی اس قابل رہی کہ مرچ کی تجارت میں اُس کا حصہ سلامت رہے؛

باب اول

کشتیوں کی دسترس کے اندر تھا اور وہ بتعداد کثیر ہر موسم میں وہاں جاتی اور جس قدر مصالحے مل سکتے، اُنھیں فراہم کرلیتی تھیں۔ جزیروں سے جو پرتگیز نکالے گئے، ۲۶ اُن میں سے بھی بعض اسی حاکم کی پناہ میں آبسے اور اس تدبیر سے اُن کی سابقہ تجارت کا کم سے کم ایک حصہ اُن کے قبضے میں رہا۔ ولندیزوں کو اُن کا اتنا کاروبار بھی سخت ناگوار تھا کیونکہ وہ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے درپے تھے اور یہ تجارت اُس میں رخنہ ڈالتی تھی۔ یہ پرتگیز سوداگر مکاسر سے بعض دوسری مشرقی منڈیوں کو بھی مال بھیجتے تھے۔ ایک انگریزی کارخانہ بھی یورپ کے واسطے مال فراہم کرنے کی غرض سے یہاں چلا آتا تھا۔ اور ترن کوبار کے (ڈن مارک والے) تاجروں نے اس تجارت میں کمال مہارت پیدا کرلی تھی۔ پس مکاسر کی رسد روکنے کی مختلف تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ سب سے بڑے ذرائع پر تو باقاعدہ پہرہ چوکی بٹھایا گیا اور ادھر اُدھر جزیروں میں جو مصالحے کے درخت تھے، اُنھیں پورے اہتمام کے ساتھ بیخ و بُن سے اُکھڑوا دیا گیا۔ جزیروں کے آس پاس جنگی کشتیاں متعین کردی گئیں کہ مکاسر جانے والے جہازوں کو راستے ہی میں پکڑلیں۔ کبھی کبھی خود اس شہر کی ناکہ بندی کی گئی اور دوسری طرف مصالحوں کو اصل قیمت سے کم پر فروخت کرکے ہندوستانی منڈیوں سے ڈنمارک والوں کو نکلوا دیا گیا۔ آخر میں رئیس مکاسر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے اور اُس نے پرتگیزی آبادی کو اپنے علاقے سے نکال باہر کیا اور اُن کی تجارت بالکل محدود اور قریب قریب مسدود ہوگئی اگرچہ ہمارے پیش نظر پورے زمانے میں مصالحوں کی تھوڑی بہت مقدار برابر دساور چڑھتی رہی[۱]۔

ڈنمارک والوں کے ذکر سے یہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ مشرقی منڈیوں میں لڑنے کے لئے ولندیز و انگریز ہی نہ تھے بلکہ اور قوموں نے بھی اس

۱۔ مگر یہ دوستی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہی اور ۱۶۶۷ء میں ولندیزوں نے مکاسر میں جبراً پورا غلبہ حاصل کرلیا۔

مقابلے میں حصہ لیا مگر یہ سچ ہے کہ دوسرے مقابلہ کرنے والے کم وقعت ثابت ہوئے۔ ڈنمارک والوں نے ہمارے پیش نظر عہد میں سوائے مکاسر میں تعلق پیدا کرنے کے اور کچھ سرگرمی نہ دکھائی اور ان کی تھوڑی بہت جو کچھ قوت تھی وہ خلیج بنگالہ ہی کے خاص خاص مقامات کے اندر محدود رہی۔ فرانس والوں کے جہاز بھی کبھی کبھی جاوا اور سماترا کے ساحلوں پر دکھائی دیئے اور اس سے کمتر موقعوں پر مشرق کے دوسرے سمندروں تک بھی پہنچے لیکن انھوں نے جو کچھ حصہ لیا وہ بہت تھوڑا تھا اور ہندوستان میں ان کی اولوالعزمی کی داستان ہمارے حلقۂ زمانی کی حدود سے باہر ہے۔ صدی کے چند ابتدائی سنین میں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسپین والے اپنی جزائر فلپائن کی نوآبادیوں سے نکل کر مصالحوں کی تجارت میں کوئی خاص حصہ لیں۔ لیکن ان کی سعی مستقل نہ رہی[1]۔ غرض اس عہد کی تاریخ کا اجمالی خاکہ تمام کرنے میں صرف پرتگیزی مقبوضات کے مزید نقصانات کو بیان کر دینا باقی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں سب سے پہلے مصالحوں کے جزیروں کے مقبوضات ان کے ہاتھ سے گئے۔ دوسرا نقصان ہرمز کا ہوا جسے ۱۶۲۲ء میں ایرانی اور انگریز اتحادیوں نے مل کر فتح کیا۔ اس کے قریب مسقط کے قلعے پر ایک ربع صدی تک اور پرتگیزوں کا تسلط رہا لیکن یہ خلیج فارس میں ان کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کافی نہ تھا اور جب مسقط کو بھی عربوں نے چھین لیا تو ان سمندروں میں پرتگیزوں کی

---

[1] یاد ہوگا کہ ۱۵۸۰ء کے اتحاد سے پرتگال کی جداگانہ ہستی کا بالکل خاتمہ نہیں ہوگیا تھا اور ایشیا میں تو ان ملکوں میں پورے اہتمام سے تفریق و امتیاز کیا جاتا تھا۔ فلپائن کے ہسپینی آبادکاروں نے جزائر ملکا کے ایک جزیرے ترنیت میں بھی ایک قلعہ لے لیا تھا اور جب پرتگیزوں نے ولندیزی دباؤ سے دوسرے قلعے چھوڑے تو انھیں نے ان پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور گو وہ ان سب کو اپنے پاس نہ رکھ سکے تاہم جزیروں میں سالہا سال تک ان کا قدم جما رہا اور فارموسا میں بھی ایک قلعہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ مگر ان عمدہ موقعوں سے انھوں نے بہت کم کام لیا۔ (ڈین ویل پنجم ۲۳۸ وغیرہ)

تاریخ ختم ہوگئی۔ ہرمز کے بعد دوسرا نقصان ہگلی کی تجارتی نوآبادی کی بربادی تھا جسے شاہجہاں کی فوجوں نے ۱۶۳۲ء میں تباہ و تاراج کر ڈالا اور اگرچہ بعض پرتگیزوں کو اس نواح میں واپس آنے کی اجازت مل گئی بایں ہمہ تجارت میں اُن کی بالادستی پھر بحال نہ ہو سکی۔ چاٹ گام پر اُن کا قبضہ بیشک زیادہ عرصے تک رہا لیکن ہمارے پیش نظر عہد کے ختم ہونے کے تھوڑے ہی روز بعد یہ بندرگاہ بھی قطعی طور پر اُن کے ہاتھ سے نکل کے مغلوں کے احاطۂ اقتدار میں داخل ہو گئی۔ ہگلی کی بربادی کے نو سال بعد ملکّا بھی ولندیزوں کے ہاتھ آگیا۔ اسی سلسلے میں کچھ عرصے ہنگامی صلح رہی لیکن صدی کے چھٹے عشر میں پرتگیز رفتہ رفتہ لنکا سے نکال دئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ولندیزوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر نگاپٹم لیا اور پھر کوچین اور ملیبار کے چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قابض ہو گئے۔ انھیں وجوہ سے بالآخر مستقل صلح نامہ مرتّب کیا گیا اور اس کی رُو سے ایشیا میں پرتگیزوں کے مقبوضات گھٹ گھٹا کر قریب قریب اتنے رہ گئے جتنے کہ آج اُن کے پاس ہیں[1]۔ اُن کی بحری طاقت رخصت ہوئی اور تجارت بالکل ناقابل لحاظ ہو کے رہ گئی۔ مشرق اقصیٰ میں فقط مکاؤ اور تمور کا ایک جزو اُن کے پاس رہا۔ ہندوستان میں دارالحکومت گوآ اور دمن اور دیو کی بندرگاہیں ساحل گجرات پر جہازوں کی آمد و رفت تو اب بھی دیکھتی تھیں مگر دست اندازی کی قوّت ان میں باقی نہ رہی تھی۔

---

[1] بمبئی کے جزیرے اور بندرگاہ چارلس دوم اور پرتگیزی شہزادی کے معاہدۂ عقد کی رو سے انگریزوں کے حوالے کر دئے گئے البتہ بسین کے علاقے اُن کے قبضے میں رہے حتّٰی کہ اٹھارھویں صدی میں انھیں مرہٹوں نے چھین لیا۔

باب اوّل کے ماخذ

فصل اوّل

ہندوستان کی سیاسی کیفیت، ایلیٹ اور تزک جیسے مسلم الثبوت
ماخذ پر مبنی ہے۔ تفصیلی حوالے فضول ہوں گے۔ جنوب کے حالات
کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے وہ کیفیات مطالعہ کرنی چاہئیں جو "داغ رجسٹر"
میں مندرج ہیں۔ دوسرے ایشیائی ممالک کی نسبت جو اجمالی حالات
لکھے گئے ہیں، وہ ایک وسیع میدان سے چُنے گئے ہیں۔ ایران و ترکی
کے تعلّقات کا بار بار "انگلش فیکٹریز" اور "داغ رجسٹر" میں ذکر آتا ہے
اور کبھی کبھی ان ہی کتابوں سے ہندوستان کے مشرق کے ملکوں پر بھی روشنی
پڑتی ہے پیگو کے مزید حالات دیکھنے ہوں تو عام کتابوں کے علاوہ
(Begin ende Voortgangh اور Faria-y-Sousa)
میں ملیں گے۔ انھیں دو ولندیزی ماخذوں سے مشرق الہند کے جزیروں
کا بہترین طریق پر حال معلوم ہو سکتا ہے۔
بحری قوت کی نسبت مغل بادشاہوں کی جو روش رہی اُس پر
ٹرپ اسٹرا کی "سورت" خصوصاً ضمیمہ نمبر ۴، نمبر ۶، نمبر ۸، نمبر ۱۳ میں بحث
کی گئی ہے اور یوں بھی تمام انگریزی مراسلات میں اس کا پتہ چلتا ہے۔
نیز دیکھو (English Factories اور Letters Received)
جورڈین، ۲۲۳؛ منوکی (جلد دوم، ۵۴) یہ بصیرت افروز (اور ممکن ہے کہ معتبر)
قصّہ سناتا ہے کہ اورنگ زیب نے یہی طے کیا تھا کہ بحری جنگ آرائی صرف

باب اول کے آخذ

فرنگیوں کے لئے موزوں ہے"۔ ایران کے طرز عمل کی نسبت ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، نہم، ۲۲۶۔

فصل دوم

پرتگیزوں کی بحری سلطنت کی تاریخ وہائٹ وے اور ڈین ورز کی کتاب میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ زیادہ تفصیل چاہیئے تو بیروس وغیرہ وغیرہ پرتگیز مصنفوں کی کتابیں دیکھی جائیں۔ اُن کی اولوالعزمی کے فرنگستانی پہلو کے متعلق غالباً کیمبرج موڈرن ہسٹری (خصوصاً جلد اول، باب اول۔ جلد سوم، باب نمبر ۱۵) کا حوالہ دینا کافی ہوگا جس میں آخذ کی پوری فہرستیں شامل ہیں۔ پرتگیزوں کے اقتدار و نگرانی کے عملی حالات کو پیارڈ نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ بددیانتی کی کیفیت، جلد دوم، ۲۴۰ میں مذکور ہے۔ اکبر بادشاہ کے پرتگیزی تسلّط تسلیم کرنے کے ثبوت میں دیکھو کوتو، ۹، ۲۴۶، ۱۲، ۱۴۴ اور ایلیٹ، جلد پنجم، ۴۰۳۔ ہندوستانی سمندروں پر برتری کی اقتدار قائم کرنے کی کوششیں مسٹر لونگ ورتھ ڈیمز نے رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی (بابت جنوری ۱۹۲۱ء) کے ایک مقالے میں تحریر کی ہیں۔ مشرقی افریقہ میں اُن کی ترکتازی کا حال کوتو نقل کرتا ہے (۱۶۱ء) ۴ کُنہا "(بحری قزاق) کے کارناموں کے واسطے یہ کتابیں ملاحظہ طلب ہیں

Faria-y-Sousa, iii. 99 ff., Hay, 831 ff., Renneville, 453. Calendar S. P., 1513-1616, No. 280.

پرتگیز سپاہیوں کی دلاوری کی ۱۶۲۵ء تک کی شہادت (della Valle, ii, 290). اور بحری لڑائیوں کے مختلف حالات وقصص میں مذکور ہے۔

فصل سوم

ہالینڈ کو ان دنوں یورپ میں جو مرتبہ حاصل تھا، اُس پر کیمبرج موڈرن ہسٹری میں بحث کی گئی ہے۔ سادہ و دلنشین پیرائے میں

باب اول کے ماخذ

اڈمنڈسن نے بھی یہ حالات لکھے ہیں۔ ایشیائی کاروبار اور کارناموں کے متعلق خود ولندیزی مواد بہت کثیر ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ ان ماخذوں پر مبنی ہے:- (Van der Chijs, de Jonge, Elias, Linschoten, Houtman.) اور ابتدائی سفروں کیلئے (Begin ende Voortgangh, Renneville, i-iv.) انگریزوں کے ابتدائی سفروں کے لئے ملاحظہ ہوں (Early Travels, Letters Received (Introduction to Vol. i). Purchas, Book I., Calendar S. P., 1513—1616 (Nos. 258, 268 281, etc.)

فصل چہارم

مشرق اقصیٰ کی جد و جہد کا انگریزی پہلو ذیل کی کتابوں میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے:- (Letters received, (English) Factories, i. ii., Calendar, S. P. 1611 (onwards) Purchas, Book I., and Jourdain (especially 318 ff.)

ولندیزوں کے طرزِ عمل پر "ہیگ ٹرینس کرپٹس" (Hague Transcripts) سے روشنی پڑتی ہے اور اہل پرتگال کی کیفیت کا اندازہ کرنے میں "لزبن ٹرینس کرپٹس" (Lisbon Transcripts)' سے مدد مل سکتی ہے۔ اسی کے اوراق سے اُن کی مشکلات ظاہر ہوتی ہیں مثلاً آدمی، جہاز اور روپے کی کمی (صفحہ ۱۲۶) شہتیر کی کمی (۱۷۳) توپوں کی کمی (۴۰۹) شورے کی کمی (۹۳۱) وغیرہ۔ انگریزوں کو سورت سے نکال دینے کا حکم اسی کے صفحہ ۴۴ پر درج ہے۔ اور انگریزوں اور پرتگیزوں میں صلح ہو جانے کا حال "انگلش فیکٹریز" میں ملتا ہے (پنجم صفحہ ۹) اُدھر ولندیزوں کا ضروری اشیا پر توجہ صرف کرنے کا ذکر ہیگ ٹرینس کرپٹس میں جا بجا ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کا سلسلہ ۶ و ۴،

باب اول کے مآخذ

نمبر ا و ۲ و ۵ و ۹ و ۱۲ و ۲۶ وغیرہ نیز سلسلۂ سوم، ب و ث و ۳؎

دوازدہ سالہ متارکۂ جنگ کے زمانے میں بھی پرتگیزوں اور ولندیزوں کی جو آویزشیں ہوتی رہیں، اُن کا جا بجا تذکرہ ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو ”ہیگ ٹرینس کرپٹس“ اول، ۲۹۔ رین ویل ہفتم، ۲۵۶۔ ولندیزوں اور انگریزوں کے درمیان جو نیم خام سا عہد نامہ ہوا تھا، اُس کا ”کیلنڈر، ایس، پی“ ۱۶۱۷ء تا ۱۶۲۱ء (:۔ نمبر ۱۱۵ و ۳۵۱ و ۴۲۵ و ۶۶۶ وغیرہ) میں قدم قدم پر حوالہ آتا ہے اور اس پر عملدرآمد کی مختلف جزئیات ”انگلش فیکٹریز، جلد اول، و دوم“ میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔ ولندیزوں نے پرتگیزوں کے خلاف بعد میں جو کچھ کارروائیاں کیں اُن کا سراغ ”داغ رجسٹر“ بابت ۱۶۲۴ء و سنین مابعد سے ملتا ہے؎

انگلستان و ہالینڈ کی لڑائی کے واقعات ”انگلش فیکٹریز“ جزو ہفتم میں تفصیل سے درج ہیں۔ اس زمانے کا ”داغ رجسٹر“ افسوس ہے کہ اتنا مختصر ہے کہ اس سے زیادہ کام نہیں نکلتا۔

یورپ کے سمندروں میں جو لڑائیاں ہوئیں، اُن کے لئے ملاحظہ ہو کیمبرج موڈرن ہسٹری جلد چہارم باب شانزدہم۔ اور جاوا و سماترا میں برطانی تجارت کے برباد ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو ”انگلش فیکٹریز“ دہم، ۲۵۵۔ اور الیئاس Elias دوم، ۴۶۔

بیچ کے سنین میں ولندیزوں نے جو فروغ پایا، اُس کا سب سے بہتر و معتبر ماخذ تو ”داغ رجسٹر“ ہے لیکن ”انگلش فیکٹریز“ کے اوراق میں بھی جا بجا حاسدانہ عبارتوں سے اس فروغ و ترقی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مکاسر کے معاملات کا سب سے اچھا مطالعہ ”داغ رجسٹر“ میں ہو سکتا ہے لیکن ”ہیگ ٹرینس کرپٹس“ میں بھی کہیں کہیں حوالے موجود ہیں (۱ جلد اول ۲۳۳ و ۲۶۴۔ دوم ۹۴ و ۱۰۰۔ سوم ف ۵) ۱۶۱۲ء میں اس مقام کی اہمیت کے لئے ملاحظہ ہو جورڈین“ ۴ ۲۹؎

ڈینمارک والوں نے اس میدان میں جو تگ و تاز کی اُس کے

باب اول کے مآخذ

کسی ڈینی مآخذ کا جو اُسی زمانے میں لکھے گئے ہوں، مجھے علم نہیں۔ اُن کی سعی کا حال منتشر طور پر داغ رجسٹر اور انگلش فیکٹریز میں ملتا ہے؛ تسخیر ہرمز کے بارے میں دیکھو انگلش فیکٹریز، دوم۔ (مقدمۂ کتاب وغیرہ) اور انگریزی کمپنی کے معاملات پر اس واقعے کا جو اثر پڑا وہ کیلنڈر، ایس، پی ۱۶۲۲ء تا ۱۶۲۴ء نمبر ۴۱۸ و ۴۴۸ میں تحریر ہے؛ تسخیر مسقط کے لئے ملاحظہ ہو فیکٹریز، ہشتم ۳۱۱۔ تسخیر ہگلی کے لئے ایلیٹ جلد ہفتم۔ ۱۳۱ و ۲۱۱۔ چاٹ گام کے لئے سرکارز اسٹڈیز، ۱۳۱۔ لنکا اور کوچین کے لئے دی ڈچ ان ملیبار (مقدمہ ۷)؛

باب دوم

ولندیزوں اور انگریزوں کی تجارت کا نشو و نما ہندوستان میں

۱۔ پہلی کوششیں۔ اور ساحل کورومنڈل کے کارخانے

لیکن اب ہمیں ولندیز اور انگریز تاجروں کے ہندوستان اور دوسرے مغربی ملکوں میں کاروبار پھیلانے کے حالات پر توجہ مبذول کرنی چاہئیے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سب سے اول جو بحری سفر کئے گئے اُن کا ہندوستان سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مگر ولندیزوں کو ایشیا میں پہنچے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ تجربے نے انھیں خواہ مخواہ اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر فائدے کے ساتھ تجارت کرنی ہے تو ہندوستان کو اپنے دائرۂ عمل میں داخل کرنا پڑے گا۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مرچ اور مصالحے جن کی تلاش میں فرنگی ایشیا آتے تھے، وہ عام طور پر انھیں زمینداروں سے مل سکتے تھے جو اس کے معاوضے میں ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا لیتے تھے۔ ولندیزوں نے شروع میں قسمت آزمائی کی تو سارا منصوبہ اُن اطلاعات کی بنا پر مرتب کیا جو پرتگیزوں کے تجارتی طور طریق کے متعلق انھیں بہم پہنچی تھیں۔ اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ لزبن سے زیادہ تر چاندی روانہ کی جاتی تھی۔ اسی کو دیکھ کر ولندیزوں نے شروع میں تجارت کے لئے جو سرمایہ بھیجا وہ بیشتر سکوں پر مشتمل تھا اور اسی کے ساتھ

متفرق اشیاے تجارت بھی تھیں۔ لیکن پرتگیزوں کی یہ نظیر دراصل قابل عمل
نہ تھی کیونکہ لزبن سے جو چاندی بھیجی جاتی وہ ہندوستان جاتی تھی بحالیکہ ولندیز
اپنے سکے لے کر سیدھے جاوا گئے اور تجربے سے ثابت ہو گیا کہ گو اس
طریق سے بھی وہ مرچیں خریدنے میں کامیاب ہو گئے لیکن تجارتی اعتبار
سے یہ داد وستد کچھ ٹھیک نہیں رہی۔ اصل میں بنٹم کی تجارت چینی ۳۱
بیوپاریوں کے ہاتھ میں تھی جو زمینداروں سے فصل آنے کے وقت سودا
کر لیتے اور چین سے جہازوں کے آنے تک مرچیں بھر رکھتے تھے۔ چونکہ
چین سے خریداروں کا آنا یقینی بات تھی اور وہاں مال کی بکری قدیم سے
ہوتی چلی آتی تھی لہذا یہ لوگ دوسروں کے ہاتھ مال بیچنے کے کچھ بہت خواہشمند
نہ ہوتے تھے۔ پس ولندیزوں کو یا تو اُن کی منھ مانگی قیمت دے کر مال
خریدنا تھا اور یا ایک صورت یہ تھی کہ بندرگاہوں میں دوسری فصل تیار
ہونے تک لنگر ڈالے پڑے رہیں۔ مگر یہ صورت بہت مخدوش تھی۔ اوّل
تو اتنے دن پڑے رہنے اور جہاز کے ملّاحوں وغیرہ کا خرچ ہی کم نہ تھا دوسرے
اس سے کہیں زیادہ اہم خطرہ یہ تھا کہ کیڑوں سے، جن سے بندرگاہیں بھری
رہتی تھیں، جہازوں کو نقصان پہنچتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملّاحوں
اور خلاصیوں میں اموات کی شرح اتنی بڑھ گئی کہ خوف آتا تھا۔ اور
اس کا ایک سبب وہ بدعنوانیاں تھیں جن کے ارتکاب کی ان
بندرگاہوں میں تمام آسانیاں میسّر آتی تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیادہ عرصے
تک جہاز کے بندرگاہ میں ٹھہرے رہنے سے ممکن تھا کہ وہ یورپ
واپس جانے کے قابل ہی نہ رہے اور یا ملّاحوں کی کمی کے باعث
راستے میں برباد و ضائع ہو جائے۔ ولندیزوں کو بہت جلد احساس ہو گیا
کہ نفع کے ساتھ کاروبار کرنا ہے تو اُنھیں اُس دیس کے طور طریق کے مطابق
کام کرنا چاہیئے اور اپنے گماشتے یا آڑتی برسر موقع چھوڑ دینے چاہئیں کہ
براہ راست کھیت والوں سے فصل کے وقت سودا کر لیں۔ دوسرے
ان گماشتوں کے پاس روپے کی بجائے سوتی کپڑا پہلے سے مہیا

رہنا چاہیئے تاکہ جہاز بندرگاہ میں صرف اتنی دیر ٹھہریں کہ مال جو پہلے سے فراہم کر لیا گیا ہو، کوٹھوں سے نکلوا کر جہازوں میں لدوا لیا جائے۔ بنتم کی جو کیفیت بیان ہوئی عام طور پر یہی حال اچین کا تھا بلکہ یہاں ایک جوکھم یہ اور تھا کہ باشندے یک بہ یک ہنگامہ و فساد پر تیار ہو جاتے یا وہاں کے بادشاہ پر جذبۂ حرص و استبداد غالب آجاتا۔ مصالحے کے جزیروں میں معاملہ اور بھی مشکل تھا کیونکہ وہاں روپے پیسے کا عام طور پر رواج ہونے نہیں پایا تھا اگرچہ جو باشندے اُس کا استعمال جانتے تھے وہ سکہ لینے پر رضامند تھے۔

غرض یہ کہ یہاں بھی تجارت کے سرسبز ہونے کی صورت یہی تھی کہ خریدار فصل کے وقت ہندوستانی کپڑے کا ذخیرہ لے کے منڈی میں پہنچ جائے۔

ہندوستان کا کپڑا ملنے کو تو اچین و بنتم کے بیچ والوں سے بھی مل سکتا تھا لیکن بہت ہی گراں قیمتوں پر۔ پس یہ کچھ حیرت کی بات نہیں کہ ایسے تیز فہم سوداگر جیسے کہ ولندیز تھے، چند ہی روز کے تجربے کے بعد مستعد ہو گئے کہ اصل کارخانوں سے مال خریدیں اور بیچ والوں کے پاس جو نفع جاتا ہے اُس کو بچالیں۔

ہندوستان کی کپڑے کی منڈیوں میں داخل ہونے کی پہلی کوشش،

جہاں تک تحریری شہادت ملتی ہے، سنہ ۱۶۰۱ء کے اواخر میں ہوئی جب کہ دو ولندیزی گماشتے ایک جہاز میں جو اچین سے واپس گجرات آرہا تھا، روانہ ہوئے۔ سورت میں لوگوں نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُنھوں نے یہاں کے متعلق حوصلہ افزا کیفیت لکھ کر بھیجی۔ لیکن انھیں تجارت کا ۲۲ لالچ بلکہ عجب نہیں کہ جھانسا دے کر کالی کٹ لایا گیا اور وہاں پرتگیزوں کے حوالے کر دیا گیا جنھوں نے گوآ میں لا کے انھیں جان سے مار دیا؛ آیندہ چند سال کا حال کسی کتاب میں نہیں ملتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ولندیزی گماشتوں کے گجرات بھیجے جانے کا سلسلہ جاری رہا کیونکہ یہ صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۶۰۶ء میں ولندیزوں کی ایک آڑت کی دُکان سورت میں موجود تھی۔ مگر اگلے سال ہی اس کا خاتمہ ہو گیا جب کہ فان ڈیٹ سن نے جو اپنی جماعت بھر میں اکیلا باقی رہ گیا تھا، پرتگیزوں کی ساز باز اور جبر و تعدی سے پریشان ہو کر

خودکشی کرلی۔ اس کے بعد ولندیزوں نے گجرات کو چند سال کے لئے بالکل چھوڑ دیا۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ یہاں تجارت کی ترقّی کے بہترین مواقع نکل سکتے ہیں لیکن ان کے حکّام اب اپنی پوری قوّت مصالحوں کے جزیروں کے واسطے صرف کرنے پر تُل گئے تھے، لہذا اس زمانے میں گجرات کا مال وہ اچین کی منڈی میں خریدتے رہے۔

اصل یہ ہے کہ مصالحوں کی منڈیوں کے لئے کپڑا فراہم کرنے میں ساحل کورومنڈل کو گجرات سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اسی اثنا میں ولندیزوں نے مچھلی پٹم میں پاؤں ٹکانے کی جگہ پالی تھی۔ ۱۶۰۵ء میں ایک چھوٹی دکان وہاں کھل گئی تھی لیکن کارخانوں کا باضابطہ قیام اگلے سال سے شروع ہوا جب کہ شاہ گول کنڈہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ مرتّب ہو گیا اور ولندیز سوداگروں نے خود مچھلی پٹم اور نظام پٹم میں، جو اُن دنوں پٹاپلی کے نام سے زیادہ مشہور تھا، کاروبار کا آغاز کیا۔ یہاں انھیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کشتنا کا شاخدار دہانہ ان کی تجارت کی جملہ ضروریات کے لئے سب سے بہتر مقام نہیں ہے۔ مقامی کاریگر زیادہ تر سادہ کپڑا یا چھینٹ، دھلی ہوئی یا رنگین، تیار کرتے تھے لیکن بعض منڈیوں خاص کر جزائر مُلکّا میں اس کپڑے کی زیادہ مانگ تھی جسے ہمعصر تحریروں میں "پنٹاڈو" یعنی چھاپے کا مال لکھا ہے اور اس خاص صنعت کا بڑا مقام آگے جنوب میں، یعنی پولی کٹ اور سان تھامی کی نواح میں تھا۔[1] پس یہ مناسب معلوم ہوا کہ جنوب کی طرف کام زیادہ بڑھایا جائے اور

---

[1] مشہور رنگوں کی کشتنا (کرشنا) کے دہانے کے علاقے میں فراوانی تھی کیونکہ قریب ہی نیل کی کاشت ہوتی تھی اور خود پٹاپلی بہترین قسم کے دیسی مجیٹھ کی کاشت میں مشہور تھا۔ ان کے لئے ملاحظہ ہو "احوال گولکنڈہ" جو فان ڈن بروک کے رسالے میں درج ہے اور یہ رسالہ "Begin ende Voortgangh" کا جزو ہے۔ ٹرین ڈیل نے ان الفاظ کے صحیح معنی نہیں سمجھے اور اس لئے ان فقرات کی اہمیت بھی ترجمے میں باقی نہیں رہی (جلد ہفتم - ۵۱۲) پرتگیزوں کا لفظ "پن ٹیڈو" یعنی چھاپے کا، اس کپڑے (= چھینٹ) کے واسطے خاصی طرح

باب دوم ۳۳

آیندہ دو تین سال میں ہم تگناپٹم کے قریب کارخانوں کا قائم ہونا سنتے ہیں اور یہ وہ جگہ ہے جسے زمانۂ حال کے نقشوں میں فورٹ سینٹ ڈیوڈ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کام میں سب سے اہم ترقی یہ تھی کہ چندراگیری کے راجہ نے خود پولی کٹ میں ایک جگہ عنایت کردی۔ ۱۶۱۰ء میں ولندیزوں کے یہاں قدم جم گئے اور یہیں جو کارخانہ انھوں نے بنایا وہ اس تمام ساحل کے کاروبار کا صدر مقام ہو گیا۔ سان تھومی کے پرتگیزوں نے اسے ۱۶۱۲ء میں ان سے لے لیا تھا لیکن تھوڑے ہی دن بعد وہ دوبارہ ان کے قبضے میں آگیا اور اسے اتنا مستحکم کر لیا گیا کہ خشکی کی طرف سے آیندہ حملہ ہو تو اس کی مدافعت کی جا سکے[1]۔ اس کے بعد سے ساحل کی تجارت استقلال کے ساتھ ترقی کرتی رہی۔ مشرقی تجارت کے لوازم مہیا کئے جانے لگے۔ جو سامان یہاں کھپ سکتا تھا وہ باہر سے لایا جانے لگا اور کچھ مدت میں ایران اور یورپ کے درمیان براہ راست تجارت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

انگریز سوداگر مچھلی پٹم اور پیٹاپلی میں آ کے ۱۶۱۱ء میں آباد ہوئے تھے لیکن ان کی تجارت کو ولندیزوں کے برابر فروغ نہ ہوا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ مشرق اقصیٰ میں وہ اس وسیع پیمانے پر کاروبار نہیں پھیلا سکے تھے۔ کورومنڈل سے وہ مال تو فراہم ہو جاتا تھا جس کے عوض میں وہ سماترا اور جاوا سے مرچیں خریدتے تھے یا اسے مکاسر میں فروخت کر دیتے تھے اور

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ صحیح تھا جس پر وہ شروع میں اس کا اطلاق کرتے تھے۔ انگریزوں نے اسی کو اختیار کر لیا لیکن پرتگیزوں نے آگے چل کر اسے بدل دیا اور اسے "Geschilderd" کہنے لگے اس کی ساخت کے متعلق ملاحظہ ہو "فرسٹ لیٹر بک" ۵۹۔ بعد میں ہر قسم کے چھپے ہوئے کپڑے کو خواہ برش سے چھاپا ڈالا گیا ہو یا لکڑی کے سانچے بنا کے، یہی لفظ بولا جانے لگا۔ چنانچہ سورت کے انگریزوں کے خطوں میں چھاپے کے کپڑے سے غالباً چھینٹ مراد ہے اور آگرے کے ایک ابتدائی خط میں بھی ان دونوں لفظوں کو بطور مرادف استعمال کیا گیا ہے۔

[1] پولی کٹ کی اس مورچہ بندی کو ہم نے باب ہشتم میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔

اور ایک عرصے بعد اس سے ایران و یورپ کی تجارت میں بھی انھیں مدد ملی لیکن ہمارے زیر بحث جو زمانہ ہے، اس میں اول سے آخر تک ولندیزی ہی اپنی وسیع تجارت کے باعث منڈیوں پر پوری طرح چھائے رہے اور عام طور پر انگریز سوداگر اسی پر قانع رہے کہ ان کی پیروی کرتے رہیں۔ شمال میں انگریزوں کا مستقر مچھلی پٹم ہی رہا۔ جب یورپ میں کمپنیوں کا باہمی عہد و پیماں ہو گیا تو اس کی رو سے سنہ ۱۶۲۱ میں انھیں پولی کٹ کی نو آبادی میں آنے کی اجازت مل گئی لیکن جو حال دوسری جگہ تھا وہی یہاں ہوا کہ ایک ولندیزی قلعے میں بود و باش رکھنا برداشت سے باہر ہو گیا اور سنہ ۱۶۲۶ میں وہ پولی کٹ کی بحری جھیل کے شمالی سرے پر ارماگون (= ارم گاؤں؟) میں اٹھ آئے جہاں کے نائک یا مقدم نے انھیں خاطر خواہ شرطوں پر جگہ دے دی۔ ایک عرصے تک یہ گاؤں کام دیتا رہا لیکن ایسے تجارتی مرکز بنانے میں بہت سے سقم تھے۔ لہذا سنہ ۱۶۴۰ء میں انگریز گماشتے اس جگہ آ رہے جسے اب مدراس کہنے لگے ہیں۔ اور نائک سے جو ساحل کے اس ٹکڑے پر قابض تھا، اقرار نامہ کر کے ایک قلعہ یہاں بنا لیا گیا۔ یہ انتظام ہمارے پیش نظر زمانے تک چلتا رہا۔ یعنی ولندیزوں کا مستقر پولی کٹ میں اور انگریزوں کا مدراس میں رہا اور مچھلی پٹم اور اسی نواح کے دوسرے مقامات میں بھی انکی کمپنیوں کی کوٹھیاں رہیں اور ساحل پر مختلف منڈیوں میں الگ کاروبار جاری رہا۔

۲۔ مغربی ہند کی کوٹھیاں

اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے کہ ولندیزوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدم جمانے کی جو کوششیں کی تھیں، ان کا خاتمہ سنہ ۱۶۰۷ء میں فان ڈین بس کی وفات پر ہوا۔ یہ اسی واقعے کے ایک سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک انگریزی جہاز سورت کے سامنے پہنچا اور جب ابتدائی شرطیں طے ہو گئیں تو گجرات سے تجارت بڑھانے کا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا گیا۔

اسی موقع پر ہم ایک نئے محرک کو کام کرتے دیکھتے ہیں۔ انگریزوں کا منشا ولندیزوں کی طرح یہ تھا کہ مشرقی کاروبار کے واسطے گجرات سے پارچہ فراہم کریں لیکن اسی کے ساتھ وہ کمپنی کے کام کا دائرہ وسیع کرنے کے بھی آرزومند تھے کہ انگلستان و ہندوستان کے مابین براہ راست تجارت کا سلسلہ قائم ہو جائے۔ اس توسیع کی ضرورت بہت قبل، یعنی ۱۶۰۳؁ ہی سے محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ یورپ میں صرف مرچوں کی مانگ اگرچہ بہت بڑھی ہوئی رہتی تھی تاہم وہ ایسی نہ تھی کہ کبھی سیر ہی نہ ہو سکے چنانچہ جب انگریزوں اور ولندیزوں کا مال کثیر مقدار میں پہنچنے لگا تو منڈیاں گویا اٹ گئیں۔ اور چند ہی سال کے اندر بنتم کے انگریز سوداگروں کو ہدایتیں لکھی جانے لگیں کہ ہرچند خالی جہاز واپس آنے سے تو بہتر ہوگا کہ مرچ ہی بھر کر بھیج دی جائے مگر زیادہ مناسب یہی ہے کہ بجائے مرچ کے اور کوئی شے روانہ کی جائے۔ خلاصہ یہ کہ انگریزی کمپنی کا فائدہ صریحاً اس میں تھا کہ نئی ایشیائی منڈیاں تلاش کی جائیں جہاں انگریزی مصنوعات فروخت ہو سکیں اور اس کے عوض میں انگلستان کے لئے مناسب اشیا خریدی جا سکیں مگر اس غرض کے لئے جو ہدایات ۱۶۰۷؁ کے تیسرے بحری سفر کے سردار کو دی گئی تھیں، ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں تجارتی ترقی کے امکانات کا کس قدر کم علم تھا۔ حتّیٰ کہ بحر قلزم کی بندرگاہوں سے ہندوستان کی بندرگاہوں کی نسبت زیادہ فائدے کی امید سمجھی جاتی تھی اور حکم تھا کہ اگر موسم اجازت دے تو عدن میں خرید فروخت کی کوشش کی جائے اور بنتم جاتے میں خلیج کھمبائت کے متعلق صرف دریافت حال کر لیا جائے کہ وہاں بھی کاروبار کی کوئی صورت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ لیکن اگر تجارتی موسم میں عدن تک بیڑا نہ پہنچ سکے تو پھر حکم تھا کہ وہ گجرات چلا جائے اور ممکن ہو تو وہاں تجارت کا سلسلہ شروع کرے؛ غرض یہ کہ ہندوستان حقیقت میں ثانوی درجہ رکھتا تھا اور محض تاخیر ہو جانے کا سبب تھا کہ بحر قلزم کی تجارت کا وقت نکل گیا اور کپتان ہاکنس کے جہاز ہیکٹر نے اگست ۱۶۰۸؁ میں سورت کے سامنے لنگر ڈالا۔

مقامی حکام کی طرف سے ہاکنس کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا، اُسے سمجھنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ سورت میں پرتگیزوں کو کیا رتبہ حاصل تھا۔ اس شہر میں ان کی کوئی بستی یا علیحدہ زمین اور کارخانہ نہیں تھا لیکن تقریباً ایک صدی سے وہ اُس کی بحری تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ دیو اور دمان میں وہ جنگی قوت کے ساتھ جمے ہوئے تھے اور ان ہی چوکیوں سے وہ اُن تمام جہازوں سے محصول راہ داری وصول کرتے تھے جو گجرات کی بندرگاہوں سے آگے جاتے ہوں۔ صوبے سے جو مال باہر دساور جاتا تھا، اُس کا بڑا حصّہ خود پرتگیزی ساحلی بیڑے (جنھیں "قافلہ" کہتے تھے) لے جاتے تھے۔ اور اُن کے جنگی جہاز ساحل کے قریب سمندر میں پاسبانی کرتے تھے کہ انھیں مغل بادشاہوں نے بلا حفاظت چھوڑ رکھا تھا۔ مقامی حکام پرتگیز کپتانوں سے سخت خوف زدہ رہتے تھے جو وقتاً فوقتاً بندرگاہ (سورت) میں آتے اور اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو جہازوں میں آگ لگا دینے کی دھمکی دے سکتے تھے۔ قریب زمانے ہی میں ولندیزوں کو سورت میں پاؤں ٹکانے کی جو جگہ ملی تھی، وہ اُس سے محروم کئے جا چکے تھے۔ اور جب ہاکنس یہاں پہنچا تو غالباً پرتگیزوں کی مقامی توقیر انتہائی درجے پر پہنچی ہوئی تھی اور ادھر اُن کے اس مصمم ارادے میں ذرا بھی سستی نہ آئی تھی کہ یہ رتبہ برابر قائم رکھا جائے۔ ان سب باتوں کے باوجود انگریزوں کی جو مخالفت ہوئی وہ اُس سے بیدل نہ ہوئے اور جب مقامی حکام نے کہا کہ کارخانے کے قیام کی اجازت کے لئے بادشاہی منظوری درکار ہے، تو ہاکنس بکمال مستعدی سے آگرے روانہ ہو گیا کہ دربار جہانگیر میں پہنچ کر باقاعدہ تجارت کے واسطے گفت و شنید کرے۔ وہاں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہوا لیکن گفتگو میں اُس کی لن ترانیاں پرتگیزوں کی ریشہ دوانی کے مقابلے میں بے اثر ثابت ہوئیں اور طول طویل گفت و شنید کے بعد وہ بغیر اپنا مقصد بر آئے آگرے سے رخصت ہو گیا[۲]

انگریزی کمپنی کو انتظار تھا کہ ہاکنس کی کوشش کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور اس اثنا میں وہ دوسرے جہاز بھی سورت بھیجتی رہی۔ ۱۶۰۹ء میں اسینشن نامی جہاز

ساحل کے قریب آیا لیکن پایاب پانی میں ٹکرا کے ٹوٹ گیا۔ نقصان کے ساتھ اس کے جو لوگ بچ کر خشکی پر پہنچے ان میں سے بعض کی بدعنوانیوں نے بھی غالباً اُن انگریزوں کی کامیابی کی اُمیدوں میں رخنہ ڈالا، جو پہلے سے مُلک میں موجود تھے۔ ۱۶۱۱ء میں سر ہنری مڈلٹن، سورت آیا لیکن اُس وقت بھی پرتگیزوں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ دوسرے سال بسیٹ کی کسی قدر زیادہ آؤ بھگت ہوئی اور اُس نے ایک اقرار نامہ بھی کر لیا جس کی رو سے انگریزوں کو گجرات میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ ہوا کے اس طرح رُخ بدلنے کی کوئی وجہ تحریر نہیں ہے اور اہل ایشیا کی سیاسی آرا کے ردّ و بدل کے متعلق قیاس آرائی کرنا بھی مخدوش ہوا کرتا ہے لیکن بظاہر ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب بسیٹ کے جہازوں پر پرتگیزوں کے حملے ناکام رہے تو اس سے پرتگیزوں کی سطوت و شہرت پر حرف آگیا۔ مغل بادشاہوں کے پاس کوئی بحری قوت نہ تھی اور وہ پرتگیزوں کی بحری فوج کو یہ سمجھنے لگے تھے کہ اس پر کوئی حریف غالب نہیں آسکتا۔ لہٰذا اب جو انگریزوں نے اپنے سے کہیں زیادہ کثیر تعداد کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور اس میں بعض ایسی لڑائیاں بھی ہوئیں جنھیں لوگوں نے خشکی پر سے خود دیکھا، تو قرینہ کہتا ہے کہ مُغل عمّال کو ایک فرنگی قوم کو دوسری فرنگی قوم سے لڑانے کی تدبیر سوجھی تاکہ مُلک کی تجارت پر جو شکنجہ پرتگیزوں نے کس رکھا تھا، وہ ڈھیلا ہو جائے۔ بحرِ قلزم میں مڈلٹن کی سرگرمیوں نے گجرات کی جہاز رانی تک پر اثر ڈالا تھا، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہو چکا تھا کہ انگریز سمندر پر کچھ کم زور نہیں ہیں۔ دوسرے غالباً ولندیزوں کی مشرقی سمندروں میں کامیابیوں کی خبر سے بھی اب مغل حکّام کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور اُنھیں معلوم ہونے لگا تھا کہ پرتگیزی سیادت کے اب حریف و مدِّ مقابل میدان میں اُتر آئے ہیں۔ بہر حال اندرونی اسباب جو کچھ ہوں، واقعہ یہ ہے کہ بسیٹ کی مدافعت کے بعد ہی باضابطہ وہ مراسلہ اُس کے حوالے کیا گیا جو معلوم ہوا کہ بادشاہی فرمان تھا اور اُس میں اُن شرائط کی توثیق فرمائی گئی تھی جو گجرات کے مغل عہدہ داروں نے بامید منظوری اُن سے کی تھیں۔

اس فرمان کے نفاذ سے انگریزوں نے گجرات میں کارخانے بنانے کا اپنے آپ کو مجاز سمجھا اور اسی کے مطابق عمل شروع کیا لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغل ارباب سیاست جو انگریزی تجارت تو چاہتے تھے مگر مستقبل کے متعلق کسی بات کا پابند ہو جانا انھیں پسند نہ تھا، وہی جیت میں رہے اور یہ فرمان آگے چل کے کچھ زیادہ بکار آمد ثابت نہ ہوا۔ تاہم فی الوقت اس سے کام چل گیا اور انگریزوں کی سورت میں تجارت کے آغاز کو ۱۶۱۳ء ہی قرار دے سکتے ہیں[1]۔ بعد، عارضی طور پر ہی سہی، یہ قدم ٹکانے کا جو موقع ملا تھا، اس کو قوت اس طرح پہنچی کہ پرتگیزوں کی مغل حکام سے جنگ چھڑ گئی اور دو برس تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ مغلوں نے دمان کو خشکی کی طرف سے محصور کر لیا اور پرتگیزوں نے گجرات آنے جانے والے جہازوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ تا آنکہ آخر میں ایک بے نتیجہ سی صلح طے پا گئی مگر خود اسی واقعے سے پرتگیزوں کی سطوت کا تیز انحطاط زیادہ نمایاں ہو گیا اور اسی کے ساتھ، جب تک لڑائی رہی، اس وقت تک یورپ کی دوسری قوموں کے سوداگروں سے خواہ مخواہ بہتر سلوک کی صورت نکل آئی ورنہ پہلے پرتگیزی کارندے سارے ملک میں ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔

سورت میں ولندیزوں کے دوبارہ آنے کی غالباً وجہ یہ ہوئی کہ ۱۶۱۶ء میں مقامی حکام نے ان کے مچھلی پٹم کے کارخانے کو لکھا کہ فان ڈین سن نے جو تجارتی مال چھوڑا تھا، وہ ابھی تک ہماری تحویل میں ہے اور یہ خیال دلایا کہ ولندیز اس کی بازیابی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ضمناً اشارہ کیا کہ اپنی

---

[1] "لیٹرز ریسیوڈ" (جلد دوم، باب نوزدہم، ۱۸۰ و جلد چہارم، باب بست ونہم، ۳۱۱) میں فرمان میں جو کسریں تھیں، انھیں وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ سورت میں کارخانہ قائم ہو جانے پر سب سے زیادہ تعریف عموماً بیسٹ کی ہوتی تھی، لیکن جیسا کہ مسٹر فوسٹر نے جتایا ہے، ہمعصر تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ بہت کچھ ٹامس الڈورتھ نامی ایک سوداگر کے مضبوطی سے اپنی بات پر جمے رہنے سے بر آمد ہوا۔ (لیٹرز ریسیوڈ۔ دوم، ۱۳۷ - ۱۵۷)

باب دوم

مصلحت دیکھیں تو پرتگیزوں سے دیو یا دمان لے لینے کی بھی فکر کریں؛ مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ خط ولندیزوں کو گویا ایک نیم سرکاری تحریک تھی کہ بیڑا لے کر پرتگیزوں پر چڑھائی کریں اور متروکہ مال متاع کی تحویل محض ضابطے کی بات تھی[۱]۔ لیکن ولندیزوں نے اس کے یہی معنی لئے اور سال آئندہ فان راویس ٹین نامی ایک گماشتہ چند آدمیوں کے ساتھ خشکی کے راستے سورت آیا کہ وہ مال اُس کے حوالے کر دیا جائے۔ جیسا کہ خیال ہوتا ہے، مال تو بہت کم اُس کے ہاتھ آیا البتہ سیاسیات اور تجارت کے متعلق بہت سی باتیں اُسے معلوم ہوئیں خاص کر اندازہ ہوا کہ مغل حاکم پرتگیزوں کی بحری قوت سے کس قدر ڈرتے ہیں۔ خشکی کی طرف سے یورش کر کے تو وہ دمان کو فتح کرنے کی امید کر سکتے تھے لیکن جب تک سمندر کی طرف سے قلعہ والوں کو رسد پہنچتی رہے، اُس وقت تک انھیں بھوکا مارنا ممکن نہ تھا اور ادھر اس عرصے میں اُن کی اپنی بندرگاہیں پرتگیزوں کی زد میں کھلی ہوئی اور غیر محفوظ پڑی تھیں۔ ولندیزی گماشتے کو بتایا گیا کہ سمندر پر مغل لڑائی نہیں لڑتے۔ دربار بادشاہی کو بحری معاملات کی کچھ خبر نہیں ہے اور چونکہ پرتگال کے ساتھ حال ہی ایک ہنگامی مصالحت ہو گئی ہے لہٰذا غالب گمان یہ ہے کہ پرتگیز پادری پھر دربار میں پہلا سا رسوخ و اثر پیدا کر لیں گے؛ فان راویس ٹین نے گجرات میں تجارت کی ترقی کے نہایت عمدہ موقعے ہونے کا اعتراف کیا لیکن اُس کی دشواریاں بھی اُس کی سمجھ میں آ گئیں اور اُس نے اصرار کیا کہ وہاں کامیابی
۳۸ کی امید کے ساتھ کاروبار جاری کرنے سے پہلے تفصیلی قول و قرار ہو جانے ضروری ہیں۔ انگریزوں کو جو تجربہ ہوا تھا اور ۱۶۱۵ء کے آخری مہینوں میں فی الواقع اُن کی ہمت شکنی کے جیسے کچھ اسباب پیدا ہو گئے تھے، فان راویس ٹین نے

---

[۱] مغل حاکموں کی اصلی غرض کا اس خط سے بھی پتا چلتا ہے جو نومبر ۱۶۱۴ء میں نکولاس ڈونٹن نے سورت سے تحریر کیا تھا۔ اُس میں وہ تحریر کرتا ہے کہ "والیٔ سورت نے ہالینڈ والوں کو پچھلی ٹیم سے بلایا ہے اور دمان کے جب وہ فتح ہو جائے تو انھیں دینے کا وعدہ کیا ہے" (لیٹرز رسیوڈ، دوم۔ ۱۷۱)۔

انھیں پیش کیا اور اسی بنا پر طول طویل حجتیں کیں۔ سر ٹامس رو کے رسالے میں کیفیت پوری صراحت سے تحریر ہے کہ وہ بھی اسی زمانے میں جب راویس ٹین سورت میں مقیم تھا، یہاں پہنچا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی حکّام کا طرز عمل قریب قریب ناقابل برداشت تھا اور اگر اس میں تبدیلی نہ ہو تو پھر باقاعدہ تجارت کرنے کی کوئی امید نہ ہو سکتی تھی۔ رو کی دربار شاہی میں گفت و شنید سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں برآمد ہوا تاہم اُس کے رسوخ نے معاملات میں ایک نمایاں سہولت ضرور پیدا کر دی۔ انگریز گماشتے استقلال کے ساتھ خرید و فروخت کے لئے سکونت گزیں ہو گئے بعض ناگوار تجربوں کے باوجود اُن کے مقاصد حاصل ہو گئے۔ اور ادھر تو بنتم کی ضروریات بخوبی پوری ہو گئیں اور اُدھر سورت و لندن کے درمیان براہ راست تجارت سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی تھی۔

راویس ٹین کے وفد کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ولندیز بھی پورا تہیہ کر کے آ پہنچے۔ اصل میں اُن کی یہ تدبیر کہ گجرات کا مال اچین ہی میں خرید کر کام چلایا جائے، کامیاب نہ ہوئی اور ؁۱۶۱۶ء میں وہاں کی دکان بند کرنی پڑی۔ جاوا کے صدر ناظم نے فیصلہ کیا کہ سورت سے براہ راست تجارت کا سلسلہ قائم کرنا ضروری ہے گو کورومنڈل کے ولندیز گماشتوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا تھا۔ اب اسی مقصد کے لئے پائٹر فان ڈین برو کے مقرر ہوا کہ مغل حکّام سے ضروری شرطیں طے کرے۔ مشرقی سمندروں میں ولندیزوں کی روز افزوں قوت و ناموری نے برو کے کی مساعی میں سہولت پیدا کر دی اور گجرات کے حکّام سے جو مناسب شرطیں طے ہوئی تھیں اُن کی دربار شاہی سے باضابطہ توثیق ہونے میں بھی رکاوٹ نہ پیش آئی اور ؁۱۶۱۷ء میں ایک کارخانہ کھول دیا گیا۔ لیکن اوّل اوّل اس کے لئے جو سرمایہ میسّر آیا وہ بہت کم تھا لہٰذا کہیں ؁۱۶۲۱ء میں جا کر یہ کارخانہ وقعت حاصل کر سکا جب کہ فان ڈین برو کے ناظم مقیم ہو کے واپس آیا اور اس نے کمال گرمجوشی اور کامیابی کے ساتھ ولندیزی کاروبار کو پھیلانا شروع کیا۔ ہمارے پیش نظر زمانے کے باقی ماندہ حصّے میں انگریز و ولندیز پہلو بہ پہلو سورت اور گجرات کے دوسرے شہروں میں تجارت کرتے رہے۔ دونوں میں سے

کسی قوم کی کمپنی کے پاس اس علاقے میں ایسی زمین یا املاک نہ تھیں جیسی کہ کورومنڈل کے ساحل پر قلعوں وغیرہ کی صورت میں حاصل ہو گئی تھیں۔ ان کے گماشتے محض پردیسی سوداگروں کی طرح رہتے سہتے تھے اور اُن کا آسرا وہی اجازت اور شرطیں تھیں جو بادشاہی دربار سے انھیں مل گئی تھیں۔

فان ڈین بروکے کا دائرۂ عمل ایران و بحر قلزم تک کی تجارت پر حاوی تھا کیونکہ ان علاقوں کا گجرات کی منڈیوں سے بڑا تعلق تھا۔ اس زمانے میں بحر قلزم کی تجارت کا مرکز مخّہ کی بندرگاہ تھی جہاں ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کا مال آ کے بکتا تھا کہ وہاں سے لد لد کر مصر اور بحر متوسط کی بندرگاہوں کو جائے۔ ولندیز اور انگریز دونوں کو طمع ہوئی کہ اس تجارت میں حصّہ بٹائیں جس کا سبب یہ تھا کہ یہاں جو مال بکتا اُس کی قیمت زیادہ تر سونے چاندی کی صورت ہی میں ادا کی جاتی تھی کہ ان دھاتوں کی ہندوستان میں سب سے بڑھ کر مانگ تھی۔ مگر اس تگ و دو کے باوجود نتائج حسب دلخواہ برآمد نہ ہو سکے۔ مخّہ میں سیاسی اور نظم و نسق کی دشواریوں سے گہ بہ گہ سابقہ پڑتا رہتا تھا جن کے باعث کاروبار کچھ عرصے کے لئے بند کرنا پڑتا اور دوسری طرف تجربے سے ثابت ہوا کہ یہاں کی منڈی کے متعلّق بھی کوئی اطمینان اور بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ہمارے پیش نظر زمانے کے بیشتر حصّے میں یہ تجارت رُک رُک کے ہوتی رہی لیکن اسے کسی کمپنی کے بھی سب سے نفع بخش کاروبار میں شمار نہیں کر سکتے۔

خلیج فارس میں ان مغربی تاجروں کی قسمت آزمائی دوسری نوعیت رکھتی ہے۔ اس صدی کے آغاز میں ہندوستان اور خلیج فارس کی تجارت پر پرتگیز بڑے اہتمام سے نگرانی رکھتے تھے اور اسے بہت فائدے کا کام سمجھتے تھے۔ ایران سے گھوڑے، خشک میوے، عرق گلاب اور عیش و تکلف کے مختلف سامان دساور جاتے اور اشیائے درآمد میں زیادہ تر مصالحے اور سوتی کپڑے باہر سے آتے تھے۔ اور جو کمی رہ جاتی وہ ہندوستان کو چاندی بھیج کر پوری کر دی جاتی تھی۔ لیکن ایران کی سب سے نمایاں تجارتی چیز یعنی ریشم مشکل سے اس

خرید و فروخت میں آتی تھی کیونکہ جس قدر ریشم قابل برآمد ہوتا، وہ تقریباً سب کا سب برّی راستوں سے بحر متوسط تک پہنچا دیا جاتا تھا اور ہمارے زیر نظر عہد میں جو کچھ نئی صورتیں نکلیں وہ زیادہ تر اس تغیر کا نتیجہ تھیں کہ یہ تجارت خشکی کی بجائے سمندر کے راستوں سے ہونے لگی۔ اصل میں شاہ عباس کو ناپسند تھا کہ اس کے دشمن ترک، ایرانی ریشم کے ترکی علاقوں سے گزرنے کا محصول لیں اور فائدہ اٹھائیں لہذا اس نے فرنگی قوموں کو اپنے جہاز خلیج فارس میں بھیجنے پر آمادہ کیا اور اس کام میں خاصی دردسری اٹھائی۔ بالآخر انگریزوں نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور ۱۶۱۸ء کے اخیر میں ریشم کا پہلا بار جاسک سے جہازوں میں روانہ کیا گیا۔ پرتگیزوں کو اس علاقے میں جسے وہ خاص اپنا مقبوضہ سمجھتے تھے، انگریزوں کا آنا طبعاً خار گزرا اور انھوں نے اپنے دعاوی منوانے کی غرض سے ایک جنگی بیڑا ادھر بھیجا۔ مگر اس کی کچھ زیادہ پیش نہ گئی اور ۱۶۲۲ء میں ایرانی فوجوں نے پرتگیزی قلعۂ ہرمز پر فوج کشی کی تو انگریز بھی ایرانیوں کے شریک ہو گئے۔ اس لڑائی نے ہرمز کا بہ حیثیت بندرگاہ یا منڈی کے، گویا خاتمہ کر دیا اور اس کی تجارت ایرانی علاقے کے بندر گمبران میں منتقل ہو گئی، جس کا دوسرا نام بندر عباس مشہور ہے۔ ۴۰
ہرمز پر حملہ کرنے میں ولندیزوں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب یہ قلعہ مسخر ہو گیا تو انھوں نے ریشم کی تجارت میں حصہ طلب کرنے میں تاخیر نہ کی اور ۱۶۲۳ء کے بعد سے دونوں قومیں ریشم کے یورپ لے جانے میں سرگرم رہیں۔ ایک اعتبار سے یہ تجارت بہت سہل تھی کہ ریشم خالص بادشاہی مال سمجھا جاتا تھا اور فرنگی سوداگر جب تک دربار میں رسوخ رکھتے ہوں اس وقت تک توقع کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجموعی طور پر ولندیزی نیابت کا دربار میں بھی انتظام بہتر تھا لیکن بہر صورت ان کو انگریزوں پر تجارت میں ایک بڑی فوقیت یہ حاصل تھی کہ وہ ایرانی منڈیوں کو مصالحے فراہم کر سکتے تھے جس کی وہاں سب سے زیادہ مانگ تھی۔ انگریز مصالحے مہیا کرنے میں قاصر تھے۔ انھیں بار بار فروختنی سامان کافی مقدار میں آرڈر دینا پڑتا تھا۔ غرض یہ یقینی بات ہے کہ ریشم کی تجارت کا زیادہ حصہ ولندیزوں کے قبضے میں

رہا اور کچھ عرصے تک اس میں نفع بھی کثیر تھا لیکن ہمارے پیش نظر عہد کے اخیر میں یورپ کی مانگ کم ہوتی جاتی تھی اور ادھر بنگالے کا مال مقابلے کے لئے منڈی میں آنے لگا تھا۔ پس سنہ ۱۶۵۵ء تک انگریزی کمپنی نے رفتہ رفتہ ایران سے ریشم خریدنا موقوف کر دیا۔"

واضح رہے کہ نہ صرف ہندوستان کے اکثر اقطاع بلکہ آگے مغربی ممالک میں بھی تجارت کی توسیع کا مرکز سورت تھا۔ خود سورت شہر کی مصنوعات یا پیداوار کچھ بہت زیادہ قابل قدر و منزلت نہ تھیں لہذا فرنگی سوداگروں نے یہاں مستقل قیام کرتے ہی سارے گجرات یعنی احمد آباد، بڑھوچ اور بروڈہ میں اور بعض صورتوں میں دوسری جگہ بھی کوٹھیاں بنائی تھیں تاکہ نیل اور سوتی مال فراہم کرنے والوں سے براہ راست معاملہ رکھا جا سکے۔ یورپ بھیجنے کے لئے اوّل اوّل نیل سب سے "پہلی جنس" سمجھا جاتا تھا لہذا انگریز خریدار فوراً آگرے بھیجے گئے تھے کہ نواح بیانہ سے اُس کی خریداری کریں جہاں کا نیل ممالک غیر کی منڈیوں میں معروف اور گجرات کے نیل کی نسبت زیادہ خالص ہوتا تھا۔ پھر جب ولندیزوں کی تجارت کا سورت میں انتظام درست ہو گیا تو اُنھوں نے بھی آگرے میں کام شروع کرنے میں دیر نہ کی اور بہت جلد نیل کی تجارت میں سب سے پیش پیش ہو گئے۔ باوجود اس کے یہ خریدار اپنی توجہ کو صرف ایک جنس تک محدود نہ رکھتے تھے اور جس وقت یہ معلوم ہوا کہ یورپ ہندوستان کا سوتی کپڑا خریدے گا تو ان فرنگی سوداگروں نے شمالی
۴۱ ہندوستان میں کاروبار پھیلنے کے امکانات تلاش کئے چنانچہ ہم سنہ ۱۶۲۰ء ہی میں انگریز گماشتوں کا سامانہ (جو اب ریاست پٹیالہ کے علاقے میں ہے) اور پٹنے پہنچنا سنتے ہیں۔ مگر یہ دکانیں زیادہ عرصے تک قائم نہیں رکھی گئیں کیونکہ تجربے سے ظاہر ہو گیا کہ گجرات ہی یورپ کی مانگ پوری کر سکتا ہے۔ البتہ جب سنہ ۱۶۳۰ کے قحط نے (جس کی کیفیت ہم اگلے باب میں بیان کریں گے) اس صوبے کے صنعتی وسائل کو عارضی طور پر تباہ کر دیا تو شمال میں کام پھیلانا ضروری ہوا اور نواحِ آگرہ سے کثیر مقدار میں کپڑے کی خرید کی گئی اور دوسری طرف

اودھ کا مال جمع کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں ایک انگریزی کوٹھی کھولی گئی۔ سورت و آگرہ کے درمیان کے اضلاع سے فرنگی گماشتے خوب واقف تھے کیوں کہ بار بار مال لے کر اس علاقے سے گزرتے تھے اور چونکہ یہاں انھوں نے خرید و فروخت کا کوئی کارخانہ نہیں پھیلایا، اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان اضلاع میں ان کی دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ راستے بھر میں صرف برہان پور ایسا مقام تھا جہاں ان کا ایک وسطی کارخانہ قائم ہوا اور کچھ عرصے تک چلتا رہا کہ مغلیہ افواج کو جو ملک احمد نگر کی تسخیر کی غرض سے برہان پور کے مرکز پر مجتمع تھیں، باہر کا لایا ہوا مال فراہم کرتا رہے لیکن یہ بیوپار بھی اتنا باوقعت نہ ثابت ہوا کہ وہاں مستقل کارخانہ رکھنا مناسب سمجھا جاتا۔

انگریز سوداگروں کے بالکل ابتدائی مقاصد میں ایک بات یہ بھی داخل تھی کہ سندھ کی تجارت میں حصہ لگائیں۔ اس تجارت کے مرکز شہر ٹھٹھہ اور اس کی بندرگاہ لاہری (یا لہاری) تھی جہاں سے مال زیادہ تر خلیج فارس کو دساور جاتا یا ساحل ساحل جنوب میں گجرات و گوا بھیج دیا جاتا تھا۔ خلیج کی طرف سب سے بڑی کپڑے کی منڈی بصرہ میں تھی اور سندھ کی برآمدہ اشیا میں کپڑا ہی سب سے زیادہ باہر جاتا تھا۔ لاہری بندر میں جو اب بے نشان ہو گیا ہے، اس زمانے میں بھی بڑے جہاز نہیں آسکتے تھے کیونکہ اس کی کھاڑی کافی گہری نہ تھی۔ مقامی جہاز والے تعداد میں کم تھے لہٰذا زیادہ تر یہ تجارت پرتگیزوں کی ساحلی کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی جو ان دنوں "فری گیٹ" کہلاتی تھیں، ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز میں پرتگیز ہی اس علاقے کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے اور مغل حکام کے مزاج میں انھیں اتنا درخور حاصل تھا کہ سنہ ۱۶۳۵ء میں انگریزوں نے جو سب سے پہلی کوشش اس بندرگاہ میں قدم لگانے کے لئے کی، وہ انھوں نے چلنے نہ دی۔ اس موقع پر ان کی دلیل بحری یا جنگی طاقت پر مبنی نہ تھی بلکہ انھوں نے دھمکی یہ دی کہ اگر انگریزوں کو اجازت دی گئی تو ہم اس بندرگاہ کو چھوڑ دیں گے۔ اور صوبہ دار سندھ، جس کے پاس محاصل تجارت کا ٹھیکہ بھی تھا، ۴۲ اس نقصان کو جو پرتگیزوں کے چل دینے سے ہوتا، برداشت نہ کرسکا۔ اس

باب دوم

زمانے میں یہاں کی مقدار تجارت میں بظاہر مبالغہ بھی کیا جاتا تھا چنانچہ سنہ ۱۶۱۸ء میں سر تامس رو نے اطلاع دی تھی کہ "یہ اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی ظاہر کی جاتی ہے اور نہ پرتگیزوں کو اس کا دسواں حصہ بھی نفع ہوتا ہے جتنا کہ وہ جھوٹ بیان کرتے ہیں۔" اُس نے یہ بھی لکھا کہ پرتگیزوں کی زیادہ ستانی کے باعث اس تجارت کو سخت نقصان پہنچا ہے اور ایک بعد کے خط میں صراحت کی تھی کہ اس منڈی میں ہاتھی دانت کے سوا اور کسی (بیرونی) چیز کی کھپت نہیں ہو سکتی اور خود یہاں سے صرف + اچھا کپڑا اور بہت سے کھلونے" باہر کے لئے خریدے جا سکتے ہیں۔ نظر بر ایں باہر کے سوداگروں کو یہاں آنے کی زیادہ ترغیب نہ ہو سکتی تھی۔ سنہ ۱۶۳۱ء میں ولندیزوں نے یہاں قدم ٹکائے تھے مگر کاروبار کو زیادہ عرصے جاری نہ رکھا اور عملاً پرتگیزوں کی اجارہ داری سنہ ۱۶۳۵ء تک قائم رہی۔ البتہ میتھو ولڈ نے انگریزوں اور پرتگیزوں کے مابین ہندوستان میں صلح کی شرطیں طے کیں تو سندھ کی بلا شرکت غیر تجارت بھی ختم ہوئی اور اسی سال ماہ نومبر میں ایک انگریزی جہاز نے لاہری بندر کے سامنے لنگر ڈالا۔ حکام بھی اچھی طرح پیش آئے، ایک کوٹھی قائم کر لی گئی اور پھر ہمارے پیش نظر زمانے کے آخر تک تجارت کا سلسلہ قائم رہا" ولندیز چند سال بعد دوبارہ سندھ آئے اور سنہ ۱۶۵۲ء کے قریب سے باقاعدہ تجارت کرتے رہے، اگرچہ جہاں تک مجھے تحقیق ہوئی، یہ تجارت کچھ زیادہ وسیع پیمانے پر نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ سندھ ولندیزوں کیلئے اس قدر ضروری نہ تھا جس قدر انگریزوں کے لئے کیوں کہ خلیج فارس کے ساتھ یہاں کے مال کی تجارت کرنے میں ایک صورت مال آڑھیں رکھنے کی نکل آتی تھی جس سے ریشم کی برآمد کے واسطے سرمایہ بہم پہنچانے میں مدد ملتی تھی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ولندیزوں کے پاس ایران میں خریداری کا وسیلہ مصالحوں کی فروخت سے مہیا ہو جاتا تھا بحالیکہ انگریزوں کی مصالحے کی بڑی منڈیوں تک رسائی نہ تھی اور انھیں تجارت کے دوسرے وسائل سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا اور انھیں وسائل میں سندھ کی چھینٹ کی

تجارت داخل تھی جسے وہ خود ایران میں لاتے یا بصرے میں بیچ کر نقد سرمایہ بہم پہنچا لیتے تھے۔ اسی کے ساتھ انگریزوں نے سندھ کا مال لندن کی منڈی تک پہنچانے میں بھی بڑی تن دہی سے کام لیا کیوں کہ جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں سنہ ۱۶۳۰ء کے بعد سے گجرات اس کی رسد پوری نہ کر سکتا تھا حالانکہ لندن میں چھینٹ کی بڑی مقدار میں کھپت ہو جاتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود مجموعی طور پر اس علاقے کی تجارت کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ درحقیقت کسی بڑے پیمانے پر ترقی کر گئی تھی۔ سندھ غریب صوبہ تھا اور حکام کے جور و تعدی سے اُسے سخت نقصان پہنچتا تھا۔ جس قدر زمانہ گزرتا گیا اُسی قدر جہاز رانی کی مشکلات میں بھی بیشی ہوتی گئی۔ غرض سندھ کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ سورت کے اصل بیوپار میں یہ بھی ایک مفید ثانوی درجے کا معاون تھا۔ ۴۳

جانب جنوب یعنی ساحل کوکن پر کاروبار پھیلانے کی کوشش میں اتنی کامیابی بھی نہ ہوئی جس قدر مغرب کی طرف قسمت آزمائی میں ہو گئی تھی۔ اس ساحل (= کوکن) کے امکانات کا پوری طرح تجربہ کر لیا گیا تھا اور ہم انگریزی کمپنی کے گماشتوں کا مختلف زمانوں تک ڈنڈا راجپور، دابھول، اور راجاپور کی بندرگاہوں میں مقیم رہنا سنتے ہیں۔ اس سے بھی آگے جنوب میں بھٹکل، کورٹین کی "انجمن تجار"[1] کا مستقر تھا اور یہ وہ انجمن تھی جو سنہ ۱۶۳۶ء میں انگریزی کمپنی کی رقابت میں قائم کی گئی تھی۔ ولندیزوں نے وین گرلا میں جو کارخانہ قائم کیا اُس کی خاص غرض یہ تھی کہ اُن کے بیڑے جو چھٹے چھ ماہی گوآ کا محاصرہ کرتے رہتے تھے، اُن کی رسد رسانی کا انتظام ہو جایا کرے۔

---

[1] سنہ ۱۶۳۶ء سے سنہ ۱۶۴۶ء تک اس کورٹین کی انجمن کا انگریزی تاجروں کے مراسلات میں جا بہ جا بہت کچھ ذکر آتا ہے لیکن اس انجمن سے ہندوستان کی تجارت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا بجز اس کے کہ انجمن کے مقابلے نے پرانی کمپنی کے شرکا کو مزید سرمایہ فراہم کرنے میں جو دوسرے نفع آور کاموں کے لیے درکار تھا، مذبذب و متشوش کر دیا۔ اس انجمن کی داستان مطالعہ کرنی ہو تو دیکھو "انگلش فیکٹریز" پنجم، ششم وغیرہ وغیرہ۔ نیز "کورٹ منٹس"، جس میں جستہ جستہ حوالے آتے ہیں۔

اسی کے ساتھ تجارت بھی اچھی خاصی مقدار میں ہو جاتی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر زمانے کے بڑے حصّے میں ان سب بندرگاہوں میں درآمد برآمد کا سارا تعلق سلطنت بیجاپور سے تھا، اور خود یہ منڈی قابل اطمینان نہ تھی۔ اس میں قیمتی دھاتوں کے سوا اور کسی چیز کی مانگ بہت کم تھی اور اسی طرح بدل میں خود بیجاپور سے بہت کم اجناس برآمد ہو سکتی تھیں۔ ساحل کے اس حصّے پر سنہ ۱۶۵۹ کے قریب مزید توجہ کی گئی اور انگریزی کمپنی نے پوری تن دہی سے یہاں کی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن اس کے نتائج ہمارے پیش نظر زمانے کے بعد سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہاں کی سب سے بڑی تجارتی دل کشی مرچ تھی جس کی ضرورت اس لئے بڑھ گئی کہ ان دنوں بنتم و اچین سے مرچ کی فراہمی میں دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں بریں ہم جب ہندوستان کی مرچ کی مانگ ہوتی تو بیرونی تاجر طبعاً اور آگے جنوب کے علاقے یعنی کوچین و کالی کٹ کے مضافات پر نظر ڈالتے تھے۔ بلکہ کالی کٹ ہی وہ جگہ تھی کہ جب ولندیزوں نے پرتگیزوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کے سب سے مقدم مقاصد میں اس شہر میں پہنچنا بھی تھا۔ سنہ ۱۶۰۴ء میں اُنھوں نے رئیس کالی کٹ سے معاہدہ کیا کہ پرتگیزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں گے اور بعد میں دوسرے عہد و پیماں بھی ہوئے لیکن اُس وقت کسی باقاعدہ تجارت کی صورت نہ نکلی اور سنہ ۱۶۲۰ میں انگریزوں پر جو کچھ گزری، اُس کے باعث بھی یہی فیصلہ کیا گیا کہ یہاں بیوپار کرنے کی اور کوئی کوشش نہ کی جائے۔ بایں ہمہ چند سال بعد دونوں قوموں کے تاجروں نے اس ساحل پر تجارت کی اجازت حاصل کر لی جیسا کہ باب سوم میں ہم صراحت سے بیان کریں گے۔ لیکن ولندیزوں کا کوچین فتح کر کے مرچ کی تجارت کو از سرِ نو منتظم کرنا، ہمارے عہد کی حدود سے باہر ہے۔

۳۔ بنگالے میں کاروبار کا پھیلنا

اب ہمیں مشرقی ساحل ہند کی طرف پلٹنا چاہیئے جہاں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی نوآبادیاں مچھلی پٹم سے تگناپٹم کی نواح تک پھیل گئی تھیں۔

انگریزوں کی آمد کے چند سال بعد، ایک دوسری قوم یعنی اہل ڈین مارک، یہاں نمودار ہوئے اور ترنکوبار کی بندرگاہ حاصل کی اور ہمارے پیش نظر زمانے کے اخیر تک یہی مقام اُن کا مستقر رہا۔ اُن کی تجارتی سرگرمیوں کا حال مجھے باضابطہ طور پر کہیں قلمبند کیا ہوا نہیں ملا لیکن جس حد تک ولندیز اور انگریز سوداگروں کی اطلاعات سے پتا چلا، یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرمایے کی کمی سے برابر تکلیف اُٹھاتے رہے اور ہندوستان کی تجارت میں اُن کا حصّہ بہت قلیل رہا۔ ادھر ولندیزوں اور انگریزوں کی کوششیں صرف اُن ہی کارخانوں تک جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا، محدود نہ تھیں بلکہ اُن کا کاروبار ساحل کے ہر قصبے تک، جہاں واجبی قیمت پر مال مل سکے، پھیل گیا تھا۔ ولندیزوں نے ساحل سے آگے بڑھ کے گولکنڈے کے مضافات میں بھی خریداریاں کیں اور انگریزوں نے بھی اُن کی تقلید کی لیکن آگے جنوب میں مسلسل فتنہ و فساد کے باعث یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ کاروبار جاری کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ خود ساحل پر جنگ و جدال یا بدنظمی کے باعث لین دین میں فتور پڑ جانا کچھ بعید از قیاس نہ تھا۔ ہمارے عہد کے بڑے حصّے میں انتہائے جنوب کا ٹکڑا خالی چھوٹا رہا لیکن سنہ ۱۶۴۵ میں ولندیزوں نے ٹٹی کورن کے جنوب میں بمقام کائل ایک کوٹھی کھولی۔ اسی زمانے کے قریب ہم اس نواح میں انگریز سوداگروں کو بھی سوتی کپڑا اور مرچ خریدتے دیکھتے ہیں اور کچھ روز بعد اُن کی ایک کوٹھی کائل میں قائم کی جاتی ہے جو بظاہر ولندیزوں کے مقابلے ہی کے لئے کھلی تھی۔ کچھ مدت بعد ہی ولندیزوں نے نگاپٹم کا زیادہ باوقعت قصبہ بھی پرتگیزوں کے ہاتھ سے نکال لیا۔

اسی طرح مچھلی پٹم سے لے کے جنوب کی طرف تمام ساحل پر تجارت خاصی ترقی کر گئی تھی لیکن تاریخ کی اصلی دلچسپی اوپر شمال کے مقامات سے وابستہ ہے۔ بالکل شروع ہی سے ولندیزوں کو توقع تھی کہ پیگو، ارکان اور بنگالے میں لین دین کریں اور خوب فائدہ اُٹھائیں گے۔ ان میں پیگو کی نسبت،

باب دوم
۴۵

جہاں کی تجارتی اور انتظامی حالت نہایت ابتر تھی، ابتدا ہی کہا جا سکتا ہے کہ مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا اور بڑے پیمانے پر وہاں کاروبار پھیلانے میں نہ انگریز کامیاب ہوئے نہ ولندیز۔ وہاں کی انگریزی کوٹھی سے وقتاً فوقتاً خاصی امید افزا اطلاعیں بھی ملتی رہیں لیکن ۱۶۵۵ء میں بیان کیا گیا کہ وہ "بیضرورت" ہے اور سال آیندہ اُسے بند کر دیا گیا۔ بحالیکہ ایک ولندیزی اطلاع میں یہاں کی تجارت کی نسبت لکھا گیا کہ وہ مردہ ہے۔

ارکان میں ہر چند کبھی کبھی کی لڑائی سے تجارت رُک جاتی تھی، تاہم ہمارے پیش نظر سارے عہد میں ولندیزوں کے تعلقات قائم رہے۔ یہ تجارت کچھ بہت مالیت کی نہ تھی لیکن دو جنسیں خاص طور پر یہاں مہیا ہوتی تھیں۔ یعنی چاول اور غلام۔ اور جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے یہ دونوں بتاویہ میں بہت ضروری تھیں۔ لہذا ارکان کی تجارت میں ہمارے واسطے جو کچھ دلچسپی ہے وہ اسی پر مبنی ہے کہ یہ جنسیں زیادہ تر چاٹ گام سے فراہم کی جاتی تھیں۔

بنگالے میں ترغیب کے اتنے سامان جمع تھے، کہ پہلی نظر میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ساحل پر پہنچنے کے بعد انگریز و ولندیز دونوں اتنے سال تک ادھر سے غافل کیوں رہے؟ اس کا جواب مقامی حالات سے ملتا ہے کہ مُلک کی حالت ایسی ناقابل اطمینان تھی کہ امن کے ساتھ یہاں تجارت نہیں ہو سکتی تھی۔ ادھر بندرگاہوں تک پہنچنا دشوار تھا اور اُن پر پرتگیز چھائے ہوئے تھے۔ ہندوستانی وقائع نویس، عہد جہانگیر میں بنگالے کی اندرونی حالت کے متعلق بہت کم معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور انگریزی مراسلوں میں بھی صرف ایسی تجاویز کا ذکر آتا ہے جن پر عمل کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ ولندیزی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ گوپولی لٹ اور مچھلی پٹم کے (ولندیز) تاجر ممکنہ منافع سے باخبر تھے لیکن جو اخبار اُن تک پہنچتے وہ اُنھیں اُدھر قدم بڑھانے سے روکتے تھے اور اُن اخبار کا خلاصہ یہ رائے ہے جو ۱۶۲۷ء میں بتاویہ کے صدر ناظم نے ظاہر کی تھی

باب دوم

کہ مسلسل جنگ، بغاوت اور عمال کے پیہم تبادلوں کے باعث یہاں نفع آور تجارت کی کوئی امید نہیں ہے۔ کورومنڈل کے ہندی سوداگروں کے طرز عمل سے بھی ظاہر ایہی ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بنگالے کی تجارتی زندگی فی الواقع پست و مضمحل تھی۔ چنانچہ ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ ولندیز سوداگر اُن پر بھروسہ کرتے ہیں کہ بنگالے کا سامان مچھلی پٹم میں بہم پہنچائیں گے اور اُن کی یہ توقع پوری نہیں ہوتی۔ جس سے یہ نتیجہ نکالنا جائز ہوگا کہ ہندی سوداگر بھی اس کاروبار میں ہاتھ ڈالنا مفید مطلب نہیں سمجھتے تھے

۴۶

بڑی بڑی بندرگاہوں کا حال ایسا تھا کہ وہاں جانے میں تامّل و تذبذب کچھ بے سبب نہ تھا۔ بنگالے میں ہگلی اور میگھنا کی دو کھاڑیاں کام دیتی ہیں[1]۔ ان میں سے میگھنا پر چاٹ گام کے بحری قزّاق مسلّط تھے جن میں دیسی باشندے اور پرتگیز آبادکار شامل تھے اور اُن کا وسیلۂ معاش ہی تاجروں کو لوٹنا تھا۔ وہاں کا حاکم یعنی ارکان کا راجہ ان کی پشت پناہی کرتا تھا (اگرچہ کبھی کبھی اُن کی راجہ سے نااتفاقی بھی ہوجاتی تھی) اور کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اُسے اپنے پیشے کی کمائی کا ایک مقررہ حصّہ ادا کرتے تھے[2]۔

---

[1] اپنی کتاب "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" کے ضمیمہ (C) میں ہم پرتگیزی لفظ "(Porto)" کی نسبت یہ بحث کر چکے ہیں کہ کن وجوہ سے اس لفظ سے سولھویں صدی میں بنگالے کی بندرگاہیں نہیں بلکہ کھاڑیاں مراد لینی چاہئیں۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں ایک ولندیز گماشتے کی جو ارکان آیا تھا، مرسلہ کیفیت میں چاٹ گام کو "پورٹو گرینڈ کا بڑا شہر" بتایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "پورٹو گرینڈ" کے لفظ سے وہ میگھنا کی کھاڑی مراد لیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو de Jonge, III. 287) اور ہماری مذکورۂ بالا تعبیر کی یہ بہت اچھی مثال ہے۔ یہ اضافہ کردینا بے محل نہ ہوگا کہ ولندیز بعض اوقات چاٹ گام ہی کو "چھوٹا بنگالہ" لکھتے تھے لہٰذا وہ اُسے کم سے کم بنگالے کا بڑا شہر نہیں سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو Dagh Register Coromandel ۱۹ مارچ سنہ ۱۶۴۴ء و ۶ جنوری سنہ ۱۶۴۵ء)۔

[2] مسٹر کیمپوس نے "بنگالے میں پرتگیزوں" کے جو دلچسپ حالات لکھے ہیں، ان میں وہ سنہ ۱۶۰۷ء کو

ظاہر ہے کہ ان کی دست درازیوں سے جائز تجارت کو لازماً نقصان پہنچتا تھا۔ زیادہ تر اس واسطے کہ مال کے ساتھ انسان بھی بطور غنیمت پکڑ لئے اور غلام بنا کے فروخت کر دئے جاتے تھے۔ غرض، اُس زمانے میں، میگھنا اور بیرونی ممالک کے درمیان کسی اچھے پیمانے پر براہ راست تجارت ہونے کی مجھے کوئی شہادت نہیں ملی؛ دوسری یعنی ہُگلی کی کھاڑی بھی قزاقوں کی جولاں گاہ تھی اگرچہ یہاں اُن کا اتنا زور نہ تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں یہاں جہازرانی کے خطرات زیادہ اور سب کو معلوم تھے[1]۔ لہٰذا ان خطرات میں محض اس لئے پڑنا کہ سلامت رہے تو ایسی بندرگاہ تک پہنچ سکیں گے جس کی تجارت قریب قریب تمام وکمال پرتگیزوں کے ہاتھ میں تھی، کچھ بہت ترغیب کا موجب نہ ہو سکتا تھا۔ اور پرتگیزوں کے حاوی ہونے کا انگریزوں نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں سرتامس رو نے "ہندوستان کے تمام اسرار کی تہ چھاننے" پر جو تحریر لکھی، اُس میں صاف طور ۴۷ پر کہہ دیا کہ بنگالے میں کوئی بندرگاہ نہیں بجز ایسی بندرگاہوں کے جو چھوٹے جہازوں کے واسطے پرتگیزوں کے قبضے میں ہیں۔ اور دو سال بعد انگریز کارندے جو آگرے سے بڑھتے ہوئے پٹنے تک پہنچ گئے تھے، اُنھوں نے لکھا کہ "چند سال سے پرتگیز یہاں پٹنے میں تجارت کرنے لگے ہیں۔ یہ بنگالے کی تلیٹی سے اپنی کشتیوں میں آتے ہیں اور بنگالے میں ان کی دو بندرگاہیں ہیں"۔

(بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ) پرتگیزوں کی بحری قزاقی کا سال آغاز قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک انفرادی طور پر یہ قزاقی کچھ مدت پہلے سے ہوتی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سترھویں صدی کے ابتدائی سنین میں، تجارت کی یہ آفت بہت بڑھ گئی اور مغلیہ افواج کے چاٹگام فتح کرتے تک کم نہ ہوئی (کیمپوس، ۸۱ - ۸۷ - ۵۵ تا ۱۶۷) یہ قول کہ بحری قزاق ارکان کے راجہ کو لوٹ کا حصہ ادا کرتے تھے، ہم نے شہاب الدین کی تحریر سے نقل کیا ہے جس کا "سرکارز اسٹڈیز" میں ترجمہ شامل ہے صفحہ ۱۲۸ ؁

[1] میتھوولڈ ۱۶۲۰ء کے قریب کے زمانے کے احوال میں لکھتا ہے کہ "بنگالے میں ہم بالکل اجنبی ہیں۔ یہاں کے ساحل ایسے پرخطر اور ہمارے جہاز ایسے بڑے ہیں کہ ان کھڈوں اور ریتیوں میں قسمت آزمائی کرنا ممکن نہیں ہے"۔ (میتھوولڈ، ۱۰۰۴) ؁

ایک گولی (= ہگلی[۱]) اور دوسری پیپلی۔ اور وہاں اُنھیں بسنے کا اس بادشاہ نے اجازت نامہ دے دیا ہے۔ اُن کی بڑی بندرگاہ گولی ہے جہاں وہ کثیر تعداد میں ہیں"۔ ؎

میگھنا میں تجارت کی دشواریاں ہمارے سارے زمانے تک موجود رہیں۔ ولندیزی تاجر کبھی کبھی ارکان سے چاٹ گام آنکلتے تھے اور اُن کے ضمنی اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کا تجارت نہیں، بلکہ قزاقی خاص پیشہ بن گئی تھی۔ اور جو مال انھوں نے حاصل کیا، اُن کی فہرستوں سے بھی تجارت میں کسی ترقی کے آثار نہیں نظر آتے۔ ہگلی کے حالات میں یک بہ یک تبدیلی اُس وقت ہوئی جب کہ سنہ ۱۶۳۲ء میں پرتگیزی بستی برباد کر دی گئی اور اُن کا خوف دور ہوتے ہی ساحل کورومنڈل کے ہندی سوداگر وہاں کاروبار کرنے کی غرض سے چل پڑے اور اسی طرح ولندیزی اور انگریز دونوں کے جہاز شمال کی طرف روانہ ہوئے ؎

یہاں کاروبار بتدریج وسیع ہوا۔ ابتدائی کوششیں، کٹک کی نواح میں یعنی راستے پر جگہ حاصل کرنے کی غرض سے تھیں۔ کچھ دن بعد اور شمال میں یعنی پیپلی اور بالاسور کی بندرگاہوں تک جہاز آنے لگے حتّیٰ کہ سنہ ۱۶۳۴ء میں بٹاویہ سے (ولندیزوں کو) احکام پہنچ گئے کہ ہگلی سے براہ راست کاروبار کرنے کی تدبیر کریں۔ لیکن اوّل اوّل جو تجربہ یہاں ہوا، وہ کچھ حوصلہ افزا نہ تھا۔ حکومت نے دو مقامی سوداگروں کو ساری تجارت کا اجارہ دے رکھا تھا اور عمّال ولندیزوں سے اچھی طرح نہ پیش آئے۔ بنگالے کے صوبہ دار سے ڈھاکے میں جو عہد و پیمان ہوئے وہ خاصے حسب دلخواہ تھے۔ لیکن یہ بھی مقامی مشکلات پر غالب نہ آسکے اور سنہ ۱۶۳۶ء میں گماشتوں نے پیپلی چلے جانے کا فیصلہ کیا جہاں بنگالے کا مال میسر آسکتا تھا اور ہگلی کی سی زیادہ ستانی اور جور و تعدی بھی نہ تھی ؎

---

[۱] (اہل مغرب کی) ہمعصر تحریروں میں "ہگلی" کا نام عجیب عجیب اور مختلف طریق سے آتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ پر جو بحثیں ہوئی ہیں، اُن کا کچھ حال کیمپوس نے لکھا ہے۔ (۶۳ تا ۶۵) ؎

کئی سال تک انگریز اور ولندیز اسی حکمت عملی پر کار بند رہے کہ پپلی اور بالاسور میں دریا کے دہانے ہی پر مقیم رہتے اور اندرون ملک میں اپنے خریدار بھیج دیتے۔ ۴۸ انگریزوں کی یہاں سرگرمیوں کے متعلق ہماری معلومات تشنہ ہیں لیکن ان سے بھی یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ انگریز سوداگر کمپنی کے مشترکہ فوائد کے مقابلے میں اپنا ذاتی فائدہ پہلے دیکھتے تھے اور اس خطے میں اصلی رہنمائی زیادہ تر ولندیزوں ہی نے کی جن کے گماشتے دوسرے عشرے کے آغاز ہی میں پٹنے اور قاسم بازار تک پہنچ گئے تھے۔ مجھے صحیح تاریخ کی تحقیق نہیں کہ ولندیز ہگلی میں واپس کب آئے لیکن یہ ۱۶۴۵؁ و ۱۶۵۰؁ کے درمیان کا کوئی زمانہ تھا[1]۔ اس لیے کہ ۱۶۴۵ء میں ہم انھیں پپلی ہی میں کاروبار کرتے دیکھتے ہیں۔ بحالیکہ دسمبر ۱۶۵۰؁ میں انگریز گماشتوں کو جو ہگلی میں بسنے کے لئے بھیجے گئے تھے، ہدایت کی جاتی ہے کہ ولندیزوں کے قدم بہ قدم چلیں اور اُن کی بستی کے قریب ہی اپنے واسطے اراضی خرید لیں۔ یہ انگریزی کوٹھی اوائل ۱۶۵۱؁ میں قائم کی گئی اور دونوں کمپنیاں پہلو بہ پہلو تجارت کرتی رہیں لیکن ہمارے عہد کے باقی ماندہ تمام وقت میں ولندیز، منڈی پر چھائے رہے۔ وہ قاسم بازار سے کچا ریشم اور پٹنے سے شورہ خریدتے تھے اور اُن میں سے پہلی چیز کی تجارت کو فروغ دینا ان ہی کا سب سے ممتاز کارنامہ تھا۔ تھوڑی مقدار میں باریک دھاگے کا سوتی کپڑا ابھی خریدا جاتا تھا مگر بنگالے کی ململ کی یورپ کی منڈیوں میں ہنوز شہرت نہیں ہوئی تھی۔ ہگلی میں جہاز رانی کی مشکلات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور ہمارا عہد ختم ہونے تک معمول یہی رہا کہ اوپر سے مال چھوٹی کشتیوں میں لاتے اور پپلی یا بالاسور پر دوبارہ بڑے جہازوں میں منتقل کرتے تھے۔ اس طریق میں ظاہر ہے کہ بہت خرچ اٹھانا پڑتا تھا اور

---

[1] افسوس ہے کہ "داغ رجسٹر" کا سلسلہ نامکمل ہے اور ۱۶۴۵؁ سے ۱۶۵۳؁ تک کی صرف ایک جلد محفوظ رہ گئی ہے اور وہ بھی ۱۶۴۷ء کا نہایت مجمل خلاصہ ہے جس میں ہندوستان کے اخبار کا ملخص شامل نہیں ہے۔ یہ کمی کسی اور تحریر سے بھی جو میرے علم میں آئی، پوری نہیں ہوتی۔

سنہ ۱۶۶۰ء میں انگریزی کمپنی نے اجازت بھی دی کہ بحری جہاز آزمائشی طور پر دریا میں آگے بھیجے جائیں لیکن اس تجویز کا قصہ ہماری حدود زمانی سے باہر ہے۔

گزشتہ باب میں بتایا گیا ہے کہ ڈین مارک والوں کی جولاں گاہ زیادہ تر خلیج بنگالہ تھی۔ مگر ان کی اس زمانے کی سرگرمیوں کا کوئی تحریری حال مجھے نہیں ملا البتہ ٹامس بورے کا جو سنہ ۱۶۶۹ اور آئندہ سنین میں ادھر آیا ہوا تھا، بیان ہے کہ ان دنوں وہ اہل بنگالہ سے برسر جنگ تھے اور انھیں جنگ کرتے تیس سال سے زیادہ مدت گزر گئی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا وجود بھی ترقی تجارت کے راستے میں سنگ راہ ہوگا۔ بورے کی روایت یہ ہے کہ یہ ڈین مارک والے بالاسور میں آبسے تھے مگر سنہ ۱۶۴۲ کے قریب ڈین مارک سے (تجارتی مال کے) جہاز نہ پہنچے تو ۴۹ مقامی حاکم نے وہاں کے ڈین مارکی ساکنوں کو زہر دلوا دیا اور ان کا مال واسباب ضبط کرکے کوٹھی مسمار کرادی۔ پھر جو ڈین مارک کا بیڑا پہنچا تو بستی ویران پائی اور بیڑے کا سردار مجبور ہوا کہ اس واجبی شکایت کی بنا پر جنگ کا اعلان کردے۔ لیکن یہ جنگ آرائی جو ملک کی بحری تجارت کا ستیاناس کرسکتی تھی، کارگر طریق پر عمل میں نہیں لائی گئی۔ سنہ ۱۶۴۷ء میں صلح کی گفتگو جاری تھی اور تھوڑے ہی دن بعد ڈین مارکیوں کو ہگلی کے کنارے سیرام پور میں بستی کے لئے جگہ دے دی گئی۔ لیکن اس جھگڑے کی ابتدا کے متعلق اور کوئی روایت میری نظر سے نہیں گزری اور یہ زہر خورانی کا قصہ بجائے خود قرین قیاس نہیں ہے۔ لیکن اصل حقیقت جو کچھ بھی ہو ڈین مارک والوں کے بنگالے کے جہازوں پر حملہ کرنے کے ضمنی اخبار سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ صورت جنگ قائم تھی نیز یہ نتیجہ نکالنا جائز ہے کہ پرتگیزوں کا تسلط ٹوٹنے سے تجارت کو از سر نو جو فروغ ہوا اس میں مقامی مالکان جہاز اپنا واجبی حصہ پانے سے اسی لئے محروم رہ گئے کہ ڈین مارک والے ہنوز برسر جنگ تھے۔

اس باب میں جو واقعات اجمالاً جمع کئے گئے ہیں، ان سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد کے ختم ہوتے تک یورپی سوداگروں کا اثر ہندوستان کے بڑے حصّے تک وسیع ہوگیا تھا۔ سندھ سے بنگالے تک تمام سواحل پر جہاں کہیں کاروبار کے قابل جگہ تھی، وہاں ولندیز و انگریز برابر پائے جاتے تھے اور شمال کے اُن علاقوں میں بھی جنھیں آج کل بہار و صوبۂ متحدہ کہتے ہیں، اکثر مقامات میں ان کی سرگرمیاں جاری تھیں اور آگرے سے جو راستے بندرگاہوں کو جاتے تھے، اُن پر ان کی صورتیں اجنبی نہ رہی تھیں، جنوبی ہند کے اندرونی علاقوں میں وہ دور تک نہیں بڑھ سکے تھے لیکن یہ علاقے ساحل سے اتنی دور نہ تھے کہ بندرگاہوں کی دادوستد کا اثر اُن تک بالکل نہ پہنچ سکتا۔ پس یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ بہ استثنائے پنجاب، ہندوستان کا ہر قابل لحاظ حصّہ اُن جدید حالات سے جو اُسی زمانے میں رونما ہوئے، متاثر ہو رہا تھا۔ ہماری تحقیقات کا اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان حالات کی بدولت جو تجارتی تغیرات ہوئے، اُن کی نوعیت اور وسعت کا تعین کرنے کی کوشش کریں۔

باب دوم کے ماخذ

فصل اوّل

مصالحے کی مختلف منڈیوں کے کاروبار اور اُن کے
ہندوستانی بنے ہوئے کپڑے پر دارومدار کی کیفیت مطالعہ کرنی ہو
تو ولندیزوں اور انگریزوں کی سب سے ابتدائی سیاحتوں کے احوال
پڑھنے ہوں گے۔ ایک یا دو بحری سفر کرنے کے بعد راوی ان ۵۰
امور کا اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ معروف و مسلّم ہیں۔ مثلاً
ذیل کی عبارات ملاحظہ ہوں: ہوٹ مین۔ اوّل، ۲۷ تا ۱۲۲ ص
رین ویل، اوّل، ۳ و ۳۶۶ و مابعدہا ص (بنتم) دوم، ۵۰۔ (جاوا) دوم، ۲۲۰
و مابعدہا۔ (ملکا) دوم، ۱۵۸۔ (اچین) دوم، ۳۷۱۔ و مابعدہا (امبوے نا) ص و
(de Jonge) دوم، ۸۴۴۔ سوم، ۱۴۹ ص ترپ اسٹراز کورومنڈل
(=Terpstra's Koromandel) ۵۰ و مابعدہا ص ترپ اسٹراز سورت
۳۰ و ۳۵ ص پرچاس، اوّل، جز و سوم ۱۵۳ و مابعدہا۔ (اچین) ۱۶۱ و مابعدہا
(بنتم) ۱۹۴ و مابعدہا۔ (پریامن) ص فرسٹ لیٹر بک۔ ۷۳ و ۷۴ و ۷۷
و ۴۸ و ۱۳۱ و ۱۴۸ و ۲۷۴ ص لیٹرز ریسیوڈ۔ اوّل، ۱۸ و ۶۸۔ ۷۷ و مابعدہا۔
دوم، ۲۷۵ و ۳۱۴ و ۳۳۶۔ سوم، ۱۳۹ ص

مشرقی بندرگاہوں میں جہازرانی کے خطرات کا ہر جگہ ذکر
ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو پرچاس۔ اوّل، سوم، ۱۷۹ و ۱۸۰۔ چہارم، ۵۲۳ ص
لیٹرز ریسیوڈ۔ سوم، ۲۲ ص جورڈین (Jourdain) ۲۳۴ وغیرہ۔

باب دوم
کے ماخذ

بیماری یا فسادات کے باعث جو نقصان ہوتے تھے، اُن کے لئے دیکھو رین ویل، اوّل، ۱۰۱۔ اسکاٹس ڈس کورس، پرچاس، اوّل، جزو سوم وغیرہ؎ مڈلٹن، ۱۹ و مایلیہا؎

ولندیزوں کی سورت میں پہلی آمد کو ٹرپ اسٹراز سورت" (صفحہ ۱۷) میں بیان کیا ہے۔ ڈی ژونگ میں بھی بعض تحریریں اس کے متعلق موجود ہیں: دوم، ۳۹۱؎ ہیگ ٹرینس کرپٹ، دوم، جزو اوّل، ۵۔ نیز فان ویژ (Van Dijk) صفحہ ۲۹ کی مختلف عبارتوں سے بخوبی صراحت ہوتی ہے کہ کس طرح ولندیزوں نے امور ضروریہ پر توجہ مبذول کی اور اسی لئے کچھ عرصے تک گجرات کی تجارت سے تغافل کیا؎

مشرقی ساحل کے ابتدائی کارخانوں کو "ٹرپ اسٹرا کے کوروسنڈل" صفحہ ۴۳ میں بیان کیا ہے۔ پرتگیزوں کے پولی کٹ پر قبضہ پانے کا حال ہیگ و لزبن ٹرینس کرپٹس نیز فان ویژ میں درج ہے؎ مشرقی ساحل پر انگریزوں کی آمد کے لئے ملاحظہ ہو پرچاس، اوّل۔ جزو سوم ۳۱۵ و ۳۲۰ و مایلیہا۔ پولی کٹ، ارم گاؤں اور مدراس میں ان کے پہنچنے کے متعلق دیکھو انگلش فیکٹریز، جلد اوّل وغیرہ وغیرہ؎

فصل دوم

انگریزوں کے پہلے سفرِ سورت کے اسباب کا فرسٹ لیٹر بک، صفحات ۳۸ و ۱۱۴ وغیرہ سے پتا چل جاتا ہے۔ یہ بات کہ ولندیزوں کو بھی مرچ کے افراط سے منڈی میں بھر جانے سے سابقہ پڑا ڈی ژونگ سے ظاہر ہے۔ (جلد سوم، ۱۲۰) پرتگیزوں کا مصمم قصد کہ سورت میں کسی دوسری فرنگی قوم کو نہ گھسنے دیں گے، لزبن ٹرینس کرپٹس سے بخوبی روشن ہے (جلد اوّل، ۵۸۔ ۴۴۴) ہاکنس کی سرگزشت پرچاس، اوّل،

باب دوم کے ماخذ

جزو سوم میں درج ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ارلی ٹریولز، ۷۰ و مایلیہا۔ اسفنشن جہاز کی تباہی کا حال دیکھو پرچاس۔ اوّل جزو سوم ۲۰۶ و مایلیہا۔ بیسٹ کے لئے ایضاً، صفحہ ۱۲۴ مغل حکام اور پرتگیزوں کی جنگ کا انگریزی تحریروں میں جا بہ جا تذکرہ آتا ہے:۔ لیٹرز ریسیوڈ۔ سوم، صفحہ ۳۷۔ پرتگیزی نقطۂ نظر سے اس جنگ کے حالات ملاحظہ ہوں فاریا یا سوسا (Farya y Sousa) سوم، ۱۹۵۔ ولندیزوں کے گجرات میں پہنچنے کی کیفیت کے لئے ملاحظہ ہو ٹرپ اسٹراز سورت، خصوصاً ضمیمۂ ۵ و ۶۔ انگریزوں کی اُس زمانے میں حالت کے بارے میں، سب سے مستند ماخذ رو ہے۔ فان ڈین بروکے کی سرگزشت ''بگین اینڈ وورٹ گینگ'' (Begin ende Voortgangh) مندرجۂ رین ویل۔ ہفتم، ۳۸۰ و مایلیہا میں موجود ہے۔

بحرِ قلزم میں تجارت کی کیفیت کو جورڈین، ۷۷، ۱۰۳ میں صراحت سے لکھا ہے۔ نیز پرچاس۔ جلد اوّل، جزو سوم میں، مڈلٹن اور ڈاؤنٹن کی سرگزشتوں میں۔ انگریزوں کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا ہو تو انگلش فیکٹریز، جلد اوّل کے صفحہ ۹ سے مسلسل پڑھنا چاہیئے۔ ولندیزوں کی مساعی کے لئے ملاحظہ ہو ٹرپ اسٹراز سورت، صفحہ ۱۰۶ و مایلیہا۔ اور ۱۶۲۴ کے آگے سے داغ رجسٹر۔ تجارت کے ناقابلِ اطمینان ہونے کے متعلق دیکھو انگلش فیکٹریز، چہارم، ۵۹۔ ایرانیوں نے ریشم کی دساور کو منتقل کرنے کی جو کوششیں کیں وہ وقتاً فوقتاً کیلنڈر ایس۔ پی: ۴۸۶ بابت ۱۵۱۳ تا ۱۶۱۶ اور ۱۶۷ و ۲۱۰ بابت ۱۶۱۷ تا ۱۶۲۱ میں مذکور ہیں، انگریزی کاروبار کے ایران میں آغاز ہونے کے متعلق ملاحظہ ہو۔ رو، نیز انگلش فیکٹریز۔ اوّل، صفحہ ۲۵۔ دوم ۷ و مایلیہا۔ ولندیزوں کی ابتدائی تجارت کے لئے: ٹرپ اسٹراز سورت،

باب دوم کے ماخذ

۱۳۷ و مابعدہا۔ انگریزوں کا ریشم کی تجارت سے دست کش ہوجانا، انگلش فیکٹریز، دہم ۲۴ و ۶۴ و ۱۱۹ میں مذکور ہے؛

شمالی ہند میں کاروبار پھیلنے کے متعلق ملاحظہ ہوں: متعدد عبارات، لیٹرز ریسیوڈ۔ انگلش فیکٹریز، داغ رجسٹر وغیرہ۔

انگریزوں کی سندھ میں پہلی کوشش کا حال پرچاس اول، چہارم ۴۹۷ میں درج ہے اور تجارت کی مقدار پر انگلش فیکٹریز میں بحث کی گئی ہے۔ (جلد اوّل، ۲ و ۱۴۵) اسی کتاب میں ولندیزوں کے سفر ۱۶۳۱ء کی کیفیت تحریر ہے۔ جلد چہارم، ۲۰۷۔ نیز ملاحظہ ہو ہیگ ٹرینیس کرپٹس۔ اوّل، ۳۱۸؛ ۱۶۳۵ء میں انگریزی کارخانہ قائم ہونے کے لئے ملاحظہ ہو ۵۱ انگلش فیکٹریز پنجم، ۱۱۷۔ اس کتاب کی آئندہ جلدوں میں اس ملک کی دشواریوں کا جابجا تذکرہ ہے۔ اسی میں ولندیزی بستی کا ذکر ملتا ہے اور ٹیورنیر (اوّل ۳۱۳) اور منوکی (اوّل، ۵۷) بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

لندن میں سندھی مال کی بکری کے متعلق ملاحظہ ہوں: مختلف عبارات، کورٹ منٹس، مورخہ ۱۹ مئی ۱۶۴۳ء و ۸ جون ۱۶۵۸ء؛ رہا مغربی ساحل، تو انگریزی کاروبار کی کیفیت انگلش فیکٹریز کی جلد اوّل اور آئندہ حصوں میں مطالعہ کی جا سکتی ہے اور کورٹین کی انجمن تجار کا حال جلد پنجم سے شروع ہوا ہے۔ ولندیزوں کے وین گرلا کے کارخانے کے متعلق ملاحظہ ہو داغ رجسٹر ۱۶۳۷ء سے آئندہ سنین تک۔ انگریزوں کی از سرنو کوششوں کا انگلش فیکٹریز، دہم ۲۳۳-۳۵۲ و مابعدہا میں ذکر آتا ہے۔ کالی کٹ سے ولندیزوں کی گفت و شنید "بیگن اینڈ وورٹ گینگ" (رین ویل پنجم، ۲۰۔ ہفتم ۵۷ و مابعدہا) میں درج ہے اور ڈی ژونگ سوم، ۲۰۴ و ۲۰۸ میں عہدنامے نقل کردیئے ہیں۔ مشرقی ساحل سے بعد کی آمد و رفت کے متعلق ملاحظہ ہو ٹریپ اسٹرا کورومنڈل، ۱۴۶۔ کالی کٹ میں انگریزوں کی تجارت کے لئے دیکھو لیٹرز ریسیوڈ، چہارم، ششم۔ اور انگلش فیکٹریز، اوّل، ۷۶؛

باب دوم
کے ماخذ

فصل سوم

اُس زمانے میں اہل ڈین مارک کی تنگ و دو کا انگلش فیکٹریز اور داغ رجسٹر میں کہیں کہیں ذکر آجاتا ہے خصوصیت کے ساتھ ملاحظہ ہو، انگلش فیکٹریز۔ اوّل صفحات ۴۶۔ کائل اور ڈاٹی کورن کے لئے دیکھو داغ رجسٹر (کور و منڈل) بابت ۱۷ ستمبر ۱۶۴۵ء اور انگلش فیکٹریز۔ ہفتم ۲۵۲ وغیرہ۔ پیگو کا ولندیزی اور انگریزی تحریروں میں جا بہ جا ذکر آتا ہے۔ علی الخصوص ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، نہم ۱۹ وغیرہ اور داغ رجسٹر۔ ۱۶ مئی ۱۶۶۱ء۔ ارکان کا پہلا ولندیزی بیان ڈی ژوونے سوم، ۲۸۷ میں درج ہے اور بعد کی کیفیتیں جا بہ جا داغ رجسٹر میں ملتی ہیں۔

ولندیزوں کے بنگالے کے متعلق ابتدائی تفحّص کے لئے دیکھو ہیگ ٹرینس کرپٹس۔ اوّل، ۶۳ وغیرہ۔ انگریزوں کے منصوبوں کے متعلق: لیٹرز ریسیوڈ۔ چہارم، ششم۔ اور انگلش فیکٹریز اوّل، ۱۱۶۔ چاٹ گام کے بحری قزاقوں کا سب جگہ ذکر ملتا ہے۔ ان کا دلچسپ حال سرکارز اسٹڈیز، ۱۱۸ تا ۱۵۲ میں بھی تحریر ہے اور داغ رجسٹر میں ضمناً بعض حالات آجاتے ہیں۔ ہگلی پر پرتگیزوں کے حاوی ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز اوّل، ۱۴ و ۲۱۳۔ اس شہر کی تسخیر کے بعد ہندی سوداگروں نے جو ہمت دکھائی وہ ہیگ ٹرینس کرپٹس، جلد اول، ۳۱۸ میں، اور انگریزوں کی ابتدائی قسمت آزمائیاں انگلش فیکٹریز جلد چہارم و پنجم وغیرہ میں جا بہ جا تحریر ہیں۔ اور ولندیزوں کی مساعی کا حال ۱۶۳۴ء سے داغ رجسٹر میں ملتا ہے (خصوصاً ملاحظہ ہو ۸ فروری و ۱۲ جولائی ۱۶۳۶ء وغیرہ) انگریزوں کے ہگلی کے کارخانے کی کیفیت انگلش فیکٹریز میں ہے (ہشتم، ۳۳۴ وغیرہ) اس ندی میں بحری جہازوں کے آنے کے متعلق ملاحظہ ہو،

باب دوم
کے ماخذ

ایضاً، دہم، ۴۰۸؎

حکومت بنگالہ اور ڈین مارک والوں کی جنگ کے بارے میں دیکھو: بورے، ۱۸۱۔ نیز ماسٹر اول، ۳۱۸۔ اس کے آثار واخبار انگلش فیکٹریز، ہفتم وہشتم۔ اور ڈاغ رجسٹر (کورومنڈل) بابت ۶؍ مئی و ۲۹ دسمبر ۱۷۴۵ء میں بھی مل سکتے ہیں۔؎

باب سوم

ہندوستان کی تجارت خارجہ کے تغیرات

۱۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کا تجارتی مرتبہ

گزشتہ باب میں انگریزوں اور ولندیزوں کے بتدریج ہندوستان میں پھیلنے کا حال ہم نے بیان کیا۔ لیکن ان کی تجارت کی عملی حالت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تجارت کے اُن بڑے بڑے شعبوں کی عام کیفیت کا بھی ہمیں علم ہو جن میں یہ قومیں حصہ لینا چاہتی تھیں۔ ہمارے عہد کا آغاز ہوا، تو ہندوستانی مال کی مغربی یورپ میں کچھ بہت مانگ نہ تھی۔ براہ راست تجارت کی سب سے بڑی چیز ملیبار کی مرچ تھی اور اس علاقے سے بڑے پیمانے پر مرچ کا دساور جانا، زیادہ تر پرتگیزوں کی تجارتی تنظیم پر منحصر تھا اور ہندی زمینداروں کو (عمدہ پیداوار بہم پہنچانے سے) جو قدرے ترجیح حاصل تھی[۱]، اُس کا برآمد پر چنداں اثر نہ پڑتا تھا۔ نیل سے

---

[۱] لندن میں فروخت کے تحریری حالات دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملیبار کی مرچ عام طور پر سماترا کی پیداوار سے ایک یا دو آنہ فی پونڈ زیادہ قیمت پاتی تھی۔ ملاحظہ ہوں کورٹ منٹس ۸،۱۰ دسمبر ۱۶۴۶ء۔ ۲۰ ستمبر ۱۶۴۸ء وغیرہ وغیرہ۔ پرتگال میں مرچ کی درآمد شاہی اجارے میں داخل تھی اور سولھویں صدی کے اخیر میں اس کا ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا ٹھیکہ والوں کے

باب سوم

بحر متوسط کے رقبے میں کام لیتے تھے۔ لیکن مغربی یورپ میں اُس کی بہت کم مقدار درکار ہوتی تھی۔ سوتی مال کی تجارت، زیادہ سے زیادہ خردہ فروشی کے طرز پر ہوتی تھی اور دوسری اشیا کی نسبت بھی جو مغرب کو لے جاتے تھے، یہی کہہ سکتے ہیں۔ ادھر یورپ کے مال کی ہندوستان میں اتنی بھی قدر و طلب نہ تھی اور اجمالاً یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مغربی یورپ اور ہندوستان ایک دوسرے کی ضروریات کسی خاص پیمانے پر بہم پہنچانے کا کوئی کام انجام نہ دیتے تھے؛ ۵۳ لیکن ایشیا کا معاملہ بالکل دوسرا تھا اور خود ایشیائی ممالک میں ہندوستان کا سُوتی مال ناگزیر تھا۔ جنوبی ایشیا میں کپڑے کی مانگ گجرات اور مشرقی ساحل ہندوستان کے پارچہ بافوں کو برابر مصروف بکار رکھتی تھی اور ایشیائی سمندروں میں نفع کے ساتھ تجارت کرنی ہو، تو ہندوستان سے تعلق قائم رکھنا لازمی بات تھی؛

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی سب سے ممتاز خصوصیت، سونے چاندی کی کھپت تھی۔ یہ کیفیت محض وقتی یا عارضی نہ تھی سلطنت روما کے ماہرین مالیات تک کو اس بات نے اسی طرح مشوّش و پریشان کیا تھا، جس طرح کہ آج بھی بعض حلقوں میں فکر و تشویش کا موجب ہے۔ اور طامس رو کا مقولہ کہ "ایشیا کو موٹا کرنے کے لئے یورپ خون دیتا ہے" اُس زمانے کے مغربی خیالات کا یقیناً سچا مظہر ہے۔ ہندوستان میں جو قوانین رائج تھے، وہ سونا چاندی کی کھپت کے مُمِد تھے۔ یا کم سے کم یہ ہندوستان کے اقتصادی حالات کا لازمی نتیجہ تھی۔ ہندی پیداوار کے مالک اپنا مال بیچنے کے مشتاق تھے اور سوائے خاص خاص صورتوں کے، سرکاری طور پر انھیں مال باہر بھیجنے کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ دوسری طرف، ہندوستانی

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کارندے گوآ میں رہتے تھے اور جاوا یا سماترا، ہر جگہ کی مرچ ان ہی لوگوں کے ہاتھ مقررہ قیمت پر فروخت کرنے کی غرض سے گوآ لانی پڑتی تھی۔ اس سے خواہ مخواہ خرچ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس بیوپار میں کچھ نفع نہ رہا تھا۔ (دھوٹ مین۔ اوّل، ۱۰۵)؛

گاہک اتنی استطاعت نہ رکھتے تھے کہ باہر کا مال خریدیں لہذا اس کی منڈی صرف دولتمند طبقۂ اعلیٰ کے لئے جس کے افراد کی تعداد کچھ بھی نہ تھی، محدود تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ بیرونی اشیا کی مانگ اگرچہ اتنی کم بھی نہ تھی کہ ناقابل التفات سمجھی جائے، تاہم کسی طرح تجارت برآمد کے برابر نہیں ہوتی تھی اور اسی وجہ سے ولیم ہاکنس کا یہ قول بالکل صحیح تھا کہ "ہندوستان، چاندی سے مالامال ہے کیونکہ سب قومیں اپنے سکے لاتی اور اس کے عوض میں اجناس خرید کر لے جاتی ہیں اور یہ سکے ہندوستان ہی میں گڑ جاتے ہیں اور پھر باہر نہیں جاتے"۔

ہندوستان کی منڈیوں کی کوتاہی گنجائش ظاہر کرنے کے لئے خاص خاص اشیائے درآمد کے نام گنا دینا کافی ہوگا: مصالحے۔ رنگ گھوڑے۔ ہاتھی۔ کچا ریشم۔ ہاتھی دانت۔ مونگا۔ چند اور اجناس، جیسے تانبہ، سیسہ، ٹین، جست اور پارہ، اور یہ سب اتنی کم مقدار میں کہ آج کل سن کر ہنسی آتی ہے۔ پھر سامان تکلف یعنی مختلف اشیا جو محض ندرت کی وجہ سے قیمت پاتی تھیں۔ بس یہ چیزیں تھیں جن کی ہندوستان میں مانگ ہوتی اور جو سوداگر انھیں بہم نہ پہنچا سکتے اور ہندوستان میں خریداری کرنا چاہتے انھیں لامحالہ سونا چاندی بدل میں پیش کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے یہ لکھنا ضروری ہے کہ ان اشیا میں سے یورپ
۵۴ بہت کم چیزیں فراہم کر سکتا تھا۔ پارے کی کچھ مقدار لنڈن سے براہ بحر قلزم ہندوستان آتی تھی۔ لیکن چین بھی اس کی بہم رسائی کرتا تھا۔ جست اور مونگا، اونی کپڑا، ریشم، مخمل اور دوسرے کپڑے، شراب و مسکرات، شیشہ اور آئینے، پرتگیز باشندوں کے لئے بعض عمدہ اشیائے خوردنی اور کچھ متفرق مال یورپ سے لایا جاتا تھا لیکن برآمد کی مقدار کثیر ایشیا سے آتی تھی اور یورپ کے جو سوداگر ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے جانا چاہتے، انھیں پہلی دقت یہی پیش آتی کہ گھر سے جہازوں میں کیا چیز بھر کے لے جائیں کہ کچھ نفع کی صورت نکل آئے؟

تجارت برآمد کو دیکھئے تو پورے ہندوستان پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوگا کہ اس کی سب سے ممتاز جنس سوتی مال تھا جو مقدار کثیر میں ہندوستان سے دساور جاتا تھا اگرچہ خاص خاص بندرگاہوں کی تجارت بیشتر دوسری اشیا پر مشتمل تھی۔ مثلاً ملیبار کی بندرگاہیں، بڑی مقدار میں مرچ باہر بھیجتی تھیں اور اس کے سوا دوسری چیز بہت کم یہاں سے جاتی تھی۔ کھمبائت[1] اور قریب کی بندرگاہوں سے زیادہ تر نیل اور بہت سی دوسری اشیائے تجارت دساور جاتی تھیں۔ بنگالے سے چاول، شکر۔ کورومنڈل سے رنگا ہوا تاگا معقول مقدار میں پیگو بھیجا جاتا۔ دوسری قابل ذکر اشیائے برآمد میں اس قسم کے ثانوی درجے کے مصالحے داخل تھے جیسے ادرک، الائچی اور ہلدی۔ نیز بعض ادویہ، لاکھ، موتی اور ہیرے۔ لیکن ملیبار و بنگال کے سوا، جملہ برآور علاقوں میں تجارت کی بنیاد سوتی مال ہی تھا اور بیوپار کی کیفیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے چند جزئیات کا بیان کرنا ضروری ہوگا۔ خریداری کی اکثر منڈیوں کو قدامت پسند کہنا چاہئے کہ جانے پہچانے مال کے سوا، وہ اجنبی اشیا کو خریدنے سے احتراز کرتی تھیں۔ اور ہندوستان کے پیداوار والے اقطاع نے بھی ان ہی منڈیوں کی، جن میں مال جاتا تھا، ضروریات پوری کرنے کا مخصوص طور پر ذمہ لے رکھا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اشیائے برآمدہ نہایت مختلف النوع ہوتی تھیں اور چونکہ ان کی اصطلاحات جو عام بول چال میں رائج تھیں، مختلف زبانوں سے ماخوذ تھیں، لہٰذا مروجہ تجارتی محاورات واسما، اس زمانے میں حد درجے نامانوس اور پریشان کن معلوم ہوں گے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اس کثرت اسما کو چند سادہ قسموں میں محدود کر دیا جائے اور میں برآمدہ

---

[1] صحیح معنی میں کھمبائت، بندرگاہ نہ تھی کیونکہ بحری جہاز اس بستی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کی اشیائے برآمد یا تو ساحلی کشتیوں میں گوآ لے جاتے تھے یا بندرگاہوں کی ناویں انھیں گوگھا یا دیپ پہنچا دیتی تھیں اور وہاں سے وہ جہازوں میں بار کر دی جاتی تھیں۔

(پارچے) کو صرف لٹھا، ململ، اور ملبوسات یا اسبابِ تکلّف کے نام سے یاد کروں گا۔

لٹھا ہندوستان کے قریب قریب ہر حصّے میں تیار ہوتا تھا اور اُس کی اصلی غرض یہ تھی کہ خود مُلک میں کام آئے لیکن اسی کے ساتھ معقول مقدار میں دساور بھی جاتا تھا۔ یہ سادہ سوتی کپڑا تھا جسے دُھلا، بے دُھلا یا مختلف رنگ سے رنگا ہوا خرید سکتے تھے۔ معمولاً اُس کے تھان ۱۲ سے ۱۵ گز تک لمبے اور پون گز عریض ہوتے تھے اور گجرات کی منڈیوں میں اُنھیں "دُوتی" اور بافتے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[1]۔ مگر زیادہ عرض کے تھان بھی جنھیں سوداگر چوڑے بافتے کہتے تھے، پارچہ بافی کے بعض مرکزوں میں مل جاتے تھے۔ بِکری عام طور پر تھان یا کوڑی (= بیس) تھان کے حساب سے ہوتی تھی لیکن کسی کسی جگہ لٹھا بہت طویل بھی تیار کیا جاتا تھا لہٰذا وہاں گزوں کے حساب سے فروخت کرتے۔ ساحلِ کورومنڈل کا لمبا تھان سب سے زیادہ مشہور تھا مگر شمالی ہند میں لمبے تھان تیار ہوتے اور وہاں سوداگر اسے گزی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایشیا کے مختلف مُلکوں میں لٹھے کی دساور قدیم سے جاری تھی لیکن سولھویں صدی میں پرتگیزوں نے اس تجارت کو ترقی دے کے مغربی افریقہ اور نیز اپنے مقبوضات برازیل تک وسیع کر دیا تھا۔ ان دونوں علاقوں کی مانگ قریب قریب ایک سی تھی کیونکہ ساحل برازیل کی نو آبادیاں بھی زیادہ تر افریقی غلاموں پر مشتمل تھیں۔ وہاں جو لٹھا دساور جاتا اُسے عام طور سے "گی آنا کلاتھ" کہتے تھے۔ علاوہ ازیں بعض اشیائے تکلّف بھی وہاں استعمال ہوتی تھیں جو تاجروں کے خطوط میں "گی آنا کا مال"، "دسمال"، یا "حبشی کپڑے" کے نام سے مذکور ہیں۔

لٹھے اور ململ میں صرف موٹے باریک کی تفریق ہے اور بعض

---

[1] "دوتی" یقیناً ہندی لفظ دھوتی کا مرادف ہوگا۔ بافتہ بمعنی "بُنا ہوا" فارسی لفظ ہے لیکن گجرات میں اس کے اصطلاحی معنی یہ ہو گئے تھے کہ وہ لٹھا جو دھوتی کے کپڑے سے ذرا بہتر بُنا ہوا ہو۔

باب سوم

صورتوں میں مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی کپڑے کو "باریک لٹھا" کہا جائے یا اس کا "موٹی ململ" میں شمار
ہو۔ علی العموم ململ بناوٹ میں باریک اور وزن میں لٹھے سے ہلکی ہوتی تھی۔ یہ گرم ملکوں کا لباس
تھی اور بظاہر اس کی زیادہ برآمد ایران، عرب اور مصر کے لئے ہوتی تھی۔
پرتگیزوں نے اس تجارت کو شمال مغربی افریقہ میں بھی فروغ دیا جہاں یہ کپڑا
پٹکے اور عمامے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ
اس فروغ دینے سے ہندوستان میں کس حد تک جدید خرید و فروخت کی
صورت نکلی اور کس حد تک یہ وہی پرانی تجارت تھی جو مصر کے قدیم راستوں ۵۶
کی بجائے اب براہ راست ہونے لگی؛ رہی ململ تو اس کی تیاری، خاص کر
بنگالے اور دکن میں، ایک حد تک مقامی صنعت ہو گئی تھی اگرچہ باریک کپڑا
بعض اور اقطاع میں بھی مل سکتا تھا۔

ملبوسات اور اسباب تکلف کی، جس میں چھپا ہوا کپڑا، چھینٹ، رومال، لٹھے کے رنگے ہوئے چھوٹے تھان، گل بوٹے یا قدرے ریشم کے ساتھ بنے ہوئے کپڑے شامل ہیں، ایشیائی بازاروں میں بڑی مانگ تھی اور ہر منڈی کا ذوق اور پسندیدہ وضع جدا تھی۔ ولیم فنچ نے سورت سے انگلستان کو سب سے پہلی جو تجارتی کیفیت لکھ کر بھیجی[۱]، اسی میں لکھ دیا تھا کہ "پیامن (سماترا) اور بنتم و ملکا وغیرہ کے لباس و پارچہ کا حال تحریر سے باہر ہے کہ ان کی بے حساب اقسام اور نہایت مختلف قیمتیں ہیں"[۲] ڈاکٹر ٹرپ اسٹرا نے مال کی بیالیس قسمیں گنوائی ہیں جن کی ولندیزوں نے کورومنڈل کے ساحل پر ابتدائی سنین ہی میں لین دین کی۔ ۱۶۱۹ء میں سورت سے ایک انگریزی جہاز جاوا گیا تھا، اس کی فہرست میں تیس جداگانہ اشیا تحریر ہیں اور انگلش فیکٹریز کی پہلی دس جلدوں میں سوتی پارچے کے ایک سو پچاس نام درج فہرست ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے پیش نظر مقاصد کے لئے ان سب اشیا کے جاننے پہچاننے کی

---

[۱] یہ کیفیت "لیٹرز ریسیوڈ" جلد اول ۲۸ میں درج ہے۔ لکھنے والے کے دستخط موجود نہیں لیکن بظاہر مسٹر فوسٹر کا اسے فنچ سے منسوب کرنا درست ہے (ارلی ٹریولز۔ ۱۲۳۔ حاشیہ ذیلی)۔

ضرورت نہیں - یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ مختلف منڈیوں کے جداگانہ مذاق کے موافق جملہ ضروریات کچھ گجرات سے کچھ کورومنڈل اور کچھ ہندوستان کے دونوں ساحلوں سے، پوری کردی جاتی تھیں۔ اور یہ کہ گو خاص خاص اشیا کی مانگ زیادہ نہ ہو، تاہم مجموعی طور پر ملبوسات اور اسباب تکلف کی تجارت ملک میں بہت کچھ اہمیت رکھتی تھی۔

اس تجارت برآمد کی مقامی تخصیص کسی حد تک ایک جدول کے ذریعے اچھی طرح ظاہر کی جاسکتی ہے اور آیندہ نقشے میں مسلسلہ ساحلی قطاع کی بڑی بڑی بندرگاہوں کے نام لکھ کر میں نے وہ اشیا جن کی زیادہ مقدار میں برآمد ہوتی تھی اور نیز جس ملک کی طرف مال جاتا تھا، اُن کی تصریح کردی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقشے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہے وہ کسی اعتبار سے بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس مال کے علاوہ جس کی میں نے تخصیص کی ہے، قریب قریب ہر جہاز دوسری متفرق اشیا بھی ضرور بھر کر لے جاتا ہوگا۔ دوسرے اکثر بندرگاہوں سے کبھی کبھی دوسری سمتوں ۵۷ میں بھی جہاز روانہ کیے جاتے تھے۔ باایں ہمہ جب تک ولندیز اور انگریز سوداگروں کی سرگرمیاں فرق پیدا کریں، اُس وقت تک معمولی تجارت کا عام راستہ وہی تھا جو میں نے تحریر کیا ہے:-

ملخص تجارت برآمد ہندوستان
سترھویں صدی کے اوائل میں

ساحلی خطہ اور اسکی بڑی بندرگاہیں	خاص خاص اشیائے برآمد	مقام مرسل الیہ
سندھ: لاہری یا لہاری بندر	ٹھٹھا	خلیج فارس- ساحل ساحل، گوآ-
گجرات:- کھمبائت- گوگھا- دیو- سورت	سوتی مال- تانگا- نیل (و نیز حاجیوں کی آمد و رفت)	بحر قلزم- خلیج فارس- اچین- ساحل ساحل، گوآ

باب سوم

ساحلی خطہ اور اس کی بڑی بندرگاہیں	خاص خاص اشیائے برآمد	مقام مرسل الیہ
کوکن :- چول - دابھول - راجہ پور -	بیشتر لٹھا اور اسباب تکلف - کسی قدر مرچ - (نیز حاجیوں کی آمد و رفت) -	بحر قلزم - خلیج فارس - ساحل ساحل، گوآ -
گوآ :- گوآ - (بالکل حالت زوال میں تھا)	حمل و نقل - مقامی اشیائے برآمد بہت کم -	خلیج فارس - مشرقی افریقہ - لزبن - ملکا اور اس کے آگے - لنکا ۔
ملیبار :- کالی کٹ - کوچین بعض چھوٹی بندرگاہیں -	مرچ -	کوچین سے لزبن تک - کالی کٹ اور چھوٹی بندرگاہوں سے بحر قلزم تک -
ساحل جنوبی :- کوئیلن - ٹٹی کورن - نگاپٹم	لٹھا - مرچ -	بیشتر ساحل ساحل - نگاپٹم سے ملکا اور آگے تک ۔
ساحل کورومنڈل :- جنوب میں سان تھومی - پولی کٹ	اسباب تکلف - لٹھا - ململ - تانگا ۔	ملکا اور اس کے آگے - اچین - پیگو - تناسرین - ساحل ساحل گوآ اور ملیبار تک ۔
شمال میں مچھلی پٹم	〃 〃 〃 〃	ملکا اور اس کے آگے - اچین - پیگو - تناسرین - خلیج فارس - ساحل ساحل، شمال اور جنوب میں ۔
ساحل گنگلی :- وزیگاپٹم - بیملی پٹم	اجناس (چاول، روغنی تخم)	زیادہ تر ساحل ساحل ۔
بنگالہ :- ہگلی - پیپلی - بالاسور چاٹگام ۔	〃 (چاول، شکر) ململ -	پیگو - تناسرین - ملکا اور اس کے آگے - اچین - ساحل ساحل دور تک -

باب سوم ۵۸ سمندر کے ذریعے برآمد ہونے کے علاوہ، تھوڑی سی آمد و رفت مغرب کی طرف کے دو بڑی راستوں سے، براہ کابل و قندھار بھی ہوا کرتی تھی۔ اس تجارت میں فرنگی سوداگروں کا براہ راست کوئی حصہ نہ تھا لیکن قرینہ چاہتا ہے کہ اُن کی جہازرانی کے مقابلے کا کسی حد تک برّی تجارت پر بھی اثر پڑا ہوگا مثلاً اگر آگرے سے نیل خشکی کے راستوں سے سلطنت عثمانیہ کے ممالک تک جاتا تھا یا گجرات سے برّی و بحری دونوں راستوں سے جاتا تھا، اس کا بحر متوسط کی منڈیوں میں اُس نیل سے مقابلہ ہوا جو سورت سے لندن اور امسٹرڈم ہو کر ان منڈیوں میں آتا تھا۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ بری تجارت کی مقدار میں کمی آگئی اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے پیش نظر زمانے میں یہ تجارت کلیتہً موقوف نہیں ہوئی؛ قندھار کا راستہ وقتاً فوقتاً سیاسی حالات سے متاثر ہوتا تھا۔ صدی کے بالکل شروع میں تجارتی قافلوں کے اونٹوں کی تعداد جو سالانہ اس راستے سے آتے جاتے تھے، تقریباً تین ہزار بیان کی جاتی تھی، جو پانچ سو ٹن یا کچھ زیادہ وزن کے مرادف ہوئی۔ لیکن ۱۶۱۵ء کے قریب، جب پرتگیزوں کی مغل حکام سے لڑائی چھڑی اور گجرات سے جہازوں کے ایران جانے میں خلل واقع ہوا، تو اونٹوں کی تعداد چوگنی ہوگئی۔ پھر تقریباً تیس سال بعد قبضۂ قندھار کے لئے مغلوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی، تو ہم دیکھتے ہیں کہ برّی تجارت اُدھر سے ہٹ کر سمندر کے راستے ہونے لگی۔ اور اُدھر ایران کے بعض گماشتوں کے خطوط میں ضمناً اس قسم کے کلمات ملتے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ ایران کی اندرونی منڈیوں کے لئے بھی برّی اور بحری تجارت میں مقابلہ ہونے لگا تھا۔ پس جنگ و جدال کے باعث جو عارضی کمی بیشی ہوتی تھی اس سے قطع نظر کیجئے تو عجیب نہیں کہ انگریزوں اور ولندیزوں کی تجارتی سرگرمیوں نے شمال کی برّی تجارت کا کچھ حصہ سمندر کی طرف منتقل کر لیا ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ مشتبہ ہے اور حقیقت جو کچھ بھی ہو، خود تجارت کی مقدار اتنی کم ہے کہ اُس کی جزئیات میں پڑنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم نہیں ہے۔ ہندوستان کی تجارت کے اہم تغیرات سمندر کی طرف

واقع ہوئے، لہذا ہم اپنی توجہ کو صرف اس بیوپار تک محدود کر سکتے ہیں جو سواحل ہند پر ہوتا تھا؛

۲۔ قوتِ خرید کا مہیّا ہونا

ہندوستان کی بیرونی تجارت کا جو خاکہ ابھی ہماری نظر سے گزرا، اس سے بھی یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ جو فرنگی تاجر ہندوستان کا مال خریدنا چاہتے تھے انھیں ابتدا ہی میں یہ عقدہ حل کرنا پڑا کہ گجرات اور کورومنڈل کی منڈیوں میں خریداری کے لوازم یا قوتِ خرید، مہیّا کریں؛ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، ولندیزوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مصالحے کی جس تجارت کو ترقی دینے وہ ایشیا آئے تھے، اُس کے لئے ہندوستان کا سوتی مال درکار تھا لیکن ۵۹ ابھی تک یہ گُر اُن کے ہاتھ نہ آیا تھا کہ خود ہندوستان کا مال خریدنے کے لئے کیا بدل مناسب ہو گا؛ اسی طرح جب انگریز یورپ کے واسطے نیل اور لٹھا خریدنے سورت آئے تو یہی سوال پیش آیا۔ اور ایران میں ریشم کی خریداری شروع ہوئی تو یہی سوال اُٹھا کیونکہ اُس کے عوض میں بھی یا تو ہندوستان کی اشیا دی جاتی تھیں یا ایسا مال جیسے مصالحے کہ ان کی خریداری کے واسطے بھی ہندوستان ہی کی مصنوعات مطلوب تھیں۔ مشرقِ اقصیٰ کی معمولی درجے کی اجناس بھی جو یورپ دساور جاتیں، زیادہ تر ہندوستان ہی کے مال سے خریدی جا سکتی تھیں اور اجمالی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یورپ کو نہ صرف ہندوستان کے مال کے لئے بلکہ ایشیائی سمندروں کے جملہ اقطاع میں لین دین کرنے کے لئے ایسی قوتِ خرید کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں کارآمد ہو۔ اسکی صریحی تدبیر تو یہ ہوتی کہ یورپ کا مال ہندوستان میں بیچنے کے واسطے لایا جائے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ فرنگی اشیا کی ہندوستان میں مانگ اتنی کم ہے کہ یورپ کی ضروریات کو کسی طرح پورا نہیں کر سکتی۔ تو پھر تین صورتیں اور ذہن میں آتی تھیں؛ یعنی یا تو سونا چاندی بھر کر ہندوستان لایا جائے، یا ہندوستان کی منڈیوں سے

روپیہ قرض لیا جائے اور یا ایشیائی تجارت کے واسطے سرمایہ فراہم کیا جائے اور اس کا نفع، مصالحوں یا دوسری ایشیائی اجناس کی صورت میں یورپ کے حصہ داروں کو ادا ہوتا رہے۔ یہ سب مختلف صورتیں آزمائی گئیں اور ان میں کامیابی بھی کم و بیش ہوئی لیکن ہمارے پیش نظر عہد میں جس حد تک تجارت نے فروغ پایا وہ ان سب تدابیر کے اشتراک کا نتیجہ تھا۔

یہ بات تو بہت جلد معلوم ہو گئی کہ ہندوستان میں فرنگی اشیا کی کافی ضرورت اور طلب نہیں ہے۔ مغربی یورپ سے قریب قریب ہر قسم کا مال جو ممکن تھا وہ انگریز اور ولندیز سوداگر لے کر ہندوستان آئے لیکن پے در پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور تھوڑے ہی دن کے تجربے نے یورپ سے جانے والی اشیا میں سے اکثر چیزیں موقوف کرا دیں اور جو فروخت کے لئے بھیجی جاتی رہیں اُن کی مقدار بھی محدود کر دی گئی۔ مثلاً لوہے کے لے جانے میں اتفاق ہی سے کبھی نفع ہو جاتا تھا۔ ٹین، عام طور پر ملایا کے ٹین کا تجارتی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور یورپ سے (کپڑا یا) ململ لے کے ہندوستان جانا، جہاں سوتی مال کے مرکز تھے، ظاہر ہے کہ محض بیکار ہوتا۔ پھر جب ایک مرتبہ تجربہ ہو گیا تو مدت دراز تک صِرف چند خاص خاص اشیا یورپ سے بھیجی جاتی رہیں اور ان میں سے فقط بعض اشیا کی مقدار میں کمی بیشی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اجناس خوردنی اور زر نقد کے سوا، یورپ سے ایشیا جانے والے جہازوں میں فقط اُونی تھان، کچھ جست، کچھ پارہ اور زعفران، بحر متوسط کا مونگا، ساحل افریقہ کا ہاتھی دانت، ۶۰ چاقو چھُری، تلوار کے پھل، اور سامان تکلفات، جو قابل فروخت نظر آیا، بھیجا جاتا تھا اور جیسا کہ ہم نے لکھا اُس کی مجموعی قیمت مصالحے، لٹھا، ریشم اور نیل وغیرہ ایشیا کی ان چیزوں کے واسطے جن کا یورپ محتاج تھا کسی طرح اکتفا نہ کرتی تھی۔

ابتدائی تجربوں میں جہاں یہ ثابت ہوا کہ یورپ کا مال کافی مقدار میں ہندوستان میں فروخت نہیں ہو سکتا، وہیں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ سونے چاندی کی فراہمی کافی مقدار میں ہو تو ساری دشواریاں حل ہو جائیں گی کیونکہ ہندوستان نقد لے کر مال بیچنے پر ہمیشہ آمادہ رہتا تھا۔ لیکن سونے چاندی کی برآمد ان اصول کے

سراسر خلاف تھی، جو اُن دنوں مغربی یورپ کے اہل سرمایہ اور مدبرین سیاسی میں مقبول و مروّج تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ نظری اُصول زمانے کے حالات پر مبنی تھے اور عام تعصبات نے اُنھیں اور زیادہ قوت پہنچادی تھی۔ مانا کہ جو سوداگر نقد روپیہ باہر لے جانا چاہتے وہ ٹامس مُن کی تقلید میں یہ حجت پیش کر سکتے تھے کہ اگر اس برآمد کا نتیجہ یہ ہو کہ اور زیادہ زر نقد ملک میں آجائے، تو پھر روپے کا باہر لے جانا پُر از منفعت ہوگا، لیکن عام تعصب ایسی دلیلوں سے دُور نہ ہوتا تھا اور اس تعصب کا سخت لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ انگریزی کمپنی سونے چاندی کو اپنے مُلک سے صرف اُس حد تک باہر لے جاسکتی تھی جس کی منشور شاہی میں اجازت مرحمت کردی گئی تھی اور یا جس کی وقتاً فوقتاً پریوی کونسل (یعنی بادشاہی مجلس شوریٰ) سے منظوری مل جاتی تھی، اور وہ اس بات کی بھی پابند بنائی گئی تھی کہ مشرقی مال کو یورپ کی منڈیوں میں بیچ کر کم سے کم اُسی قدر روپیہ ضرور وصول کرتی رہے جتنا کہ اپنے مُلک سے باہر لے گئی تھی لیکن ان قیود کے باوجود وہ نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں ٹاور (لندن) کے صرافوں نے چاندی کی کمی کے متعلق عرضی پیش کی اور انگریزی کمپنی کے روپے باہر لے جانے کو، کمی ہوجانے کا سبب قرار دیا۔ سنہ ۱۶۲۰ء میں پھر اس بارے میں شکایت آمیز عرضیاں بادشاہی مجلس شوریٰ میں پیش ہوئیں اور دوسرے سال کمپنی کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ مُلک میں چاندی کے بافراط اندر لانے کی کیا صورتیں ہوں گی۔ سنہ ۱۶۲۲ء میں اس مضمون پر خوب رسالہ بازی اور مناقشے ہوئے اور سنہ ۱۶۲۴ء میں دارالعوام کی ایک بحث کی بنا پر باہر جانے والے جہازوں کو روک لیا گیا کیونکہ بحث کے دوران میں بعض ارکان اس قدر گرم ہوگئے تھے کہ جیسے آجکل ہنگامہ دیکھا تا ہیں گے وہ کیفیت نظر آنے لگی تھی۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر کمپنی نے انتہائی کوشش کی کہ جہاں تک ہوسکے زر نقد کم سے کم مقدار میں مُلک سے باہر جائے، تو یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ گو اصل مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا، تاہم کمپنی کی ابتدائی تاریخ کا معقول حصّہ اسی تگ و دو کی داستان ہے کہ کسی طرح انگریزی مال ایشیا کے دوسرے اقطاع میں فروخت ہو کیونکہ ۶۱ ہندوستان کی منڈیاں اسے قبول نہ کرتی تھیں۔ سنہ ۱۶۰۹-۱۰ء کی ہدایات جو جاوا کے

گماشتوں کو بھیجی گئیں، اُن میں یہی تاکید تھی کہ جس طرح ہو سکے اپنا مال، خاص کر اُونی اشیا اور دوسری انگریزی مصنوعات کو جلد فروخت کر دینا ضروری ہے "تاکہ ہم بغیر زرِ نقد کو منتقل کئے" وہ کاروبار چلا سکیں جو ہمارے مقاصد کا خاص منشا ہے۔" اسی طرح ۱۶۲۸ء میں سورت کے گماشتوں کو شکایت ہے کہ "اگر آپ کی پیہم خواہش یہ نہ ہوتی کہ زر نقد کی منتقلی کو کم کیا جائے، جس کی بنا پر ہم کو مشورہ دینا پڑا کہ تمام اشیا جو اصلی لاگت پر بک سکیں، انھیں نکال دیا جائے" تو ہاتھی دانت کی بکری میں اتنا کم نفع نہ رہتا۔ مگر اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود بھی کچھ بہت کامیابی نہ ہوئی اور کاروبار کی صورت یہی رہ گئی کہ جس قدر سونا چاندی قانونی طور پر باہر جا سکتا تھا، اُس سے تا امکان بہتر سے بہتر کام لیا جاتا رہے۔

اس معاملے میں معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ولندیزی کمپنی کی حالت کسی قدر بہتر رہی۔ کم سے کم انگریز سوداگروں کا یہی خیال تھا اور اُنھوں نے دارالعوام کی خدمت میں ایک مرتبہ جو معروضہ کیا اُس میں زور دیا تھا کہ "ہالینڈ، وینس یا جنووا کہیں کے حکام بھی روپے کی برآمد روکنے میں اس قدر سرگرم نہیں نظر آتے" اور یہ خلاف قیاس ہے کہ عرضی گزار جب تک کہ اُن کے پاس معقول ثبوت نہ موجود ہوتا، ایسی بات معرضِ تحریر میں لاتے۔ غالباً اس بارے میں ولندیزی کمپنی نے اپنے دائرے کے وسیع ہونے سے فائدہ اُٹھایا کہ اس میں جو سوداگر شریک تھے، وہ حکومت میں بہت کچھ دخل و اثر رکھتے تھے اور ان کے لئے اپنا کام نکال لینا سہل تھا، بحالیکہ اس زمانے میں لندن کی پارلیمنٹ پر انگریز تاجروں کا بہت کم اثر تھا؛ بایں ہمہ دونوں ملکوں میں، اس بارے میں جو کچھ فرق تھا وہ صرف درجے کا فرق تھا ورنہ اُس زمانے کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ روپے کی برآمد کے اس نظریے بلکہ تعصب کا ولندیزی کمپنی کے کاروبار پر بھی اثر پڑتا رہا۔ مثلاً اُن کا ایک سوداگر زور دیتا ہے کہ آگرے میں کاروبار پھیلایا جائے اور اُس کی واحد دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ اس کام میں زر نقد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یا مثلاً ایک سوداگر کو اصرار ہے کہ مخہ میں تجارت سے روپیہ فراہم کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہندوستان میں کاروبار سرسبز نہیں ہو سکتا۔

باب سوم

غرض یہ کہ روپے کی اسی قلت کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کمپنیوں کا بیوپار محدود رہ گیا اور وہ اس فکر میں رہنے لگیں کہ ان حدود سے باہر کام کرنے کے لئے دوسرے مقامات میں کاروبار شروع کریں جیسا کہ مُنخہ کے مذکورۂ بالا معاملے میں ہوا۔

اس دشواری کو دور کرنے کی چلتی ہوئی تدابیر میں سے ایک یہ تدبیر بھی تھی کہ ہندوستان سے سرمایہ قرض لیا جائے اور اس سے ولندیزوں نے کبھی کبھی اور انگریزوں نے بارہا کام لیا۔ لیکن ایسے قرض کی مقدار کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی اور ۶۲ اسی لئے شرح سود بھی بہت زیادہ ادا کرنی پڑتی تھی[۱]۔ ۱۶۲۵ء اور ۱۶۵۰ء کے درمیان سورت میں بارہ فی صدی کے قریب سود دینا پڑا اور گو اگلے دس برس میں یہ شرح کم ہو گئی اور ہم بعض معاملتوں میں اُس کی مقدار ۶ فی صدی تک اُتری ہوئی پاتے ہیں لیکن یہ کمی عارضی تھی اور ۱۶۵۹ء ہی میں ۹ فی صدی سود دینے کی آمادگی کے باوجود بہت کم قرض مہیا ہو سکا؛ مشرقی ساحل کی طرف عام شرح غالباً ۱۸ فی صدی کے لگ بھگ رہتی تھی اگرچہ ۱۶۳۰ء سے ۴۰ء تک، جب کہ انگریز سوداگروں کی ساکھ بگڑی ہوئی تھی، ان سے ۲۴ تا ۳۶ فی صدی سود تک کا مطالبہ کیا گیا؛ آگرے میں ہم ۹ سے ۴۲ تک، سندھ میں ۱۵، بنگالے میں ۳۶ اور ساحل کوکن پر ۱۳½ فی صد شرح سود کا حال پڑھتے ہیں۔ یہ شرحیں کاروبار پھیلانے کے حق میں سخت مضر تھیں اور اگر دونوں کمپنیوں نے تجربہ حاصل کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں

---

[۱] مذکورۂ متن شرحیں سالانہ ہیں۔ انگلش فیکٹریز اور داغ رجسٹر میں ماہانہ شرح کا حساب مندرج ہے جسے ہم نے سالانہ بنا کر تحریر کیا؛ ایک ولندیز گماشتے کا بیان ہے (حالات گولکنڈہ مندرجۂ بیگن اینڈ..... رین ویل ہفتم، ۵۱۰) کہ گولکنڈے کے اعلیٰ عہدہ دار خود ۴ فی صد ماہانہ سود پر روپیہ قرض دیتے اور جو لوگ زیادہ زیر بار ہوتے اُن سے ۵ فی صد لیتے تھے۔ اس قول سے بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا شرح سود عام شرح سے زیادہ نہ تھی؛ بتاویہ جرنل بابت ۱۶۴۱ء کا مؤلف یہ لکھ کر کہ ساحل کورومنڈل پر کوئی سودی قرضہ اب واجب الادا نہیں رہا، آخر میں دعا کرتا ہے کہ "خدا کرے آیندہ کمپنی اپنے ہی سرمائے سے کاروبار کر سکے!" (داغ رجسٹر۔ ۲۶ر دسمبر ۱۶۴۱ء: کورومنڈل)؛

قرض لے کر تجارت نہ کی جائے، تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ لیکن ولندیزوں کے پاس تو اتنے وسائل کثیر موجود تھے کہ عرصے تک اُنھیں ایسا قرضہ لینے سے بے نیازی رہی مگر لندن میں روپیہ فراہم کرنے کی مشکلات کے باعث انگریزی کمپنی کو ناگزیر اجازت دینی پڑی کہ خاص خاص حدود کے اندر قرضہ حاصل کیا جائے اور اُن کے گماشتوں کو ضرورت پڑی کہ کاروبار چلتا رکھنے کی خاطر کمپنی کی عائد کردہ قیود سے بعض موقعوں پر تجاوز کر جائیں۔ بایں ہمہ اس ضرورت کو پورا کرنا ہمیشہ بارِ خاطر ہوتا تھا اور زرِ نقد مہیا کرنے کا یہ طریقہ تھا بھی اس قدر گراں، کہ سوائے اشد ضرورت کے اس سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا؛

۳۔ کمپنیوں کی ایشیائی تجارت

یورپ سے مال اور زرِ نقد کی کمی پورا کرنے کی ایک شکل یہ باقی تھی کہ سرمائے کا ایک حصہ ممالک ایشیا سے باقاعدہ تجارت میں لگا دیا جائے اور اس کاروبار کو اس طرح کیا جائے کہ ہندوستان میں تجارت کے لئے روپیہ میسر آسکے اور اصل رقم روک کر صرف منافع یورپ بھیج دیا جایا کرے۔ اس طریق کار میں جو فوائد تھے، اُن کو سرٹامس رو نے بہت صراحت کے ساتھ ۶۳ بیان کیا اور لندن کے نظمائے کمپنی کو جتا دیا کہ جس قدر مال آپ جہازوں میں بھیج رہے ہیں" وہ کبھی تجارت کو نہیں چلا سکتا اور آپ کو لازماً مبادلے سے اس کو تقویت پہنچانی ہوگی" پھر کچھ روز بعد اُس نے زور دیا کہ بحرِ قلزم میں تجارت سے سرمایہ مہیا ہو سکتا ہے جو کمپنی کی ساری ہندوستانی تجارت کے لئے مکتفی ہوگا؛ ولندیزوں نے وسیع پیمانے پر اس تدبیر سے فائدہ اُٹھایا اور انگریزوں نے بھی اپنے قلیل وسائل و مواقع کے مطابق اس سے کام لیا۔ چنانچہ یہ کیفیت جو بادی النظر میں بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ سوداگر آتے تو ہیں یورپ کے لئے ایشیائی مال خریدنے اور یہاں پہنچ کر وہ خالص ایشیائی

تجارت میں مصروف ہو جاتے اور ایک بندرگاہ سے دوسری کو مال لاد لاد کر لے جاتے ہیں اور زیادہ تر کاروبار ان منڈیوں میں کرتے ہیں جہاں سے براہ راست بہت کم مال یورپ کے واسطے مل سکتا ہے، اس کا سبب یہی مذکورۂ بالا حالات ہیں؛

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہی وقتی تدبیر اُس نظام کی ایک حقیر ابتدا تھی جو بعد میں "نظام استعمار" موسوم ہوا اور اگر ولندیزوں کے نامی گرامی صدر ناظم کوئن کی رایوں پر عمل کیا جاتا تو ابتدا ہی سے یہ نظام پوری وسعت و قوت کے ساتھ وجود میں آجاتا۔ کوئن نے ضروری ہدایات کی جو یادداشت اپنے جانشین کے واسطے چھوڑی تھی اُس میں نہ صرف ایشیائی تجارت کو جاری رکھنے پر زور دیا تھا بلکہ یہ بھی تاکید تھی کہ جس قدر سرمایہ میسّر آسکے وہ پیداوار کے سب سے بڑے ذریعے (یعنی چند ہزار غلاموں کی خرید) اور کمپنی کے مقبوضات کو ترقی دینے میں صرف کیا جائے۔ "تاکہ ہمارے وطن کے مداخل میں اندرونِ مُلک تجارت و مالگزاری کا اضافہ ہو جائے" اور سالانہ زرِ نقد بھیجنے کی ضرورت رفتہ رفتہ بالکل نہ رہے[۱]۔ ولندیزوں نے ان اصول کے مطابق پیداوار کو ترقی دینے کا عملاً جزائر ملکا، جاوا اور فارموسا میں کام شروع بھی کیا لیکن ہالینڈ کے نظمائے کمپنی نے کوئن کی زیادہ اولوالعزمانہ تجاویز رد کردیں اور ہمارے پیش نظر عہد میں اُن کے کارندے بیشتر ایشیائی تجارت ۶۴ کے منافع پر ہی انحصار کئے رہے؛ انگریزوں کے قبضے میں اُن دنوں ایشیائی سمندروں کا کوئی علاقہ نہ تھا لہٰذا اُن کے معاملے میں کسی خاص استعماری منصوبہ بازی کا

---

[۱] یہ اقتباس، مذکورۂ بالا یادداشت کے اس انگریزی ملخص سے لیا گیا ہے جو کیلنڈر' ایس' پی۔ ۲۴-۱۶۲۲ء عدد ۱۴۳ میں درج ہے۔ ولندیزی زبان کے جس لفظ کا یہاں "اندرون ملک" ترجمہ کیا گیا ہے، وہ اُس زمانے کی تحریروں میں اکثر ان ہی معنی میں آیا ہے جس کے لئے ہم ایشیائی تجارت لکھتے رہے ہیں اور جو کمپنی کے اصلی کاروبار یعنی یورپ کو مال لے جانے سے بالکل جداگانہ تھا۔ استعماری حکمت عملی کو جس طرح کوئن پیش کرتا ہے، اُس کا مطالعہ "ڈی ٹرونگ" سوم، ۲۶۹، وغیرہ میں کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ پیدا نہ ہوا۔

ایشیائی تجارت میں حصہ لینے کا اصل مقصد یہ تھا کہ سونے چاندی کی مقدار زیادہ حاصل کی جائے جس سے ہندوستان میں خرید کا کام لیا جا سکے۔ لہٰذا انگریزوں اور ولندیزوں دونوں نے طبعاً وہی تدابیر اختیار کیں جن سے یہ دھاتیں بلا دقت میسر آسکیں۔ بعض جزیرے جیسے سماترا و بورنیو تھوڑی تھوڑی مقدار میں سونا فراہم کرتے تھے اور یہاں ہم فرنگی گماشتوں کو ہندوستان کا مال دے کر سونا خریدتے دیکھتے ہیں اور یہی سونا جب ہندوستان میں لایا جاتا ہے تو آمد و رفت کا نفع مل کر اصل مال سے اُس کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس طریق سے جو کچھ روپیہ ملتا تھا، وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا لیکن بحر قلزم، چین اور جاپان کی تجارت سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا، اُس کے مقابلے میں یہ نفع بہت کم تھا۔ یہ بات ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یورپی سوداگروں کا بحر قلزم کی تجارت کی طرف کھنچ کھنچ کر آنا، اس وجہ سے تھا کہ یہ تجارت زیادہ تر زر نقد کے لئے ہوتی تھی۔ مخا میں جو مصالحے اور دوسری ہندوستانی اشیا بکتی تھیں اُن کی قیمت اشرفی اور دوسرے سکوں کی صورت میں وصول ہو جاتی تھی جن سے ہندوستان کی تجارت میں کام لیتے تھے اور سخت مشکلات کا سابقہ پڑنے کے باوجود ان سوداگروں کا اڑے رہنا اس بات کی بہترین شہادت ہے کہ کاروبار کے اس شعبے کو وہ کس قدر ضروری تصور کرتے تھے۔ بایں ہمہ، واقعہ یہ ہے کہ روپے کی سب سے زیادہ فراہمی چین و جاپان ہی سے ہوتی تھی اور ان ملکوں کی تجارت کا ولندیزوں نے گویا اجارہ لے رکھا تھا چنانچہ مصالحے کے جزیروں کے قبضے کے بعد دوسرا سب سے اہم تجارتی سبب یہ تھا جس نے اُنھیں اس قدر کامیاب بنا دیا۔

اُس زمانے میں جاپان سے کثیر مقدار میں چاندی برآمد ہوتی تھی اور یہ جنس خوشی خوشی اُن اشیا کے عوض میں لے لی جاتی تھی، جن کی اس ملک کو ضرورت تھی۔ اس حقیقت سے پرتگیز سولھویں صدی میں باخبر ہو گئے تھے اور ولیم ایڈمس نے ۱۶۱۱ء میں جو خط "اپنے نامعلوم دوستوں اور ہموطنوں"

باب سوم کے نام تحریر کیا، اُس میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ خط میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ولندیزوں کے پاس یہاں ایک روپے کا جزیرہ ہے اور انھیں جزائر شرق الہند میں اپنے وطن سے روپیہ لانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ جاپان میں کثرت سے سونا چاندی موجود ہے کہ شرق الہند
۶۵ میں جہاں کہیں ضرورت پڑے، اس سے مبادلے کا کام لے لیا جائے"[1]۔ تجربے سے اس قول کی، جہاں تک کہ چاندی کا تعلق ہے، بار بار تصدیق ہوتی رہی[2]۔

---

[1] ایڈمس اس عہد کا بہت ممتاز آدمی ہے۔ اُس کے اپنے بیان کے مطابق وہ پہلے بحر متوسط کی تجارت میں کئی سال کام کرتا رہا اور بعد ازاں اُسے شوق ہوا کہ ولندیزوں کی ایشیائی تجارت سے واقفیت پیدا کرے چنانچہ ۱۵۹۸ء میں ایک بیڑے کا ناخدا بن کر ولندیزوں کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ یہ بیڑا جنوبی امریکہ کے راستے ہندوستان روانہ ہوا تھا۔ بحری سفر میں سخت مصیبتیں پیش آئیں اور بالآخر ایڈمس جاپان کے ساحل پر اُترا جہاں کچھ عرصے قید بھگتنے کے بعد بادشاہ جاپان اُس پر مہربان ہو گیا اور اسے کچھ سرکاری وظیفہ ملنے لگا پھر اسی ملک میں اس نے سکونت اختیار کر لی ۱۶۱۱ء میں جب ولندیز سوداگر اس ملک میں پہنچے تو ایڈمس ہی نے دربار میں اُن کی طرف سے معاملہ کیا اور اسی طرح بعد میں انگریز سوداگروں کے لئے گفت و شنید کی خدمت انجام دی۔ آخر میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی ملازمت میں داخل ہو گیا؛ متن میں جس خط کا اقتباس نقل کیا ہے وہ پرچاس جلد اوّل، سوم، ۱۲۵ میں چھپ گیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو لیٹرز ریسیوڈ، اوّل، ۱۴۲۔ ولندیزوں کو اُس کے مدد دینے کا حال ملاحظہ ہو رین ڈیل، ہفتم، ۱۴۹ تا

[2] اس امر کی کوئی تحریری شہادت مجھے نہیں ملی کہ زیر نظر عہد میں جاپان سے سونا ہندوستان آتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کی برآمد شیوگان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد، جبکہ بری راستے سے فراہمی کا سلسلہ درہم برہم ہوا، ۱۶۶۵ء میں (سمندر سے) شروع ہوئی چنانچہ سنہ مذکور کی ۲۵؍ اپریل کی یہ کیفیت ڈاغ رجسٹر میں تحریر ہے کہ بادشاہ جاپان نے سونے کی برآمد کی اجازت دے دی اور اسکے بعد سے ہم اس کا کم و بیش باقاعدہ ساحل کورومنڈل کو بھیجا جانا سنتے ہیں؛ ۱۶۶۱ء کے اخیر میں سورت کے انگریز گماشتوں نے بھی ولندیزوں کی جاپان کی چاندی اور چین کے سونے کا ذکر کیا ہے۔ (انگلش فیکٹریز، ششم ۲۷۹) ع

اور ولندیزدں کو معلوم ہو گیا کہ اگر وہ جاپانی منڈیوں کے واسطے مناسب اشیا فراہم کر سکیں تو انھیں زر نقد کی جس قدر ضرورت پڑے گی، وہ چاندی کی صورت میں یہیں سے مہیا ہو جائے گا۔ لیکن جاپانی منڈیوں کا ذوق سب سے جداگانہ اور بہت خاص قسم کا تھا۔ یہاں یورپ کی چیزیں بہت کم مقدار میں بکتی تھیں اور ہندوستان کا سوتی کپڑا ابھی محض عجیب شے سمجھ کر خریدا جاتا تھا۔ مصالحوں کی بھی کچھ زیادہ مانگ نہ تھی۔ پس، جاپان سے چاندی لینی ہو تو ریشم، چمڑا اور کھال لانے کی ضرورت تھی۔ یہ سب چیزیں بیشتر سیام سے ملتی تھیں اور سیام میں ہندوستان کا سوتی مال ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ غرض یہ کاروبار وسیع پیمانے پر اس طرح چلنے لگا تھا کہ ہندوستان کا سوتی مال، سیام۔ وہاں کی کھالیں اور چمڑا، جاپان، اور جاپان کی چاندی، ہندوستان لائی جاتی تھی۔ ہمارے پیش نظر زمانے کے آخری حصے میں، ہندوستان سے براہ راست بھی کھالیں جاپان لے جانے لگے تھے جیسا کہ آیندہ کسی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا

لیکن اصلی فراہمی جاپان کے لئے برابر سیام ہی کی منڈیوں سے ہوتی رہی گو

مگر جاپان کی بڑی مانگ کچے ریشم کی تھی۔ اس جنس کی فراہمی شروع میں چینی سوداگروں کے ہاتھ میں تھی اور ولندیزوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت جاپان، چین سے بلا واسطہ تجارت کی تامین و حفاظت کرتی ہے۔ پس خود چین سے اُن کا علانیہ ریشم خرید کر لانا تو ممکن نہ تھا البتہ ہند چینی سے لا سکتے تھے اور وہ وہیں سے لانے لگے کہ ہندوستان کے سوتی مال اور مصالحوں یا دوسری اشیا کے بدل میں وہاں ریشم مل جاتا تھا۔ اور خود یہ مصالحے وغیرہ ان ہی اشیا کے عوض میں، جنھیں پہلے سے خرید لیا جاتا تھا، فراہم ہو جاتے تھے۔ وہ ایرانی ریشم بھی لے گئے تھے مگر یہ تجارت ۶۶ آگے نہ چلی اور اس شعبے میں ولندیزدں کی سب سے بڑی کامیابی یہی تھی کہ اُنھوں نے بنگالے کے کچے ریشم کا راستہ جاپانی منڈیوں میں پیدا کر دیا۔ اس کارنامے کے تفصیلی حالات کا ہمیں پتا نہیں چل سکا کیونکہ ان ضروری تفصیلوں کے رسائل تباہ و گم ہو گئے ہیں۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اس ریشم کا نمونہ تو بہت پہلے یعنی ۱۶۱۲ء ہی میں

بھیج دیا گیا تھا اور اسی سال میں گماشتوں نے اطلاع دے دی تھی کہ بنگال کا ریشم جاپانی منڈی کے موافق حال ثابت نہیں ہوا کیونکہ موٹا، ناہموار اور اسی کے ساتھ بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۶۴۶ تک کے رسائل میں اس تجارت کا کوئی ذکر نہیں آتا لیکن پھر سنہ ۱۶۵۳ میں جہاں سے ان کا سلسلہ دوبارہ دستیاب ہوتا ہے، ہم اس تجارت کو زور شور سے جاری پاتے ہیں چنانچہ اس سال ایک پورا جہاز قریب قریب تمام تر بنگالے کا ریشم ہی بھر کر بھیجا جاتا ہے اور بعد کے داخلے بھی یہی داستان سناتے ہیں۔ سولھویں صدی میں اس قسم کی تجارت کا کہیں نشان تک نہیں پایا جاتا اور بنگالے کے مال کی نکاسی کے اس نئے راستے کو قطعی طور پر ولندیزوں کی کارگزاری سمجھنا چاہیئے۔

اس طرح جاپان سے تو چاندی مل جاتی تھی۔ چین اور ہند چینی سے سونا آتا تھا جہاں کے تاجر، مرچ، صندل، رنگ دینے والی اشیا اور دوسری ایشیائی اجناس کے عوض میں (جو تقریباً سب کی سب ہندوستان کی سوتی مصنوعات دے کر خریدی جاتی تھیں) خوشی سے سونا دیتے اور دے سکتے تھے۔ اس تجارت کا مرکز فارموسا میں تیوان کی ولندیزی بستی تھی اور اسی کے ناظم کے تحت میں جاپان کا ولندیزی کارخانہ رہتا تھا لہذا ہندوستان کو سونے چاندی کی رسد رسانی زیادہ تر اسی کے توسط سے ہونے لگی۔ حتی کہ ہمارے زیر نظر عہد کے آخری نصف میں ولندیزوں کی ہندوستانی ضروریات کا بیشتر حصہ براہ راست تیوان سے مہیا ہوتا تھا۔ یعنی یہیں سے سونا، کورومنڈل اور چاندی گجرات اور بنگالے کو لے جاتے تھے اور اسی نسبت سے ان اشیا کی یورپ سے طلب گھٹ گئی تھی[۱]۔ اس طرح ان کے

---

[۱] مثال کے طور پر سنہ ۱۶۴۴ء میں سورت اور کورومنڈل سے تیوان کو جو مال بھیجا گیا اُس کا مطلوبہ بیس لاکھ مہر طلائی (Guilders) تھا اور دوسرے سال صرف سورت نے دس لاکھ مہریں طلب کیں (داغ رجسٹر، ۶ دسمبر سنہ ۱۶۴۰ و ۳۱ جولائی سنہ ۱۶۴۱ء) اور صرف

باب سوم

کاروبار کی نوعیت ہی بدل گئی - آغاز تو یورپ کے لئے مصالحے خریدنے سے ہوا تھا اور اب رفتہ رفتہ وہ ایشیائی سمندروں میں تجارت کی ہر اہم شاخ میں مصروف بکار نظر آنے لگے اور اُن کے بیوپار کا مقصد یہ ہو گیا کہ زیادہ سے زیادہ (۶۷) مقدار میں سونا چاندی لالا کے ہندوستان میں بھریں کیونکہ یہاں کی اشیا کافی مقدار میں صرف سونا چاندی کے عوض حاصل ہو سکتی تھیں؛ انگریز سوداگروں نے بھی جہاں تک ہو سکا یہی طریقہ اختیار کیا لیکن مشرق اقصیٰ میں انھیں رسائی نہ مل سکی اور اسی لئے وہ ان مواقع سے محروم رہ گئے جن سے ولندیزوں نے ایسا اچھا کام لیا - نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے پیش نظر پورے عہد میں، ایشیائی تجارت میں اُن کا حصّہ بہت کم وقعت رہا - انگریزوں کا لے دے کے بڑا کام یہ تھا کہ ہندوستان اور یورپ کے مابین بلا واسطہ تجارت کو فروغ دیں بحالیکہ اُن کے حریف نہ صرف اس میدان میں اُن کے برابر کامیاب تھے بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی قابلیت رکھتے تھے کہ ہندوستان کے مال کی کہیں زیادہ مقدار میں تقسیم کریں اور اس کے ضمن میں تمام جنوبی ایشیا کی تجارت میں دخیل ہو جائیں[1]؛

۴ - تجارت درآمد کی رفتار میں تغیر

ہندوستان کے فوائد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جن تجارتی سرگرمیوں کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، یہ دو قسموں میں منقسم ہو جاتی ہیں: ایک طرف تو ولندیزا اور انگریز سوداگر ہندوستان اور مغربی یورپ کے مابین ایک نیا سیدھا

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ یہ رقم اُس پوری رقم کے مساوی ہے جو اس زمانے میں ولندیز ایشیائی ضرورتوں کے لئے ہالینڈ سے منگواتے تھے (ریالیا، سوم) .. Vaderlandse Gled Eysh

[1] سنہ ۱۶۵۸ء میں انگریزی کمپنی نے گی آنا کمپنی کہ خرید لیا کہ آفریقہ کا سونے کا ریزہ اور ہاتھی دانت براہ راست ہندوستان بھیجے اور اس طرح سونے چاندی کی فراہمی کا گویا ایک نیا ذریعہ نکالا - لیکن یہ قصّہ ہمارے عہد کی حدود سے باہر ہے (دیکھو انگلش فیکٹریز، دہم ۱۷۱ وغیرہ)

تجارت کا راستہ نکالتے ہیں اور دوسری طرف خود ایشیا اور مشرقی افریقہ کے سواحل سے جو تجارت قدیم سے ہوتی تھی، اُس کی روش میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ اس باب کی ما بقی فصلوں میں ہم پہلے تو اُن تغیرات کا اندازہ کریں گے جو مختلف اسباب و وجوہ سے تجارت درآمد میں واقع ہوئے پھر اُن تغیرات کا، جو ممالک ایشیا کے ساتھ ہندوستان کی تجارت برآمد میں ہوئے اور آخر میں یہ دیکھیں گے کہ ان تغیرات کا ہندوستان کی جہاز سازی پر کیا اثر پڑا۔ مغربی یورپ سے تجارت برآمد کا تعلق قائم کرنا، بجائے خود ایسی اہم صورت کا رونما ہونا تھا، کہ اس کے واسطے ایک علٰحدہ باب کی ضرورت پڑے گی۔[عہ]

جہاں تک اشیائے درآمد کا تعلق ہے، بہت کم تبدیلیاں قابل تحریر ہیں۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کوئی نئی ضرورت (ہندوستان میں) پیدا ہوئی یا غیر ملکی اشیا کی کھپت میں کوئی خاص بیشی ہوئی اور موازنہ کیا جائے تو یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہوگا کہ مجموعی طور پر اہل ہند کو زمانۂ سابق کی نسبت اب زیادہ ۶۸ اچھی طرح سامان مہیا ہونے لگا ہے۔ اشیائے برآمد میں جو کچھ بیشی ہوئی اُس کا معاوضہ قریب قریب کلیتہً سونے چاندی میں (ہندوستان کو) وصول ہوتا تھا اور صرف ایک شے برآمد میں بڑھی بھی (یعنی جاپان کا تانبہ، جو شمالی ہند میں جانے لگا تھا) تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ اس کا خرچ زیادہ ہونے لگا تھا، بلکہ جہاں تک معلوم ہوا، یہ محض مقامی وسائل رسد میں جو کمی آگئی تھی، اُسے پورا کرنے کی کوشش تھی۔ البتہ اس تبدیلی سے خاص طور پر جو اثر مطالعہ کرنے کے قابل ہے، وہ رائج الوقت سکوں کے متعلق ہے لیکن اس بحث کو ہم سر دست ملتوی کر سکتے ہیں اور اس سے قطع نظر کر لیجئے تو اُس زمانے کے تجارتی مکاتیب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ضروریات بحیثیت مجموعی وہی رہیں جیسی کہ زمانۂ سابق میں تھیں اور

[عہ] اس قول کی مثالیں باب پنجم میں ملیں گی، جہاں منڈیوں کی کیفیت دکھائی ہے۔ ایسی اشیا کی جیسے پارہ یا لونگ قیمتوں میں غیر معمولی اُتار چڑھاؤ نظر آتے ہیں، اسی لئے بعض اوقات گاہک فائدے میں اور بعض اوقات خسارے میں رہتے تھے اور یہ مشکل سے ممکن ہے کہ نفع نقصان کا ٹھیک ٹھیک موازنہ کیا جاسکے۔

اُن کی فراہمی بدستور ہوتی رہی (یورپ کے سوداگروں کے آجانے سے) بعض اشیا کی قیمتیں ارزاں ہوگئیں اور بعض کی گراں ہوگئیں۔ بعض اشیا نئے ذرائع سے ورنہ عموماً اُن ہی قدیم ذرائع سے بہم پہنچتی رہیں، ہاں دولتمندوں کو پہلے سے زیادہ آسانیاں میسر آگئیں کہ اُس زمانے میں جو نئی اور نادر چیزوں کا شوق چل نکلا تھا، اُسے حسب دلخواہ پورا کر لیا کریں۔ اس قسم کی نئی چیزوں کو انگریز سوداگر ”کھلونوں“ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اُن کے کاروبار کی اس شاخ کے واسطے یہ نام واقعی مناسب تھا۔

یہ ”کھلونوں“ کی تجارت خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے کیونکہ گو اُس کا پیمانہ وسیع نہ تھا نہ یہ کچھ بہت نفع بخش تھی، بایں ہمہ اس عہد کی تجارت کی ایک ضروری مد تھی۔ اصل میں بیرونی سوداگروں کی بغیر حکام کی نظر عنایت کے کوئی پرسش نہ ہوتی تھی۔ نہ بغیر مناسب تحفہ تحائف کے کوئی عرضی دی جا سکتی تھی اور ان دنوں گویا یہ دستور ہو گیا تھا کہ تحفے میں زیادہ تر اسی قسم کے ”کھلونے“ نذر کئے جائیں۔ پس یورپ کی کمپنیوں کو اس غرض کے لئے لازم تھا کہ اپنے سوداگروں کو ضروری سامان بہم پہنچاتی رہیں۔ اس کے لئے مشرق اقصیٰ کی منڈیاں بھی ڈھونڈنی پڑتی تھیں اور پیش نظر عہد کی تجارتی مراسلت میں ہم بار بار اس موضوع کا ذکر پڑھتے ہیں۔ بعض ”کھلونے“ دوسروں کے لئے باہر سے لائے جاتے تھے کہ وہ اُنھیں خرید کر اپنے تحفوں میں پیش کریں اور بہت سے خود یہ فرنگی سوداگر نذر دیا کرتے تھے۔ مگر دونوں صورتوں میں ہندوستانی رؤسا اور اُن کے حاشیہ نشینوں کے ذوق کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ اسی ذوق سے یہ مانگ پیدا ہوئی تھی اور اس مانگ کی نوعیت بتانے کے لئے چند مثالیں لکھنا کافی ہوگا۔ سنہ ۱۶۰۹ء میں مغلیہ سلطنت (ہند) کی تجارت کے متعلق سب سے پہلی انگریزی کیفیت سورت میں مرتب کی گئی تھی۔ اس میں باقاعدہ اشیائے برآمد جیسے اُونی سامان، سیماب، زعفران، سیسہ، ٹین، ہاتھی دانت، (۶۹)
مرجان، اور تلوار کے پھل گنانے کے بعد یہ عبارت تحریر ہے:۔

”نئی قسم کے ساغر، شیرینی کی قابیں، لیکن سب سے بڑھ کر ہر قسم و قیمت کے

آئینے (بشرطیکہ بالکل کھلونے نہ ہوں) معقول مقدار میں خوب فائدے سے بک جائیں گے۔ حقیقت میں میرا گمان ہے کہ کوئی اچھا بڑا آئینہ ہو تو یہ بادشاہ (جہانگیر) خوشی سے قبول کرلے گا، کیونکہ وہ کسی چیز کی قیمت کا خیال نہیں کرتا بلکہ ہر شے میں ندرت کا جویا ہے حتیٰ کہ اگر نئی وضع کے خوبصورت کھلونے بھی پیش کیے جائیں تو خواہ وہ کم قیمت ہی کیوں نہ ہوں، اُسے پسند آتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی دولت یا بیش بہا چیز کی اُسے ضرورت نہیں۔ وہ بے شمار دولت کا خود مالک ہے“

تزک جہانگیری کا جس نے مطالعہ کیا ہے وہ اس قول کی تصدیق کریگا۔ یہ سچ ہے کہ کیفیت نگار نے جس قدر بیان کیا ہے شہنشاہ اس سے زیادہ اصل قیمت کا لحاظ کرتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اُسے نُدرت ہی کی تلاش رہتی تھی۔ چند سال بعد ولندیزی گماشتے فان راویسٹین نے بھی یہی قصہ دُہرایا ہے کہ ہر قسم کے نوادر بھیجے جائیں، ”خاص کر شہنشاہ کے واسطے“۔ مناظر و مشاہیر کے مرقعے، قد آدم آئینے جن کے چوکھٹوں پر عمدہ نقش ہوں، ”عمدہ تازی اور دوسری قسم کے مضبوط کتے جو شیر کو قابو میں لاسکیں“ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ پھر شہنشاہ کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ ”ہر طرح کی نادر و قدیم اشیا کا شوقین ہے“

فرنگی سوداگر خواہی نخواہی شہنشاہ کے ذوق طلب کو پورا کرنے کی سعی کرتے تھے کہ اُس کی نگاہ التفات پر اُن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا مدار تھا، لیکن تھوڑے ہی دن میں اُنھیں معلوم ہوگیا کہ اس کام میں دشواریاں بھی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شاہزادے اور سورت کے عمّال مشتاق رہتے تھے کہ ایسے تحائف جو خاص طور پر جہاں پناہ کو پسند آئیں، خود پیش کر کے تحسین و آفرین کے مستحق بنیں۔ اسی خیال سے وہ درآمدہ اسباب کی تلاشی اور جو چیزیں اُن کے مطلب کی ہوں، اُنھیں خود اپنی مقرر کردہ قیمت پر لئے بغیر نہ رہتے تھے چنانچہ سرکاری عمال اور فرنگی سوداگروں میں جو ان بن رہتی تھی اُس کا ایک بڑا سبب یہ جھگڑا بھی تھا کہ اچھے سے اچھا تحفہ پیش کر کے کون

فائدہ اُٹھائے۔ سر تامس رو نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ کس طرح وہ تحائف جو ۱۶۱۷ء میں ہندوستان بھیجے گئے تھے، شاہزادہ خرم نے ضبط کر لیئے اور انھیں اپنی طرف سے بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ دو سال بعد انگریز سوداگروں نے کسی تدبیر سے ایک تصویر شہزادے کو علم ہوئے بغیر دربار میں پہنچا دی حالانکہ سورت اسی شہزادے کے علاقے میں داخل تھا۔ شہزادے کو جب (۷۰) اس واقعے کی خبر ہوئی تو بہت بگڑا کہ یہاں کے (یہ سورت کے) اخباری نے بھی اطلاع نہ دی اور مال کے ساتھ جو بادشاہی احدی گیا تھا اُس کے کوڑے لگائے اور فرمان قطعی بھیج کر حکم دیا کہ اسی قسم کی سزا قلعہ دار جمال خاں، اسحٰق بیگ اور داروغۂ کرورگیری کو دی جائے اور اگر انھیں یہ منظور نہ ہو تو ایک ایک ہزار روپیہ جرمانہ ادا کریں۔ کاتب خط لکھتا ہے کہ ان عمال شاہی نے سارا الزام انگریزوں کے سر تھوپا اور تہدید کی کہ آئندہ چوری سے مال بھیجنے کا انسداد کرنے کی غرض سے سخت تلاشی لی جایا کرے گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ (کاتب خط کی رائے میں) کاروبار کو جو نقصان پہنچے گا وہ ایسی ایسی بیس تصویروں کے تحفے میں دینے یا بیچنے کے نفع سے بھی کہیں زیادہ ہوگا۔ اس معاملے میں شہزادۂ خرم کی خواہش بلاشبہہ یہ تھی کہ اُس تصویر کو خود حضور میں پیش کرے۔ لیکن جب وہ خود تخت سلطنت کا وارث ہوا تو اُس کا اپنا جداگانہ مذاق عیاں ہو گیا۔ یعنی اُس کے عہد میں نہ صرف نادر بلکہ بیش بہا تحائف کی قدر ہوتی تھی اور بٹاویہ کے رسالے بابت ۱۶۴۳ء میں ایک عجیب قصہ لکھا ہے کہ کسی طرح ولندیزوں نے ایک تانبے کی قندیل بلا کسی کو

---

[1] مراسلے کی اصل عبارت میں لفظ "Haddle" درج ہے مگر اس سے مراد احدی ہے اور یہ وہ سپاہی ہوتے تھے، جو بذات خود اپنا گھوڑا رکھتے تھے اور کسی منصبدار کے ملازم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ تازیانے کے لیئے "Chabacktt" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ چابک سے بنا لیا گیا تھا۔ اور مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ عہد میں یہ آلۂ سزا خاصا مقبول تھا۔ ملاحظہ ہو سورت کے محصول ہٹانے کا حال نوشتۂ فرائر (جلد اول ص ۴۷)

خبر ہوئے دربار میں پہنچانے کی کوشش کی اور دارا شکوہ نے اُن کے ساتھ کس قدر بُرا سلوک کیا اور پھر جب وہ بالآخر بادشاہ سلامت کے حضور میں پیش ہوئی تو وہ کس درجہ مسرور ہوئے۔ اس تحفے کا فوری انعام یہ ملا کہ ولندیزوں کو بہت رعایت آمیز شرطوں کے ساتھ تجارت کا اجازت نامہ عطا ہو گیا اور بادشاہ سلامت نے یہ فرمائش بھی کی کہ جاپان سے چند پالکیاں لاکھ کے کام کی لائی جائیں۔

الغرض سلطنت مغلیہ میں، جہاں تک ہمارے پیش نظر زمانے کا تعلق ہے، ضروری تھا کہ ان "کھلونوں" کی بہم رسانی برابر ہوتی رہے۔ گولکنڈے کے بادشاہ کی فرمائشیں بھی کچھ کم پیہم نہ ہوتی تھیں۔ مراعات کی وہ دستاویز جو "فرمان زریں" کے نام سے موسوم ہے اور سنہ ۱۶۳۴ء میں انگریزوں کو مرحمت ہوئی، اُس کے حاصل کرنے کے لئے بھی انگریز سوداگروں کو ۶ ہزار دینار سرخ یا یوں کہئے کہ بیس ہزار روپے کی قیمت کے تحائف پیش کرنے پڑے تھے۔ اور فرمان کے بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عطائے شاہی میں "نوادر" کے ملنے کی توقع بھی داخل تھی[1]۔ ولندیز بھی اس ضرورت کو خوب سمجھتے تھے اور سنہ ۱۶۴۳ء میں ہم اُن کے تحائف کا حال پڑھتے ہیں جو دس ہزار اٹھ ماشی (قریب قریب بیس ہزار روپے) کی مالیت کے تھے اور ان میں بہت سے مصالحوں، صندل اور تانبے کے ایک جھاڑ کے علاوہ جس کا وزن تقریباً سات من تھا، ہاتھی، گھوڑے بھی تھے۔ لیکن واضح رہے کہ اس فہرست سے جیسا اندازہ ہوتا ہے، (۱۷)

---

[1] فرمان زریں کی اصل دستاویز محفوظ نہیں ہے اور اُس کے تین ترجمے بعض مقامات پر ایک دوسرے کے معارض ہیں۔ خاص اُسی زمانے میں جو ترجمہ ہوا اُس میں "نوادر" کا ذکر ہے جو بادشاہ کے لئے لائے جا رہے تھے سنہ ۱۶۷۰ء کا ترجمہ بھی "نوادر" کا تذکرہ کرتا ہے لیکن سنہ ۱۶۷۶ء کے ترجمے میں "تحفہ اشیا" یا "تحفہ" کا لفظ ہے۔ سب سے پہلے ترجمے کے دیکھنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ غالباً اصل عبارت فارسی میں "تحفہ" کا لفظ تھا جو "نوادر" یا "کھلونوں" کے معنی میں بولا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں ترجمے انگلش فیکٹریز (ایڈیشن وغیرہ) میں چھپے ہوئے ہیں۔

بادشاہ کا مذاق اس سے زیادہ ہمہ گیر تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۳۹ء میں انگریز کارندوں نے لکھا کہ تحائف کے عوض میں معقول حد تک جو کچھ بھی طلب کیا جائے وہ دستیاب ہو جائے گا اور ان تحائف میں "ایرانی گھوڑے، انگریزی بُو گیر، آئرلینڈ کے تازی اور پنیر کتے۔ عمدہ قسم کے بڑے آئینے، اعلیٰ درجے کی اطلس کا تھان، قرمزی اور عنابی ساٹن، ہمارے (= برطانوی) بادشاہ کی بڑی تصویر، مجلسی لباس میں، عمدہ پوستین کا کوٹ، اچھی قسم کی گھٹتی بڑھتی دوربین، کردن کی ایک بڑی جوڑی اور عمدہ بنی ہوئی ہلکی زرہ کہ ہو سکے تو گولی اُس پر اثر نہ کرے" بھیجنی چاہئیں جن کی قیمت کچھ بہت نہ ہوگی۔ اگرچہ نویسندہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ تجویز شاید نامعقول نظر آئے لیکن ان کو اصرار تھا کہ اس کام میں سرمایہ کم لگے یا زیادہ، "تحائف پیش کرنے بہرحال ناگزیر ہیں" ورنہ ان لوگوں میں ہمارا گزر نہیں ہو سکتا"۔

جنوب کے ہندو رئیسوں کا مذاق بھی مسلمانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ جس نائک نے انگریزوں کو ارم گاؤں میں آنے کی اجازت دی، اُس نے بے شبہ ایک مفید چیز یعنی توپ بھی مانگی لیکن اسی کے ساتھ "بعض قیمتی کھلونوں کا" تقاضا تھا جیسے کہ مخمل، مشجر (دمشقی)، تفتا، جاپانی لکھنے کی میز، اور "کوئی اور انگریزی کھلونا" جو دستیاب ہو سکے۔ اسی طرح مدراس میں انگریزوں کے ساتھ جو فیاضانہ رعایتیں کی گئیں، اُن کی ایک وجہ خود معطی نے یہ لکھدی تھی کہ وہ ایران کے عمدہ گھوڑے منگانے چاہتا ہے اور دوسرے یہ امید رکھتا ہے کہ اُسے "شکرے، بندر، طوطے اور اسی قسم کی طفل پسند اشیا" بنگالے سے منگانے میں آسانی ہوگی۔ غرض تمام ہندوستان، بلکہ سچ یہ ہے کہ سارے ایشیائی سمندروں میں تجارت کرتے وقت نوادر کے اس شوق کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا تھا اور بیرونی سوداگروں کی دوڑ دھوپ میں ان تحائف کی بہم رسانی کی کوشش بھی پیش نظر رکھنی چاہئے۔ کیونکہ جس طرح آج کل سلیقے سے اشتہار چھاپنا کام دیتا ہے۔ اسی طرح سترھویں صدی میں ان کھلونوں کا ہوشیاری سے بہم پہنچانا، گو براہ راست نفع کا ذریعہ نہ ہوتا، تاہم نفع بخش معاملت کے لازمی مبادی میں ضرور داخل تھا۔

باب سوم (۶۲)

۵- ہندوستان کی ایشیائی تجارت کے تغیرات

ایشیا کے دوسرے ممالک اور نیز مشرقی افریقہ کو ہندوستان سے جو مال بھیجا جاتا تھا، اس بارے میں دو بالکل جداگانہ سوال پیدا ہوتے ہیں اور ان کا تعلق ایک طرف تو اس تجارت کی توسیع سے ہے جو پہلے سے ہو رہی تھی اور دوسری طرف تجارت کے نئے شعبے وجود میں آنے سے؛ اور وہ سوال یہ ہیں کہ آیا فرنگی سوداگروں کے میدان میں آنے سے اُن منڈیوں کی خریداری میں جو پہلے سے کھلی ہوئی تھیں، کچھ اضافہ ہوا یا نہیں؟ اور دوسرے یہ کہ کیا ہندوستان کا مال فرنگی تاجروں کی بدولت ایسے علاقوں میں بھی پہنچنے لگا جہاں پہلے کسی معقول مقدار میں نہ جاتا تھا؟

پہلے سوال کا جواب دینا کچھ سہل نہیں ہے۔ حال کے ایک مصنف[1] نے صرف انگریزی تجارت کے ذکر میں، اور زیادہ طویل زمانہ پیش نظر رکھ کے، خیال ظاہر کیا ہے کہ ایشیائی منڈیوں میں سوتی مال کی ہندوستان سے برآمد ضرور بڑھ گئی ہوگی لیکن اپنے پیش نظر زمانے میں اس بیشی کا کوئی قطعی ثبوت مجھے نہیں ملا۔ اور عام قرائن و حالات کے لحاظ سے مناسب یہی نظر آتا ہے کہ اس بارے میں رائے قائم کرتے وقت احتیاط کی جائے؛

منڈیوں کا سب سے اہم مجموعہ وہ تھا، جن میں ملکا اور جاوا کی بندرگاہوں کے ذریعے مال پہنچتا تھا۔ سب سے پہلے ان پر نظر کیجیے تو اس میں شبہ نہیں کہ ولندیزوں کے ہاتھوں سوتی مال کی جو تجارت ہوتی تھی، اُس میں بتدریج بیشی ہوئی اس کے متعلق جو اعداد ملتے ہیں، وہ افسوس ہے کہ بہت ناقص رہ گئے ہیں کیونکہ رسائل بتاویہ جن کا موضوع ہی ہندوستان کے آنے والے مال کو قلم بند کرنا ہے، ان میں در اصل بہت سے مقامات سادہ اور چھٹے ہوئے رہ گئے ہیں

---

[1] یعنی سی جے ہیملٹن، "دی ٹریڈ ریلیشنز بٹ وین انگلینڈ اینڈ انڈیا" صفحہ ۱۱۰؎

باب سوم

جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ خود بعض رسالے ہی ضائع اور مفقود ہو گئے اور دوسرا یہ کہ لکھنے والوں نے غفلت سے کام لیا۔ اب اگر صرف اُن سنین کو لیا جائے جن کے اعداد محفوظ ہیں، اور سرسری طور پر چھپے ہوئے مال کی بھی رعایت رکھی جائے، تو سوتی اسباب کے گٹھوں کی تعداد، جو ولندیزوں نے بتاویہ پہنچائے کم و بیش حسب ذیل ہوگی:—

سنہ	سالانہ دساور			میزان
	از کورومنڈل	گجرات	بنگالہ	
سنہ ۱۶۲۵	۱۷۰۰	۸۰۰	×	۲۵۰۰
سنہ ۱۶۴۱ تا سنہ ۱۶۴۴	۲۵۰۰	۱۰۰۰	صرف نمونے	۳۵۰۰
سنہ ۱۶۵۷ تا سنہ ۱۶۶۰	۴۰۰۰	۱۲۰۰	۵۰۰	۵۷۰۰

(۴۳) ان اعداد کی صحت پر کچھ بہت وثوق نہیں ہو سکتا کہ ان میں مختلف قیاسات کو بھی دخل ہے۔ تاہم ایک عام اندازہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جس زمانے میں دوسرے فرنگی تاجر مشرق اقصیٰ کی منڈیوں سے بے دخل کر دیئے گئے اگر اسی سے شروع کیجئے تو ہمارے پیش نظر عہد کے آخر تک صرف ولندیزوں نے کورومنڈل سے اشیائے برآمد کی مقدار کو دُگنا اور گجرات سے ڈیڑھ گُنا کر لیا تھا بحالیکہ بنگالے سے پہلے کچھ مال نہ آتا تھا، اب وہاں سے بھی یہ سوداگر ایک مقدار دِساور لانے لگے تھے۔ ان منڈیوں میں انگریزی تجارت کی اسی قسم کی ترقی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور اُس زمانے کے لوازم تجارت کو دیکھتے اُن کے کاروبار کا پھیلنا خلاف قیاس بھی پایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مذکورہ بالا بیشی حقیقت میں پہلے سے زیادہ مال نکلنے کی دلیل ہے یا اس کا سبب محض یہ ہے کہ دوسروں کی تجارت بھی ولندیزوں کے قبضے میں آگئی تھی؟ اس بارے میں بلاواسطہ شواہد میسّر نہیں آتے البتہ امور ذیل سے ہمیں صحیح نتیجہ

نکالنے میں مدد مل سکتی ہے:-

پہلی بات تو یہ ہے کہ ولندیزوں کے مذکورۂ بالا اعداد میں بہت سا وہ مال بھی شامل ہے جو بٹاویہ سے یورپ، امریکہ اور افریقہ کو روانہ کر دیا جاتا تھا لہٰذا ایشیائی ممالک کی تجارت کے اصلی اعداد ان اعداد سے بہت کچھ کم تھے۔ دوسرے اگر انگریزوں کے جہازوں کو ہم ہندوستانی جہاز قرار دیں[1] تو یہ مسلّم ہے کہ اُس زمانے میں اُن جہازوں کے مال لانے لے جانے میں کمی ہو گئی تھی۔ پس اوپر کے نقشے میں جو بیشی نظر آتی ہے وہ دراصل نیا مال نہیں دکھاتی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ تمام و کمال صرف ذریعۂ نقل و حمل کے بدل جانے سے پیدا ہوئی ہو۔ تیسری بات یہ بھی میرے نزدیک بحث طلب ہے کہ خود ان ایشیائی منڈیوں میں اتنی صلاحیت بھی تھی کہ ان میں بڑھتے ہوئے درآمدہ مال کی کھپت ہو جاتی۔ ان کی حالت میں کسی خاص تغیّر کا ہمیں کوئی علم نہیں اور جو کچھ تغیّر ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پہلے ان منڈیوں میں مال کی بہم رسانی عرب تاجر خاطر خواہ کر دیا کرتے تھے پھر پرتگیز کرنے لگے اور اب ان کی جگہ ولندیز آ گئے۔ ورنہ طبعاً یہ منڈیاں قدامت پسند تھیں۔ ان کے خریدار عام طور پر مفلس تھے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ان میں مال کی کھپت بڑھ گئی ہمیں پہلے اس بات کے ثبوت بہم پہنچانے ہوں گے کہ یا تو وہاں کی آبادی میں اضافہ ہوا یا معاشرت کا معیار بہ نسبت سابق کے زیادہ بلند ہو گیا۔ میں نے اپنے پیش نظر زمانے میں اس قسم کے تغیّرات کو تفصیلی طور پر جانچنے کی کوشش نہیں کی لیکن میری دانست میں جب تک یہ تحقیق نہ ہو جائے اُس وقت تک یہ نتیجہ نکالنا کہ (۴۴) ولندیزوں کی سرگرمی کی بدولت مشرق اقصیٰ میں سوتی مال کی ہندوستان سے برآمد کسی بڑی مقدار میں بڑھ گئی، احتیاط کے خلاف ہو گا۔ ممکن ہے کہ تھوڑی بہت بیشی ہوئی ہو مگر جہاں تک ہمیں معلومات میسر آتی ہے، وہاں تک بلا اختلاف

---

[1] حمل و نقل تجارت پر اسی باب کی اگلی فصل میں بحث کی گئی ہے۔

یہی نظر آتا ہے کہ منڈیوں کی حالت برابر یکساں رہی اور فرق پڑا تو صرف یہ کہ مال لانے والوں کی قومیت دوسری ہو گئی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو جس طرح یہ ممکن ہے کہ تجارت میں افزونی ہوئی ہو اسی طرح اس بات کی دلائل بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ تجارت گھٹ گئی۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بعض مشرقی منڈیوں میں سوتی مال سے مبادلے کا کام لیا جاتا تھا اور اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ سولھویں صدی میں بھی سوتی مال بطور سرمائے کے استعمال ہوتا تھا اگرچہ ظاہر ہے کہ خراب و فرسودہ ہوتے رہنے کے باعث وہ اس کام کے لئے کچھ بہت موزوں شے نہ تھی[۱]۔ علاوہ ازیں ولندیزوں کی تجارتی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ان منڈیوں میں سونے چاندی کے سکے کا رواج بھی بڑھتا جاتا تھا، لہذا ہو سکتا ہے کہ سونا چاندی کو بطور اندوختہ جمع کرنے کی عادت کے ساتھ سوتی مال کی خریداری اور مانگ میں بھی نسبۃً تخفیف ہو چلی ہوگی۔

ایشیا کی دوسری منڈیوں کو جہاں سوتی مال کھپتا تھا، دیکھئے تو یہاں بھی پیگو کی مثال ہمارے سامنے ہے اور یہاں انگریزوں اور ولندیزوں کو جو مایوسیاں ہوئیں، اُس کا ذکر ہم پہلے سُن چکے ہیں اور اُس سے خاصی طرح یہ بات ثابت ہے کہ ان اقطاع میں تجارت کوئی ترقی نہیں کر رہی تھی۔ ادھر ارکان کی نسبت بھی مسلم ہے کہ وہ حالت جمود میں تھا بحر قلزم کی تجارت کے بارے میں بھی کوئی ایسی شہادت مجھے نہیں ملی جس سے ظاہر ہو کہ ہمارے عہد میں اُس نے کوئی قابل لحاظ وسعت یا ترقی پالی تھی، یہ ممکن ہے کہ ریشم کی تجارت میں روپیہ لگانے کے باعث خلیج فارس کو جہازوں میں زیادہ مال جانے لگا ہو لیکن اگر سب نہیں تو زیادہ تر دساور جو انگریزوں کی وساطت سے جا رہی تھی، اصل میں وہی مال تھا جو پہلے دوسروں کے ذریعے خشکی کے

---

[۱] باربوسا (دوم ۱۹۹) کا بیان ہے کہ امبوئنا میں ہر شخص کھمبائت کے اتنے اتنے کپڑے لاد لینے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر اُن کی گٹھڑی کھول کر تہ بہ تہ جمایا جائے تو اُسکے قد کے برابر ڈھیر ہو جاتا تھا۔

راستے جاتا تھا اور اب صرف اُس کا ذریعۂ نقل وحمل بدل گیا۔ غرض تمام ایشیائی منڈیوں پر نظر ڈالئے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گو تجارت برآمد میں تنزل کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تاہم جہاں تک ہماری موجودہ معلومات بتاتی ہے یہ دعویٰ کرنے کی بھی کوئی قطعی دلیل نہیں کہ ہندوستان کے سوتی مال کی دساور میں نسبتہً کوئی بڑی افزونی اور توسیع ہوئی ہو۔ دوسری اشیا کے متعلق بھی جو عام طور پر ہندوستان سے ایشیا کے دوسرے ملکوں میں دساور جاتی تھیں، یہی مشروط قول صادق آتا ہے۔ کیونکہ کسی قسم کے مال کی نسبت مجھے ایسی شہادت نہیں نظر آتی جس سے یہ ثابت ہو یا یہ اندازہ ہوتا ہو کہ اس کی تجارت میں معقول توسیع ہوئی۔ لیکن تجارت کے نئے شعبوں کے بارے میں صورت حال دوسری ہے۔ اس لئے کہ بنگالے کے ریشم اور غالباً کورومنڈل سے جاپان کو کھالوں کی دساور میں ولندیزوں کی سرگرمیاں خاصی طرح بار آور ہوئیں اور اسی طرح غلاموں کی تجارت اور سامان خوردنی وغیرہ کی برآمد میں جس کی انھیں اپنے ایشیائی کارخانوں میں ضرورت پڑتی تھی، معقول ترقی کی صورت نکل آئی ہے۔

جیساکہ ایک گزشتہ فصل میں بیان ہو چکا ہے، جاپان کو ریشم کی برآمد کا آغاز سنہ ۱۶۵۰ء میں یا کچھ بعد ہوا، اگرچہ اس تجارت کے قیام کی تفصیلی کیفیت کا ابھی تک ہمیں علم نہیں ہے۔ مئی سنہ ۱۶۵۳ء کی ایک تحریر میں تین سو گٹھوں کی تحویل کا ثبوت ملتا ہے اور دو ہی مہینے بعد ایک کشتی بٹاویہ سے روانہ ہوتی ہے جس میں زیادہ تر بنگالے کا ریشم بھرا ہوا تھا۔ اگلے تین سال کے رسالے مفقود ہیں لیکن سنہ ۱۶۵۷ء میں ہم ۴۵۲ گٹھوں کا بھیجا جانا پڑھتے ہیں نیز ایک چھوٹی کشتی کا، جس میں تمام تر ریشم بھرا ہوا تھا۔ سنہ ۱۶۵۹ء میں جو مال لادا گیا اُس میں ۶۶۲ گٹھے تھے لیکن اس میں ایک حصہ ہند چینی کی پیداوار کا تھا بحالیکہ دو اور کشتیاں صرف بنگالے کے ریشم سے معمور تھیں۔ اور سنہ ۱۶۶۱ء میں واحد بار ہی ۱۰۱۰ گٹھوں پر مشتمل تھا۔ ریشم کا ایک گٹھا جو ولندیز لاتے لے جاتے تھے، اُس زمانے میں بالاوسط دو من کے قریب ہوتا تھا اور سنہ ۱۶۵۹ء میں ایک

گٹھے کی قیمت جو انگریزی کمپنی نے منظور کی نوے یا سو روپے فی من تھی۔ (من غالباً ۷۴ پونڈ کا تھا) اس طرح ایک ہزار گٹھوں کی قیمت جو ریشم تیار کرنے والوں کو ادا کی جاتی تھی کم و بیش دو لاکھ روپیہ سالانہ ہوئی اور اُس زمانے کی تجارت کا معیار پیش نظر رکھئے تو یہ رقم بہت معقول تھی۔ جہاں تک میری تحقیق ہے، ہندوستان کے سوداگروں کی طرف سے ریشم کی اس دساور کی کوئی مخالفت کبھی نہیں ہوئی اور چونکہ بعض دوسری اشیائے خام کی برآمد کی مخالفت کی گئی تھی[1] لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہیں کہ نئی مانگ کے ساتھ ساتھ ریشم کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا ہو گا۔

کورومنڈل کے ساحل سے جاپان کو کھالیں جانے کے متعلق سنہ ۱۶۴۳ء تک کوئی تحریری شہادت میری نظر سے نہیں گزری۔ گو تھوڑی مقدار میں یہ بٹاویہ دساور جاتی اور وہیں کی مقامی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ سنہ ۱۶۴۷ء میں ان کے نمونے سیام بھیجے گئے تھے۔ اس مُلک میں ایک جاپانی سوداگر کا کاروبار تھا جس نے ان نمونوں کے بارے میں اچھی رائے دی اور اس سال کے بعد سے ہم ولندیزوں کو دیکھتے ہیں کہ باقاعدہ کورومنڈل کی کھالیں جاپان میں لا رہے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اس تجارت کی وقعت ریشم کے مقابلے میں بہت کم تھی اور گو اس کی وسعت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اعداد (۷۶) و رقوم نہیں ملے تاہم قرینۂ غالب یہی ہے کہ کھالوں کی یہ تجارت لاکھوں کی بجائے ہزاروں (روپے) کے پیمانے سے آگے نہیں بڑھی تھی۔

ریشم اور کھالوں کے علاوہ، ہندوستان سے ممالک ایشیا کو دوسری اشیائے برآمد میں زیادہ تر وہ چیزیں داخل ہیں جن کا ولندیزوں کی جاوا اور مصالحوں کے جزیروں کی تجارت سے تعلق تھا۔ ولندیزی بٹاویہ میں ایک نیا شہر بنا رہے تھے جو کہ ایشیا میں اُن کا مرکز اور دارالسلطنت بن جائے اور اسی کے ساتھ مصالحوں کے جزائر کی معاش و معاشرت کو از سر نو درست

---

[1] گجرات سے سوت کے باہر لے جانے پر جو مخالفت ہوئی، اُس کا ذکر آگے آتا ہے (باب چہارم فصل ۶)

کر رہے تھے ۔ ان دونوں مقاصد کی مادّی ضروریات کے لئے اُنھیں زیادہ تر ہندوستان سے مدد لینی پڑتی تھی خصوصاً کورومنڈل کی بندرگاہوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ جہاز بھر بھر کے مختلف اشیا جیسے لوہا، فولاد، بورے، بوریاں، چمڑا، نمک، اور کھپریل (= کویلو) تک بھیج رہی ہیں جو جاوا میں آسانی سے میسّر نہ آتی تھیں، بایں ہمہ ولندیزوں کی بڑی ضرورتیں دو تھیں: آبادی اور اجناس خوردنی ۔ اور ان ہی دو عنوانوں کے تحت میں تجارت پر غور و بحث کرنا کافی ہوگا۔

ابتدا ابتدا میں بتاویہ ایسا صدر مقام تھا، جہاں کوئی آبادی نہ تھی ۔ خود ولندیزوں کی تعداد بہت کم تھی اور ہمسایوں کی دشمنی کے ڈر سے کثیر تعداد میں آباد کار آتے نہ تھے ۔ ۱۶۲۶ء کے بتاویہ کے ایک خط میں لکھا ہے کہ دیسی باشندوں نے اُن مقامات کو بھی جو پہلے آباد تھے، چھوڑ دیا اور سارا علاقہ جو چمن بنا ہوا تھا، ویران بن ہو کے رہ گیا۔ غرض شہر بسانے کے لئے مقدم کام یہ تھا کہ باشندوں کو لانے کی تدبیر کی جائے اور اُس زمانے کے حالات کے مطابق کاریگر، اہل حرفہ، دکاندار، ماہی اور اسی قسم کے لوگ تو چین سے ملتے تھے لیکن عام مزدور اور شاگرد پیشہ اشخاص ہندوستان کے مشرقی ساحل سے بہم پہنچائے جاتے تھے ۔ ان میں چینی تو بطور خود بتاویہ آئے اور آزاد افراد کی طرح خود اپنی قوم کے ایک سردار کے ماتحت بس گئے لیکن ہندوستانی باشندے وہ تھے جنھیں خود اُن کے ہم قوم ساحل پر فروخت کر دیتے تھے اور جو اشیائے تجارت کی مثل ولندیزی کشتیوں میں لاد لاد کر جاوا بھیجے جاتے تھے۔

مصالحوں کے جزائر کا مسئلہ بھی زیادہ تر آبادی ہی کا مسئلہ تھا ۔ بعض جزیروں میں عرصے تک بد امنی رہی اور اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی ۔ اس پر ولندیزوں نے (جو بالآخر فتحمند ہوئے) قیام امن کے واسطے ایسے شدید طریقے اختیار کئے جن سے اور بھی آبادی کم ہوگئی ۔ چنانچہ منجملہ دوسری سزاؤں کے ایک سزا یہ بھی دی جاتی تھی کہ سرکش لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں جلاوطن

باب سوم
(۴۴)

کردیا جاتا تھا اور ان ہی اسباب سے آبادی کی کمی کی یہ نوبت پہنچی تھی کہ مصالحوں کی جو دُنیا کی منڈیوں میں بھیجے جاتے تھے، پوری طرح کاشت اور پیداوار میں خلل آگیا۔ اب تنظیم جدید کی صورت یہ ہوئی کہ ان جزیروں میں متعدد ولندیز خاندان بسا دئے گئے اور اُن کو کافی تعداد میں غلام بہم پہنچائے گئے کہ مطلوبہ مقدار میں مصالحے پیدا کر سکیں۔ یہ غلام بیشتر ہندوستان کے ہوتے تھے۔ اور جس کامل اہتمام کے ساتھ یہ کام ہوا تھا اُس کا کچھ اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۶۳۶ء میں جزائر بندا[۱] کی کل آبادی ۳۸۴۲ تھی جس میں صرف ۵۶۰ دیسی باشندے تھے اور باقی ۵۳۹ ولندیز، ۸۳۴ آزاد غیر ملکی اور ۱۹۱۲ درآمدہ غلاموں کی تعداد تھی اور ان غلاموں میں اکثریت یقیناً ہندوستان والوں کی ہوگی۔

اس طرح سنہ ۱۶۲۰ء سے ولندیزوں کی ہندوستان سے تجارتی اغراض میں، سب سے مقدم تو غلاموں کی کافی مقدار میں ابتدائی فراہمی تھی اور پھر اس سلسلے کا برابر جاری رہنا کہ کمی پوری ہوتی رہے کیونکہ یہ فرض کرنا بالکل بجا ہے کہ ان غلاموں میں بہ تعداد کثیر اتلاف و نقصان ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ مذکورۂ بالا مردم شماری کی کیفیت ہی میں یہ بھی مرقوم ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے باعث درآمدہ غلام "بنگال در، آرکان در، ملیبار وغیرہم" عام طور پر جزیروں میں آتے ہی بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ غلاموں کی بہم رسانی عام تجارتی اصول پر ہوتی تھی اور یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ولندیز سوداگر کسی فند فریب یا جبر سے کام لیتے تھے۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حکام کی اجازت حاصل کرکے باقاعدہ ہندوستانی سوداگروں سے غلام خرید رہے ہیں[۱]۔ جہازوں میں جو غلام

---

[۱] اس معاملے میں پولی کٹ کے ایک انگریز کا خط جو انگلش فیکٹریز، جلد دوم ۱۰۲ میں چھپا ہے، حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے انگریز کارندوں کی ولندیزوں سے ٹھنی رہتی اور وہ خط میں غلاموں کی تجارت سے جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں، اُن کا شد و مد سے

بھیجے جاتے تھے، اُن کے اعداد کی تحریری شہادت بہت ناقص ہے لیکن
رسائل بتا دیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۲۵ء کے قریب تو غلاموں کی خریداری
ایک ہزار سالانہ سے زیادہ تھی (اگرچہ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر زیادہ تھی!)
اور سنہ ۱۶۲۴ء سے سنہ ۱۶۶۶ء تک یہ تعداد غالباً کم وبیش ۵۰۰ سالانہ ہوگئی تھی۔
اب اگر ایک[1] مستعد اور اچھے غلام کی قیمت پچاس روپے بھی لگائی جائے،
جو اُس زمانے کے نرخ کی رو سے کافی گراں ہے، تو محض تجارتی اعتبار سے
یہ داد وستد کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، مگر اس تجارت کا خاص طور پر دلچسپ
پہلو یہ ہے کہ ان غلاموں کی قیمتیں گھٹنے بڑھنے سے ہندوستان کے عام
(۷۸) معاشی حالات پر روشنی پڑتی ہے مثلاً سنہ ۱۶۱۸ء میں قحط پڑا تو پولی کٹ میں
غلاموں کی کثرت ہوگئی اور سنہ ۱۶۲۲ء میں جب چاول سستا تھا، تو غلاموں کا بہم
پہنچانا دشوار ہوتا تھا۔ کچھ دن بعد پھر رسد خاطر خواہ ہونے لگی تھی مگر سنہ ۱۶۳۰ء کے
سخت قحط کے بعد سارا کاروبار رک گیا اور قریب قریب ساری تجارت
ارکان میں منتقل ہوگئی۔ سنہ ۱۶۳۴ء میں پولی کٹ کے گماشتوں نے خبر دی
کہ کثرت اموات کے باعث غلام نہیں مل سکتے اور دس سال بعد بھی ہم پڑھتے
ہیں کہ اس علاقے میں خریداروں کو زیادہ کامیابی نہیں ہوتی جس کی وجہ کا
خلاصہ یہ ہے کہ قحط کے زمانے میں زاید آبادی یا تو تلف ہوگئی اور یا خود غلام
بن کر کھپ گئی اور اب کوئی بکنے کے لئے نہیں آتا لہٰذا ہندوستانی بردہ فروش
کبھی کبھی بچے چُرا لیجانے کے سوا اور کسی طرح غلام بہم نہیں پہنچا سکتے۔ البتہ
ارکان میں سنہ ۱۶۳۵ء کے قریب سے ہمارے پیش نظر زمانے کے تقریباً

بقیۂ حاشیہ صفحہ گزشتہ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن معترف ہیں کہ ان خرابیوں کو کم کرنے کی تدبیریں کی جاتی تھیں۔

[1] غلاموں کی قیمت کے متعلق بھی ملاحظہ ہو یہی کتاب جلد سوم ۱۰۔ جہاں ایک انگریز گماشتے کو معمولی مزدور کے واسطے ۲۰ ریال یا کچھ زیادہ یعنی ۴۰ تا ۵۰ روپیے ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے پہلے کی عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ شرح بھی ولندیزوں کی مانگ کے باعث اتنی ہوگئی تھی ورنہ سابقہ نرخ ۱۵ سے ۲۰ روپے (فی غلام) ہی تھا۔

اخیر تک یہ تجارت کم و بیش مسلسل جاری رہی۔ ان سنین میں بنگالے کی طرف کوئی بڑا قحط نہیں پڑا اور ان علاقوں سے جو غلام بردہ فروشوں یا بحری قزّاقوں کے ذریعے آتے تھے، وہ بظاہر عام طور پر متوسّط تعداد میں بہم پہنچتے تھے اگرچہ یہ تجارت بھی مُلکِ ارکان کے اور سب کاموں کی طرح، وہاں کے راجہ یا وزیروں کے ترنگ میں آ کے مداخلت کر بیٹھنے سے رُک رُک جاتی تھی۔ مثلاً کبھی تو ہم سنتے ہیں کہ یک بہ یک سرکار نے خود تجارت کا اجارہ لے لیا۔ کبھی کسی غلام کو جو دستکاری میں ماہر تھا، حق شفع کے دعوے سے چھین لیا اور کبھی بلا کسی وجہ کے تجارت ہی ممنوع کر دی؛ مگر فرنگی گماشتے جو ارکان میں کام کرتے تھے اس قسم کی رکاوٹوں سے ضرور آگاہ ہوں گے لہٰذا ان رکاوٹوں کے باوجود کاروبار جاری رہا اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی مانگ تھی اُس کے موافق تجارت وسیع نہ ہو سکی؛ ادھر ہمارے پیشِ نظر زمانے کے ختم کے قریب، کورومنڈل کی تجارت کے پھر فروغ پانے کے آثار پیدا ہوئے کیونکہ رسائل بتاویہ کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد، سنہ ۱۶۶۱ میں ہم دوبارہ پڑھتے ہیں کہ نگاپٹم میں غلاموں کی بھیڑ کم ہو رہی ہے اور دوسری طرف تنجور کے علاقے میں خشک سالی کے باعث بھی غلاموں کی بہم رسانی پر اثر پڑ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں، ان دنوں ارکان کی منڈی قابلِ اطمینان نہیں نظر آتی جس کا ایک سبب تو کثرتِ اموات ہے اور دوسرا یہ کہ جنگ و جدال کے باعث بنگالے کی سرحد بند اور آمد و رفت موقوف ہے؛

ارکان میں عارضی طور پر یہ تجارت بند کر دی گئی تھی اور اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو، انسانی ہمدردی تو قطعاً اس کا سبب نہ تھی۔ لیکن اس کے سوا ہندوستانی حکّام کے غلاموں کی خریداری روکنے کی صرف ایک اور مثال مجھے (۷۹) ملی ہے۔ یہ ۱۶۴۳ کا واقعہ ہے جب کہ ایک نائک یا رئیس سے ولندیزوں نے درخواست کی کہ ایک ہزار غلام سالانہ خریدنے کی اجازت دی جائے اور اُس نے اس بنا پر کہ انسانی نفوس کی بکری نہ صرف فضیحت بلکہ گناہ ہے،

درخواست نامنظور کردی۔ مگر یہ ہمدردانہ طرزِ عمل عام نہ تھا اور جس رسالے میں یہ واقعہ لکھا ہے اُسی میں ہم ایک نائک کے ملازموں کا حال پڑھتے ہیں کہ وہ دو ولندیزی چھوکروں کو جو جہاز سے بھاگے اور اس نائک کے ہاتھ پڑ گئے تھے، بیچنے کی دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ ۱۶۶۱ء میں خود شاہ گولکنڈہ کا ایک جہاز ۳ سو غلام اچین سے لے کر آیا اور اس موضوع پر یکے بعد دیگرے جو اطلاعات تحریر میں محفوظ ہیں، اُن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کی تجارت کو ولندیزوں کی طرح ہندوستان والے بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے جس طرح تجارت کے کسی دوسرے شعبے کو۔ انگریز گماشتوں نے اس خرید و فروخت میں زیادہ حصّہ نہیں لیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے آقا ایشیا میں کسی علاقے کے جسے آباد کرنا پڑتا، مالک نہ تھے، بنتم سے کبھی کبھی چند ہندوستانی شاگرد پیشوں کی فرمائش ہوتی تھی لیکن آگے چل کے معلوم ہوتا ہے انگریزوں کی یہ ضروریات بھی زیادہ تر مدغاسکر یا دوسرے جزیروں سے پوری ہونے لگیں؎ پرتگیز اس تجارت میں زیادہ سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے اور ہم کبھی کبھی ہندوستان کے دونوں ساحلوں سے انھیں غلاموں کی کھیپ لے جاتے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے پیشِ نظر زمانے کی کوئی جدید چیز نہ تھی بلکہ عام طور پر ایسی تجارت سولھویں صدی ہی میں جاری ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں جو ترقّی ہوئی وہ ولندیزوں کے بٹاویہ اور مصالحوں کے جزائر بسانے کی مخصوص ضروریات کے باعث ہوئی؎

ان ہی ضروریات نے اجناس خوردنی کی برآمد میں اضافہ کیا۔ جو نئی بستیاں ولندیز بسا رہے تھے، ظاہر ہے کہ انھیں کھلانے پلانے کا سامان مہیّا کرنا پڑتا تھا اور چونکہ مقامی اجناس کافی نہ ہوتی تھیں لہٰذا خواہی نخواہی ہندوستان سے بہتر کوئی ذریعۂ رسد رسانی نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ سولھویں صدی میں بھی مصالحوں کے جزائر ضروریات خوردنی کو خود پورا کر لیتے تھے یا نہیں؟ لیکن اگر پورا کرتے بھی ہوں، تو بھی اُس زمانے میں اُن کی ضرورت زیادہ تر ساگودانہ ہوتی تھی اور ولندیزوں کی تنظیم جدید کا

باب سوم مقتضیٰ یہ تھا کہ اب چاول اور اُسی کے ساتھ گیہوں اور دالیں زیادہ کثیر مقدار میں بہم پہنچائی جائیں کہ نئے آباد کار اور باہر کے لائے ہوئے غلاموں کے لئے کافی ہوں۔ یہ اجناس برابر بٹاویہ سے بذریعۂ جہاز بھیجی جاتی رہتی تھیں اور چونکہ اس شہر کے ہمسائے میں ولندیزوں کے دشمن بھرے ہوئے تھے اور اس علاقے کی پیداوار کے بہم پہنچنے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی لہذا یہاں ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے غلہ آنے لگا کہ خود بٹاویہ اور نیز اُس کے توابع کی ضروریات پوری ہوں اور اس طرح یہ شہر غلے کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ (۸۰) درآمد کی مقدار کا صحیح اندازہ بتانا ممکن نہیں ہے کیونکہ گو یہ مد اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ رسائل بٹاویہ میں تفصیل سے اوزان و اعداد قلمبند کئے جائیں لیکن تحریر کرنے والوں نے نہ کسی خاص وزن کی پابندی کی ہے نہ یکساں پیمانے کا لحاظ رکھا ہے اور غلے کی درآمد کو کبھی "ایک کشتی چاول" اور کبھی "اتنے ہزار ٹوکرے دھان" ومثل ذالک تحریر کر دیا ہے۔ بہرحال ۱۶۳۲ء میں درآمد کی مقدار دو ہزار لاسٹ[ع۱] یعنی تقریباً ۳۱۲۵ ٹن سے کم نہیں ہو سکتی جو ہندوستان کی کُل بحری برآمد کا ایک معقول جزو ہوتی ہے۔ لیکن جس سنہ کا یہ حساب ہے، اُس سال ہندوستان کا تجارت میں حصہ کم تھا اور عام طور پر پوچھئے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ غلاموں کی تجارت کی طرح، غلے کی تجارت بھی ملک کی عام اقتصادی حالت بتاتی تھی۔ معمولاً تو بٹاویہ میں جو مال آتا وہ کورومنڈل کے ساحل سے یا براہ ارکان بنگالے سے آتا تھا۔ لیکن سیام، ہند چینی، بلکہ جاپان بھی اس میں حصہ لیتے تھے اور چونکہ موسمی اسباب ان وسائل رسد رسانی کو متاثر کر سکتے تھے، لہذا یہ مسئلہ دشواری سے خالی نہ تھا اور ابتدائی سنین میں کئی بار قحط کا اندیشہ پیدا ہو ہو گیا۔ ۱۶۳۰ء تک ساحل کورومنڈل سے باقاعدہ رسد رسانی ہوتی رہی لیکن اس سال کے خوفناک قحط نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر یہاں تجارت ۱۶۳۴ء سے پہلے دوبارہ جاری نہ ہو سکی اور اس

[ع۱] ایک لاسٹ (Last) چاول کے وزن کے واسطے دیکھو ضمیمہ "د"

اثنا میں ارکان سے تجارت کی صورت نکالی گئی ۔ پھر یہ ہو گیا کہ کورومنڈل اور بنگالے سے باقاعدہ چاول جہازوں میں بھر بھر کے لاتے اور کبھی کبھی تھوڑی سی مقدار گیہوں اور دال کی بھی ان ملکوں سے بہم پہنچ جاتی تھی ۔ اس تجارت سے ہندوستان کے مشرقی اقطاع کو ضرور فائدہ پہنچا ہوگا کیونکہ یہ فاضل پیداوار کی کھپت کی عمدہ شکل تھی بحالیکہ ہندوستانی حکام جس زمانے میں دیکھتے کہ فاضل پیداوار نہیں ہوئی، تو فوراً برآمد روک دیتے تھے؛ یہاں یہ اضافہ کر دینا مناسب ہوگا کہ سنہ ۱۶۶۰ء سے ولندیزوں کی لنکا کو دساور بھی نمایاں ہونے لگی تھی لیکن اُسے ہندوستان کی تجارت میں کوئی جدید عنصر نہیں کہہ سکتے کیونکہ لنکا بہت پہلے سے اجناس خوردنی میں ہندوستان کا محتاج چلا آتا تھا؛

ایشیائی منڈیوں کو چھوڑ کر، چند کلمے تمباکو کی تجارت کے فروغ پر بھی لکھنے مناسب ہوں گے کہ اُس زمانے میں صرف یہی چیز ایسی نظر آتی ہے جس کی ترقی کے محرک فرنگی سوداگر نہ تھے بلکہ سولھویں صدی کے اخیر ہی میں تمباکو گجرات میں خوب کاشت ہونے لگا تھا اور سنہ ۱۶۳۲ء میں سورت سے جو اشیا دساور بھیجی گئیں، ان میں یہ جنس بھی موجود ہے ۔ لیکن اسے جہازوں میں لاد کر لے جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اُس کے خشک پتوں کے گٹھے بہت بڑے بڑے باندھے جاتے تھے ۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کاروبار زیادہ تر مقامی سوداگروں کے ہاتھ میں تھا جو انفرادی طور پر یہ تجارت کرتے تھے ۔ کورومنڈل کے ساحل پر بھی اُس کی کاشت ہونے لگی تھی اور سنہ ۱۶۲۰ء کے قریب میتھ وولڈ اپنے مشاہدات کے ضمن میں تمباکو کے مخہ اور ارکان دساور جانے کا ذکر کرتا ہے نیز چند سال بعد ہم خشک پتے کے بنگالہ و پیگو لائے جانے کا حال سنتے ہیں؛

۶ ۔ ہندوستان کی صنعت جہاز سازی

ہم اوپر مطالعہ کر چکے ہیں کہ ایشیائی تجارت میں سرگرمی سے

حصّہ لینے کی ضرورت دیکھ کر ولندیزی اور انگریزی جہاز ہندوستان کی تجارت برآمد کے تمام بڑے بڑے راستوں پر کام کرنے لگے تھے۔ اس سے ہندوستان کی بعض پیداواروں کے واسطے کسی قدر نکاسی کی صورت نکلی لیکن زیادہ تر ان جہازوں کی زائد گنجائش سے ان ہی اجناس کے لانے لے جانے کا کام لیا جانے لگا جن کی تجارت پہلے سے ہوتی چلی آتی تھی۔ اس سے صریحی نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ جو لوگ حمل ونقل کی یہ خدمت پہلے انجام دیتے تھے، انھیں ان نئے حریفوں کے آجانے سے ضرور نقصان پہنچا۔ جہاں تک پرتگیزی مالکان جہاز کا تعلق تھا، یہ نقصان بالکل مسلّم ہے۔ سقوط ہگلی کے بعد اُن کی بنگالے کی ساری تجارت ہی غارت ہوگئی اور اُن کے ہندوستان میں دوسرے کارخانوں کی نسبت بھی ہم یہی پڑھتے ہیں کہ اُن کا افلاس وانحطاط برابر بڑھتا جاتا ہے۔ صدی کے شروع میں پرتگیزوں کا تجارت برآمد میں یقیناً بڑا حصّہ تھا لیکن آیندہ ولندیزوں اور انگریزوں نے اسی میں حصّہ بٹایا۔ اور گو مقدار کا صحت کے ساتھ بتانا ممکن نہیں تاہم یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ ایشیا میں حمل ونقل کے کاروبار میں نئے حریفوں کی آمد سے پرتگیزوں ہی کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ مغرب کی طرف سورت کو فروغ اور گوآ کو زوال ہونے لگا۔ کورومنڈل پر پولی کٹ اور مدراس نے سان تھومی اور نگاپٹم کی جگہ چھین لی اور اُدھر ہگلی میں پرتگیزوں کے ہاتھ سے جو تجارت نکل گئی تھی وہ بالآخر زیادہ تر ولندیزوں کے پاس منتقل ہوگئی؛

پرتگیزوں کے علاوہ، دوسرے ہندوستانی مالکان جہاز کا حال معلوم کرنا ایسا آسان نہیں ہے اس لئے کہ اُن کے معاملے میں یہ اثرات یکساں نہ تھے اور بہتر یہی ہوگا کہ اس مسئلے کا ہم گجرات، کورومنڈل اور بنگالے میں علٰحدہ علٰحدہ مطالعہ کریں؛ گجرات میں سب سے عجیب تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ گوآ تک ساحلی تجارت میں، جو پرتگیزوں کے زیر حمایت ہندوستانی کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی، بہت کمی آگئی۔ صدی کے آغاز میں دو یا تین بڑے بیڑے (جنھیں قافلہ

کہتے تھے) ہر موسم میں روانہ ہوا کرتے تھے۔ ہر بیڑے میں، ۲ سو تا ۳ سو کشتیاں اور بدرقے کے جنگی جہاز رہتے اور ہر کشتی میں ۴۰ تا ۵۰ ٹن (قدیم) وزن کی گنجائش ہوتی تھی۔ ان میں زیادہ تر سوتی سامان، نیل، اور سوداگری مال بھرا ہوتا تھا جو گوآ سے پھر باہر دساور جاتا تھا اور کچھ حصہ غلہ وغیرہ ایسی اجناس پر مشتمل ہوتا جو مغربی ساحل پر کھپ جاتی تھیں۔ مگر اب اس تجارت میں سرعت کے ساتھ زوال آگیا۔ ۱۶۲۱ء میں **فان ڈین بروکے** سورت سے تحریر کرتا ہے کہ پرتگیزوں کی ساحلی تجارت کا ستیاناس ہو چکا ہے اور امسال صرف دو بیڑے جن میں ۴۰ سے ۵۰ تک کشتیاں تھیں روانہ ہوئے تھے اور ان میں بھی اجناس خوردنی کے سوا دوسرا تجارتی مال کچھ نہ تھا۔ دوسرے سال اسی بروکے نے کشتیوں کی تعداد جو اُس موسم میں چلیں، کُل ۶۰ سے ۸۰ تک قرار دی ہے اور ۱۶۲۶ء میں ایک اور شخص **پلسارٹ** لکھتا ہے کہ کھمبائت سے گوآ آنے والی کشتیوں کی تعداد صرف ۴۰ تھی اور ان میں جو مال لدا ہوا تھا، وہ بھی بہت کم قیمت کا تھا۔ اس کے بعد اُن بڑے بڑے ساحلی بیڑوں کا بہت کم ذکر آتا ہے۔ بعض اوقات پرتگیزوں کے پاس اتنے جنگی جہاز نہ ہوتے تھے کہ ان بیڑوں کے ساتھ بطور بدرقہ بھیجے جا سکیں اور ادھر ولندیزوں نے جو کئی سال تک ہر تجارتی موسم میں گوآ کی ناکہ بندی کی، اس کے باعث بھی پرتگیزوں کو انتظام بدلنا ضروری ہوا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی صرف چند کشتیاں چھپ کر گوآ سے نکلتی اور اسی طرح ناکہ بندی سے بچ کر گوآ پہنچتی اور اجناس خوردنی کی رسد رسانی کرتی ہیں، جس کی شہر کو بارہا سخت احتیاج ہو جاتی تھی۔ کچھ تو اس ناکہ بندی اور کچھ پرتگیزوں کے زوال دولت سے ہندوستان کے مغربی ساحل کی مانگ لامحالہ کم ہو گئی تھی اور اسی کے ساتھ گجرات کے کاروبار میں نقصان رونما ہوا ہوگا۔ لیکن جہاں تک ممالک غیر کو دساور جانے کا تعلق ہے، اس تبدیلی سے ہوا تو کچھ فائدہ ہی ہوا کیونکہ وہ مال جو پہلے گوآ جاتا اور وہاں سے بڑے جہازوں میں لد کر دوسرے ملکوں کو روانہ کیا جاتا تھا، اب اُسے ولندیز اور انگریز براہ راست یورپ لے جانے لگے۔ اس طرح گو ساحلی کشتیوں کے مالک تو ضرور خسارے میں رہے لیکن مقامی

سوداگروں یا مالکان اجناس پر اس تغیر کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا اور گوآ سے بیوپار بند ہونے کی تلافی اس طرح ہوئی کہ نئ اور براہ راست تجارت قائم ہو گئی؛ ساحلی تجارت کے علاوہ، وہ راستے جن سے گجرات کی تجارتی اغراض وابستہ تھیں، اچین، ایران اور بحر قلزم کے بحری راستے تھے۔ اچین کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں سے سوتی مال دوسرے اقطاع میں تقسیم ہوتا تھا اور اسی لئے اُس کا بتاویہ کے ولندیزوں اور بنتم کے انگریزوں سے مقابلہ ہونے لگا تھا۔ اور گو ان دونوں قوموں کے تجارتی جہاز بھی یہاں آتے جاتے رہتے تھے تاہم، جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ خود برآمد میں کوئی بڑا اضافہ ہو گیا تھا، یہ نتیجہ ۸۳ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ اس طرف کے مقابلے میں گجراتی مالکان جہاز کو خسارہ ہونے لگا۔ بایں ہمہ انکا کاروبار کلّیتہً برباد نہیں ہوا تھا اور اپنے پیش نظر زمانے کے اخیر تک ہم اُن کے جہازوں کو بندرگاہوں میں آتے دیکھتے ہیں اور سنہ ۱۶۶۱ ہی میں ان کے جہازوں سے اتنا مال اچین پہنچتا ہے کہ منڈی اٹ جاتی ہے۔ دوسرے ایک زمانے تک ولندیز اس کاروبار میں نقصان میں بھی رہے اور سنہ ۱۶۳۲ سے قبل تک ہندوستانی تاجروں کی بہ نسبت ان سے زیادہ محصول لیا جاتا رہا البتہ سنہ مذکور سے خاطر خواہ شرطیں طے اور مساوات حاصل ہو گئی۔ آئندہ دس برس تک دوستانہ تعلقات رہے لیکن جب ولندیزوں کا ملکا پر قبضہ ہوا تو انھوں نے اچین سے اس جدید مقبوضے کی طرف تجارت منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا تجارتی نتیجہ تو صاف طور پر معلوم نہیں مگر یہ ضرور ہوا کہ ولندیزوں اور حکومت اچین میں اَن بَن ہو گئی اور صدی کے چھٹے عُشر میں اُن کے درمیان جنگ و مخالفت نظر آتی ہے۔ اس وقت میں بھی تجارت زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن اس عہد کے اخیر میں ولندیزوں کو آخر کار اس منصوبے میں کہ مرچ کی تجارت تمام و کمال اُن کے ہاتھ میں آ جائے، کامیابی ہو گئی۔ اور اس کا نتیجہ خواہی نخواہی یہ ہونے والا تھا کہ اچین کی ساری تجارت پر بھی وہی چھا جائیں۔ غرض جہاں تک ہمارے زیر نظر عہد کا تعلق ہے، تمام تحریری شواہد سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ

گو گجرات کے مالکان جہاز پر نئے حریفوں کے آ جانے سے اثر پڑا، تاہم اچین کے راستے کی تجارت میں اُن کا معقول حصّہ نکل آیا؎

ایران کے بحری راستے کو دیکھئے تو ہمارے عہد کی ابتدا میں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کا مال زیادہ تر پرتگیزی جہازوں میں وہاں پہنچ رہا ہے اور مغربی ہند سے جتنے جہاز ہرمز آتے ہیں وہ خواہ خاص گوآ سے آتے ہوں، یا لاہری بندر، چول، دیو وغیرہ دوسری بندرگاہوں سے، جہازوں کی اکثر تعداد پرتگیزوں ہی کی مملوکہ ہوتی ہے۔ البتّہ ہرمز کے پرتگیزوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی جہاز والے اُس کی جانشین بندرگاہ گمبرون کی طرف کھنچنے لگے ہیں اور اُس زمانے کی تحریروں میں بار بار سورت کے جہازوں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ابھی تک وہ نقصان میں اس لئے رہتے تھے کہ جو جہاز ہندوستان سے آتے اُن سے مسقط کے پرتگیز برابر وہی محصول وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے جو پہلے وہ ہرمز میں لیا کرتے تھے۔ مگر اس کام کے لئے جو بیڑے کے جہاز انھوں
۸۴ نے مقرر کئے تھے، وہ اتنی قوت نہ رکھتے تھے کہ ولندیزی یا انگریزی جہازوں
کی آمد و رفت میں بھی خلل ڈال سکیں لہٰذا ہندوستان کے سوداگر رفتہ رفتہ ان ہی فرنگی جہازوں میں مال بھیجنے کو ترجیح دینے لگے۔ جب پرتگیزوں کا مسقطی مرکز چھن گیا تو اس مصیبت سے نجات ملی اور قرینۂ غالب یہی ہے کہ ہمارے عہد کے اواخر میں ہندوستانی جہازوں کی گمبرون اور آگے کی بندرگاہوں تک اسی طرح خوب آمد و رفت ہونے لگی تھی، جیسے کہ پرتگیزوں کے غلبے کے وقت میں تھی؎

لیکن جہاں تک سورت کا تعلق ہے، بحر قلزم کا راستہ سب سے زیادہ اہم تھا اور اسی طرف نئے مقابلے کا اثر سب سے سخت ہوا یا کم سے کم اس کی شکایت سب سے زیادہ تلخ پیدا ہوئی۔ شروع میں محض یہ خیال کہ کوئی انگریزی جہاز مخہ جائے، ہندوستان کے تاجروں کو مشتعل کر دیتا تھا اور ۱۶۱۸ء میں جب اس خیال نے واقعی عملی صورت اختیار کر لی تو سورت میں

انگریز سوداگروں سے بڑی مخالفت کی گئی اور لوگوں نے اُن سے قطع تعلق کر لیا۔ گجرات کا صوبہ اُن دنوں شہزادۂ خرم کے تفویض تھا، اُسے عرضی دی گئی کہ اور راستوں پر انگریزوں کو اجازت دینے میں مضائقہ نہیں مگر بحر قلزم کا راستہ ہندوستان والوں کے لئے مختص ہونا چاہئے۔ شہزادے نے مقامی تاجروں کی ہمنوائی کی اور انگریزوں سے کہہ دیا گیا کہ اگر مخہ کو چھوڑ کر باقی راستوں کی بے روک تجارت پر قانع ہوں تو فبہا، ورنہ اس ملک کو چھوڑ دینا ہوگا۔ اور وقت کے وقت یہ قضیہ چُک گیا۔ لیکن اس اثنا میں ولندیزوں کو بحر قلزم کی تجارت کے فوائد نظر آگئے اور بٹاویہ کے زیر ہدایات وہ پوری تن دہی سے ادھر متوجہ ہو گئے۔ ادھر انگریزوں کی عمال سورت کے ساتھ ایک وسیع تر نزاع چھڑ گئی اور یہ مسئلہ بھی اُسی کا ایک جزو بن گیا۔ ۱۶۲۲؁ سے یہ جھگڑا اعلانیہ شروع اور ۱۶۲۴؁ میں جا کے ختم ہوا[۱]۔ اس موقع پر جو قول و قرار ہوئے اُن میں بحر قلزم کی تجارت کے متعلق کسی رکاوٹ کا پتا نہیں چلتا اور نہ بعد کی کسی تحریر سے آئندہ عملی مخالفت کا ثبوت ملتا ہے۔ برایں ہم یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ سورت کے جہاز والے مطمئن ہو گئے تھے بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ انگریزوں اور ولندیزوں کو جب اس درجہ آمادہ اور اُدھار کھائے ہوئے دیکھا تو سورت والوں کو خاموش ہو جانا ہی پڑا۔ بہر حال اصلیت جو کچھ بھی ہو اُس وقت سے ہم اس راستے پر ہندوستانی جہازوں کی طرح فرنگی جہازوں کو بھی آتے جاتے دیکھتے ہیں اور چونکہ تجارت میں کسی افزونی کا مجھے ثبوت نہیں ملتا لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا خلاف قرینہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مالکان جہاز کو اپنی سابقہ تجارت میں تھوڑا بہت نقصان گوارا کرنا پڑا۔

قصہ مختصر، جملہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورت والوں کو تجارت کے تین راستوں میں سے دو پر کچھ نہ کچھ نقصان ہوا اور گوآ سے اُن کی ساحلی تجارت بھی برباد ہو گئی لیکن یہ سمجھنا کہ یہ نقصان بتدریج بڑھتا رہا، درست

---

[۱] ان معاملات کا آئندہ باب ہشتم میں تذکرہ ملے گا۔

باب سوم

نہ ہوگا۔ مقابلے کے اثرات سنہ ۱۶۲۲ء و سنہ ۱۶۳۰ء کے درمیان سب سے زیادہ محسوس ہوئے اور سنہ ۱۶۳۰ء میں جو قحط پڑا اُس نے اُنھیں ضرور شدید و تلخ تر بنا دیا ہوگا لیکن بہتر حالات نے عود کیا اور سنہ ۱۶۴۴ء میں انگریز سوداگروں نے اطلاع دی کہ مسلمانوں کے مملوکہ جہازوں کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ اُنھیں کام میں لانے کے لئے وہ حقیر سے حقیر کرایہ قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں؛ اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو منافع نہ بڑھا ہو، تاہم جہازوں کی گنجائش میں ضرور اضافہ ہو رہا تھا۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں دوبارہ ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہندوستانی جہاز اس تیزی سے تعداد میں بڑھ رہے ہیں کہ "دس سال قبل تو سورت میں کم و بیش کُل پندرہ ہوں گے اور اب اُن کا شمار ۸۰ ہو گیا ہے اور ان میں بہت سے بڑے وزن کے ہیں" اور اگرچہ اس اضافے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اُن کا ایک ہی بندرگاہ میں اجتماع ہونے لگا تھا، بایں ہمہ اُن کے دوبارہ فروغ کے ثبوت ناقابل انکار نظر آتے ہیں؛

رہا کورومنڈل کا جنوبی حصّہ، تو اس کے متعلّق مجھے کوئی شہادت ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ہمارے پیش نظر عہد کی ابتدا میں اہل ہند کے مملوکہ جہاز کوئی اہمیت رکھتے تھے۔ اس علاقے کے دو بڑے مرکز نگاپٹم اور سان تھومی تھے۔ ان دونوں پر پرتگیزوں کا تسلّط مسلّم تھا اور آگے چل کے حالات میں جو تغیّر ہوا وہ یہ تھا کہ ان بندرگاہوں کی بجائے پولی کٹ اور مدراس سے مال دساور جانے لگا؛ یہاں سے ساحل جو مال کو چین تک جاتا تھا، اُس کا لانا لے جانا بھی پرتگیزوں کے ہاتھ میں تھا اور جب ولندیزوں کی کوشش سے پرتگیزی قوت میں زوال آیا اور یہ کام ہندوستانی مالکان جہاز کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تو اُس وقت بھی خریداری کی منڈیوں کی حالت ایسی افلاس زدہ تھی کہ جہاں تک قیاس جاتا ہے اس کاروبار میں کچھ زیادہ نفع نہ ہو سکا ہوگا۔ اس کے آگے شمال میں چلیئے تو وہاں کی کیفیت صاف نہیں معلوم ہوتی تاہم کم سے کم مچھلی پٹم کے جہاز تو شروع شروع میں بیشتر ہندوستانیوں ہی کے مملوکہ تھے اور گو یہاں اس قسم کی شکایت کا کوئی

تحریری ثبوت مجھے نہیں ملا، جیسی کہ سورت میں پیدا ہوئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فرنگی حریفوں کے آجانے سے مقامی جہاز والوں کو ضرور کچھ عرصے تک نقصان ہوا ہوگا۔ مگر ۱۶۴۰ء میں گولکنڈہ کے اعلیٰ حکّام نے دست اندازی کی اور اُن جہازوں کا حق مرجح رکھنے پر اصرار کیا جو خود اُن کی ملکیت تھے پھر اسی ترجیح نے رفتہ رفتہ اجارہ داری کی شکل اختیار کرلی اور ۱۶۴۷ء میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایران، بصرہ، مخہ (اور کچھ دن بعد) پیگو کو جو مال روانہ (۸۶) کیا جاتا ہے وہ صرف اُن جہازوں میں جا سکتا ہے جن میں سے اکثر شہرۂ آفاق میر جملہ کی ملکیت تھے جو اُن دنوں گولکنڈے کا وزیر اعظم تھا۔ مگر جب وہ سلطنت مغلیہ کے دامن دولت سے وابستہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی پٹم کی یہ اجارہ داری بھی باقی نہ رہی کیونکہ ۱۶۶۱ میں ہم ایران مال لے جانے کے لئے پھر ولندیزوں اور انگریزوں کو مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہمارے عہد کے آخری حصے میں اس علاقے کی تجارت برآمد کا سب سے زیادہ نفع ہندوستانی جہاز والوں ہی کے حصے میں آگیا تھا۔

بنگالے کے بارے میں، ہم جس قدر معلومات فراہم کر چکے ہیں، اُسی سے یہ استنباط کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۳۰ء کے قریب تک یہاں کی تھوڑی سی تجارت برآمد میں حصۂ غالب پرتگیزوں کا تھا۔ اُن کی قوّت ٹوٹی تو یہ تجارت اُسی وقت ولندیزوں اور انگریزوں کے ہاتھ میں منتقل نہیں ہوئی کیونکہ یہ فرنگی ابتدا میں صرف اس مال کا بیوپار کرتے تھے جس کی اُنھیں نئی منڈیوں کیلئے ضرورت تھی جہاں وہ ہندوستان کی تجارت کے فروغ دینے میں کوشاں تھے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کچھ مدت تک پپلی اور بالاسور میں ہندوستانی جہاز والوں کا طوطی بولتا رہا اور ان دونوں بندرگاہوں سے ۱۶۴۳-۴۴ کے تجارتی موسم میں ۲۶ بیرونی جہازوں کی روانگی تحریر ہے۔ اس سال کے بعد یکایک یہ سلسلہ سست ہوگیا جس کا بڑا سبب ڈینمارک والوں کے حملے تھے جنھوں نے بنگالے سے لڑائی ٹھان رکھی تھی۔ دوسرے

ولندیزوں کا ہگلی میں قدم جم گیا تھا اور وہ روز افزوں مقدار میں ہندوستان کا مال ایشیائی منڈیوں میں لے جانے کا موقع پا گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے عہد کے ختم ہوتے ہوتے اس تجارت میں یقیناً معقول حصّہ اُن کے ہاتھ میں آگیا تھا؛

اب اگر مجموعی طور پر دیکھئے اور ہندوستان کے پرتگیز باشندوں کو ہندوستانی مالکان جہاز کی فہرست سے الگ کر دیجئے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہندوستانی جہاز والے ہمارے عہد میں بالیقین خسارے میں رہے اگرچہ یہ خسارہ ترقی پذیر نہ تھا۔ بلکہ گجرات میں اُنھوں نے کچھ اور نفع حاصل کیا مگر بنگالے میں جو موقع ملا تھا اُسے قائم نہ رکھ سکے اور غالباً کورومنڈل کی بندرگاہوں میں نفع نقصان کا مقابلہ کیا جائے، تو وہ کچھ خسارے میں رہے؛ ادھر ولندیزوں نے جہاں جہاں تجارت کی راہ نکالی تھی، وہاں کا تمام یا تقریباً تمام کاروبار اُن ہی کے ہاتھ میں تھا اور پرانی تجارت میں بھی وہ اور انگریز حصّہ دار ہو گئے تھے۔ اس حصّے کا تعیّن نہیں ہو سکتا لیکن وہ معتدبہ ضرور تھا؛ غرض یہ نتیجہ نکالنا خلاف احتیاط نہ ہوگا کہ ہندوستانی سوداگر جو مالکان جہاز بھی تھے، نئی تبدیلیوں کے باعث خسارے میں رہے لیکن اس نتیجے کو تمام ہندوستانی سوداگروں تک عام نہیں کر سکتے۔ اور سوائے جہاز سازوں کے[1] دوسرے ہندوستانی اہل حرفہ یا زمینداروں پر

---

[1] مذکورۂ بالا واقعات سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سولھویں صدی کی بہ نسبت، ہمارے پیش نظر عہد میں، مغربی ساحل پر کمتر ہندوستانی جہاز بننے لگے تھے اگرچہ مشرقی ساحل پر یہ کیفیت نہ تھی۔ لیکن یہ کمی زیادہ تر پرتگیزی جہاز سازی میں نمایاں ہے۔ دراصل ایشیائی تجارت کے لئے وہ اپنے سارے جہاز ہندوستان میں بنایا کرتے تھے اور گو ولندیز اور انگریز بھی کبھی ہندوستانی جہاز خرید لیتے تھے (ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، پنجم ۴۳، ہشتم ۹۱) لیکن ان کے بڑے جہاز یورپ ہی سے آتے تھے اور ہمارے عہد میں خود اُنھوں نے ہندوستان میں جہاز بنانے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع نہیں کیا تھا۔ پوری

اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے، یہ قیاس کرنا حق بجانب ہو گا کہ ہندوستانی سوداگروں کو حمل و نقل کا بہتر اور ارزاں تر ذریعہ مل گیا جس سے وہ بھی نفع میں رہے اور کیا عجب ہے کہ اس نفع کا کچھ حصہ بالواسطہ مالکان اجناس کے بھی ہاتھ آگیا ہو۔ اندرونی علاقوں کے تاجروں کو فرنگیوں سے کوئی مخالفت نہ تھی اور اُن کے طرزِ عمل کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں سورت والے انگریزوں کو بحرِ قلزم کی تجارت سے روکنے میں زور شور سے ساعی تھے، اُسی زمانے میں احمد آباد کے تاجر اُن سے (گجرات کا) مال کرائے پر ایران، مُخہ وغیرہ لے جانے کے لئے کہہ رہے تھے اور بیس سال کے تجربے کے بعد، سورت کے انگریز کارندوں کی اطلاع یہ تھی کہ ہندوستانی بیوپاری، ہندوستانی جہازوں کی نسبت ولندیزی یا انگریزی جہازوں کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ اسی اطلاع سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ مقابلے کی وجہ سے کرائے کم کر دینے پڑے۔ ایک طرف تو ہندوستانی مالکان جہاز نے کرائے کی شرح گھٹا دی اور یہ ذمہ لیا کہ محصول راہ داری یا دوسرے مصارف میں خود بھی شریک رہیں گے اور دوسرے ہمارے سارے عہد میں ولندیز درپے رہے کہ انگریزوں سے کم شرح پر مال لے جائیں۔ اور یہ ایسے اسباب تھے جو کرائے میں کوئی بیجا بیشی نہ ہونے دیتے تھے۔ ہندوستانی تاجروں کو اکثر ایک کو چھوڑ کر دوسرا جہاز انتخاب کرنے کا موقع رہتا تھا کیونکہ جتنی ضرورت تھی، اس سے زیادہ مال لے جانے کی گنجائش موجود تھی۔ مثلاً ۱۶۴۷ء میں سورت کے انگریز شکایت کرتے ہیں کہ ولندیزوں کی رقابت کے باعث ہمارے جہازوں کو کام نہیں ملتا حالانکہ خود ولندیزی جہاز

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ (صفحہ ۱۰۲) میں گوداوری کے مثلثی دہانے پر ان فرنگیوں کی جہاز سازی کا ذکر آتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی ابتدا ہمارے عہد میں ہو گئی ہو لیکن مجھے اس کا کوئی قرینہ نہیں نظر آیا کہ یہ صنعت اُس زمانے میں کوئی وقعت بھی حاصل کر گئی تھی۔

باب سوم آدھے خالی یا پتھر (بھرت) بھر کر چل رہے ہیں کہ فرنگی جہازوں میں مال بھیجنے والوں کو زیادہ حفاظت و اطمینان کی صورت نظر آتی تھی جو اُس زمانے کے حالات کا لازمی مقتضی تھا کہ ہندوستانی جہاز رانی کا تو اُصول یہ تھا کہ بہتر زمانہ اختیار کیا جائے اور بُرے موسموں سے احتراز کیا جائے۔ ان کے جہاز کمزور بنتے تھے اور اُن کے ملّاح بھی ناگہانی ضروریات یا حوادث کے وقت ضرور ناتجربہ کار ثابت ہوتے ہوں گے۔ برخلاف اس کے ولندیزی اور انگریزی جہاز ایسے بنائے جاتے تھے کہ ناموافق موسم کی تھکیڑ اُٹھالیں اور اُن کے ملّاح بھی رودبار انگلستان اور بحر شمال کے (۸۸) طوفانوں میں تجربہ اور تربیت پائے ہوئے ہوتے تھے۔ یوں بھی جو لوگ یورپ سے راس امید کا چکر کاٹ کے جہاز کو صحیح سلامت ایشیا تک لا سکتے تھے، اُن پر خواہی نخواہی دل ٹھکتا تھا کہ وہ ہندوستان کے سمندروں کے بدترین حوادث کا مقابلہ کر سکتے ہیں[۱]۔ مزید برآں عام طور پر فرنگی جہاز زیادہ اچھے مسلّح ہوتے اور بحری قزاقوں کے حملے روک سکتے تھے جن کے مقابلے میں ہندوستانی جہاز قریب قریب بے دست و پا رہ جاتے تھے۔ پھر ایک بڑی وجہ ترجیح یہ تھی کہ پرتگیزوں کی محصول گیر کشتیاں ولندیزی اور انگریزی جہازوں کو، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ غرض ہندوستان کے تاجروں کا ان فرنگی جہازوں کو ترجیح دینا کچھ بیجا اور بلا وجہ نہ تھا اور ہر چند ان سوداگروں کو جن کے اپنے جہاز بھی تھے، کرائے کم ہو جانے اور بظاہر مال دوسری طرف منتقل ہو جانے سے لازماً خسارہ ہوا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ زیادہ تعداد ایسے بیوپاریوں کی تھی جو صرف اپنا مال دوسری جگہ پہنچانا چاہتے تھے اور اُنھیں جدید مقابلے کے باعث ضرور یہ موقع مل گیا ہوگا

---

[۱] فرنگی جہاز رانوں کی برتری کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہے کہ وہ بارہا ہندوستان والوں کے مملوکہ جہازوں پر مقرر کئے جاتے تھے۔ ولندیز پتوار چلانے والے خصوصیت کے ساتھ ڈھونڈ ڈھونڈ کے نوکر رکھے جاتے تھے اگرچہ انگریزوں کی بھی مانگ تھی (ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، ہفتم ۱۴۳)۔

کہ نسبتہً زیادہ حفاظت اور ارزانی کے ساتھ کاروبار کریں گے

باب سوم کے ماخذ

فصل اوّل

اس فصل کا بیشتر مضمون، انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر، باب چہارم کا ملخص ہے جس میں ہندوستان کی بیرونی تجارت کا حال تحریر ہے۔ لہٰذا تفصیلی حوالے وہیں ملیں گے۔ ہندوستان کے مال کی یورپ میں جیسی مانگ تھی، اُس کی کیفیت اگلے باب میں آتی ہے۔ سوتی مال کی جو قسمیں ہم نے گنائی ہیں یہ ولندیزوں اور انگریزوں کی تجارتی تحریروں سے ماخوذ ہیں مگر جہاں تک مجھے علم ہے اُنھیں یک جا ان تحریروں میں کہیں مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ اسباب تفنّن و آرائش کے ناموں کے متعلق ملاحظہ ہو: ٹریپ اسٹراز کورومنڈل، ضمیمۂ اول۔ اور انگلش فیکٹریز، جلد اوّل، ۶۲ و ۶۳ – ہوبسن جوبسن میں ("بیلیس گڈز" کے لفظ کے تحت میں) ان اشیا کی ایک فہرست دی گئی ہے مگر یہ بعد کے ماخذوں سے مرتب ہوئی ہے اور اس میں بہت سی ایسی چیزوں کے نام چھوٹ گئے ہیں جو ہمارے عہد میں بہت عام تھیں؛ بری راستوں کی تبدیلیوں کے بارے میں ملاحظہ ہو کورٹ منٹس، بابت ۷ر اپریل سنہ ۱۶۲۴ و ۲۹ر دسمبر سنہ ۱۶۴۳۔ اور انگلش فیکٹریز، ہفتم، ۲۰۷ و ۲۶۱۔

فصل دوم

تجارت درآمد کا احوال انگریزوں اور ولندیزوں کی تحریروں کے

باب سوم کے ماخذ

منتشر اقوال و عبارات پر مبنی ہے۔ قیمتی دھاتوں کی برآمد پر کننگ ہم نے مفصل بحث کی ہے ("دی مرکنٹائل سسٹم") مُن کا رسالہ پرچاس کے مجموعے میں شامل ہے (اوّل، پنجم ۷۳۲) انگلستان میں جو حد بندیاں کی گئی تھیں، ان کا کیلنڈر، ایس پی سے پتا چل سکتا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے مخالفت کا، کورٹ منٹس سے (۱۲ر جون ۱۶۱۸ء وغیرہ وغیرہ) سنہ ۱۶۰۹-۱۰ء میں جو ہدایات نافذ کی گئیں، وہ فرسٹ لیٹر بک ۳۱۹ اور انگلش فیکٹریز کی کیفیت (سوم، ۱۹۶) میں موجود ہیں۔ ولندیزوں کو نسبتاً زیادہ آزادی میسر تھی جیسا کہ کورٹ منٹس (۱۶ر اپریل ۱۶۲۴ء) میں وثوق سے بیان کیا ہے اور ہالینڈ کی ابتدائی سنین کی کیفیت فان ڈرچیئر، باب نہم سے ظاہر ہوتی ہے۔ ولندیزوں کو ان حد بندیوں کا جیسا احساس و ادراک تھا، اس کی مثالیں ٹرپ اسٹرا کی سورت، ضمیمہ یازدہم و سیزدہم سے نقل کی گئی ہیں؛

۸۹

فصل سوم

ایشیائی تجارت کے متعلق مُن کے خیالات خود اس کے رسالے (صفحہ ۳۴۶ و ۳۴۸) میں ملیں گے۔ کوئن کی ہدایات، کیلنڈر، ایس پی ۱۶۲۲-۲۴ء، نشان ۲۴۳ میں ملخصاً درج ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ الیاس (جلد دوم، ۳۸ و ۴۷ و ۹۱) سے ہوتا ہے۔ ولندیزی مقبوضات میں زراعت کی ترقی کا ذکر داغ رجسٹر میں جا بجا آتا ہے۔ سماترا کی سونے کی تجارت کے متعلق ملاحظہ ہو لیٹرز رسیوڈ، اوّل، ۴، ۷، ۹۷ وغیرہ۔ نیز بورنیو کی تجارت کے لئے، جلد چہارم، ۲۱۹؛

ہندوستان کے مال کی جاپانی مانگ مال کی فہرستوں سے جو داغ رجسٹر میں باقاعدہ درج ہوتی رہی ہیں، ظاہر ہوتی ہے۔ یہ

باب سوم کے ماخذ

منڈی سوتی مال کی فروخت کے لئے موزوں نہ تھی اور اس حقیقت کو لیٹرز ریسیوڈ (سوم، ۲۳۸ و مابعدہا) میں خاص طور پر بیان کیا ہے۔ ایرانی ریشم کے ملنے کی کیفیت انگلش فیکٹریز (چہارم ۱۱۶) میں ہے۔ جاپان میں ہندوستانی کھالوں کی دساور کے متعلق ملاحظہ ہو داغ رجسٹر (سیام) بابت ۴؍ نومبر ۱۶۴۱ء اور بعد کی فہرست ہائے اشیا کے خلاصے۔ ریشم کی اقسام کے بارے میں لیٹرز ریسیوڈ (سوم، ۲۴۲ و ۲۴۵) اور داغ رجسٹر۔ اسی رجسٹر میں (بابت ۱۲؍ اپریل ۱۶۴۱ء) بنگالے کے ریشم کی جاپان میں درآمد کا سب سے پہلا تذکرہ ملتا ہے۔

فصل چہارم

کھلونوں کی تجارت کی مثالیں ذیل کے ماخذوں سے لی گئی ہیں:-

لیٹرز ریسیوڈ (اول، ۳۳) ٹریپ اسٹراز سورت ۴۹، وضمیمہ ششم، ر، د، ۳۸۳؛ انگلش فیکٹریز، اول، ۱۱۔ سوم، ۱۳۴ وغیرہ؛ داغ رجسٹر (گجرات) بابت ۲۷؍ اپریل ۱۶۴۳ء۔ علاوہ ازیں اور بھی حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔

فصل پنجم

جاپان میں بنگالی ریشم کے اوزان داغ رجسٹر سے جمع کئے گئے ہیں جس میں سب سے پہلا اندراج ۲۱؍ مئی ۱۶۵۳ء کا ہے۔ قیمت انگلش فیکٹریز (نہم ۲۷۶) سے لی گئی ہے۔ کھالوں کی برآمد کی ابتدائی اطلاعیں داغ رجسٹر (بابت کورومنڈل و سیام و سنین ۱۶۴۰ و ۱۶۴۲ و ۱۶۴۴) میں درج ہیں۔

باب سوم کے ماخذ

بٹاویہ اور مصالحوں کے جزائر کی ضروریات، داغ رجسٹر کا ایک مقررہ موضوع ہیں۔ بٹاویہ کے آس پاس کے علاقے کی تباہ حالی کے متعلق ملاحظہ ہو کیلنڈر ایس پی ۱۶۲۰-۲۹ نشان ۲۵۵؛ ان جزیروں میں قیام امن کے لئے ملاحظہ ہو، ایضاً ۱۶۱۷-۲۱ وغیرہ۔

ہیگ ٹرینس کرپٹس (Hague Transcripts) سوم، ایم ۴۔ داغ رجسٹر میں بھی جستہ جستہ یہ ذکر آتا ہے اور ۶ اکتوبر ۱۶۳۶ء کے حالات میں جزیرۂ بندا کی مردم شماری درج کی گئی ہے۔

غلاموں کی تجارت کے واقعات داغ رجسٹر کے بے شمار داخلوں سے جمع کئے گئے ہیں اور ہیگ ٹرینس کرپٹس اور انگلش فیکٹریز کی مختلف جلدوں سے مدد لی ہے۔ قحط کی تجارت کا بھی داغ رجسٹر میں ایک مستقل عنوان ہے۔ قطعی ممانعت کی مثال دیکھنی ہو تو اس کا داخلہ بابت ۶ جنوری ۱۶۴۵ء (ارکان) ملاحظہ ہو۔ تمباکو کی تجارت کا انگلش فیکٹریز کی مختلف جلدوں میں ذکر آتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو میتھولڈ ۱۰۰۴۔ داغ رجسٹر بابت ۶ اکتوبر ۱۶۳۶ء وغیرہ۔

فصل ششم

پرتگیزی بستیوں کی ہلاکت اس زمانے کی کتابوں کا عام موضوع ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو پی رارڈ (Pyrard ترجمہ انگریزی) دوم ۲۰۳؛ ڈلاویل (Della valle) اول ۱۵۷؛ انگلش فیکٹریز پنجم وغیرہ؛ اور چند سال بعد کی کتابوں میں ماسٹر دوم ۸۴؛ یورپ ۱۹۱؛ "قافلہ" (بحری) کی مختلف مصنفوں نے کیفیت لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو پی رارڈ ۲، جورڈین ۱۴۴ اور اس کے زوال کے متعلق دیکھو خطوط منقولۂ ٹرپ اسٹراز سورت، ضمیمہ یازدہم وغیرہ اور پلسارٹ ۷، ۹۸؛ آچین میں جہازرانی کے حالات کا سب سے اچھا ماخذ داغ رجسٹر ہے (اکتوبر ۱۶۲۵ء سے لے کے آیندہ مجموعوں تک) ہرمز کی جہازرانی کا مطالعہ بھی اسی کتاب کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

باب سوم کے ماخذ

نیز ملاحظہ ہو ٹرپ اسٹراز سورت اور انگلش فیکٹریز، پنجم وغیرہ۔ بحر قلزم کے
تجارتی راستے کی داستان انگریزی اور ولندیزی تحریروں میں پاشان
پائی جاتی ہے۔ ابتدائی مخالفت کا ذکر لیٹرز ریسیوڈ (ششم، ۲۲۷) میں تحریر ہے۔
نیز ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، اوّل، وغیرہ وغیرہ۔ اور ولندیزوں کا اس
۹۰ تجارت میں شریک ہونا ٹرپ اسٹراز سورت (سی، دہم) میں مذکور
ہے۔ سورت کی جہازرانی کے از سر نو فروغ پانے کے متعلق دیکھو
انگلش فیکٹریز، ہفتم، ۲، ۱۴ وغیرہ ؏

کورومنڈل کی ساحلی تجارت میں تغیر کا ذکر رین ویل (ہفتم، ۴۹۴) میں آتا ہے۔ شمالی بندرگاہوں کی ابتدائی کیفیت شورر (Schorer) ۳-۶، میں اور مچھلی پٹم کی بعد کی اجارہ داری انگلش فیکٹریز میں مذکور ہے (ہفتم، ۵۵۰ وغیرہ) اس اجارے کے خاتمے کا داغ رجسٹر (بابت ۱۱ و ۱۶ مئی ۱۶۶۱ء) سے پتا چلتا ہے۔ پیپلی میں جہازوں کی تعداد کا اندازہ بھی اسی کتاب سے ہوتا ہے (بابت کورومنڈل مورخہ ۳۰ اپریل و یکم جون ۱۶۴۴ء) انگریزوں اور ولندیزوں میں جہازرانی کا جو سرگرم مقابلہ ہو رہا تھا اُس کے لئے ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (ہشتم، ۳۰۱ وغیرہ) اسی کتاب سے ہندوستانی تاجروں کا فرنگی جہازوں کو ترجیح دینا ظاہر ہوتا ہے (جلد اوّل وغیرہ) منجملہ دوسرے مصنّفوں کے فان ٹوسٹ نے بھی ہندوستانی جہازوں کی کمزوری اور ان کے اسلحہ کے نقائص تحریر کئے ہیں۔ (سی، ۴۶) ؏

* * *

باب چہارم

مغربی یورپ میں نئی منڈیوں کا قیام

۱- مغربی یورپ سے تجارت ، سترھویں صدی کے آغاز میں :-

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد میں تجارت نے کیا کچھ نشوونما حاصل کیا اور ہندوستانی مال کی نئی منڈیاں انگلستان و فرانس و ہالینڈ میں کہاں کہاں قائم ہوئیں ۔ مگر سترہویں صدی کے آغاز میں یورپ کی تجارت پر نظر ڈالتے وقت مناسب ہوگا کہ ہم بیان کی آسانی کے لئے اسے تین خطوں میں تقسیم کر دیں :- ۱- خطہ روس ، ۲- خطہ بحر متوسط اور ۳- خطہ اوقیانوس ؛- ان میں جہاں تک روس کے خطہ کا تعلق ہے ، ہندوستا کے مال کی ایک محدود مقدار شمال مغرب کی طرف سے ، بحر خزر و بحر اسود کے راستوں سے روسی علاقوں میں پہنچتی تھی اور ہم کبھی کبھی اس قسم کی تجاویز بھی پڑھتے ہیں کہ دریائے والگا کے وسائل آمد و رفت کو ترقی دے کر شرقی مال بالٹک کی بندرگاہوں تک پہنچایا جائے اور وہاں سے لندن لے آیا کریں۔ لیکن عملاً یہ آمد و رفت کبھی کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکی اور خود روس کی

باب چہارم

مامگ یا کچپست میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کوئی خاص تغیر واقع نہیں ہوا۔ نظر بر ایں اس خطے سے ہمیں مشکل سے کوئی سابقہ پڑے گا۔ البتہ بحر متوسط کے خطے میں عرصہ تک ایشیا کی اجناس بحر قلزم اور خلیج فارس کے ذریعہ آتی رہیں اور پندرہویں صدی کے ختم تک انہی راستوں سے خطہ اوقیانوس میں تجارتی مال پہنچتا رہا۔ لیکن مصارف حمل ونقل کی گرانباری نے لامحالہ اس تجارت کی ترقی محدود کر دی تھی اور اوقیانوس کے یورپی ساحلوں تک ایشیا کا جو مال پہنچتا تھا، اس میں مصالح، ادویہ اور نوادر کے سوا مشکل سے کوئی دوسری چیز شامل ہوتی تھی۔ پس لزبن سے بحری راستہ کھلنے کے بعد خواہی نخواہی تجارتی تنظیم بھی بدل گئی اور نہ صرف اوقیانوس کے ملکوں میں مال ارزاں پہنچنے لگا بلکہ خود بحر متوسط کی منڈیوں میں اس طرف سے آیا ہوا مال مقابلے میں آنے لگا۔ اور گو ممالک ترکی سے اس کی آمد اور یورپ میں تقسیم کا سلسلہ جاری رہا، تاہم بری تاجروں کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور سولھویں صدی میں مال لانے والوں کے لئے یہ موقع نکل آیا کہ حلب و اسکندریہ کے راستے ال بھیجیں خواہ لزبن کے راستے۔ اور سمندر کے راستے مال بھیجنے میں ایسی خوبیاں نظر آتی تھیں، کہ کم سے کم ان منڈیوں کے معاملے میں جو لزبن کے قریب واقع تھیں، قطعی طور پر یہی راہ قابل ترجیح سمجھی جاتی تھی۔ 92

مگر پرتگیزوں کو جو یہ موقع حاصل ہوگیا تھا اس سے پوری طرح کام لینے کی انھوں نے کچھ زیادہ کوشش نہیں کی۔ جیسا کہ ہم گزشتہ باب یں بیان کر آئے ہیں اتنا تو انھوں نے کیا کہ ہندوستان کے سوتی ال کی مغربی افریقہ اور برازیل میں تجارت کی بنیاد ڈال دی لیکن اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انھوں نے یورپ کے اوقیانوسی خطے یں جہاں بڑی بڑی منڈیاں موجود تھیں۔ ہندوستان سے نئی اجناس لانے کا کام بھی انجام دیا۔ بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ بن سے جو جہاز یورپ کی شمالی بندرگاہوں کو جاتے ہیں ان میں

بیشتر ادویہ اور مصالحے یا مشرق اقصیٰ کی وہی اشیا ہوتی ہیں، جن کی پہلے سے وہاں مانگ تھی۔ اور نیل، شورہ یا لٹھا، جو ہماری پیش نظر عہد میں کثرت سے بکنے لگے تھے، سولھویں صدی میں ان کی فروخت کا ذکر تک نہیں آتا۔ خلاصہ یہ کہ پرتگیزوں کے اس میدان میں قدم دھرنے سے بجز اس کے اور کوئی تغیر نہیں ہوا کہ جو چیزیں پہلے سے کھپتی تھیں وہی ذرا ارزاں اور زیادہ مقدار میں بہم پہنچنے لگیں۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تجارت لزبن کے تفصیلی حالات پر گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اسے بہت اہتمام کے ساتھ راز میں رکھا جاتا تھا اور باہر کے مال کی مقدار یا قیمت یا وہاں سے دوسری منڈیوں کو بھیجنے کے متعلق کوئی سرکاری اعداد مجھے نہیں مل سکے۔ البتہ منڈیوں کے بارے میں اجمالی طور پر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ سوتی مال کی زیادہ مقدار تو مراکش، برازیل یا افریقہ کے ساحل گنی آنا کو جاتی تھی، اور مرچ، اور دوسرے مصالحے ولندیزی کشتیوں میں لالا کر اینٹ ورپ، ایمسٹرڈم، یا شمالی یورپ کی دوسری بندرگاہوں تک پہنچتے تھے۔[1]

لندن کے سرکاری محافظ خانے میں دو ایسی فہرستیں بھی محفوظ ہیں، جن میں سنہ ۱۶۰۲ء اور سنہ ۳ء کے (لزبن میں) درآمدہ مال کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ ان سے سرسری طور پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ سترہویں صدی کے آغاز میں لزبن میں مال کی کتنی مقدار باہر سے آتی تھی اور یہ وہ زمانہ ہے جس کے بعد ہی دوسرے حریف میدان میں آئے یعنی ولندیزوں اور انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے کارخانے قائم کئے۔ یہ تحریر نہیں ہے کہ ۹۳

---

[1] ان فہرستوں کو سرکاری کاغذات۔ صیغہ خارجہ۔ پرتگال۔ جلد سوم۔ نشان ۷ و ۱۰۷ کے عنوان کے تحت میں رکھا ہے اور کیلنڈر، ایس پی، سنہ ۱۵۱۳ء تا سنہ ۱۶۱۶ء میں ان کا نشان ۳۰۹ اور ۳۲۷ درج ہے۔ انہیں انگریزی میں مس ای سالسبری نے ترجمہ کیا جس کے لئے میں موصوفہ کا احسان مند ہوں۔

باب چہارم

ان اعداد کا ماخذ کیا ہے لیکن یہ فرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ انہیں چوری چھپی فراہم کیا گیا تھا اور ان کی جزئیات میں عجب نہیں کہ موٹی موٹی غلطیاں رہ گئی ہوں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے کے تجارتی حالات کی جو تحریریں ملتی ہیں، یہ فہرستیں ان کے ساتھ اصولی مطابقت رکھتی ہیں اور ذیل میں ان کا خلاصہ ایک ایسا اندازہ پیش کرتا ہے جو غالباً مجموعی طور پر اصلیت سے زیادہ دُور نہیں ہوگا:۔

مال کی آمد گوآ سے لزبن کو

جنس	پیمانہ	مقدار سنہ ۱۶۰۲ (دو نیم جنگی جہاز)	مقدار سنہ ۱۶۰۳ (۲ نیم جنگی جہاز = کیرک)
مصالحے	دو کوان ٹل " (= ۱۳۰ پونڈ)	۹۸۵۱ ½	۲۵،۵۸۲ ½
نیل	"	۱۷ ½	۸۰۹
دیگر اشیا بتصریح وزن	"	۸۸۹	×
ریشم	صندوق	۳۰۳	۹۳۱
لٹھا (یا سوتی پارچہ)	"	۸۶	۰
"	بڑے گٹھوں میں	۲۷۳	۹۵۹
"	چھوٹے گٹھوں میں	۱۴۶	۵۳۱۴

سنہ ۱۶۰۳ میں ان سب کو مجموعی طور پر "لٹھا" "پارچہ" "ریشم وغیرہ" کے ایک عنوان کے تحت میں لکھدیا ہے؛

ف۔ ان کے علاوہ مشک، عنبر، جواہرات، چینی ظروف بھی مختلف پیمانوں کے ساتھ فہرست میں درج ہیں

ہر صورت میں یہ اوزان سال بھر کی پوری مقدارِ مال بتاتے ہیں

اور ان میں بہت سا مال ہندوستان کے علاوہ بعید تر ممالک ایشیا کا بھی شامل ہے۔ اس میں بعض اجناس تو صریحاً ہندوستان کے باہر کی ہیں اور صرف انہی کو خارج کر دیجیے تو ہندوستان کی تجارتی اشیا کی غالباً یہ فہرست ہوگی :۔

جنس	پیمانہ	سنہ ١٦٠٢	سنہ ١٦٠٣	مقام برآمد (بقرینۂ غالب)
مرچ	کوانٹل	٧,٥٩٨	٢١,٣٤٩	ساحل ملیبار
ادرک[1]	"	؟	..	..
الائچی	"	٨٢	.	جنوبی ہند
نیل	"	١٧½	٨٠٩	گجرات یا آگرہ
جست (= کچا ہیرا)	"	٢٧	..	گجرات
آبنوس	"	؟٥٥	..	ممکن ہے کہ جنوبی ہند سے آتا ہو مگر قیاس غالب یہ ہے کہ مشرقی افریقہ سے آتا تھا
لٹھا	صندوق اور گٹھے	..	..	ہندوستان کے ہر ساحل سے
قیمتی دھاتیں	..	؟	؟	ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ غالباً ہیرا اور کچھ موتی ہندوستان سے آتے تھے ؛

---

[1] سنہ ١٦٠٢ میں ادرک کے ١٢٧٧ کوانٹل درج ہیں لیکن یہ تعین نہیں ہو سکا کہ یہ کہاں سے آئی یورپ کی منڈیاں ہندوستان کی ادرک پر چینی ادرک کو ترجیح دیتی تھیں اور اسی لئے اگر سب نہیں تو اس مقدار کا ایک جزو ضرور چین سے آیا ہوگا ؛

ان اعداد کا صحیح مطلب سمجھنے میں بڑی دشواری یہ ہے کہ ان میں سوتی پارچے کی مقدار کی نسبت سرسری قیاس بھی نہیں ہو سکتا۔ سنہ ۱۶۰۲ کی فہرست میں یہ مال، نیتھے کی جداگانہ مد میں داخل کیا گیا ہے۔ لیکن صندوق یا گٹھے کا پیمانہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے اور یہ بھی محض قیاسی بات ہے کہ اس مال کا بیشتر حصہ ادنیٰ درجہ کے موٹے کپڑے پر مشتمل تھا جو برازیل یا مغربی افریقہ میں کھپتا تھا۔ ورنہ صندوق یا پیٹی کا لفظ ہونے کے باوجود بہت ممکن ہے کہ ان صندوقوں میں خود اہل پرتگال کے استعمال یا خوردہ فروشی کے لئے، ململ یا رنگین پارچہ وغیرہ زیادہ قیمت کا سامان بھی ہو۔ پھر سنہ ۱۶۰۳ کی فہرست سے تو اس بارے میں اتنا بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ اس میں صندوقوں اور گٹھوں کی اتنی بڑی تعداد لکھ کر اسے "ولٹھا، پارچہ، ریشم، وغیرہ" کی ایک ہی مد میں گھسیٹ دیا ہے۔ اور اگر ان اعداد کو درست مان لیں تو بھی اس میں مشرق اقصیٰ کے ریشم یا متفرق اشیا کی ایک غیر معین مقدار شامل ہے جو انہی صندوقوں یا گٹھوں میں بھر کے بھیجی گئی ہوگی[1]۔ ان سب احتمالات کو پیش نظر رکھئے تو زیادہ سے زیادہ یہ

---

[1] یہ قیاس کرنے کی وجوہ یہ ہیں کہ گو پرتگیزی گٹھے مختلف وزن کے ہوتے تھے لیکن مجموعی طور پر یہ ولندیزوں اور انگریزوں کے گٹھے سے جو بعد کے زمانے میں مروّج ہوا، کم اور شاید بہت کم وزن کے تھے۔ لنشوٹن (Linschoten) (۹۲) سے ولندیزی جہاز (= کیرک) کے بھرے جانے کی جو کیفیت معلوم ہوتی ہے، اس کے اعتبار سے تو مرسلہ مال میں لوگوں کا ذاتی سامان بھی داخل تھا بلکہ اسی قسم کے ذاتی سامان کی بہت سی چیزیں ہوتی تھیں اور ان کا وزن اس قدر کم ہوتا تھا کہ اسے معمولی "بہنگی" یا پارسل کے نام سے یاد کرنا غلط نہ ہوگا۔ اور پِلاویل (صفحہ ۶۰) میں بھی ولندیزوں اور انگریزوں کے گٹھوں کو بہت بڑا "دو رومی گاڑی کے برابر" بتایا گیا ہے حالانکہ مصنّف پرتگیزوں کے زیر اثر کتاب لکھ رہا ہے۔ غرض پرتگیزوں کے گٹھوں کو جو ان کے نیم جنگی جہازوں میں بار ہوتے تھے اس قسم کے معیاری گٹھے نہ سمجھنا چاہیئے جن کے وزن پر ضمیمہ "ق" میں بحث کی گئی ہے۔ بلکہ ان کی صحیح جسامت محض قیاسی ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ اُن دنوں لزبن میں بڑی مقدار میں دو چیزیں ہندوستان سے آتی تھیں: ایک تو مرچ جس کا حصہ اکثر شمال کے ملکوں میں تقسیم ہوتا تھا، اور دوسرے سوتی پارچہ جس میں افریقہ اور جنوبی امریکہ کی مانگ کے مطابق بیشتر موٹا کپڑا رہتا تھا۔ اور ان کے علاوہ نیل، الائچی اور جست تھوڑی تھوڑی مقدار میں، اور ممکن ہے کہ ہیرے اور موتی کے ساتھ کچھ آبنوس اور ادرک بھی آتی ہو۔

ہمارے پیش نظر زمانے میں مغربی یورپ کی تجارت کا بڑا حصہ پرتگیزوں کے ہاتھ سے نکل کے، ولندیزوں اور انگریزوں کے پاس منتقل ہو گیا لیکن ایک استثنیٰ کے سوا، اس تغیر سے ہندوستان کے فوائد پر کوئی اور اثر نہیں پڑا۔ یہ استثنیٰ ملیبار کی مرچ کے بارے میں ہے کہ سولھویں صدی میں جس قدر مرچ لزبن آتی تھی، وہ سب اسی علاقے کی پیداوار ہوتی تھی جو کوچین یا قریب کے دوسرے ساحلی مقامات سے جہازوں میں بھر دی جاتی تھی اور ہر مقام کے حکام سے پرتگیزوں نے ۹۵ جدا جدا معاملہ کر رکھا تھا۔ سماترا، جاوا اور ان کے بھی آگے کے مشرقی علاقوں کی مرچ کی پرتگال کے اجارۂ شاہی کے کارندے کوئی خرید فروخت نہیں کرتے تھے اور جب تک جہازرانی تمام و کمال پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی، اس وقت تک یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ان اقطاع کی پیداوار پرتگیزوں کے علم کے بغیر یورپ پہنچ سکے[۱]۔ بعد میں ولندیز اور انگریز جو مرچ لانے لگے

---

[۱] ولندیزوں کے پہلے بحری سفر کے رسالے میں ایک نئی بات یہ بھی لکھی ہے (ہولنس ٹین، اوّل، ص ۱۰۵) کہ پرتگیز جاوا کی مرچ خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن فغفور چین نے انھیں کچھ روپیہ دے دیا کہ وہ اس تجارت کو اسی بادشاہ کی رعایا کے لئے رہنے دیں۔ رسالے کے مدوّن اس روایت کو محض دلگی کی بات سمجھتے ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ اس کی تہ میں کچھ صداقت ہو۔ مکاؤ کے پرتگیزوں اور چینی عمال میں کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا ممکن ہے کہ انھوں نے جاوا کی پیداوار کو مغرب کی طرف لے جانے کی دھمکی دے کر حکومت کینٹن کے ساتھ (بقیہ صفحہ دیگر)

وہ بیشتر جاوا اور سماٹرا ہی کی پیداوار ہوتی تھی، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ملیبار سے خریداری کی جو کوششیں انھوں نے کیں وہ اوّل اوّل بار آور نہ ہوئیں لیکن ان کی سرگرمیوں سے پرتگیزوں کی وہاں سے برآمد میں بھی رکاوٹیں پڑ گئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے یورپ کو مرچ کا دساور جانا کم ہو گیا اور ہندوستان کو کچھ عرصے تک یہ نقصان ہوتا رہا۔ انتقالِ تجارت میں آسانی کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ مرچ ایک مرتبہ کاشت ہونے کے بعد تین چار سال تک فصل دیتی رہتی ہے اور جب طلب بڑھی تو لازماً جاوا اور سماٹرا سے مرچ کی رسد رسانی میں اضافہ ہوا اور اسی نسبت سے ہندوستان کی پیداوار میں کمی ہو گئی ہو گی اگر چہ کوئی تحریر موجود نہیں ہے جس میں اس واقعے کا تذکرہ ہوئے

واضح رہے کہ ملیبار کی برآمد میں اس عارضی کمی کا سبب یہ نہ تھا کہ ولندیز یا انگریز یہاں کی پیداوار لینے میں تامل کرتے تھے۔ اس کے برخلاف انھوں نے بارہا کوشش کی مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ولندیزوں کو کالی کٹ میں کارخانہ قائم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی اور یہ خاص طور پر قابل لحاظ بات ہے کہ بعد میں انھوں نے مشرقی ساحل سے بھی مرچ باہر بھیجنے کی کوشش کی جو خرچ کی زیادتی کے باعث فروغ نہ پا سکی۔ اسی طرح انگریز کالی کٹ کی ناکامیوں کے بعد، سورت کو مرچ کی منڈی بنانے میں ساعی رہے کہ وہاں سے اسے یورپ بھیجتے رہیں۔ لیکن بہت دشواریاں پیش آئیں اور
۹۶ بنتم کی نسبت دگنا خرچ پڑا اور بالآخر ۱۶۳۰ء میں بنتم ہی کو حتمی طور پر
انگلستان مال بھیجنے کا مرکز منتخب کر لیا گیا۔ مگر پانچ سال بعد

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حسب مراد شرطیں طے کرنے میں کام لیا ہو۔ بہر حال یہ تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ ولندیزوں کے جاوا آنے سے پہلے اس جزیرے کی پیداوار بیشتر چین ہی کو جاتی تھی؛

پرتگیزوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تو ایک دفعہ کثیر مقدار میں گوآ بھی مال لایا گیا اور رفتہ رفتہ ملیبار میں بھی خرید و فروخت کی اجازت مل گئی چنانچہ سنہ ۱۶۴۰ء کے بعد سے ہم ولندیزوں اور انگریزوں کو برابر ملیبار نیز کوکن کی بندرگاہوں سے مال خریدتے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر عہد کے عین ختم کے وقت ایک انگریزی کارخانہ بھی کالی کٹ میں قائم ہوتا ہے اور اس کے چند سال بعد ولندیز خود کوچین میں قبضہ جما لیتے ہیں۔ غرض تجارت میں پھر فروغ و سرسبزی کے آثار نظر آتے ہیں اور گو اس میں شک نہیں کہ دوسرے مقامات میں انہی اجناس کی پیداوار و بہم رسانی کے باعث ہندوستانی مالکان اجناس کو کچھ عرصے تک نقصان اٹھانا پڑا تاہم اس کی تلافی یوں ہو گئی کہ نیل، شورے وغیرہ کی تجارت میں ملک کو خوب فائدہ ہونے لگا جس کی تفصیلی کیفیت اسی باب کی آئندہ فصلوں میں ہماری نظر سے گزریگی۔

۲۔ مغربی یورپ کی دساور کی مقدار

مغربی یورپ کی اس جدید بحری تجارت کی مقدار کا اندازہ لگانا کچھ سہل نہیں ہے۔ کبھی کبھی انگریزوں کا حصہ ہی مشکوک ہے جیسا کہ ہم آگے مطالعہ کرینگے لیکن بڑی دقت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ولندیزوں نے مال جہازوں میں بھرنے کا اور پھر اسے قلمبند کرنے کا ایک خاص طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ اصل میں مجموعی طور پر دیکھیے تو ولندیز اپنی تجارت کو مرکزی بنانا زیادہ پسند کرتے تھے اور ہندوستان کے دونوں ساحلوں، نیز چین، جاپان اور جزائر کا مال پہلے بتاویہ میں جمع ہوتا تھا کہ وہاں سے سالانہ بیڑوں میں یورپ روانہ کیا جائے۔ مگر ہمارے پیش نظر عہد میں ان بیڑوں کا مال عام طور سے، رسائل بتاویہ میں قلمبند نہیں کیا جاتا تھا اور اگر کسی غیر مطبوعہ تحریر میں ان کی

باب چہارم جزئیات کہیں دبی پڑی ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ اب یہ اندازہ کرنا کہ ہندوستان کا کس قدر اور کس مالیت کا اسباب ان جہازوں میں بار ہوا، غیر ممکن ہے اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مال کی فہرستیں ان رسائل میں مل جاتی ہیں جو ہندوستان سے بتاویہ آیا اور ان داخلوں سے ایسی اجناس کی مقدار کا تخمینہ کر لینا ممکن ہے جو صرف یورپ بھیجی جاتی تھیں، جیسے نیل یا شورہ۔ لیکن سوتی سامان ۹۷ کے معاملے میں یہ تدبیر کام نہیں دے سکتی کیونکہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ بتاویہ سے جو مال دوسرے ملکوں کو گیا (اور زیادہ مقدار ایشیائی ملکوں کے لئے ہوتی تھی) اس میں خاص یورپ کے کتنے گٹھے تھے۔ بطور مثال صرف یہ واقعہ لکھنا کافی ہوگا کہ نومبر ۱۶۴۲ء میں مچھلی پٹم سے ایک چالان تباویہ روانہ ہوا جس میں ۵۹۷ گٹھے سوتی مال کے، ۲۹۷، نیل کے، ۴۹۸ گٹھے ذرد رے شورے کے اور ۴۴۵ بورے صاف شورے کے بھیجے گئے اور انہی کے ساتھ، تاگا، گیہوں، لوہا اور باروت کی بھی کچھ مقدار تھی۔ ان میں سے آخر الذکر تین چیزیں صریحاً تباویہ یا اور کسی ایشیائی مقام کے واسطے بھیجی گئی ہونگی۔ تاگا مشتبہ ہے، لیکن کیفیت بیان کرنے میں جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنس خاص طور پر تباویہ ہی کی بندرگاہ میں استعمال کے واسطے آئی تھی۔ نیل اور شورہ یقیناً یورپ کے لئے بھیجے گئے لیکن سوتی مال کی اتنی بڑی مقدار کے متعلق سوائے قیاس کے اور کوئی ذریعہ یہ کہنے کا نہیں ہے کہ وہ کہاں جانے والا تھا، غرض، ہم خاص خاص اجناس کی نسبت تو یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی مقدار کتنی ہوگی لیکن ساری تجارت کی مجموعی مقدار نہیں بتا سکتے ہیں۔

مزید برآں ایک پیچیدگی یہ آپڑی ہے کہ تجارت کا تباویہ میں یہ تمرکز گو معمول بہا تھا تاہم کبھی کبھی اس کے خلاف بھی عمل ہوتا رہتا تھا اور ولندیزی جہاز ہندوستان کے دونوں ساحلوں سے براہِ راست

بھی یورپ جاتے رہتے تھے جن کے مال کی فہرست رسائل بٹاویہ میں درج نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ساحل کورومنڈل سے ۱۶۱۵ء سے اور سورت سے ۱۶۲۳ء کے قریب سے اس طرح براہ راست گو کچھ وقفوں کے ساتھ، جہازوں کے جاتے رہنے کا ہمیں علم ہے[۱]۔ ۱۶۲۰ء میں کمپنی نے بھی اجازت دے دی تھی کہ سورت سے براہ راست جہاز یورپ روانہ ہوں۔ ۱۶۲۶ء میں کورومنڈل سے جہازوں کا جانا روک دیا گیا اور دو سال بعد یہی ممانعت سورت کے لئے بھی کی گئی لیکن یہ عارضی انتظام تھا اور کچھ مدت کے بعد سورت سے پھر براہ راست جہاز جانے لگے لیکن ان کی صحیح تعداد کے متعلق کوئی مکمل تحریری شہادت مجھے دستیاب نہیں ہوئی۔ مختصر یہ کہ بٹاویہ سے یورپ جانے والے مال کا ٹھیک اندازہ بھی ہم کر سکیں تو بھی کل میزان میں کمی رہ جائے گی اور ہم اس مال کو شامل نہ کر سکیں گے جو براہ راست ہندوستان سے بھیجا گیا اور جس کی کوئی تحریری سند موجود نہیں ہے۔ ان دشواریوں کو دیکھ کر بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مبحث پر انگریزوں کی تجارت کا مطالعہ کریں کہ اس میں اتنی الجھنیں نہیں پائی جاتیں، انگریزوں کے معاملے میں ایک سہولت تو یہ ہے کہ ۱۶۴۲ء تک ہم صرف سورت کے فرستادہ مال کو ۹۸ انگریزوں کی تجارت کی میزان تصور کر سکتے ہیں کیونکہ مشرقی ساحل سے انگریزوں نے کچھ عرصے بعد مال بھیجنا شروع کیا[۲] اگرچہ ممکن ہے کہ خاص خاص

---

[۱] ضمیمہ ب میں، میں نے بعض چالانوں کے جو براہ راست ہندوستان سے یورپ گئے، خلاصے درج کئے ہیں اور یہ ولندیزوں کی اصلی رسیدوں سے ماخوذ ہیں۔

[۲] جہاز بونی ٹو جو ۱۶۴۹ء میں مدراس سے روانہ ہوا، بظاہر اس ساحل سے براہ راست انگلستان جانے والا پہلا انگریزی جہاز تھا (انگلش فیکٹریز ہشتم)۔ مشرقی ساحل سے براہ راست جہازوں کے جانے پر گفتگو تو مدراس کی بنا پڑنے سے قبل ہونے لگی تھی لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا، اس پر پہلے عمل کی نوبت نہیں آئی۔

اشیا، کسی باعث بنتم کے راستے کورومنڈل سے بھی بھیجی جاتی رہی ہوں تو اس (انگریزی) تجارت کے متعلق یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ جو مال لندن جاتا تھا، اس کا ایک معتدبہ حصہ وہاں سے پھر یورپ کی منڈیوں کو بھیج دیا جاتا تھا۔ زمانۂ حال کے معیار سے دیکھیئے تو ان دنوں انگلستان کی آبادی بہت کم اور مال کی کھپت بھی اسی نسبت سے محدود تھی۔ لیکن ہمسایہ ممالک خصوصاً فرانس، جس کی آبادی نسبتہً زیادہ تھی، لندن سے ایشیائی مال کے طالب رہتے تھے اور لٹھے کے معاملے میں خصوصیت کے ساتھ فرانس کی مانگ پر لندن کی ہندوستان سے فرمائش کا بہت کچھ انحصار ہوتا تھا۔ غرض، جب انگلستان کی تجارت کا نام آئے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں ایک بڑا حصہ مغربی یورپ کے لئے شامل ہوتا تھا۔

سورت سے انگریز جو مال باہر لے جاتے تھے، اس کے کئی دور قرار دینے چاہئیں۔ سنہ ۱۶۲۰ء تک تو اس مال کو ہم صرف نیل اور متفرقات پر مشتمل سمجھ سکتے ہیں لیکن آیندہ عشرہ میں لٹھے نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ پھر ہندوستان میں جو قحط عظیم ہوا، اس کا سنہ ۱۶۳۰ء سے سنہ ۳۷ء تک اس برآمد پر بھی اثر پڑا لیکن سنہ ۳۸ء سے سنہ ۱۶۵۳ء تک معقول مقدار میں مال جاتا رہا اگرچہ اس میں کوئی خاص بیشی نہیں ہوئی۔ اس برآمد میں خاص خاص اشیا یہ تھیں:- لٹھا، نیل اور تاگا؛ ان کے علاوہ شورہ، مرچ، شکر، ادرک، چیڑا اور بعض دوسری چیزوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۶۵۳ء سے چند سال آگے تک انگریزی کمپنی کچھ مدت بیکار رہی۔ خانگی جہازوں میں مال لانے کی اجازت دے دی گئی تھی اور ان کی لائی ہوئی مقدار کا تخمینہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ لیکن آخرکار سنہ ۱۶۵۷ء سے کمپنی کی سرگرمیاں برابر بڑھنے لگیں۔ یہ کامیابی لندن میں جدید سرمایہ ل جانے کا نتیجہ تھی۔ اسی زمانے میں، گویا ہمارے پیش نظر عہد کے آخری عشرہ میں مشرقی اور مغربی ساحلوں کی اہمیت میں بھی ایک بڑا فرق

پیدا ہوگیا۔ ایک تو بنگالے سے تجارت شروع ہوئی، دوسرے یہ ثابت ہوگیا کہ مدراس کا لٹھا (گجرات کے ساختہ کپڑے کی نسبت) یورپ کی منڈیوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ تیسرے نیل کی تجارت میں زوال آیا جس کی برآمد کی سب سے بڑی بندرگاہ سورت تھی، پھر گجرات کے نظم و نسق میں بھی بعض خرابیاں واقع ہوگئیں، اور ان سب اسباب نے مل کر مشرقی ساحل ہند کو زیادہ وقعت دے دی جو آئندہ کئی سال تک اسے حاصل رہی۔

انگریزی تجارت کے پہلے دور کی کیفیت دکھانے کے لئے صرف ایک تجارتی موسم (سنہ ۱۶۱۸-۱۹) کی برآمد کا نقشہ پیش کرنا کافی ہوگا۔ یہ انگریزی جہاز رائل این کے مطلوبے میں درج ہے جو سات لاکھ بیس ہزار محمودی (= ۲،۸۸،۰۰۰ روپیہ) کی مالیت کا چالان لے کر فروری میں سورت سے روانہ ہوا اور اس میں حسب ذیل اشیا شامل تھیں[۱] :-

---

[۱] یہ اعداد میں نے انگلش فیکٹریز (اوّل، ۶۱) سے جس میں پورا مطلوبہ طبع کر دیا گیا ہے، چن لئے ہیں۔ اس موقع پر نیز دوسری جگہ میں نے کسرات چھوڑ دی ہیں ورنہ اصل عبارت میں آنہ پائی تک کی کسرات موجود ہیں۔ اس زمانے میں ایک محمودی ۲/۵ روپیہ کے برابر ہوتی تھی۔ ہندوستان کی تجارت کو سنین کی بجائے تجارتی موسموں سے یاد کرنا زیادہ مناسب سمجھا گیا کیونکہ وہ فی الواقع موسم سے وابستہ تھی۔ چنانچہ جس قدر مال سورت میں جمع ہوتا رہتا وہ دسمبر یا جنوری ہی میں، جیسی مصلحت ہو، روانہ کیا جاتا تھا۔ انگلش فیکٹریز میں جہازوں کی روانگی کی جو فہرستیں سنہ وار درج کی ہیں ان سے یہ مغالطہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تجارت نہایت بے قاعدہ تھی۔ حالانکہ وہ حقیقت میں اتنی زیادہ بے قاعدہ نہ تھی جتنی ان فہرستوں سے نظر آتی ہے۔ مثلاً ان میں سنہ ۱۶۳۹ میں تین، سنہ ۱۶۴۰ میں دو اور سنہ ۴۱ میں صفر، جہازوں کی روانگی دکھائی ہے۔ حالانکہ دراصل پہلے دو سنوں میں ۲-۲ اور تیسرے سال (= سنہ ۱۶۴۱-۴۲) میں ایک جہاز روانہ ہوا تو

				میزان	
نیل	(از سرکھیج)	۳،۵۱،۰۰۰	محمودی		
	(از بیانہ)	۲،۷۸،۰۰۰	"	۶،۳۰،۰۰۰	محمودی
لٹھا				۷۷،۰۰۰	محمودی
نمونے اور اسباب تکلّف				۷،۶۰۰	"
چمڑا				۳۰۰۰	"
مُہری لاکھ				۲۰۰	"
ہلدی				۱۵۰	"
جواہرات اور متفرقات				۱۷۵۰	"
میزان کل				۷،۲۰،۰۰۰	"

ان کے علاوہ نیل کا بُرادہ جس کی کوئی قیمت درج نہیں، اور کچھ پرتگیزوں سے چھینا ہوا پردیسی مال بھی جہاز پر بار تھا؛ فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کُل برآمد میں ۸۷ فیصدی مالیت اکیلے نیل کی تھی اور وزن میں بھی وہ دو سو ٹن[1] تھا۔ اصل یہ ہے کہ تجارت کے اس دَور میں سب سے نمایاں شے نیل ہی کی مانگ تھی اور انگریزوں کی طرح ولندیز بھی یہی رائے رکھتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے ۱۰۰ کہ وہ مشرقی ساحل سے کثیر مقدار میں نیل بھرنے لگے تھے اور سورت سے بھی جو مال انھوں نے سنہ ۱۶۲۲ء میں بٹاویہ بھیجا اس میں زیادہ حصہ نیل ہی کا تھا جس کے باعث ان کے صدر ناظم (گورنر جنرل) نے انھیں ملامت بھی کی کیونکہ وہ اس وقت مشرق کے اور بھی آگے کے جزیروں سے

---

[1] اصل عبارت میں نیل کے چار میں سے تین چالانوں کا وزن دیا ہے اور چوتھے کے صرف گٹھے لکھ دیئے ہیں۔ مگر اس چوتھے کی قیمت سے میں نے اس کے وزن کا اندازہ لگا لیا کہ شرح قیمت اس کی بھی وہی ہوگی جو دوسرے چالانوں کی بتائی گئی ہے؛

مصالحے خریدنے کی فکر میں تھا اور اس تجارت کے لئے اسے زیادہ ضرورت سوتی مال کی تھی۔

۱۹-۱۶۱۸ء کے موسم میں مذکورہ بالا جہاز کے سوائے اور کوئی جہاز نہیں روانہ ہوا۔ اور ۲۰-۱۶۱۹ء میں بھی صرف ایک جہاز بھیجا گیا جس میں قریب قریب اسی قسم کا مال بھرا ہوا تھا اور اس کی قیمت ۵ لاکھ ۶۰ ہزار محمودی، یا سمجھیے کہ ۲ ۱/۴ لاکھ روپیہ، تھی۔ ان اعداد کی بنا پر ہم ایک سرسری تخمینہ کر سکتے ہیں کہ اس دور میں انگریزوں کی تجارت کا معیار کم و بیش ۲ ۱/۴ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔

نیل کی یہ اولیت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی۔ تھوڑے ہی دن میں پتہ چل گیا کہ ہندوستان کا سوتی کپڑا مقدار کثیر میں مغربی ممالک میں فروخت ہو سکتا ہے چنانچہ اگلے عشرے کے وسط ہی میں وہ نیل کے لگ بھگ پہنچ گیا اور یہ دونوں، تجارت برآمد کے سب سے اہم عنصر بن گئے۔ اس عشر کا کوئی مطلوبہ بظاہر محفوظ نہیں رہا لیکن ۱۶۲۵ء میں سورت کے سوداگر ۱۵ لاکھ محمودی (= ۶ لاکھ روپیہ) کا مال بھیجنے کا انتظام کر رہے تھے جو مالیت میں رائل این کے کل مال سے دگنا ہوا۔ اور اس میں سب سے تعجب انگیز شے یہ ہے کہ لٹھے کے تھان ۲ لاکھ سے بھی زیادہ تھے جو چھ برس قبل کی برآمد کے مقابلے میں قریب قریب پندرہ گنے ہوتے ہیں۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس ۱۶۲۵ء کی فہرست اجناس میں شورہ بھی داخل ہے اور مرچ کے یہیں سے بار کرنے کی کوشش بھی ظاہر ہوتی ہے جس کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ تجارت کا یہ وسیع تر پیمانہ آئندہ بھی قائم رہا بلکہ ۲۸-۱۶۲۷ء کے موسم میں اس میں مزید اضافہ ہوا جب کہ مال کے چار جہاز بھیجے گئے جس کی مجموعی قیمت ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ تھی اور اس میں کپڑا اس قدر تھا کہ پہلے کسی سال میں اتنا زیادہ دساور نہیں گیا تھا۔ اگلے موسم (۲۹-۱۶۲۸ء) میں بھی ۶ جہازوں کی روانگی عمل میں آئی اگرچہ ان کے مال کی قیمت ۱,۰۲,۵۰۰ پونڈ تھی۔ ان دونوں موسموں کی مالیتوں میں اس ریشم کی قیمت بھی محسوب

ہے جو ایران سے بار کیا جاتا تھا نیز بعض اور بیرونی اشیا بھی داخل ہیں۔ اور ان اعداد کو خالص ہندوستانی تجارت کے اعداد سمجھنا درست نہ ہوگا لیکن میں سمجھتا ہوں ہمارا یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ اس عشر میں ہندوستان کی تجارت کا پیمانہ ۶ لاکھ روپیہ سالانہ تک بڑھ گیا تھا؛

تجارت برآمد کے اس دور کو سنہ ۱۶۳۰ کے قحط نے یک بیک ختم کر دیا اس کے بعد جب گجرات میں تجارتی تنظیم کی ابتری رہی تو اس زمانے میں جہاز بھرنے کے لئے مشکل سے، اور وہ بھی دوسرے علاقوں میں خریداری کا سلسلہ وسیع کر کے، مال بہم پہنچایا جاتا تھا۔

۱۰۱ سنہ ۱۶۳۷ء میں گجرات کی معاشی حالت گویا بحال ہوئی اور اس کے بعد کے سنین میں تجارت کی جو رفتار رہی اس کا مطالعہ آئندہ تین موسموں کے جہازوں کے مطلوبوں سے ہو سکتا ہے جو وزارت ہند کے محافظ خانے میں محفوظ رہ گئے ہیں[1]۔ یہ بہت طویل دستاویزیں ہیں اور ہم نے ذیل میں ان کا خلاصہ تحریر کیا ہے:-

---

[1] یہ مطلوبے، دفتر وزیر ہند میں اورجنل کرسپانڈنیس، کے نشان سنہ ۱۶۵۶ و سنہ ۱۷۲۵ و سنہ ۱۷۶۱ کے ساتھ نتھی ہیں اور ان کی نقل کے لئے میں مس اینس ڈی کا شکرگزار ہوں؛ میں نے اوپر جو اعداد لکھے ہیں، ان میں کسرات کو ترک کر دیا ہے؛

سورت سے لندن جانے والے مال کی قیمتیں سکۂ محمودی میں

	جہاز رائل میری اور سوان سنہ ۱۶۳۸-۳۹	جہاز ڈس کوری سنہ ۱۶۳۹-۴۰	جہاز کرس پین سنہ ۱۶۴۰-۴۱
جہاز کے مال کی کُل قیمت	۱۴،۰۵،۲۰۰	۸،۱۶،۲۰۰	۱۱،۸۹،۱۰۰
ازاں جُملہ ہندوستان کے مال کی قیمت	۹،۵۹،۵۰۰	۳،۹۸،۳۰۰	۴،۱۹،۰۰۰
〃 باہر کا مال جو دوبارہ یہاں سے بھیجا گیا	۴،۴۵،۷۰۰	۴،۱۷،۹۰۰	۷،۷۰،۱۰۰
ہندوستان کے مال کی تفصیل:			
سوتی مال	۴،۱۲،۴۰۰	۱،۹۸،۳۰۰	۲،۰۵،۲۰۰
تاگا	۵۳،۸۰۰	۲۰،۲۰۰	۲،۱۰۰
نیل	۳،۶۲،۳۰۰	۱،۱۸،۹۰۰	۲،۰۶،۲۰۰
شورہ	۱۷،۰۰۰	۵،۵۰۰	۰۰۰
مرچ	۱،۰۱،۲۰۰	۰۰	۰۰۰
شکر	۸،۰۰۰	۴۶،۷۰۰	۰۰۰
ادرک	۳،۳۰۰	۸،۷۰۰	۰۰۰
متفرقات	۱،۵۰۰	۰۰۰	۵،۵۰۰
باہر کا مال :—			
ایرانی ریشم	۴،۰۹،۹۰۰	۴،۱۷،۹۰۰	۷،۲۸،۲۰۰
بنتم کی شکر	۳،۱۰۰	۰۰۰	۰۰۰
〃 مرچ	۰۰۰	۰۰۰	۳۹،۹۰۰
ایلوہ، مُر وغیرہ	۲،۷۰۰	۰۰۰	۲،۰۰۰
انگلستان کا مال جو نہ بکنے کے سبب واپس ہوا	۳۰،۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰

سنہ ۱۶۳۸-۳۹ میں میری اور سوان میں سارا مال دساور چڑھا اور سنہ ۱۶۴۰-۴۱ میں صرف کرسپین بھر کر بھیجا گیا لیکن بیچ کے سال میں ڈیس کوری کے علاوہ جہاز لندن بھی روانہ ہوا تھا جس کا مطلوبہ محفوظ نہیں رہا اور اس کے مال کی قیمتیں بھی صاف طور پر نہیں پڑھی جاتیں لیکن جس حد تک پڑھی ۱۰۲ گئیں اُن سے مجموعی مقدار ۳،۶۸،۰۰۰ (محمودی) کے قریب نکلتی ہے۔ اس میں ایرانی ریشم کی مقدار اتنی کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بہر حال اگر اس کی مالیت قیاساً ۲½ لاکھ محمودی رکھی جائے تو ڈسکوری کے مال کو اس میں جمع کرنے سے کُل تخمینہ ۶½ لاکھ کی مالیت کا ہو جاتا ہے جس کا مال اس بیچ کے سال میں ہندوستان سے لندن روانہ ہوا۔ اس طرح ان تین موسموں میں تجارت برآمد کی مالیت ۳¾ لاکھ، ۲½ لاکھ اور پونے دو لاکھ روپیہ ہوئی اور چونکہ پہلے سال کا مال، غیر معمولی طور پر گراں قیمت پر بہم پہنچ سکا تھا، لہذا ہم سالانہ تجارت کی اوسط ۲½، ۳ لاکھ روپے سے زیادہ قرار نہیں دے سکتے جو قحط کے قبل کے معیار سے تقریباً نصف نظر آتا ہے۔ آگے چل کے معلوم ہوگا کہ اتنا کم ہو جانے پر بھی یہ مال بہت پھیلے ہوئے رقبے سے مہیا ہو سکا تھا۔ کیونکہ قحط کا اثر زائل ہو جانے کے بعد بھی گجرات کی آبادی کم اور دستکاری کا معیار پست ہو گیا تھا۔ اور مقامی پارچہ بافی کی بحالی کے باوجود یورپ کے واسطے جو کپڑا اس زمانے میں خریدا گیا وہ بیشتر سندھ اور شمالی ہند کا بنا ہوا تھا۔

آئندہ سولہ سال میں انگریزی کمپنی کی سورت سے برآمد میں کوئی خاص ترقی ہوئی ہو تو اس کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ سنہ ۱۶۴۲-۴۳ کے موسم میں مرسلہ مال کی قیمت بارہ لاکھ اور اگلے سال نو لاکھ ۲۰ ہزار محمودی بتائی گئی ہے۔ سنہ ۴۷-۴۸ میں اس کا تخمینہ ۱۱ لاکھ اور اس کے بعد کے سال میں بھی اسی قدر رہا۔ ایران سے اب کم تر مقدار میں ریشم جانے لگا تھا لہذا قرینہ کہتا ہے کہ ان اعداد میں ہندوستان کے مال کا تناسب

گذشتہ ۳۸ء تا ۱۶۴۰ء کی نسبت زیادہ تھا۔ لیکن یہ اوسط زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی اور آیندہ چار سال میں علی الترتیب مالیت ۵،۷۴،۰۰۰۔ ۵،۳۰،۰۰۰۔ ۷،۴۰،۰۰۰ اور ۵،۰۷،۰۰۰ ہوگئی۔ گو ان میں بظاہر احوال باہر کا آیا ہوا مال، جو دوبارہ سورت سے برآمد ہوا، زیادہ مقدار میں شامل نہیں ہے۔ اس کے بعد ۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک کمپنی کی تجارت میں تو نمایاں تخفیف ہوگئی لیکن مجموعی طور پر برآمد کی مقدار میں غالباً اضافہ ہوا اگرچہ نج کے جہازوں کے متعلق اعداد نہیں ملتے۔ مگر اس قیاسی اضافے کی ایک وجہ، منجملہ دوسری وجوہ کے، یہ بھی ہے کہ خریداروں کی وہ کثرت ہوئی تھی کہ مقابلے کے باعث کچھ روز تک ہندوستانی منڈیوں کا انتظام درست نہ رہ سکا۔ آخر ۵۸ء میں یہ حالت دُور ہوئی۔ کمپنی کو کافی سرمایہ اور دوبارہ تجارت کا اجارہ حاصل ہوگیا۔ اور ہمارے پیش نظر عہد کے آخری تین سال میں اس کے برآمد کردہ مال کی قیمت علی الترتیب ۱۱½ لاکھ، ۱۴ لاکھ اور ۴½ لاکھ محمودی تحریر ہے۔ چونکہ بیرونی مال ابھی تک زیادہ مقدار میں شامل نہ تھا، لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اب ۱۶۳۸-۴۰ء سے ۱۰۳ تجارت کا اوسط معقول طور پر بڑھ گیا گو قحط ۳۰ء سے قبل کے معیار پر اب بھی تجارت نہیں آسکی تھی۔

مغربی ساحل پر انگریزوں کی تجارت پر یہ تبصرہ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک کہ کورٹین کی انجمن کی تجارت کا تذکرہ نہ کیا جائے جو ۱۶۳۵ء سے ۴۷ء تک ایشیا سے مال لے جاتی رہی تھی۔ لیکن ان سنین کے جو اعداد اوپر نقل ہوئے، ان میں کسی خاص اضافے کی ضرورت نہیں کیونکہ اوّل تو اس انجمن کے بہت کم بحری سفر کامیاب ہوئے۔ دوسرے جو مال انگلستان آیا اس میں سے بیشتر ہندوستان کے علاوہ دوسرے مقامات سے لایا گیا تھا تیسرے ہندوستان کی اجناس میں زیادہ تر مرچیں اور شورہ لایا گیا جن سے وزن تو بڑھا، لیکن ان کے شمول سے قیمتوں میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔

اب دوسرے ساحل کی طرف آئیے تو معلوم ہوگا کہ خلیج بنگالہ اور مشرقی ساحل سے انگریزوں کی تجارت برآمد نے سنہ ۱۶۴۹ء کے بعد جاکر کوئی وقعت حاصل کی۔ اس پر بھی سنہ ۱۶۴۹-۵۰ء اور آیندہ تین سال کی تجارت کی مالیت علی الترتیب ۵۰ ہزار، ۹۶ ہزار، ۸۵ ہزار اور ایک لاکھ ۳۰ ہزار تخمینہ کی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا اوسط رہا اور اس میں بیرونی مال کی بھی تھوڑی سی مقدار شامل تھی۔ سنہ ۵۴ء سے سنہ ۱۶۵۷ء تک کا جب کہ تجارت عملاً عام ہوگئی تھی، تخمینہ بتانا ممکن نہیں لیکن جو سوداگر انفرادی طور پر تجارت کرتے تھے ان کی سرگرمی زیادہ تر اسی ساحل سے متعلق تھی۔ لہذا یہاں کی تجارت برآمد میں یقیناً ترقی ہوئی ہوگی۔ آیندہ سنین کی تجارت کے بھی مجھے پورے اعداد نہیں مل سکے لیکن کمپنی کا کاروبار بہت کچھ بڑھ گیا۔ سنہ ۱۶۵۸ء کے مطلوبہ مال کی قیمت ۳۵ ہزار پونڈ یا تقریباً تین لاکھ روپیہ تھی اور آیندہ موسموں میں بھی یہ پیمانہ قائم رہا اگرچہ خریداری میں جتنا خرچ ہوتا رہا اس کی میزانیں درج نہیں ہیں۔ بہرنوع مختلف تخمینوں کو یکجا کیجئے تو ہندوستان کے مال کے جو انگریزی جہازوں میں یورپ گیا حسب ذیل اعداد بہم پہنچتے ہیں اور گو یہ صحیح یا اصلی ہرگز نہیں کہے جا سکتے تاہم ان کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سرسری اور اجمالی طور پر اس تجارت کا اندازہ ہو جائے جو ہمارے پیش نظر عہد میں معرض وجود میں آئی:-

ہندوستان سے یورپ کو برآمد سالانہ ۱۰۴
جو انگریزی جہازوں کے ذریعے ہوئی:

زمانہ	مغربی ساحل سے	مشرقی ساحل اور بنگالے سے	میزان
سنہ ۱۶۲۰ء کے قریب	۲½ لاکھ روپیہ	..	۲½ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۶۲۸ء 〃	۶ 〃	..	۶ 〃 〃
سنہ ۱۶۴۰ء 〃	۲½ تا ۳ 〃	..	۲½ تا ۳ 〃
سنہ ۱۶۴۳-۴۸ء 〃	۳½ 〃	..	۳½ 〃
سنہ ۱۶۴۹-۵۳ء 〃	۲ 〃	۱ لاکھ روپیہ	۳ 〃
سنہ ۱۶۵۸-۶۰ء 〃	۵ 〃	۳ 〃 〃	۸ 〃 〃

جن طریقوں سے ہم نے انگریزی تجارت کا یہ تخمینہ کیا، وہ ولندیزی تجارت معلوم کرنے میں کارآمد نہیں ہیں۔ اور تحقیق کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۶۲۵ سے یقیناً ان کی تجارت کی مقدار انگریزی تجارت کی نسبت زیادہ تھی۔ مشرقی ساحل پر انگریزوں کے باقاعدہ کاروبار کرنے سے بہت پہلے، یعنی تقریباً سنہ ۱۶۱۵ء سے وہاں کی پیداوار براہ راست یا بتاویہ ہو کے ہالینڈ جانے لگی تھی۔ اور سورت میں جہاں انگریز پہلے پہنچے تھے، ولندیزوں نے بہت جلد انھیں آلیا اور آگے بڑھ گئے۔ اسی طرح دن گرلا سے ان کی برآمد کورٹین کی انجمن کی برآمد کی نسبت یقیناً بڑھی ہوئی تھی بجالیکہ بنگالے میں اُن کا غلبہ شروع سے مسلّم رہا۔ جو لوگ صرف ہندوستان کی درسی تاریخوں سے واقف ہیں، انھیں ولندیزوں کی اتنی برتری سن کر بہت حیرت ہوگی لیکن ہر طالب علم جس نے اس عہد کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے، اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہے۔ چنانچہ جہاں ولندیزوں کے اخبار و رسائل میں جا بہ جا انگریز حریفوں کی مفلسی اور نااہلی کی تحقیر و تضحیک نظر آتی ہے وہیں خود انگریزوں کے مراسلات میں ہر جگہ ولندیزوں کی کامیابی پر حسد آمیز اور بادل ناخواستہ ستائش موجود ہے۔ اور چونکہ اس بارے میں انگریزوں کا اعتراف زیادہ مستند ہوگا، لہذا اسی ماخذ سے چند مثالیں پیش کر دینا ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے؎ بہت پہلے یعنی سنہ ۱۶۲۲ ہی میں پولی کٹ کا انگریز گماشتہ لکھتا ہے کہ وہ ولندیز اپنی آسودہ حالی کی بنا پر، ہماری مصیبتیں دیکھ دیکھ کر، دل ہی دل میں خوب خوش ہو رہے ہیں۔ اور مسٹر ڈیوک کی قابلیت پر بہت نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ کھانے پر وہ آپس میں یہی باتیں کرتے ہیں یا ہمارے مچھلی پٹم اور اس مقام (پولی کٹ) کے مختصر کاروبار پر چناں چنیں ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بالکل سچ بات ہے کیونکہ ہمارا کاروبار ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہے اور ان لوگوں میں اس فرق کو ہر شخص جانتا ہے؎ دس برس بعد ایک وسیع تر علاقے کے

بارے میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اور جیسا کہ مسٹر فوسٹر نے ۱۶۳۰ء تا ۳۳ء کی تحریر دیکھ کر نتیجہ نکالا ہے ”ہم انگریز سوداگروں کو ولندیزوں کے مقابلے کا ہر جگہ شاکی پاتے ہیں۔ جن کی ہوشیاری اور سلیقہ مندی کی تائید کے لئے بے شمار روپیہ بھی موجود تھا اور اسی لئے ایشیائی تجارت میں انہیں مسلمہ فوقیت حاصل ہو گئی تھی . . . ہم انہیں انگریزی کمپنی کے کارندوں سے ایران و ہندوستان دونوں جگہ مقابلہ کرتے اور نیل، ریشم اور سوتی پارچہ کی تجارت میں بازی لے جاتے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کا اور دوسرا مال فروخت کرنے میں بھی انھوں نے انگریزوں کو شکست دی“۔

۱۶۳۷ء تا ۴۱ء کی نسبت بھی مسٹر فوسٹر لکھتے ہیں کہ ”ولندیزوں کے تفوّق کی بہت کافی شہادت ہمارے سامنے ہے اور یہ غلبہ انھیں برّی اور بحری جنگی قوّت ہی میں حاصل نہ تھا بلکہ معمولی تجارت میں بھی وہی غالب تھے۔ پرتگیزوں سے جنگ کرنے اور کثیر التعداد قلعوں میں چھاونیاں قائم کرنے میں ان کا بے شمار روپیہ خرچ ہوا۔ مگر اس کے باوجود وہ اتنی بچت نکال لیتے تھے کہ ہندوستان و ایران میں ان کے انگریز حریف ان سے لگا نہ کھا سکتے تھے“۔

ہمارے پیش نظر عہد کے باقی سنین میں بھی یہی کیفیت سننے میں آتی ہے۔ ۱۶۴۴ء میں سورت سے اطلاع ملتی ہے کہ ”ان علاقوں میں ولندیزوں کو خوشحالی ہی خوشحالی نصیب ہے۔ جو اپنی ہنرمندی، استقامت، کمال جفاکشی اور عزم صمیم کی بدولت جو کچھ چاہتے ہیں مال حاصل کر لیتے ہیں“۔ اسی سال مدراس کی اطلاع ہے کہ ”ولندیز اس قدر طاقتور ہو گئے ہیں کہ پورے ساحل کی تجارت قریب قریب ان کے قبضے میں آ گئی ہے“۔ دس برس بعد بنگالہ بھی یہی دکھڑا روتا ہے ”انگریزوں کے پاس سرمایے کی کمی ہے اور وہ ایسا کاروبار جو ولندیزوں کی وسیع و عظیم تجارت سے کچھ بھی لگا کھا سکے“ بالکل نہیں کر سکتے۔ اور یہ قول ہمارے

باب چہارم

عہد کے آخری سنین میں گجرات، کورومنڈل اور بنگالہ تینوں ملکوں پر صادق آتا ہے۔

ولندیزوں کی اس برتری کے اسباب پر تفصیلی بحث کی جائے تو ہم اپنے اصلی مبحث سے دُور ہٹ جائیں گے۔[1] لیکن اس، بارے میں انگریزوں کا اعتراف اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ان کے حریف تجارتی قابلیت اور مادی وسائل دونوں میں بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سرمائے کا زیادہ ہونا مسلم الثبوت امر ہے۔ ہمارے عہد میں تو قریب قریب اوّل سے آخر تک انگریزی کمپنی کے کارندوں کو روپے کی کمی سے سخت دشواریاں پیش آتی ہیں بحالیکہ ولندیزوں کو برابر پورا روپیہ بہم پہنچایا جاتا تھا اور وہ کبھی کبھی اپنی فاضلات کو سود پر قرض بھی دے دیا ۱۰۶ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مصالحوں کی تجارت اور چین وجاپان کی منڈیوں پر ان کا پورا قبضہ تھا اور اس کی وجہ سے وہ اپنے سرمائے کو بہترین طریق پر لگا سکتے تھے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ ہندوستان اور ایران میں لونگ، جوز، جوتری کی بڑی مانگ تھی۔ ولندیز اس کی بہم رسانی کر سکتے تھے۔ چین وجاپان سے بہ کثرت سونا چاندی بر آمد ہوتا تھا۔ ولندیز اسے ہندوستان کے کسی حصے میں بھی پہنچا سکتے تھے اور اس کام میں انہیں معقول نفع بھی ہوتا تھا۔ پھر ان کے کاروبار کا نظام ایسا اچھا تھا کہ یہ تجارتی کام نہایت سہولت وخوبی سے انجام پاتے تھے۔ بتاویہ میں ان کا صدر ناظم اور مجلس عاملہ تھی جس کو تمام ایشیا میں وسیع اختیارات حاصل تھے اور یہی جماعت پورے نظام کے قلب و دماغ کا کام دیتی تھی۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں کی جو صدارتیں یا گماشتہ خانے ہندوستان میں تھے، وہ پیشِ نظر عہد میں ایک دوسرے کے

---

[1] اس موضوع پر بعض جزئیات کتاب کے ضمیمہ الف میں بھی درج کی گئی ہیں۔

باب چہارم

ساتھ ہی لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اور اختلاف رائے کا فیصلہ ولایت سے ہوتا تھا جس کے آتے آتے کام میں جو خرابی ہونی ہوتی وہ ہو جاتی تھی۔ غرض اس عہد کی تحریریں جو شخص مطالعہ کریگا وہ ولندیزوں کے تجارتی نظام کی باقاعدگی سے، جس میں ذرا فرق پڑنے نہ پاتا تھا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہیگا۔

ہندوستان میں ولندیزوں کا جس قدر سرمایہ لگا ہوا تھا، اس کا اندازہ اُن اعداد کے دیکھنے سے ہوتا ہے جو بٹاویہ اور بٹاویہ ان کے ہندوستان کو بھیجے ہوئے مال کی بابت رسائل بٹاویہ میں کبھی کبھی درج کردئیے گئے ہیں۔ (ان چالانوں میں سونا، چاندی اور متفرق مال ہوتا تھا) مثالاً، گجرات میں قحط کے فوری اثرات زائل ہونے سے قبل، اور سنہ ۱۶۳۵ء کے قریبی سنین میں ولندیز سالانہ دس لاکھ گلڈر سے زیادہ روپیہ خرچ کرتے رہے جو رسمی شرح مبادلہ کی رو سے تقریباً ۹½ روپیہ کے معادل ہوا۔ سنہ ۱۶۴۱ء و سنہ ۴۵ء کے درمیان یہ رقم دگنی یعنی کم و بیش ۱۸ لاکھ سالانہ ہوگئی اور ہمارے عہد کے اواخر میں بڑھ کر ۳۰ لاکھ کے قریب پہنچی۔ ان رقوم سے اس مال کی وہ قیمتیں معلوم ہوتی ہیں جو بٹاویہ کے حسابات میں درج کی گئیں۔ اور انگریزی تجارت کی جو رقوم اوپر بیان ہوتی رہیں، وہ خود ہندوستان کے ساحل پر جو قیمت دی جاتی تھی، اس کے تخمینے ہیں۔ بایں ہمہ یہ رقوم اس لئے ضرور قابل نقل ہیں کہ ان سے ولندیزوں کے بیوپار کی وسعت اور ترقی پذیری ظاہر ہوتی ہے۔ تفصیلی اعداد کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنگالے اور مشرقی ساحل کی تجارت برابر بڑھتی جاتی تھی اور ابتدائی سنین میں تو سورت و کورومنڈل میں برابر روپیہ لگایا جاتا تھا لیکن ہمارے عہد کے آخر میں سورت کو کل رقم کا مشکل سے ایک چوتھائی روپیہ ملتا تھا۔ ۱۰۷

یہ ایشیا اور یورپ دونوں کی تجارت کی رقوم ہیں۔ اور ولندیزوں کے یورپ مال بھیجنے کے جو شواہد ملتے ہیں، وہ ایسے مبہم ہیں کہ ان سے

مقدار کا تعیین کرنا قرین صحت نہ ہوگا۔ البتہ خاص خاص اجناس کے متعلق جو اوزان معلوم ہوتے ہیں، جن کا تفصیلی ذکر اگلی فصلوں میں ہماری نظر سے گزریگا، انھیں دیکھکر اجمالاً یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہیں ہوسکتا کہ ولندیزوں کی پوری تجارت مقدار و مالیت میں انگریزوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ اب اگر انگریزوں کی یورپ کے لئے خرید کا سالانہ اوسط ۸ لاکھ مانا جائے، جس میں جہاز تک مال کے لانے کے جملہ مصارف شریک ہیں، تو گمان غالب یہ ہے کہ دونوں قوموں کی تجارت مل کر ۱۸، ۲۰ لاکھ روپیہ (سکہ رائج الوقت) کی ہوتی تھی جو باعتبار قوت خرید ہمارے زمانے کے ۸۰ تا ۹۰ لاکھ روپے کے مساوی ہوگا[1]۔ اس رقم میں ڈین مارک والوں یا پرتگیزوں کی جداگانہ تجارت کی بنا پر کسی خاص بیشی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اول الذکر کی تو ہمارے عہد میں تجارت کوئی وسعت نہیں حاصل کر سکتی تھی اور پرتگیزوں کا کاروبار ہمارے عہد کے اواخر میں کم ہوتے ہوتے قابل اعتنا نہیں رہا تھا۔ اسی طرح وہ مال جو عرف عام میں خانگی طور پر بھیجا جاتا تھا، یعنی بعض سوداگر منفرداً انگریزی یا ولندیزی کمپنیوں کے جہازوں پر اسے یورپ روانہ کرتے تھے، اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ محسوب نہیں ہوسکتی۔ انگریزی تحریروں میں اس تجارت کا جا بجا ذکر آتا ہے لیکن جن باقاعدہ تجارتوں کا تخمینہ اوپر دیا گیا ہے ان کے علاوہ ایسے خانگی اور دوسرے متفرق کاروبار کے واسطے ۵ تا ۱۰ فی صدی

---

[1] اس کتاب میں "ہمارے زمانے کی قوتِ خرید" سے یہاں اور ہر جگہ روپے کی وہ قدر مراد لی ہے جو سنہ ۱۹۱۰ تا سنہ ۱۹۱۴ کے سرکاری اعداد میں بتائی گئی ہے۔ لیکن چونکہ اس "پنجسالہ" کے آخری سنین میں قحط سالی بھی واقع ہوئی، لہذا زرعی پیداوار کے معاملے میں میں نے صرف سنہ ۱۹۱۰ سے سنہ ۱۹۱۲ کے آخر تک کی قیمتیں محسوب کی ہیں۔ بعد از جنگ روپے کی قدر کا صحیح اندازہ کرنا (تصنیف کتاب کے وقت) قبل از وقت ہوتا اور اس کے اصلی یا معمولی حالت تک آنے کے لئے دیر لگنے کے علاوہ، فصلوں کی خرابی بھی طوالت مزید کا باعث ہوتی۔ بہر حال، روپے کا جو معیار میں نے اختیار کیا ہے وہ مادی شکل میں یہ ہے کہ آگرہ اور لاہور کے درمیان، ایک روپیہ ½ ۱۲ سیر گیہوں خریدتا ہو۔

رقم کا اضافہ کر لینا بالکل کافی ہوگا۔

۳- نیل

تجارت برآمد کے فروغ کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بعد اب ہم خاص
خاص اجناس کی تجارت پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں نیل کو سب
سے مقدم رکھنا واجبی ہوگا۔ لیکن اس پیداوار کے متعلق میں یہ پتہ نہیں ۱۰۸
چلا سکا کہ مغربی یورپ میں یہ سب سے پہلے کب آیا۔ اس علاقے میں
اُن کی صنعت امتیازی درجہ رکھتی تھی اور اس کے لئے نیلے رنگ کی
ضرورت پڑتی تھی۔ ابتدا میں یہ ضرورت عظلم (Wood) سے پوری ہوتی رہی
لیکن سولھویں صدی کے اخیر میں ہم نیل کو اس کی جگہ لیتے، دیکھتے ہیں۔
ان کے باہمی مقابلے کا فیصلہ ہندوستانی نیل کی قیمت پر آ ٹھیرا تھا۔ اور اگرچہ
پرتگیز جس مقدار میں نیل لزبن لاتے تھے، وہ کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اس
تجارت میں ترقی کے آثار ضرور تھے کہ سنہ ۱۵۸۷ میں شاہ ہسپانیہ نے اس کا
اجارہ لے لیا۔ ہمعصر تحریروں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کارروائی کا کیا نتیجہ
ہوا اگرچہ سنہ ۱۶۰۱ اور سنہ ۳ کی مقدار علی الترتیب ۲۰ ہنڈرویٹ (= تقریباً ۲۴ من)
اور ۹۴۰ ہنڈ درج ہے۔ مجھے کسی ذریعے سے یہ سراغ نہیں ملا کہ پرتگیزوں کا لایا ہوا
نیل کہاں کہاں جاتا تھا۔ لیکن گمان ہوتا ہے کہ یہ بیشتر بحر متوسط کے مغربی
حصے میں کام آتا تھا۔ اور بالفرض شمالی ممالک میں آتا ہو، تو بھی لندن کی
منڈی میں اس کا نرخ اور نوعیت حلب کے مرسلہ مال کی بنا پر قرار پاتی تھی
نہ کہ لزبن کے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۰۹ میں کمپنی کی طرف سے جو ماہر مقرر ہوا وہ "نیل
ریشم اور ترکی کے دوسرے مال" ہی کے واسطے مقرر ہوا تھا۔ چند سال بعد
بھی ایک گماشتے کی اطلاع بدیں الفاظ موصول ہوئی کہ میں نے ہندوستان
میں جو مال خریدا وہ "ایسا ہی اچھا ہے جیسا کہ حلب میں بہتر سے بہتر میرے
مشاہدے میں آیا ہے۔" پھر ٹامس مُن کمپنی کی ہندوستان سے تجارت کا

تخمینہ کرنے روانہ ہوا تو حلب ہی کی قیمت کو اس نے اپنے تخمینہ کی بنا قرار دیا۔ اس نے وہاں کا نرخ ۴½ شلنگ فی پونڈ قرار دیا جو لنڈن میں آٹھ شلنگ فی پونڈ کے قریب پڑتا ہوگا۔ اور حقیقت میں ۱۶۰۹ء تک شمالی ہندوستان کی پیداوار کا یہی نرخ عام طور پر مسلّم تھا[1]۔

نیل کی بہم رسانی کا ابتدائی ذریعہ جو کچھ ہو، یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ
۱۰۹ وہ جنس تھی کہ سب سے پہلے فرنگی خریداروں کو اس کی تلاش تھی۔ ۱۶۰۱ء میں جو
ولندیزی گماشتے سورت پہنچے، انھوں نے اسے سب سے اہم مقامی
پیداوار لکھا ہے۔ ان کے بعد ہی فان ڈین سن کو ہم ۱۶۰۷ء میں نیل
خریدنے کا بندوبست کرتے دیکھتے ہیں۔ ولیم فنچ نے ۱۶۰۹ء میں جو کیفیت
ولایت لکھ کر بھیجی، اس میں جن اشیا کی برآمد ممکن بتائی ہیں، ان میں
سب سے اوّل نیل کا نام ہے۔ اور یکے بعد دیگرے روانہ ہونے والے
تجارتی بیڑوں کو انگلستان سے جو ہدایتیں بھیجی گئیں، ان سے پوری
طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی تجارت کو ترقی دینے
میں کمپنی سب سے زیادہ نیل ہی کی برآمد پر بھروسہ کرتی تھی۔ سر تامس رو
کے الفاظ میں "جنس اوّل" نیل تھا۔

اس عہد میں ہندوستان میں نیل کی کاشت عام تھی۔ اور ہم وادی گنگا، سندھ، گجرات، دکن اور مشرقی ساحل پر اس کی پیداوار ہوتے دیکھتے ہیں۔ لیکن معمولاً یہ پیداوار مقامی ضروریات کے لئے ہوتی تھی

---

[1] عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سترہویں کے نصف اوّل میں نیل کا استعمال انگلستان میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ مگر مجھے اس کی کوئی سند نہیں ملی اور اس کی تکذیب میں یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں بعض ایسے طبّی مرکبات کے حقوق محفوظ کرائے گئے جن میں نیل سے کام لیا جاتا تھا۔ مسٹر ولیم فوسٹر کا قیاس ہے کہ عجب نہیں اس قول کا سبب یہ ہو کہ پارلیمنٹ نے ایک دوسرے رنگ کی ممانعت کی تھی اس کو لوگوں نے غلطی سے نیل سمجھ لیا۔ (جرنل رائل سوسائٹی اوف آرٹس، ۶۶ء، ۳۶۲ء)

اور اوّل اوّل باہر کے خریدار صرف دو قسموں، سرکھیج، اور لاہوری نیل سے سابقہ رکھتے تھے۔ سرکھیج، احمد آباد سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے احمد آباد، گجرات کی سب سے بڑی تجارتی منڈی اور خود سرکھیج اُن دنوں نیل کی پیداوار کا بڑا مرکز تھا اور اس کی پیداوار کثرت سے خلیج فارس کے شہروں میں دساور جاتی تھی۔ لاہوری قسم میں کسی قدر دوآبے کا آیا ہوا نیل بھی شامل ہوتا تھا لیکن اس کا حصّہ اعظم نواح بیانہ سے آتا تھا جو آگرے کے جنوب مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر واقع اور آجکل ریاست بھرت پور کے علاقے میں داخل ہے۔ اس چھوٹے سے خطّے کا نیل مدّت دراز سے بڑی قافلوں کے ذریعے باہر جایا کرتا تھا اور حلب کی منڈی میں لاہوری کہلانے لگا تھا کیونکہ تجارتی کاروان لاہور میں مرتب ہوتے تھے۔ اس نیل کی بڑی راستوں سے دُور بھیجنے کے لئے گولیاں بنالیتے تھے اور اسی لئے اسے اکثر "گول نیل" کہتے تھے۔ یہ نسبتہً خالص اور دساور کے واسطے زیادہ موزوں ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سرکھیج کے نیل کی ٹکیاں بنا کے دساور بھیجتے تھے اور وہ "چپٹا نیل" کہلاتا تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ریت ملی ہوتی تھی اور اسی وجہ سے سرکھیج کا ڈیڑھ سیر نیل لاہوری نیل کے ایک سیر کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ بایں ہمہ انگریزی کمپنی کے جلسوں کی رودادوں سے خیال ہوتا ہے کہ انگلستان میں گول نیل سے کام لینے میں بعض صنعتی دشواریاں تھیں۔ دوسرے خود بیانہ کا ساحل سے دُور ہونا ایک دشواری تھی جس کے باعث
۱۱۰ بحری برآمد میں یہ دونوں قسمیں قریب قریب یکساں مرتبہ رکھتی تھیں۔ یورپ میں لاہوری کی قیمت زیادہ اُٹھتی تھی لیکن اسے منڈی تک لانے میں خرچ بھی زیادہ پڑتا تھا اور اس کی خریداری میں ہر سال کم و بیش مقدار کا فیصلہ بہت کچھ ہندوستان کے نرخ پر منحصر تھا جو کبھی ارزاں کبھی گراں ہوجاتا تھا؛

بہر حال، شروع میں باہر کے خریداروں کو احمد آباد یا بیانہ ہی سے

واسطہ رہتا تھا۔ ۱۶۱۰؁ میں ہم فنچ کو بیانہ سے اور تین سال بعد وتھنگٹن کو احمد آباد سے مال خریدتے سنتے ہیں۔ ولندیزی ۱۶۱۶؁ میں سورت آئے اور ۱۶۱۸؁ میں آگرے سے نیل کی خریداری شروع کی۔ غرض دونوں قوموں کے گماشتے مذکورہ بالا دونوں منڈیوں سے بخوبی واقف ہو گئے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں، ۱۶۱۹؁ کے چالان میں سب سے بڑی مقدار نیل کی تھی جس کا ۳/۵ حصہ سرکھیج سے اور ۲/۵ بیانہ سے بہم پہنچایا گیا تھا۔ ہمارے پیش نظر عہد کے باقی سنین میں بھی ان دو منڈیوں سے خریداری ہوتی رہی لیکن رفتہ رفتہ دوسرے مقامات سے بھی اس کی بہم رسانی ہونے لگی اور اُس کے نئے نئے ذرائع کا پتہ لگانے میں ولندیز سب سے زیادہ ساعی رہے۔ ۱۶۳۶؁ کے بعد انگریزوں نے سندھ سے کچھ نیل خریدا اور ۱۶۴۵ء میں ولندیزوں کو ہم دین گرلا کے شمال کے علاقے میں خریداری کرتے دیکھتے ہیں۔ چاٹ گام سے بھی انھوں نے نیل فراہم کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی۔ لیکن مشرقی ساحل پر اس تجارت کو فروغ دینا ان کا اصلی کارنامہ تھا۔ واضح رہے کہ گجرات یا بیانہ تک رسائی پانے سے بھی قبل، یعنی ۱۶۱۳ء میں ان کے سوداگر مچھلی پٹم کو نیل کی بہم رسانی کا مرکز بنانے پر زور دیتے تھے۔ اس بندرگاہ سے جہازوں میں جو مال بار ہوا، اور ضمیمہ ب میں اس کے اعداد دکھائے ہیں، اس میں ۶۵۰ تا ایک ہزار ہنڈرڈ ویٹ وزن کا نیل شامل ہے اور کئی سال تک اس کی برآمد کا یہ معیار قائم رہا۔ بایں ہمہ ہمارے پیش نظر عہد میں نیل بھیجنے کی صدر بندرگاہ سورت رہی اور جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے، مشرقی ساحل سے ان کی برآمدِ نیل ان سنین میں کوئی وقعت حاصل نہیں کر سکی۔

اوپر کہا گیا ہے کہ مغربی یورپ میں نیل کی کھپت کا انحصار بہت کچھ اس کے نرخ پر منحصر ہوتا تھا۔ ذیل کے اعداد سے کسی قدر اندازہ ہو گا کہ براہِ راست درآمد سے اس کی کھپت میں کیا فرق واقع ہوا[1]:—

---

[1] یہ اعداد مسٹر فوسٹر کے مضمون مطبوعہ جرنل رائل سوسائٹی اوف آرٹس، (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

لندن کی منڈی میں نیل کا نرخ (فی پونڈ)

زمانہ	بیانہ	سرکھیج	سندھ	کورومنڈل
تقریباً سنہ ۱۶۰۹	۶ شلنگ	۵ شلنگ	(ہنوز منڈی میں نہیں آیا)	
سنہ ۱۶۲۰ تا سنہ ۳۰	۵½ تا ۶ "	۴ تا ۴½ "	"	
تقریباً سنہ ۱۶۴۶	۴ "	۳½ "	۳⅓ شلنگ	۱¼ شلنگ
" سنہ ۱۶۵۵	۶ "	۴ "	..	۱ شلنگ ۵½ پنس

سنہ ۱۶۴۶ میں جو کمی ہوئی اس کا سبب یہ سمجھنا چاہیئے کہ انگلستان میں خانہ جنگی کے باعث تجارت میں انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ اس زمانے کو خارج کر دیجے تو معلوم ہوگا کہ براہِ راست بحری تجارت کا اثر یہ ہوا کہ بیانہ کے نیل کی قیمت ۲۵ یا کچھ زیادہ فی صدی کم ہوگئی اور اس سے کسی قدر کم تخفیف سرکھیج کے نیل میں ہوئی اور اسی تغیر کا نتیجہ تھا کہ نیل کی کھپت میں بہت معقول اضافہ ہوگیا۔ لندن میں براہ راست نیل کی درآمد کا حساب پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سنہ ۱۶۰۲ میں ۲۰ ہنڈرڈویٹ اور سنہ ۳ میں ۹۴۰ ہنڈرڈویٹ نیل آیا۔ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۶۱۹ میں لندن کی برآمد کا وزن ۳۴۰۰ ہنڈرڈویٹ تھا اور اسی سال ایمسٹرڈم میں ہندوستان کے مشرقی ساحل سے ایک ہزار سے زیادہ ہنڈرڈویٹ نیل الگ آیا۔ دوسرے عشرہ میں انگریزی جہازوں سے نیل کی برآمد کم ہوگئی اور سنہ ۱۶۲۵-۲۶ میں سالانہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے نقل کئے گئے ہیں (م ۶۶ — ۳۶۲) ان میں کورومنڈل کے نیل کی اس قدر کم قیمت قابل غور ہے اتنے ادنیٰ درجے کے نیل کی خرید کا سبب غالباً یہ ہے کہ مشرقی ساحل پر بندرگاہ کے قریب کے دیہات سے نیل لانے میں بار برداری کے مصارف بہت کم ہوتے تھے۔

اوسط ۲ تا ۳ ہزار ہنڈر ڈویٹ رہ گیا۔ لیکن اس زمانے میں ولندیز سورت اور مچھلی پٹم دونوں جگہ کاروبار کرنے لگے تھے اور گو ان کی تجارت کے اوزان نہیں مل سکتے، تاہم گمان غالب یہی ہے کہ مجموعی طور پر نیل کی برآمد میں کمی کی بجائے بیشی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد، اُن سنین کو چھوڑ کر جب کہ قحط کے باعث گجرات کی تجارت درہم برہم ہوگئی تھی، صدی کے چوتھے عشر کے اخیر میں دیکھئے تو اس زمانے میں بھی انگریزوں کی ہندوستان سے خریداری کم نظر آتی ہے اور جیسا کہ مطلوبوں کی بنا پر اوپر حساب لگایا جاچکا ہے ۱۶۳۸-۳۹؁ میں ۱۴۸۰ اور ۱۶۴۰-۴۱؁ میں صرف ایک ہزار ہنڈر ڈویٹ کی برآمد نکلتی ہے۔ مگر یہاں بھی ولندیزوں کی تجارت کی توسیع نے اس کمی کی نہ صرف تلافی کردی بلکہ مجموعی برآمد کو بڑھا دیا تھا۔ چنانچہ ۱۶۳۹؁ میں ان کی فرمائش ۴۳۰۰ ہنڈر دویٹ اور ۱۶۴۱؁ میں جو مقدار وہ بٹاویہ لے کے آئے، وہ ۴۲۰۰ ہنڈر ڈویٹ ہے۔ ۱۶۴۲؁ میں اور بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا کہ وہ ۸ ہزار ۱۱۲
ہنڈر ڈویٹ سے بھی کچھ اوپر وزن کا نیل دساور لے گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس تجارت کی انتہائی ترقی تھی۔

انگریزی مطلوبوں سے ہم نے بعض اعداد اس غرض سے بھی جمع کئے ہیں کہ خود ان مقامات میں جہاں سے نیل خریدا جاتا تھا، اس کے نرخ میں جو کمی بیشی ہوئی، اس کا اندازہ کیا جا[۱] سکے:-

مقام	برآمد (ہنڈر ڈویٹ میں)			نرخ روپے میں بحساب فی ہنڈر ڈویٹ		
	۱۶۳۸-۳۹؁	۱۶۳۹-۴۰؁	۱۶۴۰-۴۱؁	۱۶۳۸-۳۹؁	۳۹-۴۰؁	۱۶۴۰-۴۱؁
بیانہ	۳۸۵	۷۰	۹۲۷	۱۰۶؍۳	۹۳؍۳	۷۶؍۴
سرکھیج	۱۰۶۰	۶۶۱	۷۵	۹۰؍۶	۵۸؍۱	۵۶؍۶

---

[۱] ۱۶۳۸-۳۹؁ کی برآمد میں ۳۵ ہنڈر کے قریب مشرقی ساحل کا برآمدہ نیل تھا (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

باب چہارم

اسے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ پہلے سال میں سرکھیج کے نیل کی قیمت غیر معمولی طور پر زیادہ اور اعلیٰ قسم کے بیانہ کے نیل سے کچھ ہی کم تھی۔ اس سال بیانہ سے خریداری بہتر ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے گجرات میں قیمتوں کا اس قدر چڑھ جانا سنکر انگریز گماشتے حیران رہ گئے اور یہ خبر اُن کو اس وقت ہوئی جب کہ دوسرا انتظام کرنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے سال سرکھیج کی قیمتیں بہت اُتر گئیں اور مال زیادہ تر یہیں سے خریدا گیا۔ ۱۶۴۲؁ میں بیانہ کا نرخ بھی کم ہوگیا اور گماشتوں کے لئے یہ ممکن ہوگیا کہ کمپنی کی خواہش کے مطابق اعلیٰ قسم کا نیل پہلے سے بہت زیادہ مقدار میں خرید کر ولایت روانہ کر دیں۔

ہمارے پیش نظر عہد کے آخری عشرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ برآمدہ
نیل کی مقدار میں بہت بڑی کمی واقع ہوئی۔ ان سنین میں ولندیزی تجارت
کے مکمل اعداد مجھے کہیں نہ مل سکے لیکن خانگی طور پر جو چالان بھیجے گئے
وہ بہ نسبت سابق، وزن میں کم تھے اور مال کی فہرستوں میں بھی اس
جنس کا ذکر کم آتا ہے لہذا میری دانست میں یہ یقینی امر ہے کہ ولندیزوں
کی خریداری بھی بہت کچھ گھٹ گئی۔ رہے انگریز سوداگر، تو ۱۶۴۹؁ کے قریب
ہم پڑھتے ہیں کہ اس جنس کا نرخ "نفرت انگیز" حد تک کم ہوگیا۔ ۱۶۵۱؁
میں کمپنی اس کی بہم رسانی کو ناپسند کرنے لگی اور ۱۶۵۳؁ میں صرف ۲ سو ۱۲۳
گٹھوں کی فرمائش کرتی ہے۔ پھر سرمایہ بہت زیادہ بڑھ جانے کے باعث
۱۶۵۸؁ میں نیل کی فرمائش بھی بڑھا کر ۸ سو گٹھے کر دی گئی لیکن ۱۶۶۰؁
میں جو مقدار طلب کی گئی وہ کم تھی اور قیمت بھی نہایت محدود رہ گئی[۱] اس کمی کا

بقیہ حاشیہ) اور اسے مذکورہ بالا وزن میں شامل کر لیا جائے تو اس موسم کی میزان ۱۴۸۰ ہو جاتی ہے۔ آیندہ دو موسموں میں مشرقی ساحل سے انگریزوں نے نیل ولایت نہیں بھیجا۔

[۱] معمولاً نیل کے ایک گٹھے کا (جو بیانہ سے آتا) وزن ۲۲۰ پونڈ اور سرکھیج کے گٹھے کا ۱۵۰ پونڈ ہوتا تھا۔ لہذا ۱۶۵۳؁ کی فرمائش کے معنی یہ ہوئے کہ کمپنی نے زیادہ سے زیادہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سبب یورپ کی مانگ میں کمی نہ تھی۔ بلکہ زیادہ تر یہ کہ مقابلے میں امریکہ سے نیل پہنچنے لگا تھا اور یہ وہ جدید ذریعہ بہم رسانی تھا جس نے بالآخر ہندوستان کی تجارت نیل کا خاتمہ کردیا۔ ہسپانیہ میں تو امریکہ کا نیل، بہت پہلے یعنی سنہ ۱۵۸۷ء سے دساور چڑھنے لگا تھا اور سنہ ۱۶۲۸ میں ہم ایک بڑے چالان کا پہنچنا سنتے ہیں۔ پانچ برس بعد گوائٹ مالا کا مال لندن میں اُترتا ہے اور سنہ ۱۶۴۵ میں کمپنی اپنے گماشتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ سورت سے نیل کی برآمد میں تخفیف کردی جائے کیونکہ غرب الہند سے بہ کثرت یہ رنگ آنے لگا ہے اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے، کہ کمپنی اس کو ہندوستان کے نیل سے بہتر بتاتی ہے۔ دوسرے مسافت کے معاملے میں بھی یہ حریف فائدے میں تھے۔ غرض ہندوستان کی تجارتِ نیل کچھ روز گھٹنے بڑھنے کے بعد، حدود اور سنہ ۱۷۲۹ میں بالکل موقوف ہوگئی اگرچہ اس کے نصیب میں تھا کہ کچھ مدت بعد ملک کے دوسرے حصوں میں اسے دوبارہ فروغ حاصل ہو[1]۔

اپنے عروج کے ایام میں بھی نیل کی تجارت دقت اور خرابی سے بری نہ تھی یورپ میں نرخ گر گر جاتا تھا جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔ ادھر ہندوستان میں فصلوں کی تغیر پذیری، حکام کی مداخلت اور آمیزش کا شوق وغیرہ ایسے اسباب تھے جن کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ فصلی حوادث کی مثال میں صرف یہ لکھنا کافی ہوگا

بقیہ حاشیہ) صرف ۴ سو ہنڈ نیل طلب کیا۔ اسی طرح سنہ ۱۶۵۸ کی فرمائش کا جس میں نصف لاہوری اور نصف سرکھیج کا نیل تھا، مجموعی وزن ۱۳ سو ہنڈ سے کچھ اوپر ہوا۔

[1] یہ لکھنا غالباً خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ ولندیزوں نے بہت پہلے، ایشیا کے دوسرے اقطاع، یعنی سیام، فارموسا اور جاوا سے نیل بہم پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں (:- ۲۰ مئی سنہ ۱۶۴۱ - نومبر سنہ ۴۴ دسمبر سنہ ۴۵) سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے دو ملکوں میں ناکامی نصیب ہوئی۔ جاوا کے متعلق ہمارے عہد میں ان کوششوں سے جو نتیجے مترتب ہوئے، ان کے متعلق مجھے کوئی تحریری سند نہیں ملی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس جزیرے میں یہ رنگ اسی وقت سے جب کہ ولندیزوں نے پہلا بحری سفر کیا، تیار ہوتا تھا (دیکھو ہوٹمین اول ۱۲۲)

کہ ۱۶۳۱ء میں قحط عظیم کے باعث گجرات کی بہم رسانی بالکل منقطع ہوگئی تھی اور بیانے میں ۱۶۲۱ء اور ۱۶۴۰ء میں کثرت باراں سے فصل خراب ہوئی۔ ۱۶۲۵ء کے قریب ۱۱۴ پے درپے تین فصلیں ٹڈی نے تباہ کردیں۔ اور ۱۶۴۶ء میں خشک سالی سے اسے بہت نقصان پہنچا۔ حکام کی مداخلت بھی ایک عام وجہ شکایت تھی۔ ۱۶۱۸ء میں ایک ولندیز گماشتے نے اطلاع دی کہ احمد آباد کا صوبہ دار نیل بنانے والوں سے ایک لاکھ روپیہ طلب کرتا ہے اور اس کے بغیر وہ حسب معمول نیل بنانے کی اجازت نہیں دیگا۔ ۱۶۳۲ء میں شاہ جہاں نے اس تجارت کا ساری سلطنت میں اجارہ دینا منظور کیا جس سے سارا کاروبار اس وقت بند ہوگیا۔ ۱۶۴۴ء میں حکام کے جور و ستم نے اہل سندھ کو اتنا پریشان کیا کہ وہ ان کے پاس فصل کاشت کرنے کے نہ وسائل رہے نہ اُمنگ۔ ۱۶۴۷ء میں ہم احمد آباد میں ایک نئے رواج کا ذکر سنتے ہیں جس نے نیل والوں کو پابند کردیا تھا کہ "نیل بیچنے کی آزادی قیمت دے کر خریدیں"۔ اسی طرح مختلف مثالیں یہ دکھانے کے لئے نقل کی جا سکتی ہیں کہ نیل کی تیاری اور فروخت کو سرکاری طور پر زر ستانی کا ایک عمدہ موقع سمجھا جاتا تھا۔ آخری دشواری یہ کہ آمیزش کا عام طور پر، خصوصاً گجرات میں[1]، رواج تھا جہاں غالباً مانگ کے تناسب سے ریت ملائی جاتی تھی۔ ۱۶۴۰ء میں سورت کے گماشتے لکھتے ہیں کہ ایک پورے چالان میں "رذالت سے، آمیزش کردی گئی"۔ اور یہ کہ جب تک خریداروں میں رقابت کا جوشش موجود ہے، اس طریقے کا تدارک دشوار ہے۔ لیکن صوبہ دار احمد آباد نے اس معاملے پر پوری توجہ فرمائی اور حکم دیا کہ جو شخص ملونی کرتا ہوا پکڑا جائے، وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ اس اہتمام سے تھوڑے دن صورت حال اچھی رہی لیکن ۱۶۴۵ء میں پھر سرکاری کارروائی کی ضرورت پیش آئی اور خود پیداوار میں بہت کمی پڑ گئی۔ اسی طرح ۱۶۵۰ء میں ولندیزوں نے وسیع پیمانے پر خریداری

---

[1] آمیزش سے بیانہ والے بھی ناواقف نہ تھے چنانچہ پلسارٹ (ورق ۴) میں بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ خریداروں کو کیا کیا احتیاطیں کرنی پڑتی تھیں تاہم معلوم ہوتا ہے یہاں یہ حرکت اس طرح کھلے بندوں نہ کی جاتی تھی، جیسے گجرات میں۔

باب چہارم کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریب و جعلسازی بھی غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی۔ یورپ کی منڈیوں میں اس ملاوٹ کو جو اس قدر مکروہ سمجھا جاتا تھا اس کا سبب سمجھنا دشوار نہیں جب کہ ہم یہ یاد رکھیں کہ بار برداری کا خرچ اصل قیمت سے دُگنا پڑتا تھا۔ اور چونکہ حکومت کی نگرانی اضطراری سی ہوتی تھی لہٰذا اس میں کچھ شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس گراں قدر تجارت کے بالآخر برباد ہو جانے کا ایک بڑا سبب یہی آمیزش ہوئی۔

مغربی یورپ میں نیل کی کھپت سے ہندوستان کو جو نفع پہنچا اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ پتہ چلانے کی ضرورت ہے کہ کُل پیداوار کیا تھی اور اس کا کتنا حصہ باہر بھیجا جاتا تھا۔ برآمد کے بڑے بڑے مرکزوں میں نیل ۱۱۵ کی پیداوار کا سرسری اندازہ اُن تخمینوں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو فرنگی گماشتے، جن کے سپرد خریداری تھی، وقتاً فوقتاً ولایت بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۶۲۸؁ میں سرکھیج کی فصل کا تخمینہ ۸ ہزار من کیا گیا تھا (مگر یہ من ۳۲ پونڈ یا سولہ سیر کا تھا)۔ معلوم ہوتا ہے یہ فصل کسی قدر کمزور تھی۔ لیکن ۱۶۳۴؁ میں بھی ۹ ہزار من کا اندازہ تھا۔ ۱۶۳۸-۳۹؁ کی فصل کے متعلق ایک گماشتے نے روایت عام کی بنا پر ۴۰ ہزار من پیداوار کا تخمینہ لکھا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ مبالغہ آمیز اور محض اٹکل سے لکھ دیا گیا تھا[1]۔ ۱۶۴۱؁ میں ولندیزوں نے کل پیداوار کا تخمینہ ۱۲ ہزار من (من = ۳۷ پونڈ) کیا اور ۱۶۴۴؁ میں انگریزی تخمینہ ۶ ہزار من تھا کہ جس میں سے یک سدس مقامی ضروریات کا خرچ تھا اور انگریزوں اور ولندیزوں کی خریداری ۳½ ہزار من کے اندر تھی۔ مگر گزشتہ سال منڈی مندی رہی تھی لہٰذا اس سال کی فصل کو بھی بہت

---

[1] یوں بھی یہ تخمینہ اپنی برائت ظاہر کرنے کے سلسلے میں درج کیا گیا ہے۔ یعنی بعض گزشتہ معاملات کی معافی مانگ کر یہ گماشتہ خط کے اخیر میں آیندہ کی اچھی امیدیں دلاتا ہے اور ”اطلاع عام“ کی بنا پر لکھتا ہے کہ ۴۰ ہزار من نیل میسر آسکیگا۔ (انگلش فیکٹریز ششم ۹۱) لیکن اس قسم کے تخمینے کو منقولہ بالا دوسرے تخمینوں کی مثل نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ باقاعدہ لین دین کے مراسلات میں درج ہیں۔

کم بتایا گیا ہے۔ ان اعداد کی بنا پر، پیداوار کا سالانہ اوسط کم و بیش کوئی دس ہزار من گجراتی رکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا اگرچہ نرخ چڑھے ہونے کی صورت میں اس سے زیادہ پیداوار کی بھی امید کی جا سکتی تھی بشرطیکہ موسم بھی موافق رہے۔

شمالی ہندوستان میں، ۱۶۲۶ء میں نیل کی پیداوار کا سالانہ اوسط ۱۶ ہزار من (من = ۵۵ پونڈ) تخمین کیا گیا تھا۔ اگرچہ خاص اُس مرتبہ مذکورہ بالا حوادث کے باعث کل فصل ۱۰ ہزار من یا کچھ کم کی ہوئی[1] ۱۶۳۳ء میں فصل کی حالت اچھی تھی مگر پیداوار ۱۵ ہزار من ہی رہی جس میں سے ایک تہائی اصلی بیانے کا نیل تھا اور باقی ہنڈون وغیرہ دوسرے مقامات سے آیا لیکن برآمد کے معیار کے مطابق تھا۔ دس سال بعد کی ایک ولندیزی اطلاع میں لکھا ہے کہ فصل کا سالانہ اوسط تین ہزار گٹھے کیا جاتا ہے (یعنی تقریباً ۱۲ ہزار من یا ۶ ہزار ہنڈرڈویٹ) گو سال زیر اطلاع میں وہ کم رہی۔

الغرض اس علاقے کی کل پیداوار کو ۶ ہزار سے ۸ ہزار ہنڈرڈویٹ تک اور گجرات کی فصل اس میں ملالی جائے تو کُل کوئی دس ہزار ہنڈرڈویٹ قیاس کیا جا سکتا ہے اور یہ اس وقت جب کہ باہر کی خریداری پورے عروج پر ۱۱۶ تھی۔ اس مجموعے میں سے انگریزوں اور ولندیزوں کی ضروریات ۵ تا ۶ ہزار ہنڈرڈویٹ سے زیادہ نہیں سمجھی جا سکتیں جو کل پیداوار کا نصف یا کچھ زیادہ وزن ہوا۔ اس خریداری کے بعد بھی، جو مقدار باقی رہتی ہے وہ دوسرے خریداروں کے لئے کچھ کم نہ تھی اگرچہ ۱۶۴۲ء کے سال کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے جس میں ولندیزوں نے کُل فصل کا بڑا حصہ خرید لیا تھا۔ رہا مشرقی ساحل، تو ۱۶۴۰ء کا ایک انگریزی تخمینہ یہاں کی پیداوار کو ۴ تا ۵ سو کنڈی یا تقریباً ۲ ہزار

---

[1] یہ اعداد پلسارٹ کے تجارت نیل کے مبسوط و مفصل بیان سے لئے گئے ہیں۔ اصل قلمی مسودے (بزبان ولندیزی) اور مطبوعہ ترجمے میں بعض اختلافات بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اصل مسودے میں ۲۵۰۰ گٹھے اور مطبوعہ ترجمے میں ۲۲ سو گٹھے تحریر ہے، گٹھے کا وزن ۴ من (من = ۵۵ پونڈ) دیا گیا ہے۔

ہنڈرڈ ویٹ بتاتا ہے۔ ولندیزوں کی برآمد عموماً ایک ہزار ہنڈ سے کم اور انگریزوں کی اور بھی تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ دوسری طرف سندھ کے رقبے کی کل پیداوار ۲ ہزار من (من = غالباً ۶۶ پونڈ) تھی اور اس طرح مقامی ضروریات کے کام آنے کے لئے معقول مقدار بچ جانے کے علاوہ ہندوستان میں کم و بیش ۱۲ تا ۱۴ ہزار ہنڈرڈ ویٹ نیل سالانہ دساور کے واسطے میسر آسکتا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ مل سکا کہ اس زمانے میں فی ایکڑ کتنا نیل پیدا ہوتا تھا لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ اس میں موجودہ صدی کی اوسط پیداوار (۱۵ تا ۲۰ پونڈ) سے کچھ زیادہ فرق نہ ہوتا تھا، تو صرف برآمد کے نیل کے لئے زیرِ کاشت رقبہ ۷۵ ہزار تا ایک لاکھ ایکڑ نکلتا ہے[1]

ان اعداد کے دیکھنے سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس تجارت میں مقابلے کا کافی میدان تھا اور یہ خیال کرنا کہ ولندیزوں اور انگریزوں نے پورا قبضہ جما رکھا تھا اور کسی دوسرے تاجر کے لئے گنجائش نہیں چھوڑی تھی، درست نہ ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ یہ دونوں مل کر سب سے باوقعت خریدار تھے لیکن اوّل تو ان میں باہمی رقابت شد و مد کے ساتھ موجود تھی دوسرے ایران یا دوسرے ملکوں کے سوداگروں سے بھی ان کا مقابلہ رہتا تھا جو ایشیائی ممالک یا برّی راستے سے مشرقی یورپ کے لئے نیل خرید کرلے جاتے تھے۔ اور گو اس برّی تجارت میں غالباً کمی آگئی، تاہم وہ فرنگی حریفوں کے باعث بالکل مسدود نہیں ہوئی تھی۔ ولندیزوں کی سنہ ۱۶۴۱ء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک نیل برابر آگرے سے براہ خشکی دساور جاتا تھا اور سنہ ۱۶۴۳ء کی

---

[1] اس زمانے میں ہندوستان محکمۂ اعداد و شمار کا اوسط ۱۵ پونڈ ممالک متحدہ کے لئے اور ۲۰ پونڈ فی ایکڑ بہار کے لئے مقرر ہے۔ صوبہ بمبئی کا کوئی اوسط مقرر نہیں کیونکہ اب یہ فصل اس علاقے میں کسی وسیع پیمانے پر کاشت نہیں ہوتی (ملاحظہ ہو: (Estimates of Area and Yield. . Table II.)
کوئی تحریری شہادت یہ معلوم کرنے کی موجود نہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد میں گجرات کا اوسط پیداوار فی ایکڑ کیا تھا۔ میرا گمان ہے کہ یہ شمالی ہندوستان سے کمتر ہوگا لیکن اسکے قرائن ایسے نہیں کہ کوئی قطعی نتیجہ نکالا جاسکے

انگریزی (کورٹ منٹس) رودادوں میں لکھا ہے کہ بصرے کے راستے جو
۷ چالان آئے اُن سے تمام یورپ میں نیل کی قیمت گرگئی ؎ غرض یہ کہنا بیجا
نہ ہوگا کہ یہ تجارت آخر تک ”بامقابلہ“ رہی- جو نیل لندن آتا تھا اس کا
بڑا حصہ وہاں سے دوبارہ یورپ کی منڈیوں میں بھیجا جاتا تھا اور گو حلب کی
منڈی خود لندن میں مقابلہ نہ کرسکتی ہوگی تاہم لندن سے جس قدر آگے
مشرق میں لندن کا نیل آتا ہوگا، اسی قدر حلب کے مقابلے کا اثر زیادہ نمایاں
ہوتا ہوگا ؎ خود اس مسئلے کی نوعیت ایسی ہے کہ یہ اندازہ کرنا غیر ممکن ہے کہ
ایشیائی تاجر کس قدر نیل خرید کر لاتے تھے لیکن اُس زمانے کے تجارتی مراسلات
سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاجروں کی سرگرمی منڈی پر یقینی اثر ڈالتی تھی-
پلسارٹ نے ارمنی سوداگروں کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ یادگار رہے گا- یعنی
وہ ”سارے ملک میں دیہ بہ دیہ دوڑتے پھرتے تھے اور ان کی نگاہیں
اُن مہمانوں کی مثل حریص تھیں جو یہ سمجھ کر کہ پورے دسترخوان کے لائق
کھانا موجود نہیں، دوسروں کو دھکے دے کر خود ہر رکابی پر ہاتھ مارتے ہیں“ ؎
پلسارٹ شکوہ کرتا ہے کہ ان لوگوں کے شوق و اضطراب خرید سے نرخ اس
قدر چڑھ گیا کہ وہ ان کی انفرادی خریداری کی حدود سے کہیں زیادہ تھا ؎
۱۶۴۴ء میں سورت کے گماشتوں نے اطلاع دی کہ ایران، مخہ اور بصرے
کی خریداری کم ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے نرخ اس قدر گھٹ گیا ہے کہ
”اس نے کاشتکاروں کو قریب قریب دوالیہ کردیا اور وہ اب سال بہ سال
اس کی مقدار کو کم کرتے جاتے ہیں“ ؎ پھر ۱۶۴۹ء میں انگریزی گماشتے توجیہ
کرتے ہیں کہ گو بیانے سے دسمبر یا جنوری میں، جب کہ نیل پوری طرح
سوکھ جائے، خریداری زیادہ نفع بخش ہوگی لیکن اب کے بالکل ابتدائی
موسم میں اِس لئے معاملہ کرنا پڑا کہ ایشیائی تاجر اتنی دیر انتظار نہ کرتے ؎ خلاصہ
یہ کہ گو گجرات اور علاقہ بیانہ کے کاشتکار نیل کی خریداری کی سب سے زیادہ امید
پردیسی تاجروں ہی سے رکھتے تھے لیکن وہ کسی ایک جماعت کے مقررہ
طور پر پابند نہ تھے بلکہ منڈی میں ولندیز، انگریز، ایرانی، مُغل اور ارمن غرض

سبھی قوم کے سوداگر تجارتی مقابلے میں حصہ لیتے تھے اور اگر کسی فصل میں زنگی تاجروں میں ایکا ہو جاتا تو بھی وہ ایشیائی خرید کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے ۔ اس طرح کاشتکاروں کو معقول نفع اور اس تجارت کو خاص وقعت حاصل تھی لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا اس وجہ سے دشوار ہے کہ کچھ مال جو سمندر کے راستے لندن یا ایمسٹرڈم آتا تھا وہ وہاں سے پھر اُن منڈیوں میں پہنچ جاتا تھا جن کی سربراہی پہلے حلب کے ذریعے (بری راستے سے) ہوا کرتی تھی ۔ لہٰذا اسے پہلی تجارت میں حقیقی بیشی شمار نہیں کر سکتے ۔ ۱۶۴۰ء کے قریب ولندیزوں اور انگریزوں کی برآمد ۱۱۶
۳۰ تا ۴۰ ہزار ایکڑ زمین کی پیداوار پر مشتمل تھی اور اگر اس میں سے اتنی مقدار قیاساً خارج کر دی جائے جو دوسرے راستوں سے حلب آتی ، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید ۲۰ ہزار ایکڑ کے قریب زمین ہندوستان میں اس غرض سے کاشت کی جانے لگی تھی کہ مغربی یورپ کی نئی مانگ کو پورا کرے ۔ اب اگر عہد اکبری کی تشخیص مالگزاری کی بنا پر ہم ایک ایکڑ نیل کی قیمت تقریباً ۲۰ روپیہ سکہ رائج الوقت قرار دیں[۱] (جو قوت خرید کے اعتبار سے آج کل کے ۱۴۰ روپے کے معادل ہونگے) تو گویا ولندیزوں اور انگریزوں کی خریداری نے ملکی اہل حرفہ کی آمدنی میں کم و بیش کوئی تین لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ کر دیا جو تمام ملک پر تقسیم کیا جائے تو ہیچ ہے لیکن ان مخصوص رقبوں کے لئے ، جہاں یہ رقم خرچ ہوتی تھی ، اچھا خاصا سرمایہ ہے ۔ اسی میں وہ روپیہ بھی شامل کر لینا چاہیے جو حمل و نقل اور گاڑیوں کے کرایے میں صرف ہوتا تھا اور کم سے کم بیانے سے نیل لانے کے معاملے میں یہ بھی نسبتہً خاصی رقم ہو جاتی تھی ۔

۴ ۔ شورہ

شورے کی برآمد کی نسبت حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان

---

[۱] نیل کے مقابلے میں معمولی غلّے کے کھیت کی قیمت فی ایکڑ تقریباً ۵ روپیہ ہوتی تھی ۔

کی تجارت میں نئی مد تھی۔ مجھے اس امر کا کوئی اشارہ تک نہیں ملا کہ سولھویں صدی میں یہ شے بھی ایشیائی اجناس تجارت میں داخل تھی۔ وزن اور پھیلاؤ کے باعث بری راستوں سے اس کا (یورپ) جانا ناقابل عمل تھا اور جہازوں میں اگر پرتگیز سے لے گئے بھی، تو جیسا کہ آگے آتا ہے، ان کی برآمد کی مقدار بہت کم تھی ئ

شورے کی خرید و فروخت کی ابتدا معلوم کرنے کے لئے یورپ کی جنگی تاریخ دیکھنی لازم ہے۔ اُس زمانے میں شورہ، بارود کا لازمی جزو ہوتا تھا مگر ایک عرصے تک یورپ کی ضروریات مقامی رسد رسانی سے پوری ہوتی رہیں۔ اصل میں شورہ انسان یا حیوان کی ایسی طرز معاشرت سے، جسے آج کل حفظانِ صحت کے خلاف سمجھا جائیگا، ضمناً پیدا ہوتا ہے مگر سترھویں صدی بلکہ بہت بعد تک وہ طرز معاشرت بالکل عام تھی۔ شورہ حاصل کرنے کا طریقہ وہی تھا جو اب تک ہندوستان میں جاری ہے کہ وہ گندی زمین پر سے بہ کر اوپر آجاتا ہے ئ

۱۱۹ ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز کے قریب ہی یورپ میں فنِ حرب کی ترقی کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ مقامی رسد رسانی مکتفی نہ ہوتی تھی اور یہ انکشاف کہ ہندوستان میں شورے کی گویا لامحدود مقدار مل سکتی ہے، اُن جنگ جو قوموں کے نہایت مفید مطلب تھا جو اسے بحری راستے سے حاصل کرنے کے وسائل بھی رکھتی تھیں ئ

شورے کی ہندوستان سے برآمد کا پہلا ذکر جو مجھے ملا، شاہ ہسپانیہ کے ایک خط میں ہے جو ۱۶۰۵ء کا نوشتہ ہے اور اس میں گوآ کے صوبہ دار کو ہدایت کی گئی ہے کہ آیندہ حکم تک شورے کے دس یا بارہ پیپے سالانہ بھیجا کرے۔ خط میں صراحت ہے کہ پرتگال میں شورہ بہت کم رہ گیا ہے اور چند سال سے وہاں یہی معمول ہو گیا ہے کہ ہندوستان سے فرمائش کر کے شورہ منگا لیتے ہیں ئ جس کے معنی یہ ہیں کہ سولھویں صدی کے اخیر میں شورے کی برآمد شروع ہو گئی تھی۔

لیکن اوّل تو مقدار مذکور بہت کم ہے دوسرے یہ طلب اپنی نوعیت میں تجارتی نہ تھی بلکہ سرکاری تھی۔ اس زمانے کے قریب ہسپانیہ کو سامان حرب کی بہم رسانی میں بہت مشکلات پیش آرہی تھیں اور نیم جنگی جہازوں (= کیرکوں) کو پکڑ پکڑ کے ان میں بھی اسی قسم کا سامان، تجارتی ضرورتوں کا لحاظ کئے بغیر، لاد دیا جاتا تھا۔ ۱۶۱۳ء میں اور اگلے سال بھی گوآ کو حکم بھیجا گیا کہ جہاز سازی کے لئے ہر سال شہتیر روانہ کئے جائیں حالانکہ یہ ایسی شے تھی کہ کوئی تاجر اس راستے اسے نہ منگاتا۔ اسی طرح شورے کی طلبی کو بھی یہی سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہسپانیہ کی سرکاری ضروریات کا ثبوت ہے۔

تجارتی طور پر اس کام کو، کورومنڈل کے ساحل پر بسنے کے چند ہی روز بعد ولندیزوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ میں نے ان کی تجارت کے ابتدائی حالات کی جستجو نہیں کی۔ مگر ۱۶۱۷ء کی ایک کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے گماشتے اس تجارت میں ہاتھ ڈال چکے تھے اور جہاز نیرڈن کے مال کی فہرست، جو ضمیمہ ب میں نقل کی گئی ہے، ظاہر کرتی ہے کہ ۱۶۲۱ء میں شورے کی خاصی مقدار یورپ بھیجی گئی اور اس کے بعد سے تجارتی تحریروں میں معمولاً اس کی خریداری کا تذکرہ آتا ہے۔ ولندیزوں کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے اس کام کو ہاتھ میں لیا۔ کورٹ منٹس کے مختلف اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان میں شورے کی کمی رہتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ۱۶۱۷ء میں انگریزی کمپنی کو بارود کی بہم رسانی میں بڑی دقت پیش آئی۔ چند سال بعد یعنی ۱۶۲۴ء میں نظارت بحری نے زور دیا کہ ولندیزوں کی طرح انگریزوں کو بھی شورہ ہندوستان سے لانا چاہیئے اور کچھ روز بعد (اسی سال) کمپنی سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنی بارود خود بنائے اور خود شورہ بہم پہنچائے۔ معلوم ہوتا ہے ۱۲۰
۱۶۲۰ء ہی میں کمپنی نے سورت سے شورہ بھیجنے کی فرمائش کی تھی کیونکہ ۱۶۲۱ء کی کیفیت کے ایک خلاصے میں لکھا ہے کہ اس نواح میں شورہ نہیں ملتا۔ لیکن چار سال بعد کپتان ویڈل نے اطلاع دی کہ ولندیز اسے بوجھ پورا کرنے کے لئے بھر رہے ہیں اور انگریزوں نے بھی اس کی بہم رسانی کا بندوبست

کیا ہے اگرچہ ابتدا میں انھوں نے شورے کی فرمائش احمد آباد بھیجی تھی۔ یہ مال ۱۶۲۶ء کے اخیر میں لندن پہنچ گیا اور سمجھنا چاہیئے کہ اسی سال سے انگریزوں کی شورے کی تجارت چل نکلی۔

شورہ ہندوستان کے مختلف اقطاع سے بہم پہنچتا تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا سب سے پہلے کورومنڈل سے بہم رسانی کا کام لیا گیا۔ کچھ روز بعد گجرات اور آگرے کا نام اس فہرست میں داخل ہوا اور پھر کوکن کی بعض بندرگاہوں کا لیکن جب اوّل اوّل اڑیسے کی بندرگاہوں سے اور پھر زیادہ کارگر طور پر ہگلی کے راستے بہار کے اقطاع تک خریداروں کی رسائی آسانی سے ہونے لگی، تو باقی سب وسائل ماند پڑ گئے۔ پھر بھی ۱۶۵۰ء تک یہ تجارت مقدار کے اعتبار سے بہت معمولی رہی۔ اور مجھے کوئی مثال نہیں ملی کہ کسی ایک سال میں انگریزوں کی خرید پچاس ٹن تک پہنچی ہو۔ ہم ۱۶۲۵ء میں ۴۵ ٹن، ۱۶۳۹ء میں ۲۳ ٹن ۱۶۴۳ء اور ۱۶۴۰ء میں ۳ سو تا ۴ سو گٹھے (= کچھ کم ۴۰ ٹن) اور ۱۶۴۴ء میں ۲۰ تا ۲۵ ٹن کی خریداری کا تذکرہ پڑھتے ہیں۔ ولندیزوں کی خریداری اس سے یقیناً زیادہ تھی۔ لیکن ان کی بعض اجناس ایسے پیمانوں میں تحریر ہیں جن کا وزن متعین کرنا مشکل ہے۔ البتہ قرائن سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۶۳۰ء تا ۱۶۵۰ء تک شورے کی برآمد کی مقدار ۲ سو تا ۴ سو ٹن تک ہوگی اور ممکن ہے کہ مجموعی تجارت کا اوسط یہی ۳ سو ٹن سالانہ رہا ہو۔ کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ سنہ مذکور تک شورہ، نیل یا گٹھے کے برابر وقعت نہیں پا سکا تھا اور ساحل پر اس کی جو قیمت ادا کی جاتی تھی، اس میں نفع نسبتہً کم رہتا تھا اور جہاز میں ایسی چیزیں بھرنے کو ترجیح دی جاتی تھی، جن کی فروخت سے زیادہ فائدے کی امید ہو۔ بایں ہمہ شورے کے دساور بھیجنے میں یہ فائدہ ضرور تھا کہ گٹھوں میں جو مال جاتا تھا، اس کے ساتھ شورے کو بطور بھرت[1] (Kintledge) کے

---

[1] مرچ بھی اس طرح گٹھوں میں بکھری ہوئی جاتی تھی اور کبھی کبھی کپاس کو بھی یونہی جہاز میں پھیلا پڑا رہنے دیتے تھے۔ Kintedge Kintlage کو اوکسفورڈ ڈکشنری میں۔ (بصفحہ دیگر

جہاز میں پھیلا دیتے تھے۔

۱۲۱ بہر حال، پٹنے میں ولندیزوں اور انگریزوں کے کارخانے قائم ہوتے ہی اس تجارت میں حیرت انگیز ترقی ہونے لگی جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو بہم رسانی میں سہولتیں پیدا ہوئیں اور ادھر یورپ میں شورے کی مانگ بڑھ گئی۔ غرض ۱۶۵۳ء میں انگریزی کمپنی نے ۲ سو ٹن کی فرمائش بھیجی۔ آئندہ سنین کے اعداد مشکوک ہیں لیکن خانگی جہازوں میں بھرنے کے لئے شورہ خاص طور سے تلاش کیا جاتا تھا اور جب کمپنی کو دوبارہ اجارہ ملا تو شورے کی مقدار جو بنگالے سے جہازوں میں بھیجا جاتا تھا، ۸ سو ٹن مقرر کی گئی۔ مگر یہ ٹن وزن کی بجائے پیمائش ظاہر کرنے کے لئے درج کئے ہیں اور ان کا اوپر کے اوزان سے مقابلہ کرنا درست نہیں۔ تاہم ان سے تجارت کی ترقی صریحاً ظاہر ہے[1]۔ اس ترقی میں ولندیز بھی شریک تھے اور ۱۶۶۱ء میں انھوں نے ۱۴۸۰ ٹن وزن کی مقدار کثیر جہازوں میں بھر کر یورپ روانہ کی۔ اس طرح ہمارے پیش نظر عہد کے آخر میں شورہ فرنگی تجارت کی سب سے مقدم اشیا میں داخل ہو گیا، حالانکہ بیس ہی برس پہلے اسے محض بھرتی کے طور پر بھرا کرتے تھے۔ دوسرے سابق میں تھوڑی تھوڑی مقدار مختلف مقامات سے حاصل کی جاتی تھی، لیکن اب اس تجارت کو بہار سے مختص

بقیہ حاشیہ۔ وہ مصالحہ یا سامان بتایا ہے جو مستقل طور پر بھرت کا کام دے لیکن ہندوستان کے انگریز گماشتے اس لفظ کو عام طور پر ایسی شے کے لئے استعمال کرتے تھے جو کسی سفر میں، باندھے بغیر، جہاز میں پھیلی ہوئی بھری گئی ہو۔

[1] جیسا کہ ضمیمہ د میں صراحت کی گئی ہے، یہ اکثر اوقات مشکل ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے ٹن کے معنی کیا سمجھے جائیں۔ کیونکہ اس کے وزن (= ۲۰ ہنڈرڈ ویٹ) کا تعین اس وقت تک نہ ہوا تھا اگرچہ زیادہ تر اسی وزن کا رواج ہونے لگا تھا۔ ولندیزوں کی تحریروں میں جو اعداد ملتے ہیں، ان کی بنا پر ہم ایک لاسٹ کا وزن معلوم کر سکتے ہیں۔ پھر مختلف مساواتوں میں بہت کچھ مطابقت پائی جاتی ہے اور ان سے ایک ٹن قدیم (= نصف لاسٹ) کا وزن ۱۸ تا ۱۹ سو پونڈ نکلتا ہے۔ اسی بنیاد پر حساب کیجئے تو ۸ سو ٹن کی پیمائش اس زمانے کے ۶ تا ۷ سو ٹن وزن کے مساوی ہوگی۔

کرلیا گیا جس کی وجہ اس علاقے میں شورے کی ارزانی کو سمجھنا چاہیئے؛ مختلف
مقامات پر شورے کی بہم رسانی میں جو خرچ ہوتا تھا، اس کے متعلق صحیح اعداد
تو بہت کم ملتے ہیں کہ مقابلہ کیا جا سکے تاہم انگریزی مراسلات اور رسائل تباویہ میں
پاشاں طور پر اتفاقیہ یہ ذکر آجاتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پٹنے میں
۳۶ سیر کے من کی جو قیمت تھی قریب قریب وہی قیمت احمد آباد کے ۱۷ سیر کے
من کی تھی۔ گویا دُگنے کا فرق رہتا تھا۔ رہا بندرگاہ سے پٹنے کا زیادہ دُور ہونا،
تو چونکہ کشتیوں میں حمل نقل مسلسل ہو سکتی تھی، لہٰذا نہ صرف اس دشواری
کی تلافی ہو جاتی بلکہ احمد آباد کی نسبت کچھ فائدہ ہی رہتا تھا؛ اب اگر پٹنے کی
قیمت کو سامنے رکھ کر حساب کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے اواخر
میں اس تجارت سے بہار کو قریب قریب ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی ۱۲۲
ہو جاتی تھی اور وہاں سے لا کے جہازوں میں چڑھانے تک تقریباً اسی قدر
رقم اور خرچ ہوتی تھی۔ اس طرح اس شہر کے لئے آمدنی کی یہ اچھی خاصی مد نکل
آئی اگرچہ پورے ہندوستان کی آمدنی میں اس اضافے کی کوئی وقعت نہ تھی؛
اس تجارت میں، حکام کی طرف سے دست اندازی کا برابر امکان رہتا
تھا۔ ان کا یہ عذر تو انصافاً قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ مقامی حربی ضروریات
کے لئے وہ شورہ درکار ہے، جو وہاں نکلتا تھا لیکن عام طور پر عمل یہ ہوتا تھا کہ کچھ
دے دلا کر جسے بہت نامناسب یا ناواجبی نہیں کہہ سکتے، امتناعی حکم کے خلاف
شورہ باہر لے جاتے تھے یا محصول گیرندوں کو جھوٹ بول کر دھوکا دے دیتے تھے۔
البتہ ۱۶۴۶ء میں مداخلت کا ایک نیا سبب خلافِ امید یہ پیدا ہوا کہ شہزادہ
اورنگ زیب نے جو اُن دنوں گجرات کا صوبہ دار تھا، اس بنا پر شورے کو باہر
جانے سے روکا کہ ہندوستان کے شورے سے جو بارود (یورپ میں) تیار
ہوگی ممکن ہے کہ وہ کسی اسلامی سلطنت کے خلاف استعمال کی جائے۔
لیکن اس شہزادے کا دوسری جگہ تبادلہ ہو گیا اور یہ رکاوٹ جلدی ہی دُور ہو گئی۔
دوسرے حق یہ ہے کہ اُس زمانے کے عیسائی تو اورنگ زیب کے اس فعل پر
اعتراض کرنے کا مُنہ نہ رکھتے تھے کیونکہ تھوڑے ہی دن پہلے پرتگال سے

بیجاپور کو گھوڑے بھیجنے پر رومہ کے مسیحی علما نے ٹھیک اسی بنا پر محاسبہ کیا تھا؎ حکام کی مداخلت کے علاوہ اس تجارت میں صرف ایک دقّت اور تھی کہ شورہ صاف کرنے کے لئے مناسب ظروف بہم پہنچائے جائیں۔ اوّل تو یہ چیز بھاری اور بہت جگہ گھیرنے والی، دوسرے صاف کرنا ضروری۔ پھر ہندوستان میں بھاپ بنا کے کثافت دُور کرنے کا جو طریقہ مروّج تھا، اس میں مٹّی کے برتن استعمال ہوتے تھے اور یہ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ آخر تانبے کے برتنوں کی ضرورت ہوئی تو مقامی بازاروں میں اتنا تانبہ میسّر نہ آیا۔ ۱۶۴۱ء میں کورومنڈل کے ولندیزوں نے لکھا کہ ہماری دیگیں گھس کے پرانی ہوگئی ہیں۔ مرمّت کے لئے تباویہ سے تانبے کی چادریں بھیجی جائیں اور نئی دیگوں کے لئے ہالینڈ فرمائش کی جائے۔ اسی طرح گیارہ سال بعد انگریزوں کو ہگلی اور بالاسور میں تانبا اور لگن وغیرہ حسب دلخواہ نہ ملے اتّفاق سے انہی دنوں مدغاسکر میں نوآبادی بسانے کی ایک تجویز ناتمام رہ گئی تھی۔ مگر اس سلسلے میں وہاں شکر سازی کے لئے برتن (ولایت سے) بھیجے گئے تھے۔ اب اُن سے یہ کام لے لیا گیا۔ غرض یہ دشواری آسانی سے دُور ہوگئی اور آج کل تو اس کے بیان میں صرف اتنی دلچسپی رہ گئی ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن دِنوں ہندوستان کے بازاروں میں تانبے کی بہم رسانی کی کیا کیفیت تھی؎

۵۔ سوتی مال

گزشتہ تین صدی میں ہندوستان اور مغربی یورپ کے مابین سوتی مال کی تجارت کے مختلف دَور گزرے ہیں۔ اور اس مضمون کا مطالعہ کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی توجہ خاص اس عہد کے واقعات پر قائم رکھیں جس عہد سے ہماری کتاب بحث کرتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ واضح رہنا چاہیئے کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں اہل یورپ کے لباس میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئیں مگر یہ زمانہ ہمارے پیش نظر عہد کے اندر نہیں آتا۔

باب چہارم

یہی سبب ہے کہ سنہ ۱۶۶۰ تک ہم ململ یا چھینٹ کی پہننے کے کام کے واسطے کوئی مانگ ہوتی نہیں دیکھتے اور اس قسم کا کپڑا دساور جاتا بھی ہے تو وہ قریب قریب تمام تر افریقہ یا امریکہ کے لئے مطلوب ہوتا ہے جہاں اس تجارت کو پرتگیزوں نے جاری کر دیا تھا۔ پس ہمیں اس فصل میں زیادہ تر لٹھے کی تجارت سے سروکار رہے گا جو مغربی یورپ کی خانگی ضروریات، جیسے دسترخوان، پلنگ کی چادر، رومال، توال وغیرہ کے واسطے استعمال ہونے لگا تھا۔ شاذ و نادر طور پر ہندوستان کے رنگین یا پرتکلف کپڑے بھی پردوں اور دوسرے آرائشی کاموں کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

ہمارے عہد کے آغاز سے قبل مغربی یورپ میں ہندوستان کا جو کچھ سوتی مال آتا تھا، وہ بہت قلیل مقدار میں بری راستوں سے پہنچتا تھا اور اسی حمل و نقل کے مصارف کی گرانی کے باعث اس کی کھپت بہت محدود رہتی تھی۔ مقامی ضروریات کے واسطے سن کا کپڑا اور آرائش کے لئے چارخانے وغیرہ خود یورپ میں تیار ہوتے تھے اور خوبی کے اعتبار سے لٹھے یا چھینٹ کو ان پر کوئی نمایاں فوقیت حاصل نہ تھی۔ البتہ اگر وہ مقابلے میں ارزاں ہوں تو ان کی کھپت کی صورت ہو سکتی تھی۔ اس بارے میں پرتگیزوں کو جو مواقع میسر تھے، اُن سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سترہویں صدی کے آغاز میں گو مغربی یورپ میں سوتی مال کی تجارت کا میدان بہت وسیع موجود تھا مگر اس سے بالکل کام نہیں لیا گیا تھا۔ ان منڈیوں میں تجارت پھیلانے کے امکانات جو کچھ ظاہر ہوئے وہ زیادہ تر انگریزی کمپنی کی تگ و دو کا نتیجہ تھے ورنہ ولندیزوں نے جیسا کہ آگے آتا ہے، اس جدید تجارت کے جاری کرنے میں بہت کم حصہ لیا اگرچہ اسکے کامیابی سے قائم ہو جانے کے بعد وہ اس میں شریک ہو گئے۔ ان کے اس تغافل کا اصلی سبب غالباً یورپ کی سن بافی کے حالات میں ملیگا۔ دراصل انگلستان میں سن کا کپڑا (یا کتان) وسیع پیمانے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ لہذا لٹھے سے دیسی مال کا تو کوئی سخت مقابلہ ہو نہ سکتا تھا اور ادھر ۱۲۴ لٹھے کو دوسرے ملکوں میں لے جا کر بیچنا اپنے ملک میں روپیہ لانے کے مرادف تھا۔

باب چہارم

غرض اُس زمانے کی عام تجارتی رائے اس بیوپار کی موافقت میں تھی۔ برخلاف اس کے ہالینڈ میں سن بافی ایک بڑی صنعت تھی اور اس بات کا قرینہ کم تھا کہ ولندیزی کمپنی کے شرکا ایسے مال کی درآمد پر زور دیں جو خود وطن کی ایک عام صنعت کی مدمقابل ہو اور جس کی تجارت میں خود اس کمپنی کے بعض شرکا اپنے کاروبار کی ضمن میں لازماً حصہ لیتے ہونگے۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئیے کہ ولندیزوں نے مصالحے کی تجارت کا اجارہ لے رکھا تھا اور یوں بھی ان کی مشرقی تجارت ایسی حالت میں تھی کہ تباویہ سے نفع بخش تجارتی مال بھر بھر کر بھیجنے کی کچھ کمی نہ محسوس ہوتی تھی بجائیکہ ہندوستان کے انگریز تاجروں کو بعض اوقات یہی عقدہ حل کرنا مشکل ہوتا تھا کہ واپس جانے والے جہازوں میں کیا چیز بھر کر بھیجی جائے۔ نیل بذات خود تجارت کو چلانے کے لئے مکتفی نہ ہوتا تھا اور یہ عین مفید مطلب نظر آتا تھا کہ یورپ میں سوتی مال کی نکاسی کی صورت پیدا کی جائے جو ہندوستان سے بافراط مہیا ہو سکتا تھا۔ غرض یہ امور اس واقعے کی کافی توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اس تجارت کی ابتدا دیکھنی ہو تو ہمیں زیادہ تر انگریزی تحریروں کا مطالعہ کرنا پڑیگا۔

اس سوتی مال کی تجارت کے امکان کو انگریزی کمپنی اسی وقت سے بخوبی سمجھتی تھی جب کہ اس نے ہندوستان میں کاروبار شروع کیا۔ اور سنہ ۱۶۰۷ء کے بعد سے یکے بعد دیگرے تجارتی جہازوں کو جو ہدایات دی گئیں انھی کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ کمپنی کس قسم کے کپڑے کی مانگ کی توقع رکھتی تھی۔ لیکن یہاں ہم صرف ولیم فنچ کی تجارتی کیفیت کا حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے جو اس نے سنہ ۱۶۰۹ء میں سورت سے لکھ کر انگلستان روانہ کی اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک واقف اور اپنی ضروریات سے باخبر انگریز خریدار نے مقام متعلقہ پر پہنچ کر کیا رائے قائم کی تھی۔ سب سے اول فنچ بافتے کی مختلف اقسام کا ذکر کرتا ہے[1] جس میں

---

[1] جیسا کہ کسی گزشتہ باب میں ہم لکھ چکے ہیں، "بافتہ" گجرات کے عام لٹھے کا تجارتی نام ہے۔ سامانہ (شمالی ہند) کے کپڑے کو فرنگی تاجر سمیانو (= سامانی) کہتے تھے۔ اور عام مروجہ دھوتی کو "دُتی"۔ بیراجی اگر بہتر قسم کا ہو تو ولندیزی پارچے سے ملتا تھا ورنہ اسے (بصفحہ دیگر)

بڑوچ کا باریک دوسرے مقامات کا ذرا موٹا کپڑا شامل ہیں۔ پھر سامانی پارچے کو لکھا ہے کہ یہ "لٹھے سے عرض میں زیادہ اور میرا گمان ہے کہ انگلستان کے واسطے بافتے سے زیادہ موزوں ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بافتے اور لٹھے دونوں کو بطور مرادف استعمال کرتا ہے؎ اس کے بعد دھوتی اور بیراجی پارچے ۱۲۵ کا ذکر ہے جو ہالینڈ کے کپڑے سے ملتا جلتا تھا۔ اور "لٹھے" کی عام قسمیں یہی چار تھیں؎ اس کے بعد فنچ ایک زیادہ ہلکے کپڑے یعنی ململ کا ذکر کرتا ہے جسے "شیرین باف" کہتے تھے اور جو اس کے خیال میں شمالی افریقہ میں بکنے کے واسطے موزوں تھا۔ پھر راس کماری کے قریب کسی جگہ کے لٹھے کی نسبت جو چوڑے پاٹ کا ہوتا تھا، لکھتا ہے کہ "یہ انگلستان میں چادروں کے لئے خوب بکیگا"؎ آخر میں اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو ان دیسی کپڑوں کے علاوہ زیادہ اعلیٰ قسم کا پارچہ بھی مل سکتا ہے؎

اس کے بعد فنچ نے افریقہ کی تجارت کے لئے بعض چھینٹ کی قسم کے کپڑے گنوائے ہیں جنھیں پرتگیز "بن ٹیڈو" کے عام نام سے یاد کرتے تھے کہ یہ رضائیوں اور عمدہ پردوں کے لئے غالباً خوب نفع سے فروخت ہونگے۔ نیز بنی بنائی رضائیاں اور لحاف وغیرہ کہ جو سفید یا سرخ اور اودے رنگے ہوئے لٹھے کی مل سکتی تھیں؎ اسی پر سوتی پارچے کی فہرست تمام ہوتی ہے جو فنچ کے نزدیک ہندوستان سے ممالک مغرب کو دساور بھیجے جا سکتے تھے۔ جن میں ململ افریقہ کے لئے اور مختلف قسم کے لٹھے اور رنگے ہوئے کپڑے انگلستان کے خانگی استعمال کے لئے تھے۔ جس کے بعد وہ جاوا اور سماٹرا کی تجارتِ پارچہ کی طرف متوجہ ہو گیا ہے؎ فنچ کی اس تحریری کیفیت میں جو صورتیں بتائی گئی ہیں، انگریزوں کی تجارت پارچہ آیندہ انھی کے مطابق جاری ہوئی اور ابتدا میں برآمد کا حال معلوم کرنے کے لئے

بقیہ حاشیہ۔ ململ کی بجائے لٹھا ہی شمار کرنا چاہیئے۔ بہر حال یہ نام بہت سی قسم کے کپڑے کے لئے بولا جاتا تھا۔ شیرین باف (Serribaff) ایک قسم کی ململ تھی جس کے لئے دکن مشہور تھا؎

ہندوستانی پارچے کی جو سورت سے جہاز میں بار ہوا، وہ فہرست مثال میں پیش کرنی کافی ہے جو سب سے پہلے معرض تحریر میں آئی - یہ رائل این نامی جہاز کے مال کی فہرست ہے جو ۱۶۱۹ء میں انگلستان روانہ ہوا۔ قیمتیں گجرات کے مروجہ سکے محمودی کے حساب سے درج کی گئی ہیں جو $\frac{۲}{۳}$ روپیہ کے معادل سمجھا جاتا تھا اور ان میں جہاز تک لانے کی باربرداری کا خرچ بھی شریک ہے۔

اس فہرست پر نظر ڈالتے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اشیا محض بطور نمونہ بھیجی گئی تھیں اور اصلی برآمد معمولی لٹھے، چھوٹے بڑے پاٹ کے بافتے، دھوتی اور سامانی پارچے پر مشتمل تھی گویا چار میں سے تین قسمیں وہی تھیں جن کی فنچ نے دس سال پہلے سفارش کی تھی - ایک اور بات یہ نظر آتی ہے کہ ایک ہی نام کے کپڑے کے مختلف چالانوں میں قیمتیں مختلف ہیں اور اس تجارت کو ٹھیک طور پر جاننے کے لئے یہ فرق سمجھنا واقعی ضروری ہے - اصل یہ ہے کہ اس وقت تک قسم کا کوئی مقررہ معیار نہ تھا - انفرادی طور پر ہندوستان کے جلاہے جیسا جی چاہتا، کپڑا بنتے تھے اور خریدار کو اپنی ضرورت کے لحاظ سے ایک ایک تھان منتخب کرنا پڑتا تھا۔ اس موقع پر سب سے اچھے تھان عموماً انگلستان کے لئے چھانٹے گئے تھے اور ادنیٰ قسم کا کپڑا مشرقی منڈیوں کے واسطے جاوا روانہ کیا گیا تھا - اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمعصر تحریروں میں انگلستان کے لئے بہتر قسم کے جس پارچے کا ذکر آتا ہے، اس سے یہی مراد ہے - نہ یہ کہ ہندوستان کا عمدہ قسم کا کپڑا۔ جس سے ململیں اور دوسرے باریک کپڑے مراد ہوتے تھے کہ گرم ملکوں کے واسطے تو وہ موزوں تھے لیکن خانہ داری کی ضرورتوں میں کسی کام نہ آتے تھے - غرض انگلستان جو پارچہ گیا وہ لٹھے ہی کے بہترین تھان تھے کہ جن ضرورتوں کے لئے خریدے گئے ان کے واسطے موزوں تھے۔

فہرست پارچہ (رائل آئین)

نام	تعداد تھان	قیمت	اوسط قیمت فی تھان
۱ بافتے =			
۱- "گنگامی"	۴۰	۲۷۶ محمودی	۶؍۹ محمودی
۲- عریض	۸	۱۴۰ "	۱۵ "
"	۵۳۰۲	۳۳،۱۹۵	۶؍۳
"	۱۰۰۰	۶،۷۷۷	۶؍۸
زیادہ عریض (؟)	۱	۲۴	۲۴
۳- چھوٹے پاٹ کے	۹۸۰	۳،۶۸۰	۳؍۸
"	۳۰	۵۵	۲؍۷
"	۱۹۹۷	۹۹۵۰	۵
۴- (کھانے کے) رومالوں کے لئے	۸۰	۲۱۸	۲؍۷
"Watchett" (Blue)	۲۰	۱۶۰	۸
رنگا ہوا	؟	۳،۵۸۴	؟
کھاروا	۲۰۰	۶۳۵	۳؍۳
ب دھوتیاں : ۱۲۶			
۱- بلا صراحت	۲۹۰	۱،۰۶۶	۳؍۷
۲- دھولکا	۴۰۰	۱،۲۹۱ "	۴؍۶ "
ج سامانی تکلف کے کپڑے اور مشکوک اقسام ف۱ =	۲۳۳۰	۱۴،۰۷۵	۶

ف۱ بعض رئیسی کپڑے اس نمونے کے ہوتے تھے جس کو انگلستان میں "ڈمی ٹی" (Dimity) کہتے تھے؛ نکانی، دھاری دار لٹھے کا نام تھا؛ احرامی، غالباً اس قسم کا کپڑا ہوتا تھا جیسا کہ حاجی لوگ مکہ معظمہ جاتے وقت (احرام) باندھ لیتے ہیں؛ سہوم کی کوئی کیفیت مجھے نہیں ملی؛

متفرق پارچہ	۲۰۰	۱۸۷ (؟)	ء۹ (؟)
رئیسی (؟) (Reeses)	۲۷۵	۱/۱۵۰	۴ء۲
سہوم (Sahum)	۵۰	۴۳۱	۸ء۶
نکانی (Necanies)	۴۲۰	۱,۳۲۰	۳ء۱
احرامی (؟) "Eramies"	(؟)	۱۷۷	(؟)

مگر لٹھے کی مانگ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بڑھی۔ سنہ ۱۶۱۹ کی فہرست کی میزان ۱۴ ہزار تھان کے قریب ہوتی ہے (معمولی تھان ۱۲ تا ۱۵ گز کا ہوتا تھا) لیکن سنہ ۱۶۲۵ کی فرمائش میں ۲ لاکھ سے زیادہ تھان مذکور ہیں۔ سنہ ۱۶۲۸ میں جو مال روانہ ہوا، وہ ایک ہزار گٹھوں پر مشتمل تھا جن میں ڈیڑھ لاکھ بلکہ ممکن ہے کہ کچھ زیادہ تھان ہوں۔ اور سنہ ۱۶۳۰ء میں، یعنی گجرات کے قحط سے کچھ ہی پہلے، جو تجارت کے اس دور کو ناگہانی طور پر ختم کرنے والا تھا، کمپنی نے کچھ مقدار میں تکلف کا سامان منگایا لیکن ایک لاکھ تا ایک لاکھ بیس ہزار لٹھے کے تھانوں کی فرمائش بھیجی تھی ؎

کپڑے کی اس کثیر مقدار میں برآمد سنکر شاہ انگلستان جیمز اوّل بھی اس طرف متوجہ ہوا اور کمپنی کے نائب ناظم سے اس نے دریافت کیا کہ یہ کپڑا کس طرح کھپتا ہے۔ جواب میں عرض کیا گیا کہ "اس کا اکثر حصہ تو انگلستان میں بکتا اور نہایت کار آمد ہے جس کی وجہ سے فرش فروش چار خانے اور دوسرے کتانی پارچے کی قیمتیں کم ہوگئی ہیں۔ باقی ماندہ اب خود انگلستان کی پیداوار بن گیا ہے کہ ممالک محروسہ کی ضروریات بجالانے کے بعد فاضل کپڑا دوسرے ممالک میں انگلستان کی مصنوعات کی حیثیت سے دساور بھیج دیا جاتا ہے ؎ اس پر بادشاہ سلامت نے بہت خوشنودی ظاہر فرمائی اور کہا کہ ملک میں دولت لانے کا یہ بہت اچھا اور بنا بنایا ذریعہ ہے ؎

پھر پورے دو سال بھی نہ ہوئے تھے جب کہ ناظم نے کمپنی کو اطلاع دی کہ سورت کے مال کی فروخت میں بہت فروغ ہوا ہے اور بیرونی ممالک میں لٹھے کی مانگ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اگر اس وقت ایک لاکھ سے دو لاکھ تک

باب چہارم ۲۰۰۔

تھان ہمارے پاس ہوں تو ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں ؎ مانگ کے اس قدر ایکا ایکی بڑھ جانے سے تنہا گجرات سے سارا مال فوراً بہم نہ پہنچ سکا اور کمپنی کے خریدار شمالی ہندوستان کے ان مقامات کو بھیجے گئے جہاں عام طور پر ایسا کپڑا مل سکتا تھا جو بظاہر لندن کی منڈی کے موزوں تھا۔ خاص طور پر جن شہروں میں گماشتے گئے، وہ پٹنہ اور سامانہ تھے لیکن آگرے میں بھی ہم خریداریوں کا حال پڑھتے ہیں گو یہ لٹھا دوسرے مقامات خاص کر اقطاع اودھ کا بنا ہوا تھا۔ کچھ روز بعد ہی پٹنے کو چھوڑ دیا گیا۔ سامانے میں ۱۶۲۷ء تک خریداروں کے مختلف موقعوں پر جانے کا ذکر ملتا ہے لیکن کمپنی نے آخر میں اس کی مصنوعات کے بھی خلاف فیصلہ کیا۔ اور ۱۶۳۰ء کے اوائل میں جو فرمائش بھیجی گئی اور جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے، اس میں خصوصیت کے ساتھ گجرات کے لٹھے کی مانگ تھی اور "آگرے کے مال" کی جس میں سامانی پارچہ بھی شامل ہے، صراحتہً ممانعت کردی تھی ؎ لیکن قحط نے اس حکم کی تعمیل ناممکن کردی اور مال کی بہم رسانی کا دائرہ وسیع کرنا پڑا۔ ۱۶۳۵ء میں آگرے کو لکھا گیا کہ "دریابادی" "خیرآبادی" اور "اکبری" پارچہ خریدا[1] جائے۔ پھر ان میں سے پہلے دو، جو اودھ کے قصبوں دریاباد اور خیرآباد کی صنعت تھے، بہت جلد شہرت پا گئے اور ان کے ساتھ ایک اور کپڑا ایسرقلی (Mercooli) بھی مشہور ہوا جو بیشتر مغربی اودھ میں تیار کیا جاتا تھا ؎ ۱۶۴۰ء میں لکھنو میں ایک کوٹھی کھولی گئی جس کا بڑا مقصد دریابادی کپڑے کی بہم رسانی تھا اور گو خیرآبادی کچھ عرصے تک نامقبول رہا لیکن اگلے عشرے میں ہم پھر اسے دریابادی کے ساتھ لندن میں فروخت ہوتا دیکھتے ہیں ؎ ۱۶۴۱ء میں کمپنی نے

۱۲۸

---

[1] دریاباد لکھنو اور فیض آباد کے وسط میں اور خیرآباد، لکھنو کے شمال میں قریب ہی واقع ہے۔ "اکبری" (Echbaryes) پارچے کی کوئی تصریح مجھے نہیں ملی مگر قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شہنشاہ اکبر کا پسند کردہ یا اس کے نام سے موسوم تھا۔ یہ بھی زیادہ تر اودھ ہی میں بنتا تھا اور کم سے کم کچھ مدت تک فیض آباد کے قریب جلال پور کی نواح میں بنتا رہا ؎

باب چہارم

اِن شمالی مصنوعات کی نسبت پسندیدگی ظاہر کی۔ بڑودے اور بڑوچ کے عریض بافتوں پر میر قلی کو ترجیح دی گئی اور دریاآبادی بھی بہت مقبول ہوا۔ چنانچہ کمپنی نے لکھا کہ شمالی ہندوستان سے سربراہی نہ ہونے کی صورت میں گجرات کے بافتے خریدے جائیں ورنہ نہیں ۓ۔ اور اس طرح لندن کی منڈی شمالی ہندوستان کے جلاہوں کے لئے کھل گئی ۓ

انگریزی کمپنی کے سندھ میں تجارت شروع کرنے کی کیفیت کسی گذشتہ باب میں بیان ہو چکی ہے۔ ۱۶۳۵ء میں سب سے پہلے جو خریدار وہاں بھیجے گئے انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ اصلی تلاش لٹھے کی کریں، جو انگلستان کے لئے موزوں بھی ہو۔ گو اسی کے ساتھ گی آنا کے واسطے چارخانے اور جاوا کی منڈیوں کے لئے بھی پارچہ بہم پہنچانے کی فرمائش تھی۔ ان گماشتوں نے مقامی لٹھے کی نسبت اچھی رائے لکھی اور انگلستان میں بھی وہ مقبول ہوئے لیکن سندھ کے مقامی حالات کی بنا پر وہاں صرف محدود مقدار میں مال میسر آسکا ۓ

ہندوستان کے مشرقی ساحل سے لندن کو سوتی پارچہ بھیجنے کی پہلی کوشش غالباً ۱۶۱۲ء میں کی گئی تھی۔ لیکن فروخت کچھ اچھی نہ رہی اور اس کوشش کو جاری نہ رکھا گیا۔ ۱۶۳۰ء میں سورت کے گماشتوں نے پھر یہ خیال تازہ کیا اور انگلستان میں کمپنی کو گجرات سے مال میسر نہ آنے کی خبر ہوئی تو وہ بھی اس طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن فرمائشوں کی تعمیل میں بہت دیر لگی اور ۱۶۳۶ء میں گماشتوں پر سخت لتاڑ پڑی کہ ۳۲½ ہزار پونڈ کے مال کی فرمائش کے جواب میں وہ صرف ۱۱۲۶۹ پونڈ کا کپڑا بھیج سکے۔ اس تنبیہ کا اثر اس کثیر مال کے چالان سے ظاہر ہے جو جنوری ۱۶۳۹ء میں سورت کے راستے انگلستان روانہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے اس سے اگلے جاڑوں میں کچھ نہیں بھیجا گیا۔ ۱۶۴۰ء میں مال کی معقول مقدار سورت پہنچی لیکن اس قدر دیر میں کہ جہاز بھرے جا چکے تھے اور ان میں گنجائش نہ رہی تھی چنانچہ اس سال کی فہرست اشیا میں تھانوں کا صرف ایک گٹھا مذکور ہے جو بطور نمونہ بھیجے گئے تھے ”کیونکہ یہ آپ کے نئے قلعے ۱۲۹
مدراس پٹم کا پہلا ثمرہ ہیں ۓ

بہم رسانی کے میدان کی اس توسیع کا نتیجہ مال کی اُن فہرستوں سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے جو سنہ ۱۶۳۹ اور سنہ ۴۰ میں سورت سے بھیجا گیا جب کہ قحط کے فوری اثرات زائل ہو چکے تھے۔ اس میں سوتی پارچے کے تھانوں کی تعداد حسب ذیل درج ہے:۔

تھانوں کی تعداد جو بندر سورت سے جہازوں میں لندن بھیجے گئے

مقام خرید	موسم سنہ ۱۶۳۸-۳۹ء	سنہ ۱۶۳۹-۴۰ء	سنہ ۱۶۴۰-۴۱ء
مشرقی ساحل	۱۸,۲۲۵ تھان	...	۲۵
بنگالہ	۶,۷۰۰	...	..
گجرات	۳۸,۸۸۳	۱۳,۶۶۰	۱۸,۹۱۸
آگرہ	۲,۸۲۳	۱۲,۱۲۲	۲۳,۵۵۰
سندھ	...	۲۸,۵۰۷	۱۱,۳۶۰
میزان	۶۶,۶۴۱	۵۴,۲۸۹½	۵۳,۸۵۳

ان اعداد میں آگرے اور سندھ کے سب تھان لٹھے کے تھے اور گجرات کے مرسلہ کپڑے میں بھی زیادہ تر یہی قسم تھی لیکن بعض چالان "گی آنا کے پارچے" کے بھی اس میں شامل تھے اور اس سے پُرتکلف یا دھاری یا چار خانے کا وہ کپڑا مراد ہے جو مغربی افریقہ میں خوب بکتا تھا؎ ان کے مقابلے

۱؎ اس سال کا ایک مطلوبہ گم ہو گیا ہے اور مجموعی برآمد غالباً اس سے زیادہ تھی جتنی کہ اوپر منقول ہے؎

میں، مشرقی ساحل اور بنگالے سے جو پارچہ ۱۶۳۹ء میں بہم پہنچایا گیا وہ بہت مختلف الاقسام
تھا اور گو اس میں بھی زیادہ تعداد لٹھے کے تھانوں کی تھی لیکن فہرست کو تفصیلی
طور پر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان علاقوں کے گماشتے ابھی تک مذبذب
تھے کہ لندن کے لئے کس قسم کا کپڑا بھیجا جائے۔ لہٰذا اسے آزمائشی چالان سمجھنا
درست ہوگا۔ بنگالے کے کپڑے کی بنسبت اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت
نہیں کیونکہ ہمارے پیش نظر زمانے میں یہ ملک یورپ کی منڈیوں کے لئے
کوئی باوقعت ذریعہ بہم رسانی نہیں بنا تھا۔ البتہ مشرقی ساحل کے خاص خاص
لٹھوں کی مختصر سی کیفیت لکھنی ضروری ہے کہ یہ بہت جلد مقبول عام ہو گئے۔
ان کے نام مختلف طریقوں پر لکھے ہوئے ملتے ہیں لیکن انہیں پرکال، موڑی،
سلیم پوری اور ادنیٰ لٹھا لکھ سکتے ہیں۔ ان میں سب سے بہتر قسم پرکال (۸ × ۱ گز)
کی سمجھی جاتی تھی گو موڑی بھی (۹ × ۱¼ گز) قریب قریب مساوی قیمت پاتا تھا۔ اسی ۱۳۰
طرح عمدہ سلیم پوری (۱۶ × ۱ گز) معمولی موڑی کے ہم رتبہ ہوتا تھا۔ لیکن معمولی
سلیم پوری معمولی یا گھٹیا لٹھے (Long Cloth) کی مثل (۳۰ تا ۴۰ گز لمبے اور
ایک گز یا کچھ زیادہ چوڑے) ہوتے تھے۔ اور یہ خانہ داری کی عام ضرورتوں
کے خوب کام کا ہوتا تھا۔ مگر سب سے زیادہ جو کپڑا اس ساحل پر تیار ہوتا وہ
اسی ”معمولی لٹھے“ کی مد میں داخل ہے اور معلوم ہوتا ہے یہ اسی قسم کا تھا
جسے پرتگیز و ولندیز پارچہ گی آنا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن یہ سادہ، رنگا ہوا
اور چھپا ہوا، ایشیا اور یورپ دونوں جگہ فروخت ہوتا تھا اور ہمارے عہد کے
ختم تک لندن کی منڈی میں یہی لٹھا سب سے زیادہ ممتاز ہو گیا تھا۔؎۱

؎۱ ان کپڑوں کی جو کیفیت اوپر بیان ہوئی وہ ہمعصر تجارتی کاغذات پر مبنی ہے اور کم سے کم ہمارے پیش نظر عہد کے لئے، بعد کے ماخذوں سے اور ان قیاسی تعریفوں سے جو ہوبسن جوبسن میں درج ہیں، زیادہ مستند سمجھنی چاہئیں۔ مثلاً ہوبسن جوبسن میں موڑی کو اودے رنگ کا لکھا ہے (صفحہ ۷۰۰) حالانکہ وہ کبھی کبھی رنگا ہوا اور نہ عام طور پر مٹیالا یا دھلا ہوا سفید ہوتا تھا۔ اسی طرح پرکال کو ”افشانی“ اور سلیم پوری کو ”چھینٹ“ (بقیہ حاشیہ صفحہ دیگر

۱۶۳۸-۳۹؁ اور ۱۶۴۰-۴۱؁ کے جو اعداد درج ہیں، وہ ان موسموں کی پوری انگریزی تجارت کے اعداد ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال پہلے ایک لاکھ تھان سالانہ کا جو اوسط قائم ہو گیا تھا، اس میں صریحاً کمی آگئی۔ اس کا سبب گجرات کے قحط کو سمجھنا چاہیئے۔ اول تو اُس کی بجائے دوسرے مقامات سے تجارت شروع کرنے میں کچھ عرصہ لگا دوسرے نوعیت کے اعتبار سے بھی گجرات کا مال اس قدر ادنی ہو گیا کہ یورپ کی ساری تجارت ہی کے ستیاناس ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۱۶۳۸؁ میں کمپنی کی طرف سے لکھا ہوا آیا کہ ہندوستان کے لٹھے کی خوبی میں فرق اور قیمت میں بیشی ہو جانے کے باعث نکاسی بند ہو گئی ہے اور دوسرے ملکوں کا کپڑا اس کی جگہ لیتا جاتا ہے۔ پھر تین سال بعد بھی لکھا گیا کہ پچھلے چالانوں کی ادنیٰ نوعیت سے جو شہرت خراب ہو چکی ہے، اس کی اب تک تلافی نہیں ہوئی۔ "اصل یہ ہے کہ اگر جرمن، اسکاچ اور فرانسیسی کتان سے، ہم کم قیمت پر لٹھا نہ دے سکیں تو پھر وہ کسی بڑی مقدار میں فروخت نہ ہو گا اور اس سے سورت کی تجارت کا ایک بڑا رُکن گویا ٹوٹ جائیگا" اور یہ واقعہ تھا کہ لٹھے کا مغربی یورپ کے ساختہ کپڑے سے براہِ راست مقابلہ آپڑا تھا لہٰذا اس کی منڈی میں کامیابی کا سارا انحصار اس کی قیمت کی کمی اور خوبی پر تھا۔

۱۳۱ تجارتِ پارچہ کے دُوسرے دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ مشرقی ساحل کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے حتیٰ کہ تھوڑی ہی مدت میں یہ علاقہ مغربی یورپ کو مال کی بہم رسانی میں گجرات کی جگہ لے لیتا اور سب سے بڑا مرکزِ تجارت بن جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۳۸-۳۹؁ کے چالان کے بعد، جس کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس علاقے کی برآمد ایک زمانے تک منقطع رہی اور ۱۶۴۴؁

بقیہ حاشیہ) کہنا درست نہیں۔ گو یہ دوسرے لٹھوں کی طرح کبھی کبھی چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ ان ناموں کی وجہ تسمیہ میں قیاس آرائی کی بہت گنجائش ہے لیکن ان کی نوعیت کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے میں فرمائشیں اور قیمت کے مطلوبے سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھے جا سکتے ہیں۔

کی ایک تحریر میں ہم پڑھتے ہیں کہ کمپنی کو معمولی لٹھے کے ایک گٹھے کے سوا، پانچ سال کی ساری مدت میں اور کچھ مال اس علاقے سے نہیں وصول ہوا۔ لیکن ۱۶۴۶ء میں مدراس کا مال انگلستان پہنچا اور اچھے داموں سے بک گیا۔ پھر ۱۶۵۰ء میں جب کہ یورپ کی منڈیاں مندی ہو رہی تھیں، یہ امر تحریر میں لایا گیا کہ بیشتر کورومنڈل کا مال فروخت ہوا جسے "اب سورت کے کپڑے پر ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ وہ فرانس اور دوسرے غیر ملکوں میں بکری کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے" نظر بریں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۶۴۶ء سے تجارتِ پارچہ کا نیا دور شروع ہوا جب کہ گجرات، آگرے اور سندھ کی رسد کو باقاعدہ مشرقی ساحل سے مدد پہنچنے لگی۔

آئندہ دس سال کی برآمد کی مقدار معلوم کرنے کے لئے مجھے اعداد نہیں ملے لیکن مختلف مرکزوں سے خریداری کی جو ہدایتیں ملتی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ تجارت ۱۶۴۰ء کے معیار سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ جن سنین میں تجارت عام اور بلا قید رہی، ان میں برآمد بہت ترقی کر گئی تھی اور یہی سبب ہوا کہ کمپنی کو دوبارہ اجارہ حاصل ہوا تو انگلستان کی منڈیوں میں ضرورت سے زیادہ مال بھرا پڑا تھا۔ بہرحال، ۱۶۵۸ء کے دوران میں حسبِ ذیل مقداروں میں کپڑے کی فرمائش بھیجی گئی:-

سورت سے:

میر قلی . . .	۱۰ ہزار	تھان
کم عرض کے بافتے	〃	〃
زیادہ 〃 〃	۵	〃
سندھی لٹھا	۱۰ ہزار	〃
دریابادی	〃	〃
ڈنگری[1]	〃	〃
دوسرے لٹھے	۸½ ہزار	〃
میزان	۶۳۵۰۰	تھان

---

[1] "ڈنگری" بہت ادنیٰ قسم کا کپڑا ہوتا تھا (ہوبسن جوبسن) ولندیزی فہرستوں میں (حاشیہ صفحہ آئندہ

باب چہارم ۱۳۲

ایک ہزار چھینٹ کے اور ۳ سو رضائیوں کی چھینٹ کے تھان بھی منگوائے گئے تھے ؎

مدراس سے

معمولی لٹھا	۲۰ ہزار تھان جو ناپ میں کے برابر تھا ؎	۵۰ ہزار عام تھانوں
سیلم پوری		۲۰ ہزار تھان
دوسری قسمیں (ان میں ململ بھی شامل ہے)		۱۴ ″ ″
میزان		۸۴ ہزار تھان

اس حساب سے جس میں معمولی لٹھے کی زائد لمبائی کو شامل کرلیا ہے، مانگ کی کُل میزان ۱½ لاکھ (معیاری) تھانوں کے قریب ہوتی ہے اور اس میں نصف سے بھی کافی زیادہ کپڑا مشرقی ساحل سے بہم پہنچتا تھا۔ پھر جب تجربے سے ثابت ہوا کہ منڈی کی ضروریات کا یہ تخمینہ بہت زیادہ لگایا گیا تھا، تو آئندہ سال سورت ہی کے کپڑے کو کم کر کے سابق کی نسبت صرف ایک چوتھائی یعنی کوئی ۱۶ ہزار تھان کی فرمائش بھیجی گئی اور ۱۶۶۰ء میں بھی اسی تخفیف پر عمل ہوا کیونکہ منڈی اَٹ گئی تھی اور لٹھے کی اصلی قیمت بھی مشکل سے وصول ہوتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے پیش نظر عہد کے آخر تک ہندوستان کے مغربی علاقے سے کپڑے کی مانگ تیس سال پہلے کے مقابلے میں گھٹ کر صرف دسواں حصہ رہ گئی تھی اور اس کے برخلاف مشرقی ساحل کا بیوپار برابر اپنے حال پر قائم تھا۔ چنانچہ ۱۶۵۹ء کی فرمائش میں بھی ۹۰ ہزار معیاری تھانوں کی طلب تھی جس میں ۵۰ ہزار تھان کے مساوی معمولی لٹھا، ۳۰ ہزار سیلم پوری اور ۱۱ ہزار دوسری قسم کے لٹھے شامل تھے۔ اسی کے ساتھ ایک مستقل ہدایت لکھ دی گئی تھی کہ آئندہ ہر سال اسی قسم کے تخمیناً ایک لاکھ تھان کی بہم رسانی کی جاتی رہے ؎ گویا مدراس نے قطعی طور پر

(بقیہ حاشیہ) اس کا ذکر دوسرے مال کے گٹھے باندھنے کے کپڑے کے طور پر آتا ہے ؎

باب چہارم

سورت کی جگہ بے لی اور لندن کی منڈی کو مال بھیجنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا؛ ولندیزوں کی یورپ کو برآمد پارچہ کا قصہ نسبتۃً مختصر ہے؛ یوں تو وہ ۱۶۲۰ء سے بھی پہلے راس امید کے راستے سے ہندوستان کا سوتی پارچہ لانے لگے تھے لیکن قریب قریب یہ سب کپڑے ان قسموں کے تھے جو برازیل و مغربی افریقہ میں درکار ہوتے تھے۔ ان علاقوں میں پرتگیزوں کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی اور ولندیز سرعت کے ساتھ وہاں غلبہ پاتے جاتے تھے۔ لیکن زیر بحث عہد میں ان کی یہ تجارت اسی سلسلے میں تھی جسے پرتگیزوں نے گزشتہ صدی میں قائم کیا تھا۔ البتہ آیندہ عشرہ میں اس برآمد کے ساتھ تھوڑا تھوڑا مال یورپ کی منڈی کے لئے بھی شامل کیا جانے لگا اور سب سے بڑی فرمائش جو پرانے کاغذات میں میری نظر پڑی، وہ ۱۶۳۴ء میں ۱۶ ہزار لٹھے کے تھانوں کی تھی؛ آیندہ چند سال میں یورپ کے لئے مال کی برآمد میں اضافہ ہوا ۱۳۳ اور اس کی وسعت کا اندازہ اُس فرمائش نامے سے ہوتا ہے جو ۱۶۳۹ء میں ہالینڈ سے بھیجا گیا تھا اور جس کا خلاصہ حسب ذیل کیا جا سکتا ہے[1]:

۱- گی آنا پارچہ	۵۰۰ گٹھے
۲- دیگر اقسام کے لٹھے:	
سامانی (پنجاب)	۱۰۰۰ تھان
ابرتی (بہار)	۱۰۰۰ تھان
عریض بافتے (گجرات)	۵۰۰۰ ″
کم عرض کے ″	۴۰۰۰ تا ۵۰۰۰ ″
دریابادی (اودھ)	۲۰۰۰ ″
سلیم پوری (مشرقی ساحل)	۳۰۰۰ تا ۴۰۰۰ ″
موڑی اور پرکال (″)	۹۰۰۰ تا ۱۱۰۰۰ ″
میزان	۲۵۰۰۰ تا ۲۹۰۰۰ تھان

---

[1] یہ فرمائش نامہ ہیگ ٹرینس کرپٹس میں موجود ہے (جلد دوم، ۱۱۴) بقیہ حاشیہ صفحہ دیگر

۳- ململ اور تکلّف کے کپڑے-

(مشرقی ساحل اور بنگالے سے) ۸۰۰۰ تا ۱۱۰۰۰ تھان

جیسا کہ مَیں نے اوپر لکھا ہے، گی آنا نام کا کپڑا غالباً ادنیٰ درجے کے لٹھّے کی مثل ہوتا تھا- اس کے ۵ سو گٹھّے قریب قریب ۲۰ ہزار تھان (معیاری) کے برابر ہونگے- اس طرح کُل مانگ ۶۰ ہزار تھانوں کی سمجھنی چاہیئے جس میں کچھ ململ اور گراں قیمت کپڑے بھی شامل تھے ؎ ہمارے پیش نظر عہد کے مابقی سنین میں ولندیزی تجارت کی جو کچھ کیفیت رہی، اس کی تفصیل مجھے نہیں ملی لیکن یہ قیاس کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ سنہ ۱۶۷۰ء سے قبل اس تجارت میں کوئی خاص ترقی رونما ہوئی ہو- البتہ سنہ مذکور کے بعد ترقی بہت تیز ہوئی ؎

اس نئی تجارت برآمد سے ہندوستان کے جلاہوں کو جو نفع پہنچا اس کا اندازہ لٹھّے کی قیمتوں سے ہوسکتا ہے جو برسر موقع فرنگی خریدار ادا کرتے تھے- ان قیمتوں میں، درست کرنے باندھنے اور جہاز تک لانے کے مصارف شامل نہیں ہیں- قیمتوں کے متعلّق کوئی ایسی شہادت مجھے دستیاب نہیں ہوئی جس سے معلوم ہو کہ ان میں سوائے وقتی کمی بیشی کے کوئی مستقل تبدیلی واقع ہوئی- اور عام نرخ یہ تھا کہ آگرے اور سندھ میں معمولی طول کا تھان ایک سے دو روپے تک قیمت میں مل جاتا تھا- گجرات میں تقریباً نصف روپیہ زیادہ قیمت دینی پڑی تھی ؎ گھٹّیا لٹھّے کی قیمت مطلوبوں کے حساب سے کوئی دو روپیہ فی تھان (معیاری) نکلتی ہے- سلیم پوری کی قسمیں بہت مختلف تھیں لیکن سب سے زیادہ مقبول اقسام کا نرخ تخمیناً ۲ روپیہ تھان رہتا تھا ؎ اس طرح

بقیہ حاشیہ) فہرست میں امبرتی کا ذکر آیا ہے- یہ لٹھّا پٹنے کی نواح میں تیار کیا جاتا تھا اور انگلش فیکٹریز میں اس کا حال بیان کیا گیا ہے (اوّل، ۱۶۲) دوسری قسموں کی کیفیت ہم پہلے بیان کرچکے ہیں ؎

انگریزوں کی سالانہ مانگ یعنی ایک لاکھ تھان سے اوپر کی کل قیمت جو جلاہوں کو ادا کی جاتی تھی، ۲ لاکھ روپے کے قریب ہوئی۔ اسی میں ولندیزوں کی برآمد کی قیمت بھی شریک کرلیں تو سرسری طور پر فرنگیوں کی کل خریداری کا تخمینہ سالانہ ۳ لاکھ روپیہ یا کچھ زیادہ نکلتا ہے۔ ضرورت کے وقت دھونے، رنگنے اور جہاز تک باربرداری وغیرہ کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ دوسری اشیا برآمد کی طرح، یہ روپیہ بھی صرف چند مقامات کے اہل حرفہ کی ایک جماعت میں تقسیم ہوتا تھا لہٰذا ان لوگوں کو نئی تجارت سے ضرور معقول فائدہ رہتا ہوگا۔ لٹھے کے یورپ دساور لے جانے کا کاروبار قائم کرنے میں وقتاً فوقتاً مختلف رکاوٹیں پیش آئیں جن میں سے بعض براہِ راست اہل حکومت کی وجہ سے تھیں اور بعض خود پارچہ بافی کے خاص حالات کی بنا پر پیدا ہوئیں۔ فرنگی سوداگروں کو سرکاری مداخلت کی اکثر شکایت رہتی تھی۔ کبھی رشوت ستانی اور کبھی نئے محاصل سارے کاروبار کو فی الوقت تو درہم برہم کردینے کے لئے کافی ہوتے تھے اور کبھی کسی حاکم کے واسطے تجارتی مال تیار کرنے کی غرض سے سارے کرگھوں پر قبضہ کرلیا جاتا تھا۔ لیکن اس قسم کے اتفاقات سے اس زمانے کی حکمرانی کا عام ڈھنگ ظاہر ہوتا ہے اور ان کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کسی خاص تجارت میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے ہوا کرتے تھے۔ البتہ دوسری قسم کی دشواریاں ہمارے پیش نظر مقاصد کے حق میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل جن مقامات کی سواحل تک رسائی تھی، وہاں کی صنعت پارچہ بافی منظم یا یہ کہنا چاہیئے کہ خاص خاص ایشیائی منڈیوں کو مال دساور بھیجنے کے لئے اس حد تک ترقی کرچکی تھی کہ فرنگی تاجروں کو اسی سابقہ دستور اور طریقوں کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا۔ مثالاً انھیں اس مروّجہ طریقے کی پابندی کرنی پڑی کہ مال کے لئے پیشگی رقوم ادا کردی جائیں۔ لیکن انھیں ہندوستانی سوداگروں کی طرح یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں کہ ہر پیشگی لینے والے کی ساکھ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرسکیں اور ضمانت لینے میں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مدراس میں بسنے کے متعلق جو معاہدہ وہاں کے رئیس سے ہوا، اس کی شرائط دیکھنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دشواری کو حل کرنے کی ایک عجیب تدبیر کہیں کہیں اختیار کی جاتی تھی۔ چنانچہ نائک نے اسی معاہدے میں یہ ذمہ لیا ہے کہ "اگر انگریز، مقامی سوداگروں، رنگ سازوں[1]، اور جلاہوں وغیرہ ہم . . . کو کوئی ۱۳۵ رقم دینے سے پہلے ہمیں اس سے آگاہ کر دیا کریں گے اور ان کی دیانت اور کارکردگی کے متعلق ہم سے اقرار لے لیں گے، تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ لوگ حسب وعدہ کام انجام نہ دیں تو انگریزوں کی جو رقم ان کے حساب میں باقی ہوگی، وہ خود ہم پوری کر دیں گے یا ان (وعدہ خلافی کرنے والے) اشخاص کو، بشرطیکہ وہ ہمارے علاقے میں کسی جگہ پائے جائیں، اصالتاً انگریزوں کے حوالے کر دینگے"۔

لیکن حکومت کی طرف سے ایسی ضمانت ایک مستثنیٰ صورت تھی اور یوں بھی اس کا قابل عمل ہونا محلِّ گفتگو ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس سند کے تین سال بعد مدراس کے گماشتوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ مفلس رنگسازوں اور جلاہوں پر بھروسہ کرنے کے باعث کمپنی کو سخت خسارے اٹھانے پڑے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں "مگر تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے خساروں سے کلیتہً بچ جانا غیر ممکن ہے بجز اس کے کہ (ولندیزوں کی مثل) ہم صرف ایک بڑا سوداگر مقرر کر دیں اور وہی سارا مال بہم پہنچایا کرے۔ کچھ روز تک اس قسم کا آڑھتی ہمارے ساتھ رہ بھی چکا ہے . . ." لیکن اسے اس کام میں کچھ نفع نہ ملا اور چھوڑ بیٹھا۔ تھوڑی ہی روز بعد ہم یہ شکایت سنتے ہیں کہ انگریزوں کو کام کرنے کے لئے جلاہے نہیں ملتے کیونکہ ولندیزوں نے جن کے وسائل بہت وافر تھے، پیشگی رقوم دے کے سارے پارچہ بافوں کو پابند بنا لیا اور ہنگامی طور پر پوری صنعت پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن پیشگی روپیہ دینے کے معنی یہ نہ سمجھنے چاہئیں کہ اس سے خریداروں کو ٹھیک اسی قسم کا کپڑا مل جاتا تھا جو انھیں مطلوب ہوتا۔ ایشیائی مذاق کے لحاظ سے جو کپڑا تیار ہوتا وہ پوری طرح یورپ کے لوگوں کی مرضی کے

---

[1] رنگسازوں سے یہاں سوتی کپڑا چھاپنے یا چھینٹ تیار کرنے والے مراد ہیں۔

موافق نہ ہوتا تھا۔ اور اپنے پیش نظر عہد کے اکثر حصے میں ہم ایسی کوششیں ہوتی دیکھتے ہیں کہ عرض و طول یا تانے بانے کی تعداد میں کمی بیشی کی جائے لیکن ان کوششوں کا بہت کم کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوا۔ جہاں خریداری کے میدان میں دوسرے حریف نہ تھے، وہاں تو ہدایت کے مطابق کام ہونا ممکن تھا جیسے نصرپور (سندھ) میں ہوا کہ وہاں "سوائے ہمارے دوسرا خریدار نہ تھا لہٰذا جلاہوں سے کہہ کے بانے میں زیادہ تاگے لگانے کی نسبت کوئی دشواری پیش نہ آئی لیکن جہاں اور جب کبھی جلاہوں کو اپنی مرضی کے موافق گاہک مل سکتے تھے وہاں وہ اسی قسم کا کپڑا اسی طرز پر بنانے کو ترجیح دیتے تھے جو پہلے سے ان کا معمول چلا آتا تھا"۔ یورپ کے آڑتی جس درجے کی یکسانی چاہتے تھے، اس کی پابندی کرانے میں بھی بڑی دشواریاں ہوتی تھیں بعض دفعہ چالان کے عرض و طول یا بناوٹ میں توقع سے کم نکلتے تھے۔ اکا دکا تھانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۶۳۸ء میں کمپنی کو شکایت ہے کہ ایک پورا چالان "پھیری والوں کی گٹھڑی معلوم ہوتا تھا اور باہر دساور بھیجنے کی بجائے کسی مقامی قصبے میں خوردہ فروشی کے لئے زیادہ موزوں تھا"۔ پانچ سال بعد کمپنی ایک جگہ طول کی کمی پر نکتہ چینی کرتی اور زور دیتی ہے کہ ۱۳۶
تھانوں میں اتنی یکسانی تو ہونی چاہیے کہ "ہمیں معلوم ہو کہ ہم کیا بیچتے ہیں اور خریدار سمجھ سکے کہ وہ کیا خرید رہا ہے؟"

لیکن پارچہ بافی کے حالات ہندوستان میں صریحاً کسی حقیقی معیار قائم کرنے کے مساعد نہ تھے اور جب تک اس صنعت میں عملاً ہندوستان کا کوئی حریف نہ تھا، اس وقت تک خریداروں کو یہ نقص برداشت کرنا ہی پڑتا تھا۔ مگر جس وقت مقابلے کی نوبت آئی تو پھر کوئی شبہ نہیں کہ یہ کوتاہی تجارت کے حق میں بڑی رکاوٹ بن گئی۔

۶ - دیگر اشیا اور عام رائے

جن اشیائے تجارت یعنی نیل، شورہ اور لٹھے کے متعلق ہم نے

بحث کی، وہ اس اعتبار سے کہ بغیر اُن کے نفع بخش تجارت نہ ہو سکتی تھی، گویا ہندوستان اور مغربی یورپ کے جدید تجارتی تعلّقات کی بنیاد تھے۔ لیکن جب ایک دفعہ جہازوں کی آمد و رفت جاری ہو گئی تو لامحالہ دوسری چیزوں کے دساور بھیجنے کا موقع بھی مل گیا اور فرنگی گماشتوں نے ہندوستان کی ممکنہ اشیائے برآمد کی بہت تفصیلی تحقیقات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور اشیا بھی تھوڑی تھوڑی مقداروں میں، لندن و ایمسٹرڈم کی مرکزی منڈیوں میں پہنچنے لگیں۔ ان میں سے بعض تو جلد ہی نامقبول ٹھیریں، لیکن بعض نے رفتہ رفتہ قبولیت پائی اور ان میں سے کپاس، تاگا، شکر اور ریشم، چاء ایسی چیزیں ہیں کہ مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاسکتا ہے[2]

مغربی یورپ میں کپاس کی زراعت کی ابتدائی تاریخ ایک حد تک مشتبہ سی ہے لیکن یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ سترہویں صدی کے آغاز میں انگلستان اور قریب کے ملکوں میں کپاس کی مانگ تھی کہ کچھ تو موم بتیوں اور عام ضرورت کی دوسری چیزوں میں استعمال ہو اور کچھ اس قسم کے کتان بنانے کے کام آسے جس میں عموماً تانا سن کا اور بانا سوت کا ہوتا تھا۔ ممالک ترکی سے کپاس باقاعدہ مغربی یورپ میں دساور آیا کرتی تھی اور ان مشرقی ملکوں میں اس قسم کی کلیں بھی استعمال ہونے لگی تھیں جو کپاس کو دبا کر پیوستہ گٹھوں کی صورت میں تیار کر دیتی تھیں کہ آسانی سے جہازوں میں بھیجی جاسکیں[3] سورت کے گماشتوں کو بھی اس تجارت میں حصہ لینے کی فکر ہوئی اور انھوں نے کئی بار درخواست کی کہ اسی قسم کے داب جو ترکی میں استعمال ہوتے تھے، ہمیں بھی بہم پہنچائے جائیں۔ لیکن اس کی پذیرائی نہ ہوئی اور بغیر دبائے گٹھوں میں بھیجنے سے جگہ اتنی گھرتی اور قیمت اتنی کم اُٹھتی تھی کہ وہ نیل اور لٹھے وغیرہ مال کو چھوڑ کر ۱۳۷ اسے بھرنا پسند نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر عہد کے آخر تک اس کی باقاعدہ تجارت ترقی نہ کر سکی البتہ کبھی کبھی جہاز کے مال خانے میں دوسرے گٹھوں کے درمیان اسے بغیر باندھے بھروا دیتے تھے اور زیادہ قیمتی مال کی بندشس میں کام آنے کے بعد اس کی تھوڑی بہت مقدار لندن کی منڈی

میں ہر سال بکتی رہتی تھی[ع]

اس کے مقابلے میں سوت یا تاگا جہاز میں دساور بھیجنے کے لئے نہایت موزوں چیز تھی چنانچہ اس کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی۔ اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے جو تاگا بھیجا گیا اس کی انگلستان میں کچھ قدر نہ ہوئی لیکن ۱۶۲۲ء میں ہم گماشتوں کو مخلوط کتان (=Fustian) کے بانے کے واسطے مناسب سوت خریدتے دیکھتے ہیں۔ ۱۶۲۸ء میں گجرات سے جو چالان انگریز سوداگروں نے بھیجا اس میں ۵۴۵ گٹھے تھے اور دو سال بعد کمپنی نے لکھا کہ اگر زیادہ قیمتی مال میسر نہ آئے تو سالانہ ۶ سو تا ۷ سو گٹھے تاگے کے روانہ کئے جا سکتے ہیں[ع]

ادھر اس اثنا میں ولندیزوں نے کورومنڈل کے ساحل سے تاگے کی چھوٹے پیمانے پر مگر باقاعدہ تجارتِ برآمد قائم کر لی تھی جیسا کہ اُن مطلوبوں سے جو ضمیمہ ب میں درج ہیں، ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی خریداری سورت میں بھی شروع ہو گئی تھی اگرچہ ابتدا میں وہ انگریزوں کے برابر پیمانے پر نہ تھی چنانچہ ۱۶۳۰ء کے قریب ان کی سالانہ ضرورت صرف ۱۵۰ گٹھے پائی جاتی ہے۔ اگلے عشرے میں ان کی مانگ بڑھ کر ۴ سو گٹھے سالانہ کے قریب پہنچی بحالیکہ انگریزوں نے ۳۹-۱۶۳۸ء میں صرف ۳ سو گٹھے جہاز پر چڑھائے۔ ہمارے عہد کے باقی سنین میں ولندیزوں کی دونوں ساحلوں کی مجموعی برآمد کا سالانہ تخمینہ کم و بیش ۵ سو گٹھے رہا لیکن انگریزوں کی تجارت میں کمی آگئی اور ۱۶۴۱ء میں کمپنی نے اپنی مانگ صرف سو گٹھے کر دی۔ اصل میں وہ اس شے کو پسند نہ کرتی تھی لیکن انگریز کاریگروں کو بھی مایوس کرنا نہ چاہتی تھی جن کی نسبت اُس نے لکھا کہ وہ کچھ روز سے ہندوستانی تاگے سے بہت سے کام لینے لگے ہیں[ع۱]۔ انھی کی خاطر اُس نے یہ خرید جائز رکھی۔

[ع۱] میں یہ تحقیق نہ کر سکا کہ اس زمانے میں انگلستان کی پارچہ بافی میں کس قسم کے تغیرات واقع ہوئے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ ترقی پذیر تھی اور یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے تاگے کو تانے کے لئے بھی اسی زمانے میں کارآمد پایا گیا ہو اور اس صورت میں کہہ سکتے ہیں کہ یہی زمانہ ہے جب کہ انگلستان میں خالص سوتی کپڑے کی صنعت کا آغاز ہوا اگرچہ اس واقعے کا بقیہ صفحہ دیگر

باب چہارم

دس سال بعد صرف ۵ے گٹھے روانہ کئے گئے اور ۱۶۵۴ء میں ۱۵۰۰ کی فرمائش تحریر ہے بلکہ ۱۶۵۸ء میں جب تجارت کو عام طور پر فروغ ہوا تو تاگے کی مانگ بھی بڑھ گئی اور تقریباً ۵ سو گٹھے منگوائے گئے۔ یہ سوت جو ولایت بھیجا جاتا تھا، قسم کے اعتبار سے نہایت مختلف ہوتا تھا اور ولندیزوں نے جس درجے کے تاگوں میں بیوپار کیا، اس کی کوئی صحیح اطلاع مجھے نہیں ملی مگر شاید صہ فی گٹھا (وزنی تقریباً ۱۶۰ پونڈ) اوسط لگانا بیجا نہ ہوگا اور اسی بنیاد پر تمام برآمد کی مالیت زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپیہ نکلتی ہے۔ ۱۳۸

تاگے کی تجارت کے سلسلے میں ایک عجیب قضیہ پیش آیا یہ کہ ۱۶۳۰ء میں جب کہ انگریزوں کی خرید گجرات میں انتہائی بیشی کے درجے پر تھی، جلاہوں کو خوف ہوا کہ سوت کے دساور چلے جانے سے پارچہ بافی کو نقصان پہنچے گا اور بڑوچ میں باقاعدہ انگریزوں سے مقاطعے کا انتظام کیا گیا کہ اگر سوت خریدتے ہیں تو کپڑا خریدنے نہ پائیں۔ آئندہ سنین میں اس قسم کی مخالفت کا کوئی اثر آثار نہیں پایا جاتا اور میں اس واقعے سے محض یہ سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر انگریزوں کی خریداری یک بہ یک اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ سوت کے ذخیرے جو اُس وقت موجود تھے ناکافی ثابت ہوئے ہونگے ورنہ ہندوستان جتنی مانگ ہوا اتنا سوت تیار کرسکتا تھا البتہ مانگ کے ناگہاں بڑھ جانے میں یہ احتمال تھا کہ جب تک کافی سوت مہیا نہ ہوجائے، اس وقت تک مقامی خریداروں کو سخت مشکلات کا سامنا ہوجائے گا۔

شکر کی تجارت میں سترہویں صدی سے اب تک بہت بڑا تغیر ہوچکا ہے۔ اُن دنوں یہ جنس مغربی یورپ میں اس طرح عام طور پہ استعمال نہ ہوتی تھی بلکہ ایک

بقیہ حاشیہ) ابھی تک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ تاہم سابق میں جو خیال تھا کہ انگلستان میں خالص سوتی کپڑا اٹھارہویں صدی میں، اور وہ بھی بہت سے سال گزرنے کے بعد، بننا شروع ہوا، اسے پروفیسر ڈینیلز نے خلافِ تحقیق ثابت کردیا ہے لیکن یہ امر کہ اس کی ساخت کس سال سے شروع ہوئی ابھی تک پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچا ہے۔ (ڈینیلز، ۱۲ و مابعدہا)

حد تک گراں قیمت امیرانہ چیزوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یورپ میں زمین قند کی شکر کی صنعت معرضِ وجود میں نہ آئی تھی اور نیشکر کی رسد کے بڑے بڑے مقام ایشیا میں چین و ہندوستان اور امریکہ میں برازیل و جزائر انتیل تھے۔ ہمارے پیش نظر عہد میں، ہندوستان کی برآمد میں حصہ غالب رکھنے کے علاوہ چین و امریکہ کی تجارت پر بھی زیادہ تر ولندیز چھائے ہوئے تھے۔ چونکہ ہندوستان کا گنا عام طور پر بہ اعتبار نوعیت، ادنیٰ اور بہ لحاظ اخراجاتِ برآمد نسبتہً مہنگا پڑتا تھا، لہٰذا شروع شروع یورپ کی منڈیوں میں اس کی کھپت کچھ زیادہ نہ ہوئی۔ رہی شکر، اس کی ہندوستان میں تین بڑی قسمیں تھیں: ایک تو دہقانی قسم جسے گُڑ کہتے ہیں[1] اور جسے بیرونی سوداگر نہیں خریدتے تھے، دوسری سفید دانہ دار باریک شکر جسے "بورا" (یا چینی) کہتے ہیں اور تیسری مصری جو پوری طرح صاف کر کے بنتی اور فرنگی سوداگروں میں "کنڈی" (= قند) موسوم تھی۔ ان آخری دو قسموں کی انگلستان کے ساتھ بے قاعدہ سی خرید فروخت سورت کے گماشتوں نے جاری کر رکھی تھی۔ ۱۳۹
اور کمپنی کبھی اس کی بہم رسانی کے لئے لکھتی اور کبھی اس کی خرید روک دیتی تھی اور کم سے کم ایک دفعہ اسے محض جہاز کی بھرت پوری کرنے کے لئے بھرا گیا تھا۔ پھر برآمد کی مقدار بھی بہت مختلف ہوتی مگر کبھی اتنی نہ ہوئی جسے قابلِ ذکر سمجھا جائے۔ اور سورت کے گماشتوں نے کئی بار یہ مشورہ بھی دیا کہ اسے بنگالے سے خرید کیا جائے جہاں شکر بہتر و ارزاں تر مل سکتی تھی۔ سورت کی اس تجارت شکر میں ولندیزوں نے بظاہر کوئی خاص حصہ نہیں لیا لیکن جب حالات مساعد ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کے دوسرے پہلو پر اسے ترقی دے کے معقول بیوپار بنا لیا۔ سنہ ۱۶۳۶ تک وہ بنگالے کی شکر مچھلی پٹم سے دساور بھیجتے رہے اور صدی کے پانچویں عشرے میں اس کاروبار میں اس قدر توسیع و ترقی ہو گئی کہ سالانہ

---

[1] "جگری" یا گُڑ ہندوستان میں اب بھی شکر کی سب سے عام صورت ہے۔ جسے دیسی کولھوؤں میں گنا پیل کر تیار کرتے ہیں۔ اسی کو بڑے اہتمام اور محنت سے صاف کر کے شکر کی دوسری قسمیں بنائی جاتی تھیں۔

۵ لاکھ پونڈ کے قریب شکر بٹاویہ بھیجی جانے لگی۔ بعد کی تحریریں ناقص ہیں لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ برآمد کی اتنی مقدار قائم نہ رہ سکی اور اس کا سبب یا تو یہ تھا کہ منڈی میں اتنی کھپت نہ تھی اور یا یہ کہ یورپ کی مانگ دوسرے ذرائع سے پوری ہونے لگی ؎۔ انگریزی کمپنی نے بنگالے میں شکر کا بیوپار پھیلانے میں دیر لگائی۔ سالہا سال تک اس کے متعلق قیل و قال ہی ہوتی رہی تاآنکہ ۱۶۵۱-۵۲ء میں شکر بھرنے کا حکم دیا گیا لیکن تجارت کے پھیلنے کی پہلی شہادت اس حکم کو سمجھنا چاہیئے جو ۱۶۵۹ء میں، سو ٹن شکر خریدنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اور ٹن سے یہاں مراد وزن ہو یا بہ پیمانہ گنجائش، یہ مقدار بہر حال بڑی تھی۔ ایک سال بعد اس مقدار میں تخفیف کر دی گئی لیکن آئندہ انگریزی تجارت کی تاریخ ہمارے عہد کی حدود سے باہر ہے اور ہمارے عہد میں کُل برآمد اتنی باقاعدہ کبھی نہ ہوئی کہ اس کی قیمت کا جو ہندوستان کے شکر سازوں کو وصول ہوتی تھی، کوئی تخمینہ بہ حساب سالانہ کرنا درست ہو ؎۔

بنگالے سے یورپ ریشم دساور جانے کا حال بھی ہمارے پیش نظر عہد سے باہر ہے۔ یورپ کی ضروریات پہلے چین سے اور پھر ایران سے پوری ہوتی رہیں۔ جب ولندیزوں نے بنگالے میں باقاعدہ قدم جمالئے تو جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں ان کی برآمد زیادہ تر جاپان کے واسطے ہوتی تھی اور مجھے اس بات کے تحریری شواہد نہیں ملے کہ ۱۶۶۰ء سے قبل انھوں نے یورپ کی منڈی کو فروغ دینے میں کوئی خاص کوشش کی ہو ؎۔ انگریزوں کی تجارت کا آغاز ۱۶۵۷ء میں ہوتا ہے جب کہ کمپنی کو بالآخر کافی سرمایہ میسر آگیا اور اس نے ۳ ہزار پونڈ بنگالے کے کچے ریشم کی خرید میں لگانے کا حکم دیا۔ پھر آئندہ سال اجازت دے دی گئی کہ ہر سال سو گٹھے سالانہ خریدے جائیں جن کی کُل قیمت کم و بیش ۲۰ ہزار روپیہ ہوتی تھی ؎۔ ۱۴۰

ان تمام واقعات سے جو اس باب میں جمع کئے گئے ہیں، عیاں ہو جاتا ہے کہ جہاں تک مغربی یورپ کا تعلق ہے، ہندوستان کی تجارت برآمد سترہویں صدی کے پہلے نصف میں، گویا ایک طویل تجربے کی حالت میں رہی۔

یوں تو صدی کے پہلے عشرہ ہی کے آخری سنین میں ولندیز مشرقی ساحل پر اور انگریز مغربی ساحل پر پہنچ گئے تھے لیکن ابھی تک وہ تجربے سے صرف یہ معلوم کر رہے تھے کہ کن کن اشیا کی خرید فروخت کی جائے۔ دس سال بعد ولندیزوں نے نیل اور شورے کا گویا پتہ چلا لیا لیکن جو نیل انھوں نے خریدا وہ ہندوستان میں سب سے بدتر اور شورہ سب سے گراں تر تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں نے اچھے نیل کی تجارت قائم کر لی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گجرات کے لٹھے کی برآمد کی بنیاد ڈالنے لگے۔ سترہویں صدی کے وسط تک سورت رفتہ رفتہ یورپ کے لئے سب سے اہم بندرگاہ کا رتبہ پاتا نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرقی ساحل کا حصہ کم ہے اور بنگالے کے میدان سے ابھی تک فرنگی خریدار ناآشنا ہیں۔ ۱۶۳۰ء کے قحط نے ساری تجارت میں ہل چل ڈال دی اور ہندوستان کے اکثر اقطاع کی از سر نو جستجو عمل میں آئی کہ گجرات کی ناکافی رسد کا تکملہ کیا جا سکے۔ ولندیز سوداگروں کی اعلیٰ قابلیت سے بنگالے میں انھیں ایک طویل تقدم حاصل ہو گیا تھا لیکن اسے اوّل اوّل انھوں نے صرف ایشیائی ممالک میں تجارت کو ترقی دینے کا کام لیا اور کہیں ۱۶۵۰ء کے بعد جا کے یہ نوبت آئی کہ ہندوستان کے مشرقی اقطاع یورپ کی تجارت میں کوئی ممتاز حصہ لینے لگے۔ یہ مرتبہ ان اقطاع کو کچھ تو مدراس کے لٹھے کی موزونیت کی بنا پر، کچھ بہار کے شورے کی ارزانی اور کسی حد تک بنگالے کی شکر و ریشم کی بہم رسانی کی بدولت حاصل ہوا۔ گجرات کا پہلا امتیاز صرف نیل کی تجارت میں باقی تھا سو یہ تجارت ہی اوّل تو امریکہ کے مقابلے میں آ جانے کی وجہ سے رو بہ زوال ہو چکی تھی دوسرے مرہٹوں کے غلبے سے ملک میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے وہ بندرگاہ سورت کے حق میں مزید دشواری کا سبب ثابت ہونے والے تھے حالانکہ یہی بندرگاہ تھی جس نے ابتدا میں اپنے سب حریفوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں نئی تجارت برآمد سے اہل ہند کو براہِ راست جو فائدہ ہوتا تھا، وہ چھوٹے رقبوں میں محدود تھا لیکن ان رقبوں میں کاشتکار

یا کاریگر نئی مانگ کی بہم رسانی کر کے معقول نفع اٹھاتے تھے ۔ علاوہ ازیں اس تجارت کی بدولت مغرب کی ترقی پذیر منڈیوں سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے اور اس نے بالواسطہ سارے ملک کی حالت میں ایک تغیر پیدا کر دیا ۔ ایک صدی قبل (یعنی سولہویں
۱۸۱ صدی عیسوی میں) پرتگیزوں نے تجارت کو نشوونما دینے کے جو موقعے ہاتھ آئے تھے، اُن سے کچھ اچھا کام نہیں لیا تھا لیکن ولندیز اور انگریز سوداگر بالکل دوسرے مقاصد کے ساتھ ہندوستان آئے اور بالکل مختلف اصول سے کام کیا جس کے نتائج بھی مختلف اور بہت اہم برآمد ہوئے ؛ چنانچہ ان کی وساطت سے ہندوستان کا مال ایمسٹرڈم، لندن اور پیرس کی منڈیوں میں بخوبی متعارف ہو گیا ادھر مال بہم پہنچانے والے علاقوں کو اپنے فرنگی خریداروں کے مذاق سے آگہی ہو گئی اور تمام اقطاعِ مشرق میں اُن اشیا کی باقاعدہ تلاش شروع ہوئی جن کے مغرب میں نفع سے فروخت ہونے کی امید تھی ۔ اس طرح ایک نئی تجارتی تنظیم کی بنیاد پڑی کہ جس کے ابتدائی فوائد ہی کچھ حقیر نہ تھے بحالیکہ مستقبل میں اس کی ترقی کے امکانات قریب قریب لامحدود نظر آتے تھے ؛

اس تنظیم کی ایک خصوصیت قابلِ بیان ہے کیونکہ آج کل متمدن ممالک میں اس کی مثال ملنی دشوار ہوگی ۔ وہ یہ کہ زمانۂ حاضرہ کی تجارت میں زیادہ کام بیچنے والا کرتا ہے ۔ کوئی قوم نئی منڈی کی تلاش میں نکلتی ہے تو اس ملک کے صناع، سرمایہ دار اور سرکاری گماشتے سب اس میں ہاتھ بٹاتے ہیں ۔ اکثر اوقات نئے مقام پر تجارت جاری کرنے کے ابتدائی مصارف بہت زیادہ پڑتے ہیں اور ان سب کو برداشت کر کے مال اُن کے دروازوں تک پہنچایا جاتا ہے جن سے خریداری کی توقع ہو ؛ مگر ہندوستان کے معاملے میں دوسری ہی صورت نظر آتی ہے کہ گو یہاں کے کاشتکار، صناع اور سوداگر مال فروخت کرنے کے خواہش مند تھے اور بیرونی سوداگروں کا جو خریدنے آئیں شوق سے خیر مقدم کرتے تھے لیکن ان کا یہ سب کام اپنی جگہ پر بیٹھے رہ کر ہوتا تھا اور اپنے پیش نظر زمانے میں ہم کسی ہندوستانی کے متعلق یہ نہیں سنتے کہ وہ اپنا مال بیچنے خود یورپ گیا یا بیرونی خریداروں کو نمونے دکھاتا پھرتا ہے ۔ یہ سارا اہتمام خریداروں کو

کرنا پڑتا تھا اور اسی کا لازمی نتیجہ تھا کہ حمل و نقل کے کثیر منافع میں ہندوستان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ ان حالات میں اگر یہ کاروبار یورپ کی کوئی واحد کمپنی کرتی تو بالکل من مانی شرطوں پر لین دین کر سکتی تھی۔ مگر ہندوستان کے حق میں غنیمت ہوا کہ یہاں یہ نوبت نہ آئی اور اسے وہ برا تجربہ نہ ہوا جیسا کہ مشرق اقصیٰ کے بعض دوسرے ملکوں کو جہاں ولندیزی سوداگروں نے اجارہ لے رکھا تھا۔ ہندوستان میں ولندیزوں کے مقابلے میں انگریزوں کی کمزور کمپنی ہی کا حریف تجارت ہونا علی العموم اس بات کے لیے کافی ہوتا تھا کہ ہندوستان والوں کو اپنے مال کی اچھی قیمتیں ہاتھ آجائیں۔

باب چہارم کے ماخذ

فصل اوّل

اس زمانے میں یورپ کی منڈیوں کی عام حالت کننگھم جلد دوم میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ پرتگیزوں کے جہازی مال کی فہرستوں کا ذیلی حواشی میں حوالہ دیا گیا ہے۔ تجارت کے معاملے میں اُن کے اخفا کی نسبت ملاحظہ ہو رین ویل، اوّل، ۲۵۔ ہندوستان کی ادرک کے گھٹیا ہونے کے بارے میں دیکھو لنشوٹن (Linschoten c. 64) ملیبار کی مرچ کی برآمد کے حالات انگلش فیکٹریز اور داغ رجسٹر میں مطالعہ کرنے چاہئیں۔ ہم نے جو واقعات نقل کیے ہیں وہ اوّل الذکر کی مختلف جلدوں (جلد سوم، چہارم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں۔ اسی کی پہلی جلد میں ولندیزوں کے مشرقی ساحل سے مرچ باہر بھیجنے کی کوشش کا حال تحریر ہے (صفحہ ۳۰۲) اور اس کی بعض جزئیات ضمیمہ ب میں ملینگی۔

فصل دوّم

ولندیز جس قسم کا مال جہازوں میں بھر کر بھیجتے تھے اس کی ایک مثال داغ رجسٹر (کورومنڈل) مورخہ ۳ نومبر ۱۶۴۲ء سے نقل کی گئی ہے۔ ولندیزی جہازوں کے براہِ راست یورپ جانے کے بارے میں ملاحظہ ہو ضمیمہ ب +، داغ رجسٹر کے مختلف اور بہت سے داخلے وغیرہ۔

ولندیزوں کا بہت پہلے نیل کی طرف متوجہ ہونا **ٹرپ اسٹراز سورت** میں مذکور ہے (صفحہ ۸۴ و ۸۵) انگریزوں کی برآمد نیل کے حالات انگلش فیکٹریز (جلد اوّل و سوم) سے لئے ہیں۔ اسی کی چھٹی جلد (صفحہ ۲۳۲ - حاشیہ ۲۳۳) میں لندن نامی جہاز کے مال کی فہرست درج ہے اور ساتویں سے دسویں جلد تک مختلف مقامات پر سنہ ۱۶۴۲ سے ـــ کے آیندہ سنین تک کے جہازی مال کی فہرستیں ملتی ہیں جس زمانے میں تجارت پر کوئی قید و بندش نہ تھی، اس کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو اسی کتاب کی جلد دہم (۴۴، ۵۷، وغیرہ) اور پانچویں جلد سے ـے کے آیندہ ہر جلد کے دیباچے میں کورٹین کی انجمن کی سرگرمیاں تحریر ہیں مشرقی ساحل کی برآمد کے متعلق ملاحظہ ہو جلد ہشتم، نہم وغیرہ۔ اور لیٹر بکس، جلد دوم صفحہ ۱۳ تا ۱۷ و ۱۹۶ ولندیزوں کی فوقیت کا اعتراف انگلش فیکٹریز کی مختلف جلدوں سے نقل کیا ہے اور ہندوستان میں ولندیزوں نے جس قدر روپیہ لگا رکھا تھا اس کی رقوم، بمطابقت سنین داغ رجسٹر سے مختصراً جمع کی ہیں

فصل سوم

ہمارے عہد میں انگریزوں کی تجارت نیل کی کیفیت مسٹر فوسٹر نے بطریق ایجاز **جرنل رائل سوسائٹی اوف آرٹس**، جلد چہل و ششم (۳۶۴) میں تحریر کی ہے پرتگیزوں کے اجارے کے متعلق دیکھو کوٹو (Couto, X. ii. 572) حلب کی نیل کی منڈی کے حالات فرسٹ لیٹر بک، ۲۸۵ - لیٹرز رسیوڈ، دوم، ۲۱۴ - اور پرچاس اوّل، پنجم ۷۳۴ سے نقل کئے گئے ہیں۔ ہیگ ٹرینس گریٹس (دوم، ۵۲) کے ایک قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۲۱ء تک ہالینڈ اور انگلستان میں نیل ممالک ترکی سے آیا کرتا تھا اس کی قیمتیں جو ہم نے لکھی ہیں مسٹر فوسٹر کے محولہ بالا مضمون

سے لی گئی ہیں۔ نیل کی اہمیت اس زمانے کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتی ہے اور اس کی شمالی ہند میں کاشت اور تیاری کی کیفیت بڑی تفصیل سے پلسارٹ نے لکھی ہے لیکن اس کا فرانسیسی ترجمہ ناقص ہے اور اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ۔ سرکھیج کی نیل سازی کا سب سے بہتر حال گجرات رپورٹ میں لکھا ہے۔ برآمد کی اقسام کے لئے ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (جلد سوم، ۶۳۔ ششم، ۵۸) اور پلسارٹ (۴ و ۵) انگلستان میں ان کے استعمال کے لئے مسٹر فوسٹر کا مضمون اور کورٹ منٹس مورخہ ۲ جولائی ۱۶۳۴ء۔ اور سب سے پہلی خریدوں کے متعلق: پرچاس (اوّل، چہارم) اور ٹرپ اسٹراز سورت، ۵، ۷، سندھ کی خریداریاں انگلش فیکٹریز (جلد ہفتم و ہشتم) اور داغ رجسٹر (دوین گرلا) مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۶۴۵ء، وغیرہ میں مذکور ہیں۔ مشرقی ساحل سے نیل کی برآمد کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ب۔ نیز ہیگ ٹرنیس کرپٹس (اوّل، ۶۹) اور داغ رجسٹر مورخہ ۸ اکتوبر ۱۶۳۶ء اور بعد کے داخلے ۔ ۱۴۳

۱۶۱۹ء میں انگلستان کو جو نیل دساور بھیجا گیا اس کی مقدار انگلش فیکٹریز (اوّل، ۶۱) سے لی ہے۔ آئندہ عشر کی اوسطوں کے لئے ملاحظہ ہو اسی کتاب کی جلد سوم ۹۲ و ۲۰۸۔ اسی کی چھٹی اور اور آٹھویں نیز اگلی سب جلدوں میں قیمتوں کے تغیر اور کمی ہو جانے کا حال جا بجا تحریر ہے نیز لیٹر بکس، جلد دوم صفحہ ۱ تا ۳۱۳ میں ۔ ولندیزوں کی برآمد کی مقداریں داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں سے لی گئی ہیں اور ان کا ۱۶۳۹ء کا فرمائش نامہ ہیگ ٹرنیس کرپٹس (جلد دوم، ۱۱۴) میں درج ہے ۔

امریکہ سے نیل کی برآمد کا پہلا ذکر جو مجھکو ملا، پرچاس (جلد سوم۔ پنجم، ۹۵۸) میں تحریر ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کیمبرج ماڈرن ہسٹری (چہارم، ۷۰۶) بعد کے حالات کے لئے دیکھو کورٹ منٹس مورخہ ۱۸ جنوری ۱۶۳۳ء و ۲۴ اکتوبر ۱۶۴۵ء اور انگلش فیکٹریز۔ دہم، ۳۲۲ ۔ موسمی حوادث کا

تجارت پر جو اثر پڑتا تھا اس کے لئے ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (ششم وغیرہ) اور پلسارٹ، صفحہ ۵۔ عمال کی اس بارے میں کارروائی کے لئے، انگلش فیکٹریز، چہارم، ۳۲۴۔ (اور آئندہ اوراق میں اجارے کا حال) جلد ہفتم، ۲۰۳ (متعلق بہ سندھ) جلد ہشتم، ۱۴۳ (متعلق بہ احمد آباد) نیز ٹرپ اسٹرا از سورت، ضمیمہ ہفتم۔ آمیزش کے بارے میں انگلش فیکٹریز، جلد ششم ہفتم وغیرہ ؞ اسی کتاب کی تیسری جلد سے گجرات کی پیداوار کا تخمینہ نقل کیا ہے۔ نیز دیکھو داغ رجسٹر۔ ۲۰ مئی ۱۶۴۱ء مشرقی ساحل اور سندھ کی پیداوار کے اوزان کا ماخذ بھی انگلش فیکٹریز ہے اور آگرے کی پیداوار کے لئے ان کتابوں کے علاوہ ملاحظہ ہو پلسارٹ صفحہ ۵ ؞ بڑی تجارت کا برابر چلتے رہنا داغ رجسٹر (مئی ۱۶۴۱ء) کورٹ منٹس (۲۹ ڈسمبر ۱۶۴۳ء) اور انگلش فیکٹریز کی ساتویں اور آٹھویں جلد میں مرقوم ہے اور ان ہی جلدوں میں ایشیائی تاجروں کی خرید کا تذکرہ آتا ہے ؞ پلسارٹ کا اقتباس اس کے ولندیزی مخطوطہ ورق ۶ سے لیا گیا ہے۔ اکبر کی تشخیص مالگزاری آئین اکبری جلد دوم میں موجود ہے ؞

فصل چہارم

پرتگیزوں کے ہندوستان سے شورہ لے جانے کا ذکر لزبن ٹرنس کرپٹس (اوّل، ۱۰۰ اور ۱۵ اور چہارم، ۹۳۱) میں آتا ہے۔ اور اسی کتاب کی دوسری اور تیسری جلد سے ان کی غیر تجارتی برآمد کی مثالیں لی گئی ہیں ؞ ولندیزوں کی مشرقی ساحل پر شورے کی تجارت کا سب سے پہلا ذکر جو مجھے ملا وہ ہیگ ٹرنس کرپٹس (جلد دوم، صفحہ ۳۰) میں ہے (نیز ملاحظہ ہو جلد اوّل، ۱۶۲۔ اور داغ رجسٹر نومبر ۱۶۴۲ء سے لے کے آئندہ سنین کے داخلے) انگلستان میں شورے کی بہم رسانی کے واسطے ملاحظہ ہو، کورٹ منٹس ۳۱ اکتوبر ۱۶۱۷ء وغیرہ، اور اسی مجموعے

میں انگریزی تجارت کے آغاز کا ذکر ہے۔ نیز ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (جلد اوّل، ۲۵۱۔ سوم، ۳۸۳ و ۹۰) اسی کتاب سے مقداریں لی گئی ہیں۔ لیکن ۱۶۳۹ء کے اعداد کا ماخذ اورجنل کرس پونڈینس ۱۶۵۶ء ہے۔ بھرت کے طور پر شورہ بھیجنے کا ذکر انگلش فیکٹریز کی تیسری، چھٹی اور ساتویں جلد میں آتا ہے اور انگریزوں کی بنگالے میں تجارت شورہ کا حال اس کی نویں اور دسویں جلد میں مذکور ہے۔ ولندیزوں کی تجارت کے اعداد داغ رجسٹر سے جمع کئے گئے ہیں۔ تجارت میں سرکاری دخل دہی کی مثالیں انگلش فیکٹریز (سوم، چہارم وغیرہ) میں تحریر ہیں اور گھوڑوں کی تجارت روکنے کی جو مثال مقابلے میں پیش کی گئی ہے یہ کوٹو (ہشتم، ۲۳۵) سے لی ہے۔ شورہ صاف کرنے کے لئے آلات و ظروف بہم پہنچانے کے متعلق ملاحظہ ہو داغ رجسٹر (کورومنڈل) مورخہ ۱۹ فروری ۱۶۴۱ء و ۲۹ نومبر ۱۶۴۵ء۔ نیز انگلش فیکٹریز (نہم، ۹۵)

فصل پنجم

انگلستان میں سوتی کپڑے کی کھپت کا ذکر بینز (Baines) اور ڈینیلیز (Daniels) کے ہاں ضمناً آگیا ہے۔ ہندوستان سے اس کی ابتدائی مانگ کے واسطے ملاحظہ ہو: فرسٹ لیٹر بک ۱۳۱ وغیرہ۔ فنچ کی رپورٹ لیٹرز ریسیوڈ (اوّل، ۲۸) میں شامل ہے۔ ۱۶۱۹ء کی برآمد کا گوشوارہ انگلش فیکٹریز (اوّل، ۶۱، ۶۲) سے اخذ کیا ہے اور اسی کی تیسری جلد میں ۱۶۲۵ء و ۱۶۲۸ء کے اعداد ملتے ہیں۔ اور ۱۶۳۰ء کی فرمائش چوتھی جلد میں مندرج ہے۔ اس زمانے کی انگریزی منڈی کے حالات کے لئے دیکھو کورٹ منٹس ۶ اگسٹ ۱۶۲۳ء و ۳۰ مارچ ۱۶۲۵ء اور شمالی ہند کی خرید کے متعلق انگلش فیکٹریز

باب چہارم

۱۴۴

(اوّل ۲۱۲، سوم، ۱۴۴ وغیرہ) قحط کے بعد کے تغیرات کے لئے، ایضاً جلد چہارم و پنجم ۔ سندھ اور مشرقی ساحل کی تجارت کے واسطے، ایضاً جلد اوّل، دوم، چہارم وغیرہ ۔ ۱۶۳۰ء تا ۱۶۴۱ء کی برآمدیں اُن مطلوبوں سے ملخصاً اخذ کی ہیں جو **اورجنل کرسپونڈینس** بابت ۱۶۵۶ء و ۱۷۲۵ء و ۱۷۶۱ء کے ساتھ منسلک ہیں ۔ ساحلی مال کی کیفیت زیادہ تر لیٹر بکس جلد دوم کے بیانات پر مبنی ہیں اور اس کی جزئیات ان ولندیزی مطلوبوں سے لی ہیں جن کی تلخیص ضمیمہ ب میں درج ہے ؎

گجرات کے لٹھے کی نوعیت میں فرق پڑ جانے کا ذکر انگلش فیکٹریز (ششم، ۵۶ - ۳۱۱) میں ہے اور اسی کتاب کی آخری جلدوں سے مشرقی ساحل کی تجارت کی ترقی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے ۔ (خصوصیت کے ساتھ دیکھو جلد ہفتم، ۱۷۳، ہشتم، ۱۶۴ و ۲۹۷ - دہم، ۶۱ وغیرہ) اس عہد کے تفصیلی اعداد لیٹر بکس (جلد دوم، ۱ تا ۳ و ۱۳ تا ۱۷ وغیرہ) سے ملخصاً لئے گئے ہیں ؎

ولندیزوں کی برازیل و مغربی افریقہ سے تجارت پر العیاس جلد دوم، باب ہفتم میں بحث کی گئی ہے ۔ یورپ کو اُن کے سوتی پارچہ وسادہ رے جانے کے متعلق، ملاحظہ ہو ضمیمہ ب ۔ نیز لیٹرز ریسیوڈ (چہارم، ۳۴) انگلش فیکٹریز (اوّل، ۴۱ و ۴۴ - دوم، ۳۳۶) ٹرپ اسٹراز سورت، ۷۶ ۔ ہیگ ٹرنس کرپٹس، اوّل، ۱۶۳ و ۳۱۸ وغیرہ ؎

تجارت میں رخنہ اندازی کا جا بہ جا ذکر آتا ہے میں نے جو مثالیں نقل کی ہیں وہ داغ رجسٹر، مئی ۱۶۴۱ء ۔ اور انگلش فیکٹریز، پنجم، ۲۹۶ - ہشتم، ۱۸ و ۲۳۴ سے لی گئی ہیں ۔ پیشگی رقوم دینے اور ضمانت لینے اور مال میں نقص اور اس کی درستی کے متعلق حالات بھی اسی کتاب میں مندرج ہیں (جلد چہارم، ہفتم وغیرہ) نیز ملاحظہ ہوں کورٹ منٹس، ۶ ستمبر ۱۶۵۵ء اور داغ رجسٹر مورخہ ۲۰ مئی و ۳ ستمبر ۱۶۴۱ء ؎

فصل ششم

روئی کی انگلستان میں مانگ پر ڈینئلز نے بحث کی ہے (۲ وغیرہ)

اوٹنے کی کلوں (= چرخیوں) کی استدعا کے متعلق دیکھو انگلش فیکٹریز (سوم، ۲۱۲ - پنجم، ۲۰۶) اور کپاس کی برآمد کے لئے، (ایضاً سوم، ۲۱۲) اس کی فروخت کا ذکر کورٹ منٹس میں ہے ۂ انگلستان میں سوت کی تجارت کے واقعات انگلش فیکٹریز (اوّل، ۵۸ وغیرہ) اور لیٹر بکس (دوم - ۱ تا ۳ - ۱۲ تا ۱۷) سے لئے گئے ہیں ۂ ولندیزوں کی تجارت کی مقداریں حسب معمول داغ رجسٹر کے جہازی مال کی فہرستوں سے اخذ کی گئی ہیں - نیز ملاحظہ ہو ہیگ ٹرینس کرپٹس۔ اوّل، ۳۱۸ اور دوم، ۱۱۴ ۂ

اس عہد کی تجارت نیشکر کے لئے ملاحظہ ہو النّیاس جلد اوّل، ۱۷۔ سورت سے اس کی برآمد کا انگلش فیکٹریز (اوّل، چہارم وغیرہ) میں جا بہ جا ذکر آتا ہے اور ولندیزوں کی مشرقی ساحل کی تجارت کے حالات داغ رجسٹر کے داخلوں سے جو ۳۱ اکتوبر ۱۶۳۶ء سے شروع ہوتے ہیں، اخذ کئے گئے ہیں - انگریزوں کی بنگالے میں خرید کے لئے ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (ہشتم و نہم) - اسی کی ابتدائی جلدوں میں ریشم کی تجارت کا بھی ذکر آتا ہے لیکن باقاعدہ لین دین کے اعتبار سے اس کی تاریخ جلد ہم صفحہ ۱۸۸ سے شروع ہوتی ہے ۂ

* * *

۱۴۵

باب پنجم

ہندوستانی منڈیوں کی کیفیت

(۱) عام حالات

انگریزوں اور ولندیزوں کی خریداریوں کے قصّے سنانے کے بعد اب ہم خود اُن منڈیوں کے حالات پر متوجہ ہوتے ہیں۔ جن میں ان فرنگی سوداگروں نے خریداری کا موقع بہم پہنچالیا تھا۔ اگر آج کل کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ سترھویں صدی عیسوی کا ہندوستان بالکل سادہ اور دیہقانی ملک ہوگا، تو اس زمانے کی تجارتی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ درحقیقت اس وقت کے بائع اور مشتری بھی جملہ خصوصیات میں قریب قریب ایسے ہی تھے، جیسے آجکل کے بائع اور مشتری اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستانی سوداگروں کی تجارتی قابلیت ان باہر والوں سے جن کے ساتھ ان کا سابقہ پڑتا تھا، کسی طرح کم نہ تھی۔ سب سے پہلا انگریز سوداگر جو سورت آیا، ولیم فنچ تھا اور وہ بہت زور دیتا ہے کہ اس شہر میں ایک باقاعدہ کوٹھی قائم کئے بغیر کام نہ چلے گا کیونکہ چندروز کے لئے جو باہر کے جہاز یہاں آتے ہیں تو مقامی سوداگر دُگنی قیمت سے کم پر مال فروخت نہیں کرتے پھر تاکید مزید کی غرض سے اس نے ایک عام ضرب المثل نقل کی ہے کہ "یہ لوگ چالاکی میں شیطان کے کان کاٹتے ہیں اور یہ تو

میں بھی سوچتا رہتا ہوں کہ اس کے بھائی ضرور ہیں"۔ ملک کے دوسرے مقامات کی نسبت بھی اسی قسم کے اقوال نقل کئے جا سکتے ہیں۔ ان تحریروں کے خیالات اور کبھی کبھی طرز بیان تک بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں اور دو اہم استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر، باقی سب معاملات میں، جن کا ان تحریروں میں ذکر آیا ہے، ہم زمانۂ حاضرہ کے اقتصادی اصول و تجربات کا بے تکلف ان پر اطلاق کر سکتے ہیں۔

سارے ملک میں ہم بازار کے ایک نرخ ہونے کا رواج دیکھتے ہیں گو طلب اور بہم رسانی کے اختلاف سے اس نرخ میں برابر کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ پھر، کسی صنعت
۱۴۶ یا پیداوار کی لاگت کے مطابق نرخ کے قرار دئیے جانے کا اصول بھی عام طور پر لوگ بخوبی جانتے تھے۔ خود پیداوار کی لاگت میں نرخ کی کمی بیشی سے دور چل کر جو تغیرات ہوتے ہیں، ان کی شہادتیں بے شبہہ بہت کم نظر آتی ہیں۔ مگر اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ فرنگی تاجروں کی توجہ کا مرکز ایک محدود زمانہ ہے اور اتنے عرصے میں صناعات یا زراعت میں جو تغیرات ہوئے ہوں، وہ ان کا معاینہ نہ کر سکتے تھے۔ باقی بائع اور مشتری کے داؤ گھات، خفیہ طور پر معلومات بہم پہنچانے کا شوق، تجارت پر بلاشرکت یا جماعت بندی کی صورت میں ملکر اجارہ پالنے کی کوشش، نیز ماہر فن دلالوں کی ایک بڑی جماعت کی تگ و دو، قرض، مبادلے اور بیمے کیلئے ساہوکارے کی تعجب انگیز ترقی یافتہ تنظیم وغیرہ جملہ لوازم تجارت کے حالات ملتے ہیں۔ سورت میں سترھویں صدی میں بھی تجارتی آفات و حوادث ایسے ہی مانوس چیز تھے جیسے آجکل بمبئی میں ہیں۔ دوالیہ پن کا ان دنوں کوئی باضابطہ قانون موجود نہ تھا تاہم خود دِوالہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا[1]؛

وہ دو استثنائی صورتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، ایک تو حکام کی مداخلت کے خطرے سے اور دوسری حمل و نقل کی طوالت و زیر باری سے پیدا ہوتی تھیں۔ ہندوستان کی منڈیوں میں لین دین کرنے والے سوداگروں کو ہمیشہ تیار رہنا پڑتا تھا کہ مقامی حاکم یا اس کا فرستادہ کسی شے کی بھی خرید یا فروخت کے لئے جس وقت چاہے آ دھمکے۔ اور جب یہ موقع آجاتا تھا تو پھر تھوڑی دیر کے لئے تجارتی مقابلے کی بجائے

---

[1] منوچی نے بھی پٹنے کے ایک دوالے کی بہت مفصل کیفیت لکھی ہے (دوم، ۲۴۸)

جبر و تحکم کے ہاتھ میں نرخ کا فیصلہ ہوتا تھا بعض صورتوں میں یہ مداخلت ملکی ضروریات کی بنا پر جائز قرار دی جاسکتی تھی اگرچہ ممکن تھا کہ اس کا محض حیلہ کیا جارہا ہو۔ بہرحال پردیسی تاجروں کو اس قسم کی مداخلت کی زیادہ شکایت نہ ہوتی تھی جیسے کہ ہٹ لاگ والی سورت کا سیسے کا اجارہ لے لینا۔ یا شورے کی فروخت پر سارے ملک میں قیود کا نافذ ہونا یا جس زمانے میں سکتے ہیں کمی آگئی تھی، ان دنوں تانبے کی ملک میں آنے کے بعد دوبارہ برآمد کی ممانعت۔ البتہ اس قسم کی عام ضرورت کی اشیاء جیسے نیل، پارچہ، مصالحے بلکہ غلے کی تجارت پر بھی سرکار یا عہدہ داروں کے ذاتی فائدے کی خاطر بلاشرکت قبضہ کرلینے کی تدبیر کی جاتی تھی تو یہ بیرونی سوداگر گلہ کرتے تھے اور اسی طرح حکام کوئی عام نوعیت کا اجارہ لینا چاہتے تو ان کو بہت گراں گزرتا تھا۔

ہمعصر تحریروں میں بلاشرکت مال پر قبضہ کرلینے یا اجارہ لے لینے کی مثالیں اتنی کثرت سے ملتی ہیں کہ یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ عملاً ایک مقامی حاکم پورا اختیار رکھتا تھا کہ خود اپنی مرضی سے تجارت میں دست تصرف دراز کرے۔ مزید برآں اس کا فرض تھا کہ بالادست عہدہ داروں کی طرف سے اس قسم کی ہدایت ہو تو ان کی تعمیل کرے۔ مقامی حکام کی مداخلت کا ہم ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جو ۱۴۷ صوبہ دار احمد آباد سے تعلق رکھتا ہے اور سنہ ۱۶۱۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کی نسبت انگریز سوداگروں نے ذیل کی عبارت تحریر کی ہے:۔

”ہمارے صوبہ دار نے کمال ناانصافی اور بے دردی سے بعض بنجاروں کو مجبور کیا کہ شکر کا ایک چالان اس کے ہاتھ فروخت کردیں اور اس مال پر ہزار روپے کا ناجائز فائدہ اسے حاصل ہوا۔ تو اب اسے اور بھی حوصلہ ہوگیا اور وہ چاہتا ہے کہ اس مقام کی ساری تجارت خود کرنے لگے اور شہر میں یا آس پاس جس قدر نیل مل سکتا ہے اس سب پر قبضہ کرلینے کی فکر میں ہے .... ہم سمجھتے ہیں اس کا تو کوئی قرینہ نہیں ہے کہ وہ اس سال کوئی فائدہ اٹھا سکیگا کیونکہ نیل والے بھی تلے بیٹھے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہے اس کارروائی کی مخالفت کریں لیکن اگر اس کا منصوبہ کامیاب ہوگیا تو پھر کچھ تعجب نہیں کہ تھوڑے دن بعد ہمیں اپنے چاول

اور مکھن خریدنے کے لئے بھی اس کے پاس جانا پڑے"؛

اس فعل سے فی الواقع کوئی بڑا نفع صوبہ دار کو نہیں ہوا کیونکہ تھوڑے ہی دن بعد کے مراسلے میں ہم پڑھتے ہیں کہ نیل والوں نے صرف ڈھائی سو روپے دے کے اجازت حاصل کر لی کہ اپنا مال فروخت کریں اور "یہ رقم گویا بطور نفع صوبہ دار کے حوالہ کرنی پڑی جس نے سارا مال خرید لیا تھا یا در واقعہ یہ تھا کہ محض فرضی طور پر کہہ دیا تھا کہ ہم نے خرید لیا"۔ لیکن رقم کی خود قلت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر ایک عام ضرورت کی شے کی تجارت میں بھی رخنہ اندازی کی جا سکتی تھی کہ نیل کی طرح مشرقی ساحل پر ایک زمانے میں مصالحوں کا حکومت نے اجارہ لے لیا تھا اور کچھ عرصے بعد ہی دھلے کپڑے کا۔ سنہ ۱۶۱۴ء میں گجرات کا پارچہ بھی حکومت نے بلا شرکت خرید لیا تھا کہ تحفہ روانہ کیا جائے اور جلاہوں کو تہدید کر دی گئی تھی کہ کسی دوسرے کے لئے کپڑا بُنا تو جان کی خیر نہ ہوگی۔ سنہ ۱۶۳۲ء میں جب کہ سورت میں قحط کا اثر ہنوز باقی تھا، اجناس خوردنی کی قیمت دگنی کر دی گئی کیونکہ حاکم شہر اور دو تاجروں نے مل کر جس قدر مال موجود تھا سب قبضے میں کر لیا۔ ایسی کارروائیوں میں آسانی اس واسطے پیدا ہو گئی تھی کہ بعض تجارتی مرکزوں میں مقامی حاکم علی العموم وہاں کے تاجر پیشہ لوگوں میں سے کسی کو بنا دیا جاتا تھا اور دوسری طرف عہدہ داروں کو تجارت کرنے کی کوئی ایسی ممانعت نہ تھی جیسی کہ آج کل قانوناً کر دی گئی ہے پھر جب وہ کوئی تجارت کرتے تو گویا لازمی بات تھی کہ اپنے سرکاری اختیارات سے بھی کاروبار میں کام لیں اور عام سوداگروں کو اس قسم کا کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا تھا؛ ۱۴۸

وسیع پیمانے پر اجارے کی سب سے نمایاں مثال وہ ہے جو سنہ ۱۶۳۳ء میں نیل کے متعلق بیان کی گئی ہے۔ جس طرح ایران کے بادشاہ نے کچے ریشم کا اجارہ لے رکھا تھا، معلوم ہوتا ہے اسی کی مثل یہاں نیل کے اجارے کی شکل یہ رکھی گئی تھی کہ کوئی سوداگر خزانۂ شاہی میں زر کثیر ادا کرنے کا ذمہ لیتا اور اس کے عوض میں اُسے یہ امتیاز عطا ہو جاتا کہ سلطنت مغلیہ میں جس قدر نیل بنتا ہے، اسے خرید لے۔ اس میں گجرات اور بیانہ کی پیداوار بھی شامل تھی اور سنہ ۱۶۳۳ء میں

جس شخص کو یہ اجارہ ملا تھا اس نے سرکھیج میں ۱۸ روپیہ من (من = ۱۶ سیر) نیل خریدا اور ۲۷ کے بھاؤ فروخت کرنا چاہا لیکن یہ انتظام قائم نہ رہ سکا۔ بڑے بڑے خریداروں نے خرید سے ہاتھ کھینچ لیا اور آخر دو ہی برس کے اندر یعنی ۱۶۳۵ء کے آخر میں تجارت کی آزادی بحال کر دی گئی اس عام اجارے کی ناکامی کا سبب ضرور یہی سمجھنا چاہیئے کہ ولندیزوں اور انگریز سوداگروں نے مل کر اسے درہم برہم کرا دینے کی قرار داد کر لی تھی اور ان کی مشترکہ خریداری ہی منڈی میں سب سے اہم چیز تھی۔ ورنہ جہاں انفرادی طور پر خریداروں کی کثرت اور وہ اتنے بااثر نہ ہوتے، وہاں اس قسم کی اجارہ داری کا انتظام زیادہ عرصے تک چل جاتا تھا جیسا کہ مشرقی ساحل پر باربرداری کے اجارے کے معاملے میں ہوا جس کا ہم کسی گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں لیکن زمانے کے اعتبار سے ایسے اجارہ کا قیام زیادہ عرصے تک رہے یا چند روزہ ہو، اس مداخلت کے امکان کو قریب قریب ہر قسم کے کاروبار میں پیش نظر رکھنا لازمی ہوتا تھا۔

یہاں تک ہم نے خاص خاص اشیا یا کاموں کے اجارہ لینے کا ذکر کیا لیکن یہ امر کہ کسی بندرگاہ کی ساری ہی تجارت پر بلاشرکت قبضہ کر لینے میں حاکم شہر کو کوئی شے مانع نہ تھی، ہگلی کی مثال سے ثابت ہے جہاں ۱۶۳۵-۳۶ء کے موسم میں ولندیزوں کو معلوم ہوا کہ بلاشرکت تجارت کی منظوری صرف تین شخصوں کو دے دی گئی ہے اور وہ ہر چیز کا من مانا نرخ مقرر کر دیتے ہیں۔ ایک اور صورت یہ تھی کہ خود بیرونی سوداگروں کا سارا کاروبار بطور ٹھیکہ کسی کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۶۲۵ء میں مچھلی پٹم کے ولندیز سوداگروں کا بھی دوسرے ابواب مداخل کی طرح ٹھیکہ دیدیا گیا اور انھیں معلوم ہوا کہ وہ سوا ان اشخاص کے جنھوں نے روپیہ دے کر یہ ٹھیکہ لیا تھا، اور کسی سوداگر کے ساتھ لین دین ہی نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی واقعہ انگریزوں کے ساتھ پیش آیا تھا جس کے باعث انھیں ۱۶۴۸ء میں تہیہ کرنا پڑا کہ اس بندرگاہ کو ہی خیرباد کہیں۔ اجارہ داری کی تنظیم غالباً گولکنڈہ کے مشہور وزیر میر جملہ کے زمانے میں انتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اور یہی شخص آگے چل کے سلطنت مغلیہ کی ملازمت میں

۱۴۹

منسلک ہوا۔ منوچی کا بیان ہے کہ میر جملہ ایک تاجر تھا جو بزور بازو اس عہدے پر پہنچا اور اس کی سرکاری کارروائیوں سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ جب وزارت عروج پر تھی، اس وقت بھی کہا جاتا ہے کہ تجارتی مال کی حمل و نقل کے لئے اس کے پاس بہت بڑا اعلہ نوکر تھا۔ دس جہاز ذاتی ملکیت تھے اور ممالک خارجہ سے تجارت کے واسطے وہ اور جہاز بنوا رہا تھا۔ ولندیزیوں سے ناگواری کی بنا پر ایک دفعہ اس نے انگریزی کمپنی کے ساتھ ایک طرح کی شرکت کرنی چاہی تھی کہ مشرقی ساحل کی ساری تجارت کا اجارہ لے لیا جائے۔ وہ بطور خود بھی بڑی مستعدی سے کام کر رہا تھا اور کئی وسیع اقطاع کے جلاہوں کا کام اپنے واسطے مخصوص کر چکا تھا جس کا مقصد (فرنگی سوداگروں نے) یہ لکھا ہے کہ "وہ پختہ ارادہ رکھتا تھا کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رکھے کہ باہر جانے والی ساری اشیا کی تجارت اس کے قبضے میں آ جائے"۔ مدراس کے انگریز گماشتوں نے مجوزہ شراکت کو قرین مصلحت سمجھنے میں تامل کیا اور ڈرے کہ ممکن ہے دوسرے مقامات پر اسی اصول کے مطابق حکام عمل کرنے لگیں اور وہاں انگریزی کمپنی کے کاروبار کو نقصان پہنچ جائے۔ مشرقی ساحل کے متعلق اس وقت جب کہ میر جملہ نے گولکنڈہ کی ملازمت چھوڑ کر سلطنت مغلیہ کی خدمت قبول کر لی، تو یہ خطرہ بھی زائل ہو گیا لیکن ہمعصر تحریروں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ انگریز گماشتوں کا خوف کچھ بیجا نہ تھا۔

دوسری استثنائی صورت جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا حمل و نقل کے مصارف اور وقت سے متعلق ہے اور اگر حکام کی مداخلت سے تجارت میں خلل پڑنے کا اندیشہ رہتا تھا تو یہ دوسری دقت بھی عملاً کچھ کم نہ تھی اسی دشواری کا نتیجہ تھا کہ اول تو خرید فروخت کا دائرہ اتنے رقبے میں محدود کر دینا پڑتا تھا جو آج کل نہایت تنگ معلوم ہوگا۔ دوسرے نرخ کا مدار اُس ذخیرے پر ہوتا تھا جو اسی مقام میں موجود ہو نہ کہ دنیا کی مجموعی رسد پر۔ سامان درآمدہ کے معاملے میں سب سے قوی عنصر وقت کا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے کسی حصّے میں

بھی کسی چیز کے کم رہ جانے کا اندیشہ ہو تو فوراً تار دوڑانے لگتے ہیں اور علی العموم چند ہفتے کے اندر اس چیز کے پہنچ جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بخلاف اس کے پیش نظر عہد میں، سیسہ، مرجان یا کسی خاص وضع کے اونی پارچے کے منگانے میں قریب قریب دو سال خرچ ہو جاتے تھے۔ فرمائش سورت سے ماہ جنوری میں انگلستان روانہ ہوتی تھی اور اگر کوئی خاص حادثہ پیش نہ آئے تو کہیں دوسرے سال ستمبر کے مہینے میں مطلوبہ شے ہندوستان پہنچتی تھی۔ اور ممکن تھا کہ اس عرصے میں ہنڈی کی حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا ہو۔ غرض بعید مقامات کے لئے مال بھیجنے میں بہت کچھ تردّد و تذبذب کا سامنا رہتا تھا۔ بعض اوقات جس قسم کی چیز منگائی جاتی وہ بہم نہ پہنچ سکتی تھی اور اگر مل جاتی تو پہنچتے پہنچتے قابل فروخت نہ رہتی تھی۔ سوداگروں کو وقت کے وقت مقامی نرخ کے مطابق چلنا پڑتا تھا اور کسی حد تک تازہ ترین اطلاع کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا مگر یہ تازہ ترین اطلاع بھی بالکل پرانی ہو چکتی تھی۔ ہندوستان و یورپ کے مابین مراسلت میں کچھ وقت کی کفایت اس طرح ہو سکتی تھی کہ بصرے اور حلب کے برّی راستے سے خط روانہ کئے جائیں اور تجربے سے اس راستے کے فوائد کا علم ہوا تو ادھر سے خاصی باقاعدہ ڈاک جاری بھی ہو گئی[1]۔ بایں ہمہ مراسلات کے ادھر سے پہنچنے کا کچھ بہت بھروسا نہ ہو سکتا تھا اور گو یہ ہو سکتا تھا کہ برّی راستے سے جو خط بھیجا جائے وہ جہازی ڈاک کی نسبت عملاً ایک سال پہلے پہنچ جائے لیکن بعض صورتوں میں اس کے پہنچنے میں بھی اس قسم کے موانع پیش آ جاتے تھے کہ وہ قریب قریب اتنی ہی دیر میں ملتا تھا جتنی دیر میں سمندر کی راہ سے بھیجا ہوا خط بحر مشرق اقصیٰ ۱۵۰

---

[1] پرتگیز کبھی کبھی اپنے وطن کو حلب کے برّی راستے سے اطلاعیں بھیجا کرتے تھے اور بعض اوقات سویز کی طرف سے (دیکھو کوٹو، دہم، اول، ۷۲) لیکن جو مثالیں مجھے ملیں ان میں مرسلہ اطلاعات تجارتی کی بجائے سیاسی قسم کی ہوتی تھیں۔ سنہ ۱۶۱۶ء میں ولندیز بھی فکر میں تھے کہ مچھلی پٹم سے ایمسٹرڈم تک خشکی کے راستے رسل و رسائل کی کوئی صورت نکل آئے لیکن ان دونوں درمیان کے علاقوں میں جنگ و جدال کا سلسلہ جاری تھا اور راستے رکے ہوئے تھے (ہیگ ٹریفس کوپٹس

کے ممالک سے بڑی رسل و رسائل کرنے میں تو وقت کی کوئی بچت نہ ہو سکتی تھی اور بعید منڈیوں کا باہمی تعلق بھی اس قدر غیر یقینی تھا کہ اس زمانے کی تجارت میں یہ عدم تیقن بھی ایک خاص عنصر سمجھا جاتا تھا حالانکہ آج کل اس کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔

خالص ہندوستان کی لین دین میں بھی وقت کا لحاظ، نظر انداز نہیں کیا
جا سکتا تھا لیکن وہ مصارف کے سوال کے تابع تھا۔ کم سے کم اندرون ملک
میں جو مال خریدا یا فروخت کیا جاتا، اس میں تو پہلی چیز باربرداری کا خرچ تھا۔
ہمعصر تحریروں میں بعض جزئیات ایسی مرقوم ہیں کہ ان کی بنا پر باربرداری
کے خرچ کا سرسری سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آگرے سے براہ برہانپور،
سورت تک ایک شتر بار (یعنی تخمیناً ۶ من وزن کی) باربرداری کا خرچ
سنہ ۱۶۱۹ء میں پونے پندرہ روپیہ تھا۔ سنہ ۱۶۳۸ء میں گاڑی کا کرایہ بحساب پونے تین
روپیہ فی من (من = ۵۵ پونڈ) پایا۔ سنہ ۱۶۵۱ء میں آگرے سے راجپوتانے کے راستے، احمد آباد تک ایک اونٹ
کا کرایہ پندرہ روپیہ تین آنہ تھا اور سنہ ۱۶۳۹ء میں آگرے سے لاہور تک ۲ روپیہ من
مال روانہ کیا جا سکتا تھا۔ ان سب شرحوں سے ایک اوسط نکالئے تو معلوم
ہوگا کہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں سو پونڈ (= تقریباً سوا من) وزن کے
سو میل لے جانے کا خرچ باربرداری ۸ر تا ۱۲ر پڑتا تھا اور اس میں محصول
راہداری یا راستے کے چوکیداروں کی اجرت کے مصارف شامل نہیں جو مقامی ۱۵۱
حالات کے مطابق کبھی بہت کم کبھی زیادہ ہوتے تھے۔ یہ بات کہ ان سے
بھی بعض اوقات خرچ میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا تھا، پیٹر منڈی کے ایک
قول سے ثابت ہے جس میں اس نے ایک قرارداد کا ذکر کیا ہے کہ مال لانے
والوں نے ۴۵ روپیہ فی گاڑی (یا چھکڑا) اور ۹½ روپیہ فی شتر بار کا ٹھیکہ
لیا تھا کہ راستے کے سب محصول وہ ادا کر دیں گے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اول، ۴۳) انگریزوں کے بری راستے سے کام لینے کا ذکر سترھویں صدی کے چوتھے عشرہ میں آتا ہے (ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز ششم ۲۴۵ وغیرہ)

باب چہارم

راستے میں آزاد ریاستوں کی تعداد غیر معمولی تھی اور سارے ملک میں راہ داری کے محاصل کا ان رقوم پر اندازہ لگانا درست نہ ہوگا۔ بہرحال صرف کرائے کا حساب لگائیے تو کہہ سکتے ہیں کہ گو قیمتی اشیاء کے معاملے میں یہ خرچ قابل برداشت تھا لیکن معمولی زرعی پیداوار کے کہیں لانے لے جانے کے لئے اس قدر کرایہ نہایت گراں تھا۔ سولھویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان میں گیہوں کا عام نرخ کوئی ۳ من فی روپیہ تھا۔ لیکن سو میل کے فاصلے پر ہی اسے لیکر جانے میں قیمت دگنی ہو جاتی ہی اور گجرات کی ان منڈیوں تک جہاں اس کی کھپت تھی، لانے میں تو خرچ باربرداری کے باعث کم سے کم پانچ ورنہ آٹھ گنی پڑتی تھی۔ سورت کی نسبت بھی ہم پڑھینگے کہ اس شہر میں ہمارے پیش نظر زمانے میں گیہوں روپیہ من بکتا تھا۔ اب اگر یہ جنس ڈھائی سو میل دور سے آتی تو اس قیمت کے برابر فقط کرائے کا خرچ ہوتا۔ لہذا ضرور ہے کہ یہ درآمد دو سو میل کے اندر ہی کی ہو اور جب تک قیمت بہت نہ چڑھ جائے کوئی شخص زیادہ فاصلے سے اجناس خوردنی لانے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ غرض ایسی اشیا کے لئے تو جیسے نیل ہے، یہ کہنا جائز ہوگا کہ آگرہ اور احمد آباد کی ایک ہی منڈی تھی۔ کیونکہ یہاں نیل لانا لے جانا تجارتی طور پر ممکن تھا اور بڑے خریدار ان میں سے کسی مقام سے بھی مال خرید سکتے تھے۔ مگر غلے کے معاملے میں ہندوستان کو بہت سی جداگانہ اور خودمختار منڈیوں میں منقسم سمجھنا چاہئے۔ اسلئے کہ خشکی کے راستوں سے حمل و نقل کے مصارف اتنے زیادہ تھے کہ دور کے مقامات میں قیمت کا کوئی تجارتی مقابلہ نہ ہو سکتا تھا۔ جہاں کہیں دریا سے مال لے جانا ممکن تھا، وہاں صاف نظر آتا تھا کہ منڈیاں مجتمع ہوتی جاتی ہیں۔ خصوصاً سمندر کا ان نرخوں کو متحد کرنے میں بڑا دخل تھا۔ چنانچہ جہاں تک درآمد و برآمد کا تعلق ہے، سورت اور لاہری بندر (سندھ) کا بازار ایک تھا بشرطیکہ جس مال کی لین دین کی جائے وہ اتنی مقدار میں موجود ہو کہ ایک ساحلی کشتی پوری بھری جا سکے۔ اسی طرح گجرات اور ملیبار کے بازار میں کوئی فرق نہ تھا بشرطیکہ کسی بحری ناکہ بندی یا قزاقی کے باعث راستے رکے ہوئے نہ ہوں۔ اور سورت اور مچھلی پٹم کا بھی قریب قریب یہی حال تھا۔ آخرالذکر صورت میں درآمد کے نرخ یکساں رکھنے میں [illegible] ۱۵۲

باب چہارم

کی بٹاویہ میں موجودگی کو بہت کچھ دخل تھا کیونکہ اس مرکز کی مجلس انتظامی مصالحے چینی ظروف سونے چاندی وغیرہ اشیا کو جن کی بلا واسطہ خریداری ہو سکتی تھی ساحل ہند کے کسی مقام پر بھی جہاں قیمت اچھی ملے، بہ آسانی روانہ کر سکتی تھی اور اس کے مصارف میں بہت کم فرق پڑتا تھا۔ یہی اثر بہت سی اشیائے برآمد کے نرخ پر بھی پڑتا تھا اگرچہ ایسے مال کی بجائے فوراً دوسری چیز بدل میں نہ دی جا سکتی تھی جیسے سوتی پارچہ کہ اس کی خاص خاص قسمیں درکار ہوتی تھیں[1] بہر حال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنگ اور بحری قزاقی کی صورت سے قطع نظر، باقی عام طور پر ساحلی منڈیاں اگر بالکل متحد نہ ہوتیں تو بھی ایک دوسرے سے وابستہ رہتی تھیں حالانکہ تھوڑی دور کا بری حمل و نقل بھی کافی تھا کہ کم قیمت اجناس کے نرخ میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دے۔

۲۔ ہندوستان کے سوداگر اور تجارتی تنظیم

ہمعصر تحریروں کے پڑھنے سے ممکن ہے کہ کسی کو ولندیز اور انگریز تاجروں کی وقعت کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو اور وہ یہ خیال کرے کہ جن جن منڈیوں میں ان کے قدم جم گئے تھے وہاں ان کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ من حیث الجماعت یہی فرنگی سوداگر مغربی یورپ سے تجارتی مال ہندوستان میں لاتے اور مغربی یورپ کے لئے مال کی خریداری بھی تمام و کمال انہی کے قبضے میں آگئی تھی لیکن اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ خود یورپ کی یہ تجارت ہندوستانی

---

[1] ۱۶۲۷ء میں پلسارٹ نے جتایا تھا کہ مشرقی ساحل پر اس کثرت سے مصالحے بھیج بھیج کر ولندیز اپنی شمالی ہندوستان کی تجارت کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور سفارش کی تھی کہ وہاں کی درآمد گھٹا کر سورت کی درآمد میں اضافہ کر دیا جائے۔ (پلسارٹ۔ صفحہ ۸) چنانچہ چند سال بعد ایمسٹرڈم سے عام ہدایت بھیجدی گئی کہ ایران، سورت اور مچھلی پٹم میں مال رسانی کا ایسا انتظام کیا جائے کہ اس تمام خطے میں ہر جگہ نرخ یکساں رہے۔ (دہیگ ٹرینس کرپٹس، دوم - ۹۵)

باب چہارم

منڈیوں میں سب پر چھائی ہوئی نہ تھی اور ادھر ولندیزوں اور انگریزوں کی باہمی رقابت نے ان کے اثر کو بہت کچھ کم کر رکھا تھا حالانکہ اگر یہ ملکر کام کر سکتے تو یقیناً کافی اثر پیدا ہو جاتا یہ رقابت ہندوستان کے مال بیچنے اور خرید نے والوں کے حق میں تو ضرور مفید تھی مگر فرنگیوں کو اس سے نقصان پہنچتا تھا اور اسی لئے کئی بار ہم ایسی کوششیں ہوتی دیکھتے ہیں کہ اس رقابت کو ہٹا دیا جائے مگر یہ کچھ ۱۵۳ زیادہ عرصے تک نہ چل سکیں اور ۱۶۳۴ء میں سرکاری اجارۂ نیل کے خلاف باہمی معاہدہ ہوا بھی تو اس کے اثر میں اس واسطے نہایت کمی آگئی کہ آگرے میں آزاد فرنگی تاجروں کی لین دین جاری رہی۔ مانا کہ خاص خاص اشیا کی خرید میں کسی کسی وقت فرنگی سوداگر منڈی پر مسلط ہو جاتے تھے بر ایں ہم یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ تجارت کا رُخ کسی وقت بھی اُن کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ مرتبہ حاصل تھا تو خود ہندوستان کے مسلمان، بنیئے، چیتی وغیرہ تاجروں کو حاصل تھا جن کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اپنی دولت اور قابلیتوں کی بنا پر تقریباً تمام جملہ فروشی کی تجارت پر قابو رکھتے تھے۔

ان ہندوستانی تاجروں میں، ہماری پیش نظر عہد میں سب سے ممتاز سورت کا ملک التجار ''ویرجی ووُرا''[۱] (= بیرجی بوہرہ) تھا اور غلط یا صحیح، یہ بات مشہور تھی کہ دُنیا میں سب سے دولتمند سوداگر وہی ہے۔ اس کا پہلا ذکر جو میری نظر سے گذرا، ۱۶۱۹ء کے متعلق ہے جب کہ اس کے ایک ملازم کی نسبت سفارش کی گئی کہ انگریزی جہاز والے اس شخص کے ساتھ عزت کا برتاؤ کریں کہ سورت کی

---

[۱] '' '' کا املا انگلش فیکٹریز سے بجنسہ نقل کیا گیا ہے۔ پروفیسر سرکار نے بعض فقروں میں جن میں صریحاً اسی سوداگر سے مراد ہے، اسے ''بہارجی'' اور ''بیرجی بوہرہ'' کے نام سے یاد کیا ہے (شیواجی - ۱۱۰ - اورنگ زیب، اول، ۳۲۵) پادری جان ل اسکولیٹ کے ایک سورت کے خط مورخہ ۱۶۶۴ء میں اس شہرت کی تصدیق موجود ہے کہ یہ دنیا کا سب سے دولتمند سوداگر تھا۔ یہ خط سر ٹامس براون کی تصنیفات (نسخہ ولکنس) کے ساتھ چھاپ دیا گیا ہے اور مذکورہ بالا حصہ رسالہ انڈین اینٹی کوایری، بابت ۱۹۲۱ء میں بھی چھپ چکا ہے۔ (صفحہ ۳۱۲)۔

ایک کشتی بھی خود اس ملازم کی تحویل میں تھی؛ اس کے بعد سے ہم تجارتی تحریروں میں
برابر تاجر موصوف کا حال سنتے ہیں کہ وہ سونا، چاندی، سیسہ، مونگا، ہاتھی دانت،
مصالحے، افیون، روئی وغیرہ قریب قریب ہر شے کا جس کی سورت کی منڈی
میں تھوک کی تجارت ہوتی تھی، لین دین کر رہا ہے۔ اس کی خرید فروخت وسیع
پیمانے پر ہوتی تھی اور تجارتی کارخانے جو اس کے زیر اثر تھے پورے جہاز کا مال
جن کی قیمت پانچ تا دس لاکھ روپیہ ہو، خرید لیتے تھے۔ اس قسم کی خرید سے
قدرتاً عارضی طور پر اُسے خاص خاص اشیا کا اجارہ مل جاتا تھا جیسا کہ ولندیزوں کی
مصالحوں کی درآمد کے متعلق ہم پڑھتے ہیں کہ اس کے کارخانے نے لونگ ۵۴ روپیہ
من خریدی اور ۶۲ اور ۶۵ روپیہ من کے حساب سے فروخت کر رہا ہے۔ پردیسی
مال کے علاوہ سورت کی مرچ کی منڈی بھی اس کے ہاتھ میں تھی، اور ملیبار کی
جن بندرگاہوں پر پرتگیزوں کا تسلط نہ تھا، ان کی ساحلی تجارت بھی اسی ملک التجار
کے قبضے میں تھی۔ اس کا بیوپار دُور دُور پھیلا ہوا تھا اور اس کے کارخانے
کی شاخیں یا آڑت کی دوکانیں احمد آباد، آگرہ، برہانپور اور گولکنڈہ جیسے مرکزی
مقامات میں نیز مشرقی ساحل اور ملیبار میں جابجا موجود تھیں۔ جاوا، بصرہ، ۱۵۴
گومبروں وغیرہ ممالک سے وہ براہ راست تجارتی تعلقات رکھتا تھا اور
کبھی کبھی انگریزی جہازوں میں ان ممالک کو مال بھیجتا تھا۔ جس قدر وقت گزرتا
گیا منڈی میں بیرجی بوہرے کی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انگریز گماشتوں
کو وبال معلوم ہونے لگی۔ ان کے مراسلوں میں معمولی سوداگر کی بجائے وہ
"سارے فرنگی مال کا اجارہ دار" لکھا جانے لگا اور ۱۶۴۳ء میں وہ "شہر
سورت کے چھوٹے سوداگروں پر اس قدر حاوی نظر آیا کہ اکثر اوقات
وہ زیادہ دام لگا کر مال خریدنا بھی چاہتے تو بھی رُکے رہتے اور اپنے ارادے
کا حال نقصان کے اندیشے سے اس پر ظاہر کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے کیونکہ
موقع اور نرخ اسی کے اختیار میں ہیں۔" انگریز سوداگروں کے اسی چاہیے میں یہ
بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ہم "اس کے ساتھ بے سود حساب کتاب رکھنے سے
اُکتا گئے ہیں اور بتدریج اسے چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے پر مائل

باب پنجم ہیں جو زیادہ اچھی امید دلائیں"۔ لیکن اس ارادے پر عمل نہ ہو سکا۔ سنہ ۱۶۴۲ء میں بھی بیرجی بوہرہ کے دورِ رعب سے سارے بنئے بیوپاری اس کے روبرو جھکتے تھے" اور چار سال بعد بھی انگریز گماشتے عملاً اسی کے ہاتھ میں تھے۔ اپنے پیش نظر عہد کے آخری عشرے میں ہم ایک معاملے کے متعلق نزاع ہونے کا حال پڑھتے ہیں جس کا لندن سے فیصلہ چاہا گیا تھا۔ انگریزی کمپنی نے بیرجی کے خلاف فیصلہ کیا مگر اسی کے ساتھ اظہارِ ارادت مندی کے لئے ایک قیمتی تحفہ ارسال کیا۔ پھر بھی بیرجی کی ناراضی دور نہ ہوئی اور ایک زمانے تک وہ اس قدر ناخوش رہا کہ انگریزوں کی استدعائے قرض کو کسی شرح سود پر بھی سننا تک گوارا نہ کرتا تھا۔

اس اقتدار و قوت کے باوصف، بیرجی بوہرہ بھی مقامی حکام سے ہر موقع پر تغافل برتنے کی مجال نہ رکھتا تھا۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں ہم اسے اندیشہ مند پاتے ہیں کہ والیٔ سورت اس کی تجارت میں شراکت کی نیت رکھتا تھا اور خوف تھا کہ "اس جال میں پھنس کر ملک التجار نقصان نہ اٹھائے"۔ کچھ روز بعد مسیح الزماں والیٔ سورت مقرر ہوا اور معلوم ہوتا ہے اسے بیرجی زرستانی کیلئے بہت اچھی اسامی نظر آیا چنانچہ سنہ ۱۶۳۸ء کے اواخر میں ہم ملک التجار کو سورت کے بندی خانے میں "بدترین وحشیانہ تعدی" کا شکار سنتے ہیں۔ اس پر کیا الزام تھا، اس کی صراحت نہیں کی گئی اور ہم اس کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق لاعلم ہیں۔ لیکن یہ کارروائی غالباً بے ضابطہ کی گئی تھی اور دیوانِ صوبہ (مالگزاری کے بادشاہی عہدہ دار) نے بادشاہ کو اس کی اطلاع دی۔ بیرجی بوہرہ اصالتاً جوابدہی کے واسطے دربار میں طلب ہوا اور بالآخر مسیح الزماں اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اس وقت سے ہمارے عہد کے اخیر تک بیرجی بوہرے ۱۵۵ کے کاروبار میں کوئی قابل ذکر رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔ سیواجی مرہٹہ نے سنہ ۱۶۶۴ء میں سورت پر چھاپہ مارا تو ملک التجار کو بھی بڑا نقصان پہنچا لیکن تھوڑے ہی دن بعد ہم پڑھتے ہیں کہ وہ اور ایک اور تاجر "ابھی تک زوروں پر ہیں اور بڑے بڑے بیوپار کر رہے ہیں"۔ سنہ ۱۶۶۵ء میں گمنام درخواستیں نتاہ یہ پہنچیں

جن میں پیر جی پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ سورت کی ولندیزی کوٹھی کے ساتھ ناجائز معاملت کر رہا ہے۔ اس زمانے میں سیاح تھیوینو ہندوستان آیا۔ وہ اسے اپنا دوست اور اسی لاکھ کا مالک بتاتا ہے تھیوینو نے سکہ کی صراحت نہیں کی لیکن ایک اور ہمعصر تحریر میں اسی لاکھ روپیہ بتایا گیا ہے[1] اور ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر پیر جی کو اسی قدر سرمائے کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت ممکن ہے یہ قیاسی تخمینہ اصلیت سے بالکل بعید ہو۔ پیر جی کی وفات کا حال مجھے کہیں نہیں ملا لیکن غالباً وہ ۱۶۷۷ء سے قبل انتقال کر چکا تھا[2]۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پیر جی بوہرے کے مرتبے کا سوداگر فرنگی سوداگروں کا منڈی میں آنا پسند کرتا تھا یا نہیں؟ واقعات سے اس کا جواب کم سے کم انگریزوں کے متعلق تو اثبات ہی میں نکلتا ہے کیونکہ عرصہ دراز تک وہ ان کے کاروبار کے لئے روپیہ بہم پہنچاتا رہا اور اس دوران میں اگر چاہتا تو غالباً ان کو ملک سے بالکل نکال باہر کرتا۔ ہم ایک گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں کہ انگریزوں کو اکثر سورت میں روپیہ قرض لینا پڑتا تھا۔ ان موقعوں پر پیر جی بوہرہ ہی ان کی اکثر احتیاجیں پوری کرتا تھا اور منڈی میں اس کو ایسی قوت و مرتبہ حاصل تھا کہ یہ نتیجہ نکالنا کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ اگر وہ چاہتا تو دوسروں کو بھی قرض دینے سے روک سکتا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بار جبکہ انگریز بڑی مشکلات میں پھنسے ہوئے تھے، اس نے از خود انھیں دو لاکھ روپیہ قرض دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ایک اور موقع پر اسی نے ایک لاکھ کی غیر متوقع رقم دے کے ان کی ساکھ بچا لی۔ یہ کہنا کہ یہ کام محض حسبۃً للہ یا ہمدردی سے کئے ہونگے، بے معنی ہے۔ وہ حسب معمول سود لینے میں کمی نہ کرتا تھا اور

---

[1] یہ رقم اِسکالیوٹ کے اسی خط میں جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے، مندرج ہے۔

[2] یکم جون ۱۶۷۸ء کے داغ رجسٹر میں سورت کے بعض دلچسپ خطوط چھپے ہیں۔ ان کا موضوع ایسا ہے کہ پیر جی بوہرہ کاروبار کرتا ہوتا تو اس کا لازماً ان میں ذکر ہوتا لیکن کہیں نام نہیں آتا۔

جب کبھی منڈی کی حالت متقاضی ہوتی تو شرح سود میں اضافہ بھی کر دیتا تھا پھر اپنی شرطوں پر عمل کرانے میں ذرا بھی مروت سے کام نہ لیتا تھا۔ غرض سب سے زیادہ قرینِ عقل یہی ہے کہ جن (انگریز) بیوپاریوں کے کاروبار میں اس نے اتنی مدد دی ان کے رہنے کو وہ مفید جانتا اور یہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں کے سورت سے نکال دیئے جانے میں اتنا مالی نفع نہیں جتنا ان کے یہاں رہنے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل سے ایک اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس زمانے میں شخصی ساکھ کی کیسی کچھ وقعت تھی۔ متعلقہ تحریروں میں کہیں نہیں لکھا کہ پیرجی اپنے قرض کی کوئی کفالت طلب کرتا تھا۔ اور یہ بات خاص طرح صاف نظر آتی ہے کہ ایسی شرط بیکار بھی تھی کیونکہ انگریزوں کے پاس کیا دھرا تھا جسے وہ کفالت میں پیش کرتے بجز اس کے کہ زیادہ سے زیادہ وہ مال پیش کر سکتے تھے جو ان کی کوٹھی میں بھرا ہوتا اور جو قرض لینے کے وقت تو فروخت نہ ہو سکتا تھا نظر برایں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دنوں گجرات کی ایسی حالت تھی کہ اگر قرض خواہ کا ذاتی اعتبار اجازت دے، تو تجارتی معاملات میں، لاکھوں تک روپیہ قرض ملنا ممکن تھا۔ ۱۵۰۶

مشرقی ساحل پر پیرجی بوہرے کا جواب یا مثنیٰ وہ خاندان یا کارخانہ تھا جسے ملیا کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس کا مستقر پولی کٹ اور تعلقات لنگاپٹم تک پھیلے ہوئے تھے۔ خود ملیا سنہ ۱۶۳۴ء میں مر گیا لیکن اس کا کاروبار اس کے وارثوں نے جاری رکھا اور اس کی وفات کے دس پندرہ سال بعد تک انگریزی تحریروں میں ملیا ہی کا نام لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کارخانے کی تجارت کا صحیح حال معلوم کرنا، پیرجی بوہرے کے بیوپار سے بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ ملیا کا کاروبار جنوبی ہند کی پیچیدہ سیاسیات سے بھی الجھا ہوا تھا۔ ملیا کا چھوٹا بھائی چناچیٹی تھا جو بھائی کے بعد دکان کا مالک ہوا اور معلوم ہوتا ہے ٹھیکے کے طور پر مختلف عہدے بھی اس کے پاس رہتے تھے اور کبھی کبھی میدان جنگ میں وہ سپہ سالاری کی بھی خدمت انجام دیتا تھا۔ ایسے بیوپاری کا طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہونا لازمی سی بات ہے اور ایک مرتبہ وہ اتنا

مقروض ہو گیا تھا کہ اس کا ادا ہونا مشتبہ معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے کسی تحریر میں بالکل دوالہ نکل جانے کا تذکرہ نہیں پڑھا۔ کاروبار میں یہ کارخانہ زیادہ تر جہازی تجارت سے تعلق رکھتا تھا اور ولندیزوں اور انگریزوں کی تحریروں میں اس کے جو داؤ گھات لکھے ہیں، ان سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کی بڑی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک کمپنی کو دوسرے سے لڑا کے خود فائدہ اٹھائے؛

معمولی سوداگروں کے بارے میں ظاہر ہے کہ اتنے حالات نہیں ملتے
جتنے مذکورۂ بالا کارخانوں کے تحریر ہیں اور ان کی نسبت یہی کہنا کافی ہے کہ
وہ کمتر پیمانے پر اور معمولاً اسی روش پر کاروبار کرتے تھے جو ہنڈی کے بڑے ۱۵۰
تاجروں نے ڈال دی ہو۔ ایک ایسی مثال بھی تحریر ہے کہ سورت کے ایک
تاجر نے غالباً پیرجی بوہرے سے مقابلہ کرنے کا قصد کیا اور مونگے کا ایک چالان
خرید لیا لیکن دو برس تک اسے یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس خریداری کا علانیہ اقرار
کرتا اور اتنے دن تک یہ مال انگریزی گودام میں اس کس مپرسی کی حالت میں پڑا
رہا کہ کوئی اسے مانگنے تک نہ آتا تھا۔ طرفہ تر یہ کہ اس زمانے کی تحریروں سے
ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدر انفرادی آزادی کی بھی عام طور پر توقع نہ کی جا سکتی تھی؛
ان تحریروں میں تاجروں کی نسبت دلّال زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں اور ان سے کام
لینے کا رواج عام تھا۔ ان کی تعداد کثیر تھی۔ وہ ہر جگہ پہنچتے اور بعض اوقات
پریشان کر ڈالتے تھے۔ ۱۶۳۵ء میں سورت کے انگریز گماشتوں نے "یہ قاعدہ
بنایا کہ انگریزی کوٹھی میں سوائے کمپنی کے مقرر کردہ دلّالوں کے اور ان کے
خاص خاص نوکروں کے اور کسی کے آنے کی اجازت نہ ہوگی جب تک کہ وہ ایسا
کاروبار نہ کرتے ہوں جس کا تعلق کمپنی سے ہے اور اس کے لئے بھی انھیں پہلے
اجازت حاصل کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس کے خلاف عمل ہوتے رہنے سے بہت سی
زحمتیں پیش آتی رہی ہیں اور یہی نہیں کہ لوگوں کی خانگی تجارت کو فائدہ پہنچا بلکہ
کمپنی کے کاروبار کی سب کیفیت کھل جاتی ہے اور اس سے قبل کہ تجارتی مصالح
اس امر کی اجازت دیں، یہ کیفیت کھلے بازار کی مانند سب کے علم میں آجاتی
ہے"؛

وقتاً فوقتاً دلالوں کی جعلسازی یا نمک حرامی کی بھی نظیریں پائی جاتی ہیں[1] لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مروجہ مراسم تاجرانہ کی عائد کردہ حدود کے اندر یہ لوگ عام طور سے اچھی خدمت انجام دیتے تھے اور یہ باور کرنے کی بھی معقول وجوہ موجود ہیں کہ بہت عرصے تک خود انگریز سوداگر ہی دلالوں کے ایسے جتھے کے ہاتھ میں رہے جو کچھ زیادہ باعزت نہ تھے، انکی تجارتی دیانت جیسی بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ ان کی تگاپو سے نرخ درست رہتا اور جیسا کہ ہم اگلی فصلوں میں مطالعہ کریں گے فی الواقع منڈی کی حالت کے مطابق اترتا چڑھتا رہتا تھا۔

۱۵۸ میں سمجھتا ہوں کہ دلال اور تاجر میں سرمایہ کا ہونا اور نہ ہونا ہی خط فاصل تھا اور ہمارے عہد تک منڈی میں دوسری قسم کی کوئی تخصیص پیشۂ تجارت میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ مثلاً بیرجی بوہرہ صحیح معنی میں ایک تاجر یعنی اشیا کی خرید فروخت کرنے والا تھا اور اس کے بیوپار میں ہر قسم کا مال جس کے لین دین سے نفع کی امید ہو، داخل تھا۔ اسی کے ساتھ وہ جہاز بھی چلاتا۔ ساہوکاری بھی کرتا اور ہنڈیوں کے ذریعے دوسرے مقامات میں جہاں اس کی شاخیں تھیں اجرائی زر کا بھی انتظام کر دیتا تھا۔ ملیا کے کارخانے کی سرگرمیاں بھی اسی طرح ہمہ گیر تھیں اور مجھے کوئی ایسی شہادت نہیں ملی کہ ساہوکار و تاجر میں فرق ظاہر

---

[1] انگریزوں کے پہلے دلال جادو داس کی بے ضابطگیوں کا ابتدائی مراسلات یعنی لیٹرز رسیوڈ جلد اول، ۴۸، ششم، ۲۲۴، اور انگلش فیکٹریز۔ اول، ۲۱ و ۴۲ میں بار بار ذکر آتا ہے۔ روؔ لکھتا ہے (صفحہ ۲۱۶) کہ وہ ہمارے کام میں دوسرے تمام موانع ملکر اتنی رکاوٹ نہیں ڈال سکتے جتنی اکیلے جادو داس کی بدولت پڑتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دیانت داری کے علاوہ وہ اور ہر وصف سے متصف تھا سو دیانت کے معاملے میں دوسروں کو بھی بہت کم ترجیح دے سکتے ہیں"۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دراز دست لیکن لابد قسم کا خدمتی تھا جیسے کہ اب بھی کبھی کبھی ہندوستان میں ملازم ملتے ہیں۔ یہاں تک تو اسکی کامیابی میں کچھ شک نہیں کہ کمپنی میں اپنے کئی رشتہ داروں کو رکھوا دیا تھا چنانچہ سنہ ۱۶۳۲ میں منڈی لکھتا ہے (دوم، ۹۷) کہ میرا پٹنے کا مددگار سورت کے دلال گرداس آگرے کے دھن جی اور بھڑوچ کے پنجو کا چچیرا بھائی ہے یہ سب دو بھائیوں کی اولاد ہیں جنکا تیسرا بھائی (یعنے گرداس وغیرہ کا چچا) ہمارا برہانپور کا دلال جادو داس ہے۔

باب چہارم

کرتی ہو یا کوئی ممتاز تاجر ایسا ہو جس نے اپنی خرید فروخت کسی خاص قسم کے مال تک محدود کر رکھی ہو۔ اگر اس طرز کی خصوصی تجارت سے قریب ترین کوئی صورت پائی جاتی ہے تو وہ صرّاف یا زر فروشوں کا پیشہ تھا کہ رائج الوقت سکوں کے تنوع نے اس کو ماہرین خصوصی کا پیشہ بنا دیا تھا۔ فرنگی انھیں "شراف" کہتے تھے اور ٹرے ورنیر جیسے سیاح جو باہر سے آتے، وہ ان لوگوں کی اپنے فن میں مشاقی دیکھ کر متعجب ہو جاتے تھے۔ مگر یہ لوگ بھی اپنے کام کو اسی پیشے تک محدود نہ رکھتے تھے چنانچہ ہم ایک موقع پر کسی صرّاف کا حال پڑھتے ہیں جو انگریزوں کا ملازم تھا لیکن اس نے ایک چھوٹی سی انگریزی کشتی خلیج فارس میں تجارت کی غرض سے کرائے پر لے لی تھی۔ اسی طرح خود انگریز دلّالوں کو بھی ہم کبھی کبھی بطور خود تجارتی لین دین کرتے دیکھتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جہازی بیمے کا کام خصوصی پیشہ بن گیا ہو لیکن اس بارے میں کوئی قطعی اطلاع مجھ کو نہیں میسر آئی۔ بیمے کا طریقہ عام طور پر مروج ہو گیا تھا اور ہم منجملہ جنگ کے بیموں کے "چڑھی منڈی" کے بیمے کی مثالیں بھی پڑھتے ہیں لیکن بیمہ کرنے والوں کے نام اور حالات کی تصریح نہیں ملتی اور گمان غالب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیمے عام سوداگروں ہی کے ہاں طے پا جاتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے پیش نظر عہد میں ہم ہندوستان کے کسی تجارتی مرکز کو بیوپاریوں کی ایک غیر معین تعداد پر مشتمل سمجھ سکتے ہیں کہ جس کی شاخیں جدا جدا نہ تھیں مگر قابلیت اور سرمایہ داری کے لحاظ سے وہ مختلف مدارج میں منقسم ہوتے تھے گو ہر شخص مشتاق رہتا تھا کہ جس بیوپار میں فائدہ معلوم ہو اس میں قسمت آزمائی کرے بشرطیکہ وہ ایسا بیوپار نہ ہو کہ بڑے بڑے تاجروں سے ٹکر کی نوبت لائے کیونکہ عام تاجر ان کے مقابلے میں آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس میلان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ امید افزا تجارت میں اکثر ضرورت سے زیادہ اشخاص ہاتھ ڈال دیتے تھے۔ مثالاً عربوں نے عدن پر دوبارہ قبضہ پایا تو ہندوستان کی مختلف 159
بندرگاہوں سے جہاز پہ جہاز دوڑ پڑے اور منڈیاں مال سے ایسی اٹ گئیں کہ نقصان کثیر برداشت کئے بغیر اس کی نکاسی ناممکن ہو گئی۔ مخا میں حکام کی تعدی نے

باب پنجم

اور بھی حالت خراب کر رکھی تھی بحالیکہ اچین سے تو جہاز تک واپس نہیں آتے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ سورت کے کئی ہندو اور مسلمان تاجروں کا دیوالہ نکل گیا اور ملک بھر میں روئی کی قیمت گر گئی۔ اسی طرح سنہ ۱۶۴۲ء میں ولندیزی تحریروں میں درج ہے کہ سورت میں مُخا سے کئی لین دین کرنے والوں اور متعدد صرافوں کا دوالہ نکلا اور سونے چاندی کی منڈی درہم برہم ہو گئی۔ میری دانست میں اسی قسم کی خرابی کا انگریز گماشتوں کے اس خط میں اشارہ ہے جس میں لکھا ہے کہ "گو بندروں میں ذرا کسی شے کی مانگ پیدا ہوتے دیر نہیں لگتی کہ وہ چیز یک بہ یک اتنی مقدار میں بھیج دی جاتی ہے کہ اس کی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ یہی کیفیت مُخا کے معاملے میں ہے۔ البتہ بصرہ ابھی تک ایسی جگہ ہے جہاں آپ کو زیادہ سے زیادہ نفع مل سکتا ہے"۔ مگر یہ آخری رائے بھی جلد ہی غلط ثابت ہو گئی کیونکہ سنہ ۱۶۴۷ء میں بصرے کا اٹاؤ بھی اسی درجے پر پہنچا جیسا کہ مُخا میں تھا۔ اس لئے کہ وہاں بے حساب مقدار میں مال بھیج دیا گیا حالانکہ بکری بہت کم تھی"۔ اچین کی منڈی میں بھی ایسی ہی خرابی پیش آئی۔ وہاں کا جابر رئیس سنہ ۱۶۴۱ء میں فوت ہوا اور یہ شہرت سن کر اس کا جانشین لین دین کا کھرا ہے، بہت سے ہندوستانی تاجروں نے مال بھیج دیا حتیٰ کہ سوتی پارچے کی وہ افراط ہوئی کہ کچھ دن بعد اندازہ کیا گیا کہ وہی مال ابھی دو سال تک کافی ہوگا۔ ان سے اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح آج مغربی ہندوستان کی سوداگری کی خصوصیت یہ ہے کہ نفع کے شوق میں لوگ قابو میں نہیں رہتے، تین سو برس قبل بھی یہی رنگ تھا۔ کم سے کم ہمارے پیش نظر عہد میں تو بہت سرگرمی کی کچھ کمی نہ تھی اور اس زمانے میں جس قسم کے حالات تھے، ان کے لحاظ سے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی کہ یہ شوق و سرگرمی بیشتر ایسے بیوپار میں خرچ کی جاتی تھی جو بہت زیادہ قسمت آزمایانہ نوعیت کے ہوتے تھے۔

۳۔ گجرات کی تجارت

اس عہد کے کاروبار کی کیفیت دکھانے کی سب سے اچھی صورت یہ ہوگی

باب پنجم کہ چند زیادہ اہم اشیا کے نرخ میں جو کمی بیشی واقع ہوئی، اس کے اسباب کا پتہ چلایا جائے۔
یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہندوستانی ذرائع سے تحریری نرخ ناموں کا
۱۶۰ تلاش کرنا بے سود ہے۔ البتہ انگریزی مراسلات سے بہت کچھ اطلاعات بہم
پہنچتی ہیں اور رسائل بٹاویہ میں مزید اعداد مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن
ہوگیا ہے کہ حالات موافق ہوں تو نرخ کی کمی بیشی کا ایک مسلسل نقشہ تیار کرلیا
جائے۔ افسوس ہے کہ بعض اعداد کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ مثلاً اونی کپڑے
کی قسمیں اتنی مختلف تھیں کہ جو قیمتیں درج کی گئی ہیں، ان پر فن کی واقفیت کے
بغیر کوئی بحث نہیں کی جاسکتی۔ مونگا اور ہاتھی دانت وغیرہ بعض دوسری اشیائے
درآمد کے بارے میں بھی اسی قسم کا خدشہ موجود ہے۔ ادھر برآمد میں، جہاں تک
شورے اور سوتی کپڑے کا تعلق ہے، جو اعداد ملتے ہیں ان کی اہمیت مقام
بہم رسانی کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ بہرحال ہم نے جو مثالیں چنی ہیں اُن میں
تاامکان ان خدشات سے پہلو بچایا ہے۔ اور بعض صورتوں میں جیسے سیسہ،
پارہ یا لونگ ہے نوعیت کے کسی خاص فرق کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا۔ اسیطرح
بعض اشیا کی (جیسے نیل ہے) قیمت کا صرف اوسط تحریر ہے جو کسی خاص چالان
کی خریداری کے وقت مانگی یا ادا کی گئی اور اس میں بھی مختلف گٹھوں کی قسم
کے اختلاف سے جو فرق پیدا ہوسکتا ہے، اس کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اصل سکّہ
جن میں یہ قیمتیں درج ہیں، ضمیمہ د میں ان پر بحث کی ہے۔ من میں سیر دو سیر کی
تاجرانہ رعایت سے کسی قدر اُلجھن ہوتی ہے کہ اس کی کبھی کبھی صراحت کئے جانے
کا کیا مطلب ہے۔ آیا یہ مقررہ دستور تھا یا اسی موقع پر بطور خاص اس قسم کی
رعایت کی گئی تھی تاہم اس سے غلطی بھی پیدا ہوتی ہے تو وہ پانچ فیصدی سے زیادہ کی نہیں
ہوسکتی اور ہم جو کچھ اندازہ لگائیں گو وہ بالکل حسابی صحت کے موافق نہ ہو پھر بھی بہت کچھ قرین صحت ضرور ہوگا۔

پہلی مثال احمد آباد کی منڈی میں سرکھیج کے نیل کی قیمتوں کے متعلق ہے جس کی مختلف اقسام دساور جاتی تھیں۔ آئندہ نقشے میں ان کے اعداد سنہ وار پیش کئے گئے ہیں، لیکن ان اعداد کو سمجھنے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ پہلے قیمت کا وہ اوسط معلوم کرلیا جائے جو ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز میں تھا۔ اس میں کچھ شک

باب پنجم نہیں کہ ابتدائی انگریز خریدار ۱۸ روپیہ فی من کو اوسط قیمت سمجھتے تھے نومبر سنہ ۱۶۱۳ء
میں ٹامس ایلڈورتھ نے اطلاع دی کہ پرتگیز خریداروں کے نہ رہنے کے باعث
۱۶۱ نیل کی قیمت بہت گر گئی ہے ۲۰ حتی کہ اُن کا بہترین چپٹا نیل جو ۱۴ عـہ کے بھاؤ

۱۶۲

احمد آباد میں سرکھیج کے نیل کا نرخ

سنہ ۱۶۰۹ء تا سنہ ۱۶۶۳ء

—(٠:٠)—

یادداشت:- یہ قیمتیں روپے میں بحساب فی من (من = ۳۳ پونڈ یا ۱۶ اسیر) تحریر کی ہیں۔ سنہ ۳۶-۱۶۳۵ء میں اس من کا وزن بڑھ گیا تھا لہٰذا نقل کرتے وقت ہم نے اسی حساب سے دس فی صدی گھٹا کر وزن تحریر کیا ہے تاکہ موازنے میں دشواری نہ ہو۔ (جدید من میں قدیم سے ۱۸: ۲۰ کی نسبت تھی)

سنہ	نرخ	کیفیت	مآخذ
	(اوسط قیمت ۱۸ روپیہ فی من)		(لیٹرز ریسیوڈ، اول، ۳۰۶) وغیرہ
سنہ ۱۶۰۹	عنہ تا ع۱۲ہ	اطلاع رسیدہ	”
سنہ ۱۶۱۲	للو عـہ	”	ژوردین - ۲۱۷
سنہ ۱۶۱۳	”	”	لیٹرز ریسیوڈ - اول
سنہ ۱۶۱۴	عـہ تا عـہ	”	” - دوم
”	عـہ تا عـہ	اداکردہ	”
سنہ ۱۶۱۷	عـہ تا عـہ	اطلاع رسیدہ	ٹرپ اسٹر از سورت
سنہ ۱۶۱۸	عـہ تا عـہ	”	”

سنہ	نرخ	کیفیت	مآخذ
سنہ ۱۶۱۹	دعہ	ادا کردہ	انگلش فیکٹریز۔ اول
سنہ ۱۶۲۱	عہ	تخمینی	فیکٹری ریکارڈز سورت۔ اول
"	لعہ ۸/ تا لعہ ۸/	ادا کردہ ولندیز	انگلش فیکٹریز۔ اول
"	لعہ ۴/	ادا کردہ انگریز	"
سنہ ۱۶۲۲ء (جنوری)	اعہ	تخمینی	" دوم
" (اگست تا دسمبر)	ہے تا لعہ	طلب کردہ	" "
سنہ ۱۶۲۳ (اپریل)	عہ ۸/ تا ہے	اطلاع رسیدہ	" "
" (نومبر)	ہے ۸/ تا ہے ۱۲/	"	" "
"	عہ	طلب کردہ	" "
" (دسمبر)	عہ ۴/	ادا کردہ	" "
۱۶۲۵	عہ	اطلاع رسیدہ	" سوم
"	لعہ	تخمینی	فیکٹری ریکارڈز۔ اول
سنہ ۱۶۲۸ (جنوری)	للعہ تا دعہ	طلب کردہ	انگلش فیکٹریز۔ سوم
(مارچ)	عہ تا للعہ ۴/	"	"
۱۶۳۰	عہ ۱۲/	اطلاع رسیدہ	فیکٹری ریکارڈز۔ دوم
۱۶۳۲	للعہ تا عہ	"	انگلش فیکٹریز۔ چہارم
سنہ ۱۶۳۳ (جنوری)	عہ تا دعہ	"	" "
(نومبر)	عہ تا عہ	طے کردہ با ولندیز	" "
سنہ ۱۶۳۴	اعہ	اجارے کے زمانے کا نرخ	" پنجم
۱۶۳۵	اعہ (؟)	ادا کردہ	" "
۱۶۳۶	دعہ	تخمینی	" "
۱۶۳۸	عہ ۳/ ٹکے اندرم (؟) K	اطلاع رسیدہ	" ششم

سنہ	نرخ	کیفیت	مآخذ
سنہ ۱۶۳۹ (جنوری)	عہ ۱۰/۱۴	بالاوسط اداکردہ	اورجنل کرس پونڈنیس
(دسمبر)	لعہ	؍؍	؍؍
سنہ ۱۶۴۰ (جنوری)	عہ ۵/	اطلاع رسیدہ	اورجنل کرس پونڈنیس
(دسمبر)	عہ	بالاوسط اداکردہ	؍؍
؍؍	عہ ۱۱/ تا لعہ	متوقعہ	انگلش فیکٹریز۔ چہارم
۱۶۴۱	عہ ۹/ ۰۶/ تا لعہ	طلب کردہ	داغ رجسٹر
سنہ ۱۶۴۲ (اواخر سال)	للعہ ۸/ ۰۶/ تا لعہ	اداکردہ	؍؍
۱۶۴۴	لعہ ۱۰/ ۱۳/	؍؍	انگلش فیکٹریز۔ ہفتم
۱۶۴۵	عہ تا عہ (؟)	طلب کردہ	؍؍
۱۶۴۶	عہ ۱۱/ ۸/ تا لعہ	؍؍	؍؍
۱۶۴۷	لعہ ۴/ ۹/ تا عہ	اداکردہ	؍؍
سنہ ۱۶۴۸ (جنوری)	لعہ ۴/ ۱۰/ لعہ	تخمینی } آزمائشی	؍؍
(اپریل)	لعہ ۱۰/ ۸/ ۹ تا لعہ	واقعی	؍؍
۱۶۵۰	عہ ۱۲/ ۹/ عہ	اطلاع رسیدہ	؍؍
۱۶۵۳	لعہ ۹/ ۸/ ..	اداکردہ	اورجنل کرس پونڈنیس
۱۶۵۵	لعہ ۳/ (؟)	؍؍	انگلش فیکٹریز۔ دہم
۱۶۵۶	عہ ۱۳/ تا عہ	اطلاع رسیدہ	؍؍
۱۶۶۳	عہ ۳/ تا عہ ۱۲/ ۸/ ۱۴/	اداکردہ	داغ رجسٹر۔ ۲۱ جون سنہ ۶۳ء

ف (۱) سنہ ۱۶۳۵۔ غالباً لعہ کی بجائے اصل قیمت للعہ سمجھنی چاہیئے مگر یہ صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ من کا وزن اس خرید سے پہلے بڑھ چکا تھا یا بعد میں ایسا ہوا ہو۔

(۲) سنہ ۱۶۴۸۔ یہ نرخ مشتبہ ہے کہ ایک گماشتے نے اپنی صفائی میں اسے

پیش کیا تھا۔

(۳) سنہ ۱۶۴۵۔ کتاب میں قیمت فی گٹھا لکھی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ من سے ہی مراد ہے۔

(۴) سنہ ۱۶۵۵۔ اس میں بہت آمیزش تھی۔ چنانچہ اسے "آدھی مٹی" بتایا گیا ہے۔

بکتا تھا اب للعہ میں مل رہا ہے اور غالباً آئندہ اور گھٹے گا۔" آئندہ چند سال میں دو یا تین دوسرے تاجروں نے بھی یہی قیمت بیان کی ہے۔ ان تاجروں کا بڑا بیوپار نیل کی خریداری تھا لہٰذا یہ فرض کرنا درست ہوگا کہ انھوں نے منڈی کا ٹھیک بھاؤ معلوم کرنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ لیکن اگر ہم محض وہم سے یہ قیاس بھی کر لیں کہ انھیں دلالوں نے ملکر فریب دیدیا ہوگا تو بھی یہ کہنا کسی طرح خلاف احتیاط نہ ہوگا کہ انگریزوں کی خرید شروع ہوئی تو نیل کا نرخ یقیناً عہ سے اوپر تھا۔ مانا کہ سنہ ۱۶۱۰ میں سب سے پہلی واقعی اطلاع جو فنچ نے بہم پہنچائی وہ اس نرخ سے بہت کم یعنی عہ، عہ فی من کی شرح بتاتی ہے لیکن اسے خلافِ معمول کم سمجھنے کی معقول وجوہ موجود ہیں۔ اول تو فنچ فی الواقع خریداری نہیں کر رہا تھا بلکہ محض قیمتیں دریافت کرنا اس کا مقصد تھا اور جہاں منڈی نئے خریداروں کو کھینچنے کی فکر میں ہو، جیسا کہ صریحاً گجرات کا حال تھا تو جو قیمتیں متوقعہ بتائی جائیں وہ اکثر اصل نرخ سے کم ہوا کرتی ہیں۔ دوسرے، گجرات میں اُن دنوں روپے کا سخت توڑا پڑ گیا تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ تھوک والے ہمیشہ سے زیادہ اپنا مال نکال دینے کی فکر میں تھے۔ اس اطلاع سے چند روز پیشتر ہی کے خط میں فنچ نے ایک ممتاز تاجر کے یک بہ یک دوالیہ ہو جانے کا اور ایک دوسرے تاجر کی فراری کا قصہ لکھا ہے جو اس کاروبار کے بگڑ جانے سے متاثر ہونے والا تھا۔ غرض ان حالات میں جس نرخ کی اطلاع دی گئی ہے، اسے معمولی حالت کی صحیح مثال نہیں قرار دے سکتے گو یہ اُس پریشانی کے زمانے کا واقعی نرخ ہی کیوں نہ ہو۔

نقشے میں دوسری رقم سنہ ۱۶۱۲ کی بیع کا نرخ بتاتی ہے۔ جورڈین کا بیان ہے کہ بحر قلزم کی بعض معاملوں

کو درست رکھنے کی غرض سے یہ نرخ طے ہوا تھا اور اسے فصل کا عام نرخ سمجھا جائے تو خلاف احتیاط نہ ہوگا۔ آئندہ دو سال میں پرتگیز خریداروں کے نہ آنے سے، جن کی مغلوں سے لڑائی چھڑی ہوئی تھی، قیمتیں گری رہیں لیکن یہ خرابی جلد دور ہوگئی اور جب ولندیز گجرات پہنچے اور معلوم ہوا کہ شاید وہ بھی خریداری کرینگے تو قیمت زبانی گفتگو ہی میں ۵ـه تک چڑھ گئی جسے ہم نے نرخ کا اوسط قرار دیا ہے۔ سنہ ۱۶۱۹ میں انگریزوں نے جس قدر مال بذریعہ جہاز روانہ کیا، اس میں سے
۱۶۲۳ اکثر کی مالیت ۸ہ محمودی یا تقریباً ۵ـه فی من نکلتی ہے۔ احمد آباد سے جہاز تک لانے کا خرچ ایک روپیہ من کے قریب تھا پس ۵ـه اس سال کا نرخ خاصی طرح درست ہوگا[۱]۔ سنہ ۱۶۲۱ سے سنہ ۱۶۲۵ تک قیمتیں بہت گری ہوئی رہیں حتیٰ کہ ایک وقت میں مـه کا بھاؤ بھی سننے میں آتا ہے۔ اس کمی کا کوئی سبب مجھے کہیں تحریر کیا ہوا نہ ملا اور یہ کچھ قابل تعجب بھی نہیں کیونکہ خریدنے والے چڑھے ہوئے نرخ کی تو عام طور سے توجیہیں کیا کرتے ہیں باقی بھاؤ کے سستا ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں پوچھتا۔ ان دنوں پرتگیزوں کی خرید تو بہت کم ہوگئی تھی لیکن انگریزوں اور ولندیزوں کی مانگ مجموعی طور پر منڈی کو سہارا دینے کیلئے کافی ہونی چاہیے۔ بنظر بریں میرا قیاس یہ ہے کہ قیمت کی یہ کمی عارضی طور پر مال کے زیادہ مقدار میں تیار کر لینے کے باعث واقع ہوئی ہوگی کیونکہ کاشتکاروں کے پاس نئے خریداروں کی ضروریات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور ان کی خریداری کا زور شور دیکھ کر وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ہونگے۔ بہر حال جو کچھ سبب بھی ہو، سنہ ۱۶۲۸ تک پھر نرخ ۱۰ـه ہوگیا اور سنہ ۱۶۳۰ کے آغاز ہی میں ہم ۱۵ـه کا بھاؤ سنتے ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا کمی چند روزہ تھی۔ لیکن اس کے بعد ہی قحط پڑا اور منڈی مردہ ہو کے رہ گئی، سنہ ۱۶۳۰ کے اخیر میں ۵ـه کا نرخ اس بچے کھچے مال کا ہوگیا تھا جو دو کوڑے کی بھی گھٹیا تلچھٹ تھی ،، اور

۱؎ اور جنل کرس پونڈینس ۱۶۲۵ء کے ساتھ جو تفصیلی بیجک منسلک ہے اس میں احمد آباد سے سوالی تک ۲۰۰۷ من مال جہاز میں پہنچانے کا خرچ ۲۰۳۸ روپیہ لکھا ہے یہ سوالی سورت کے راستے کی بندرگاہ تھی۔

اور نئی فصل کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ پھر دوبارہ زراعت شروع ہوئی بھی تو پہلے غلے کی فکر ہوئی۔ اس زمانے میں نیل کی قیمتیں دعسہ تک چڑھی رہیں اور سنہ ۱۶۳۳ء کے اواخر میں اس اجارے کی بنا پر جس کا کسی گذشتہ فصل میں ذکر آچکا ہے اور بھی پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ ولندیزوں اور انگریزوں نے آپس میں مل کر طے کیا کہ عصہ تا لعسہ سے بڑھ کر دام نہ لگائیں گے بجالیکہ اجارہ دار لعسہ مانگتے تھے اور اُن کے اجارے کے باعث پیداوار میں جو کمی ہوئی وہ بھی ان کے حق میں مفید و سودمند تھی۔ شمال کے کسان "جو عام طور پر ارادے کے پکے اور سر پھرے ہوتے ہیں" انھوں نے تو کھڑی کھیتی اکھاڑ ڈالی اور گو گجرات میں اس قسم کی کارروائی کی کوئی شہادت نہیں پائی گئی تاہم یہ قیاس بالکل واجبی ہے کہ وہاں بھی نیل کی کاشت کم کردی گئی۔ اجارے کے دو سال بعد تک بھی نرخ دعسہ یا کچھ اوپر رہا لیکن اب زراعت بحال ہو رہی تھی اور سنہ ۱۶۳۹ و ۴۰ میں انگریزوں نے لعسہ کے بھاؤ سے خریداری کی۔ کمی کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رہا جس کا سبب یہ ہے کہ آمیزش کا بہت رواج ہوگیا تھا اور فرنگی تاجر اعلیٰ قسم کے سوا ادنیٰ درجے کا نیل خریدتے نہ تھے۔ مگر سنہ ۱۶۴۴ء میں نرخ پھر چڑھا ہوا نظر آتا ہے جس کا سبب فصل کی کمی اور مال کی عمدگی بتایا گیا ہے آیندہ دو سال میں بھی عسہ کا بھاؤ رہا۔ اس گرانی کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ سرکاری طور پر آمیزش کو روکنے کی تدبیریں عمل میں آئی تھیں۔ سنہ ۱۶۴۸ میں پھر آمیزش نے پریشان کیا اور انگریز گماشتوں نے بطور تجربہ خود نیل تیار کیا۔ باوجود اس کے نرخ میں کوئی معتد بہ کمی نہ کرا سکے۔ سنہ ۱۶۵۰ میں شمالی ہند اور گجرات دونوں جگہ فصل اچھی ہوئی لہذا قیمت پھر گرنے لگی اور آیندہ تین سال تک للعسہ سے کچھ زیادہ اوسط نہ رہا۔ سنہ ۱۶۵۵ کی اتنی ارزانی کا سبب بہت زیادہ ملاوٹ کو بتایا گیا ہے اور سنہ ۱۶۶۰ء تک کی اطلاعات عسہ کے آس پاس نرخ ظاہر کرتی ہیں لیکن سنہ ۱۶۶۳ کی ایک ولندیزی اطلاع میں تحریر ہے کہ اُن دنوں للعسہ کے بھاؤ کو بہ نسبت سابق گراں تر سمجھا گیا۔

۱۶۴۴

آخر میں یہ بھی لکھ دینا چاہئے کہ ٹیورنیر جس کا مشاہدہ ہمارے عہد کے

آخری بیس سال پر محیط ہے، عام نرخ کو ۱۵ء تا ۲۰ء بیان کرتا ہے اور ہم نے جو ابتدائی اوسط قیاس کی ہے، یہ اس سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ غرض اس پورے عہد کو پیش نظر رکھا جائے تو ہیں نرخ میں کسی خاص اضافے کی شہادت نہیں پیش کر سکتا۔ رہا کمی بیشی کا ہوتے رہنا تو اس کا سبب محض مانگ اور فراہمی کی وقتی کمی بیشی کو قرار دے سکتے ہیں اور یہ اتفاقی صورتیں اسی قدر جلد رفع دفع ہو جاتی تھیں جس قدر جلد کہ ہم انصافاً توقع رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ خیال بھی کریں کہ شروع میں انگریز خریداروں کو فریب دیا گیا تو بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے عہد کے آخری عشرہ میں ۱۶۱۳ء کے نرخ کے مقابلہ میں کوئی معتد بہ اضافہ ہو گیا تھا۔

۴- درآمد کی منڈیاں

دوسری قابل ذکر جنس پارہ ہے۔ اس دھات کی مانگ محدود مگر موکد
رہتی تھی اور میرے نزدیک اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس سے شنگرف بناتے
تھے اور چونکہ پارہ ہندوستان میں نہیں ہوتا تھا[1] لہذا تجارت درآمد کی کیفیت
دکھانے کے لئے اس کی مثال بہت اچھی ہوگی گجرات کی منڈی میں اس کی
نکاسی کا اندازہ پندرہ سے بیس ہزار پونڈ سالانہ تک کیا جاتا تھا۔ اور معلوم ہوتا ۱۶۵
ہے کہ یہی مقدار خاصی طرح قائم رہتی تھی اس کی فراہمی میں کمی ہوتی تو نرخ بہت جلد
چڑھ جاتا تھا بلکہ تھوڑی سی بیشی کے ساتھ ہی منڈی گرنے لگتی تھی۔ یہ مال یورپ
اور چین دونوں جگہ سے ہندوستان آتا تھا اور یورپ سے خواہ بحر قلزم کے راستے
لاتے خواہ راس امید کے راستے۔ اور چونکہ تھوڑی سی چیز ہوتی تھی لہذا اسے

---

[1] لیٹرز ریسیوڈ۔ سوم، ۶۳ میں ایک پارے کی کان کا آگرے کے قریب ہونا مذکور ہے مگر کسی اور جگہ اس کا کوئی تذکرہ دیکھنے میں نہیں آتا لہذا میں سمجھتا ہوں یہ خریدنے والوں کی جھوٹ اڑائی ہوئی خبر تھی تاکہ نرخ کم ہو جائے۔

باب پنجم

چرا چھپا کے لے آنے میں بھی کچھ دشواری نہ تھی۔ ان سب اسباب نے مل کر اس تجارت کو بالکل تقدیر کا کھیل بنا دیا تھا اور نرخ میں بے حد کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ فروخت کا پیمانہ گجراتی من تھا اور سنہ ۱۶۳۶ کے بعد سے میں نے نرخ نقل کرتے وقت یہاں بھی دس فیصدی کم کر دیئے ہیں تاکہ جملہ اعداد میں وہی ۳۳ پونڈ کا من محسوب کیا جائے۔ گجرات کی مختلف منڈیوں میں روپے اور محمودی دونوں سکے مذکور ہیں مگر میں انھیں ایک ہی سکے میں بیان کرونگا اور سورت و احمد آباد کے درمیان باربرداری کا خرچ (جو عہ فی من کے قریب ہوتا تھا) چھوڑ دونگا۔

سنہ ۱۶۰۹ میں فنچ نے اس کی قیمت للعہ ۲۴ تا لـ ۸۰ روپیہ پائی لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ تجارت میں ہل چل کا وقت تھا جس میں خرید غالباً زر کی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ سنہ ۱۶۱۲ و ۱۶۱۳ میں نرخ ماعہ سے ماسہ تک تھا اگرچہ سنہ ۱۶۱۴ میں تازہ مال آتے ہی ماء ہو گیا اور سنہ ۱۶۱۵ و ۱۶۱۶ میں لـ رہا کہ آگرے کے قریب کان نکلنے کی بے بنیاد خبر کے باعث خریدار ہی نہ آئے۔ سنہ ۱۶۱۹ سے آگے پھر قیمت گری اور ان چند سال میں منڈی کا عام رجحان سہ یا لعہ رہا۔ اس کمی کی وجہ غالباً ولندیزوں کا سورت میں قدم جمانا اور انگریزوں کے مقابلے میں پارہ فروخت کرنا تھا۔ سنہ ۱۶۲۵-۲۶ میں یکایک نرخ چڑھ گیا کیونکہ اس سال ولندیز کچھ نہ لائے اور پرتگیز بہت کم مال لائے بحر قلزم کی طرف کی درآمد بھی قلیل رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ قیمت ماء بلکہ بعض اوقات تھوڑی مقدار کی ماعہ تک بڑھ گئی۔ اس کے بعد کا قابل ذکر فرق سنہ ۱۶۳۰ میں ہوا جب کہ ولندیز اور انگریز سوداگر منفرداً ضرورت سے زیادہ مال بھر لائے اور وہ بھی عین قحط کے آغاز میں جس سے منڈی درہم برہم ہوگئی اور نرخ صہ سے بھی نیچے گر گیا۔ انفرادی تجارت نے نرخ کی اس کمی کو قائم رکھا۔ سنہ ۱۶۳۳ میں شرح سہ آئندہ سال للعہ رہی اور سنہ ۱۶۳۶ میں تو ولندیزوں نے کچھ پارہ صہ کے بھاؤ فروخت کیا۔ آئندہ نو سال کے نرخ مجھے کہیں نہیں ملے لیکن سنہ ۱۶۴۵ میں پھر اس کا بھاؤ صہ تا مہ مذکور ہے اور سنہ ۱۶۴۹ میں ماعہ سے بھی اوپر چڑھ گیا ہے۔ اس گرانی کا ایک سبب چینی مال کا نہ پہنچنا ۱۶۶

معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ۱۶۵۲ میں انگریز گماشتے تحریر کرتے ہیں کہ اگر چین سے درآمد پھر شروع ہو گئی تو عجب نہیں کہ نرخ دوبارہ ۵ ہو جائے۔ بہر حال، ولندیز، انگریز اور پرتگیز تینوں اس زمانے میں مال لانے لگے اور ضرور نرخ گر گیا ہوگا کہ سنہ ۱۶۵۴ میں ۵ کی نسبت مرقوم ہے کہ پہلی قیمت کی نسبت اچھی ترقی ہوئی۔ سنہ ۱۶۵۹ میں پھر نرخ ماء نظر آتا ہے اور سنہ ۱۶۶۱ میں ولندیز للعہ کے حساب سے سودا کرتے ہیں۔ ایسی تجارت کے متعلق عام نتیجہ نکالنا صریحاً احتیاط کے خلاف ہوگا لیکن میری دانست میں یہ کہنا قرین صواب ہے کہ فرنگیوں کی نئی تجارت سے پارے کی معمولی قیمت میں جسے میں لعہ تا ماء قرار دیتا ہوں کوئی خاص کمی یا بیشی واقع نہیں ہوئی اگرچہ تجارتی مقابلے کی شدت نے بعض اوقات ہندوستان کے خریداروں کو عارضی نفع پہنچایا ہوگا۔

پارے کے مقابلے میں سورت کی سیسے کی تجارت مختلف نظر آتی ہے یہ شے بھی زیادہ تر باہر سے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ ہی سے آتی تھی[1]۔ انگریزوں اور ولندیزوں میں مقابلہ بھی رہتا تھا لیکن تجارت آزادانہ تھی کیونکہ اکثر مقامی حاکم شہر میں جتنا سیسہ آتا اسے خرید لینے کا حق جتاتا تھا اور اگر نکاسی کی دوسری صورتیں موجود نہ ہوتیں تو پھر نرخ کا مدار اسی کی رائے پر ہوا کرتا لیکن دوسری صورتیں بھی تھیں۔ چنانچہ احمد آباد میں اس تجارت میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور ساحلی کشتیوں کے ناخدا بھرت کے طور پر سیسہ لے جانے پر بھی خوشی سے آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہم سورت سے اس کا جا کے گوآ، لاہری بندر، راجپور بلکہ خلیج فارس اور بحر قلزم تک میں فروخت ہونا سنتے ہیں۔ ان وجوہ سے صورت یہ ہو گئی تھی کہ درآمدہ سیسہ معمولاً والیِ سورت کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا مگر سوائے اس کے کہ جبراً لے لے، وہ اس قیمت سے کم پر سودا نہیں کر سکتا تھا جو تمام ساحل

---

[1] رسائل تبادیہ میں کہیں کہیں سیام سے بھی سیسہ آنے کا ذکر ملتا ہے اور اس میں سے ممکن ہے کچھ تعداد سورت بھی پہنچتی ہو گو اس کی کوئی تحریری شہادت میری نظر سے نہیں گزری۔

پر مروج ہوتی تھی گو اس کے معاملے میں جھگڑے سے بچنے کے لئے تھوڑی بہت رعایت کردی جاتی تھی۔

ہمارے عہد کے شروع میں گجرات کے من کا نرخ سات اور آٹھ محمودی کے درمیان رہتا تھا[1] اور سنہ ۱۶۳۰ء تک اس میں کسی خاص تغیر کے آثار نہیں پائے ۱۶۷ جاتے۔ سنہ ۱۶۳۴ء میں ہم پڑھتے ہیں کہ انگریزی کمپنی کا سیسہ کرور گیری کے مال خانے میں دو برس تک پڑا رہا کیونکہ والیِ شہر اسے ۵½ محمودی کے حساب سے خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۶۳۸ء میں قیمت بڑھ کر ۷½ اور سنہ ۱۶۴۲ء میں ۸ محمودی ہوگئی۔ مگر اس نرخ میں دس فیصدی کی کمی کردینی چاہئے کہ اسی زمانے میں من کا وزن بڑھ گیا تھا۔ آئندہ دو سال کے منقولہ نرخ میں بھی اسی کمی کی ضرورت ہے۔ ایسی قلیل رقوم میں کسرات دکھانے سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے کہ قیمت بالکل صحیح درج کی گئی ہے لہذا میں نے اتنے خفیف فرق کو نظر انداز کردینا جائز رکھا۔ سنہ ۱۶۴۶ء میں فرنگی سوداگروں کو ۱۰ محمودی کی قیمت مل جانے کی امید تھی۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں فی الواقع یہ نرخ ہوگیا لیکن سنہ ۱۶۵۲ء میں والی کی طرف سے ۸ محمودی لگائے گئے اور سنہ ۱۶۵۹ء میں ادا کردہ قیمت ۹¼ محمودی تحریر ہے۔ اب اگر اتفاقی اور جبری فروخت کو چھوڑ دیجیے اور اس بات کو پیش نظر رکھیے کہ سنہ ۱۶۳۶ء سے منقولہ رقوم سے دس فیصدی کی کمی ہونی چاہیے تو معلوم ہوگا کہ اس پچاس برس کے زمانے میں نرخ ۷ تا ۹ محمودی فی من رہا اور اس میں کسی خاص کمی یا بیشی کا قرینہ نہیں پایا جاتا۔ تمام حالات کو سامنے

---

[1] میں نے یہ قیمتیں بجنسہ محمودی (سکے) میں نقل کردی ہیں کیونکہ وہ اتنی کم ہیں کہ انھیں روپے میں لکھا جائے تو بہت سی چھوٹی چھوٹی کسرات کا حساب کرنا پڑے گا۔ خود محمودی کی قیمت ۲/۵ روپیہ کے قریب تھی اور آیندہ چل کے ۴/۹ تک بڑھ گئی تھی۔

رکھکر یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر بیسے کا ہر جگہ یہی نرخ تھا ورنہ والی سورت کو قیمت بڑھانی پڑتی یا یہ دھات سورت کی بجائے دوسرے مقامات پر پہنچنے لگتی؛

درآمد کی منڈی کی کیفیت دیکھنے کے لئے تیسری مثال لونگ کی تجارت کی پیش کی جاسکتی ہے۔ اس جنس کا انگریزی تحریروں میں تو نسبتہً کم ذکر آتا ہے لیکن ولندیزوں کے ہاں یہ جا بجا مذکور ہے۔ یہ تجارت مختلف مراحل سے گذری۔ سولھویں صدی میں پرتگیزوں نے اسے بخیال خود بادشاہ پرتگال کے اجارے میں داخل کر رکھا تھا مگر خانگی طور پر برابر خرید فروخت جاری تھی اور جزائر ملکا میں پرتگیزوں کا پورا تسلط جم جانے کے بعد بھی مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس جنس کے سوداگروں میں خاصی طرح مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ سولھویں صدی کے اخیر میں جب مصالحوں کے جزائر کی سیاسی حالت میں روزافزوں ابتری ہوئی، تو مکاسر کی منڈی کو فروغ حاصل ہوگیا۔ لیکن آئندہ پچاس برس میں ہم ولندیزوں کو رفتہ رفتہ لونگ کے ذرائع پیداوار پر قابض ہوتا دیکھتے ہیں اور ان کی کوشش عرصہ دراز تک یہ رہتی ہے کہ اس جنس کو تھوڑی بہت مقدار میں بھی مکاسر نہ جانے دیں۔ آخر صدی کے چھٹے عشرہ میں ان کی اجارہ داری مکمل ہوکر پوری طرح عملی صورت اختیار کرلیتی ہے؛

سنہ ۱۵۹۵ء کے قریب مغلیہ پائے تخت میں لونگ کا جو بھاؤ ابوالفضل نے تحریر کیا ہے اس میں سے باربرداری کا خرچ نکال کے دیکھئے تو وہ صورت میں ـــہ فی گجراتی من (= ۱۶ سیر) نکلتا ہے[1]۔ لیکن سترھویں صدی کے شروع ہی میں ۱۶۸

---

[1] ابوالفضل کی تحریر میں ۶۰ دام فی سیر یا ـــہ فی اکبری من درج ہے اور سنہ ۱۶۲۶ء میں پلسارٹ (ورق، ۸) بیان کرتا ہے کہ دیرینہ سال تاجروں نے مجھ سے کہا کہ آگرے میں ـــ۶ تا ـــ۵ نرخ رہا کرتا تھا۔ جس سے ابوالفضل کے قول کی تصدیق نکلتی ہے؛

ہم اس کو بہت چڑھا ہوا پاتے ہیں جس کی کوئی وجہ مجھے نہیں ملی البتہ قیاسی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کچھ تو مصالحوں کے جزائر میں ہل چل اور کچھ یورپ کو زیادہ مال جانے کے باعث یہ گرانی ہو گئی ہو گی۔ بہرحال سورت کا نرخ ۱۶۱۷ء میں للعہ ۶۴ ۱۶۲۱ء میں عہ ۵ اور ۲۲ء میں للعہ ۸۴ تحریر ہے۔ اس کے بعد کے گیارہ برس کی کوئی تحریری شہادت میسر نہیں آتی لیکن جب پھر یہ سلسلہ ملتا ہے تو اس وقت بھی نرخ چڑھا ہوا پایا جاتا ہے چنانچہ ۱۶۳۳ء میں عہ ۳۴ء میں عہ اور ۱۶۳۶ء کے آغاز میں عہ ۶۷ ہے۔ اس آخری رقم اور آگے کی سب رقوم کو ہم نے دس فیصدی گھٹا کے لکھا ہے تاکہ من کے اضافے کی کسر پوری ہو جائے ۱۶۳۶ء کے اواخر ہی میں نرخ یک بہ یک گر کے للعہ کے قریب رہ گیا اور ۱۶۴۱ء و ۴۵ء کے درمیان عہ ۲۷ تا عہ ۳۵ کے اندر الٹتا بدلتا رہا۔ ۱۶۴۸ء میں خریداروں کو گراں معلوم ہونے لگا کیونکہ ایک جتھے نے تمام درآمدہ مال للعہ کے بھاؤ خرید کر کے اسے عہ تا عہ میں فروخت کیا۔ اگلے سال بھی قیمت زیادہ تر ۸ رہی۔ اس جگہ سے پھر سلسلہ منقطع ہو گیا ہے لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ بالآخر ایمسٹرڈم کے کارفرما اس تجارت پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ وہ تمام دنیا کے مصالحوں کو یکساں قیمت پر لا سکے اور ۱۶۵۰ء میں ہندوستان کے لئے بھی قیمتیں معین کر دیں جن میں لونگ کی کم سے کم قیمت عہ ۸۶۷ فی من (۱۶ سیر) نکلتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ طلب و بہم رسانی کے پلڑے برابر نہ تھے اور ۱۶۶۱ء ہی میں قریب قریب عہ تک کے بھاؤ لونگ فروخت ہوئی[1]۔ غرض یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۶۱۵ء تا ۱۶۳۳ء اور پھر ۱۶۴۸ء کے بعد کے سنوں میں مقابلے کی وجہ سے جو نرخ رہا وہ قائم نہ رہ سکا۔ یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ سورت کی منڈی میں کبھی کبھی خریداروں کو ۱۶ سیر فی من بطور زائد دیا جاتا تھا

---

[1] ربالیہ (جلد سوم۔ عنوان: مصالحے) کے ایک داخلہ سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۶۵۳ء تک ضرور قیمتوں کا تعین ہو چکا تھا لیکن واقعی تاریخ کا تحریری ذکر مجھے کہیں نہیں ملا۔

اور ولندیزوں کے تحریری حسابات نقل کرتے وقت جہاں کہیں اس رعایت کا صریحی ذکر ہے تو میں نے اس کا حساب بھی لگا لیا ہے لیکن جہاں انگریزی ذرائع سے نرخ نقل کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ ان میں یہ بات تحریر نہ کی گئی ہو اور اس لئے ان میں دس فی صدی کی کمی ضروری ہو مگر یہ غلطی ہو بھی تو نرخ میں جو تغیرات ہو رہے تھے، ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے۔

مشرقی ساحل پر لونگ کی تجارت میں چند خاص دلچسپیاں اور پیدا ہو گئی تھیں کیونکہ یہاں ولندیزوں کو اہل ڈین مارک سے سخت مقابلہ پیش آیا، جو اس جنس کو مکاسر سے ہم پہنچا لیتے تھے۔ مچھلی پٹم کے نرخ پگوڈا اور وہیں کے مقامی من کے حساب سے دئے گئے ہیں جو تقریباً ۲۱½ سیر کا ہوتا تھا۔ پگوڈا کو میں نے روپے میں اس لئے تبدیل نہیں کیا کہ صحت کے ساتھ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ہر سال چاندی کے سکے میں اس کی قیمت کیا رہتی تھی۔ باایں ہمہ یہ کہنا جائز ہو گا کہ جس اکبری عہد کی قیمتوں سے ہم نے آغاز کیا ہے، اس کے حساب سے سترھویں صدی کے شروع میں مچھلی پٹم میں لونگ کا نرخ سات پگوڈا فی مقامی من کے قریب ہو گا۔ اسی زمانے میں سورت کی طرح یہاں بھی ہم نرخ کو گراں ہوتے دیکھتے ہیں۔ ۱۶۱۶ء تک عام قیمت ۸½ تا ۱۰ پگوڈا فی من بتائی جاتی ہے[۱] اور ۱۶۱۸ء میں جب ۱۴ کا بھاؤ ہوا تو اسے "بالکل غیر معمولی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن ۱۶۲۲ء میں بھی نرخ ۱۳ پگوڈا رہا اور ۱۶۳۱ء میں اور بھی گراں، یعنی ۲۰ پگوڈا فی من مرقوم ہے۔ یہ وہ موقع ہے جہاں سے ڈین مارک والے پوری مستعدی کے ساتھ مقابلے میں اترتے ہیں اور اسی کے ساتھ نرخ ۱۶۳۲ء میں ۸ پگوڈا رہ جاتا ہے۔ ۱۶۳۸ء میں وہ اور بھی کم یعنی ۶ پگوڈا اور ۱۶۳۹ء میں صرف ۵ یا ۴½ ہو گیا اور انگریز گماشتوں نے یہ رائے قائم کی کہ اس کمی کا مطلب یہ ہے "ڈین مارک والوں کا بالکل ستیاناس کر دیا جائے"۔ آئندہ پانچ سال تک

---

[۱] یہ نرخ شورر (ورق ۱) سے منقول ہے اور گو اس کی کوئی تاریخ لکھی ہوئی نہیں تاہم یہ اطلاع ۱۶۱۶ء میں ہالینڈ پہنچی تھی لہذا یہ لازماً ۱۶۱۴ء یا ۱۶۱۵ء کا نرخ ہو گا۔

نرخ کم و بیش ۵ پگوڈا رہا۔ اس کے بعد کی تحریری شہادت غائب ہے لیکن پھر جب ہم اس تجارت کا ذکر پڑھتے ہیں تو ولندیزوں کے بلا شرکت قبضے میں کوئی کسر نہیں نظر آتی۔ اور ایمسٹرڈم کی تعین کردہ قیمت ۱۳، ۱۴ پگوڈا من نکلتی ہے اسطرح گو اول اول خریداروں کو فرنگیوں کے باہمی مقابلے کی وجہ سے خوب فائدہ رہا لیکن بعد میں انھیں تاوان، اور تاوان بھی بہت بھاری بھرنا پڑا کیونکہ ولندیزوں نے اتنی محنت اٹھا کے جو اجارہ حاصل کیا تھا، وہ نصف صدی سے بھی کچھ زیادہ زمانے تک جاری رہا؛

جوز اور جوتری کی تجارت کا بھی قریب قریب یہی رنگ رہا کہ آخر میں
۱۷۰ خریداروں کو گراں تر قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ لیکن ان اجاروں کی اجناس کے
علاوہ اور کسی درآمدہ مال کی عام قیمتوں میں مجھے کسی بیشی کا ثبوت نہیں ملتا اور
ٹین ہاتھی دانت اور مونگے کے متعلق جو اعداد موجود ہیں، ان سے مترشح
ہوتا ہے کہ اگر میلان تھا تو کچھ کمی ہی کی جانب تھا نہ کہ گرانی کی جانب؛

۵۔ اجناس خوردنی اور چاندی

اعتراض ہوسکتا ہے کہ سیسہ، پارہ، مصالحے وغیرہ ایسی اجناس تھیں کہ مجموعی طور پر ہندوستان کی عام آبادی کو ان سے کوئی تعلق نہ ہوسکتا تھا۔ یہ اعتراض بجا ہے اور حق یہ ہے کہ تمام اشیائے درآمد کی نسبت یہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی بڑے پیمانے پر عامۃ الناس کے کام آنے والی چیز نہ تھی۔ نیل کی منڈی زیادہ وقعت رکھتی تھی۔ سبب یہ کہ گو اسے نسبتۃً تھوڑی جماعت کاشت کرتی تھی لیکن اس کا مقابلہ اجناس خوردنی سے آپڑتا تھا لہذا اس کے نرخ سے زراعت کی عام حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایسا اندازہ لگانے میں ہمیں سب سے زیادہ احتیاج اس بات کی ہے کہ اجناس خوردنی، روغنی تخم اور روئی جیسی خام اشیا کے نرخ معلوم ہوجائیں کیونکہ پیش نظر عہد میں ملک کی آمدنی کے اصلی وسائل یہی اشیا تھیں۔ افسوس ہے کہ ان مسائل

کا جو مواد ملتا ہے وہ بہت کم ہے۔ روغنی تخم کے نرخ کا تو مجھے کہیں پتہ ہی نہیں چلا رہی روئی تو جو اعداد ملتے ہیں وہ اتنے تھوڑے ہیں کہ کوئی باقاعدہ نرخ نامہ مرتب کرنا ممکن نہیں بحالیکہ اجناس خوردنی کے معاملے میں بھی ہمارے ماخذ تعداد میں بہت ہی حوصلہ شکن نظر آتے ہیں۔ اصل میں انگریز تاجر تو معمولاً غلّے کی تجارت سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ ولندیزوں کو اس سے تعلق تھا مگر ان کی تحریروں میں ادا کردہ قیمت یا مرسلہ اشیا کی مالیت مرقوم نہیں ہے، گودام اور جہاز کے مصارف کا جہاں تک مجھے علم ہے، باقاعدہ حساب نہیں رکھا گیا۔ غرض بہت جزوی معلومات بہم پہنچتی ہے لیکن جو امور معرض تحریر میں آگئے ہیں وہ ایک دوسرے سے ایسا ربط رکھتے ہیں کہ ان سے، کام لینے کے لائق نتائج اخذ کر لینے ممکن ہیں؛

شمالی ہند میں غلّے کے معمولاً جو نرخ رہتے تھے انھیں ہمارے واسطے ابو الفضل قلم بند کر گیا ہے۔ اور ہمارا یہ نتیجہ نکالنا خاصی طرح قرین صواب ہے کہ اول تو مختلف غلّوں کی باہمی قیمت میں جو نسبت آج کل (یعنی سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۲ء) میں ہے قریب قریب وہی اس زمانے میں تھی۔ اور دوسرے یہ کہ ان دونوں زمانوں کے ۱۷۱ نرخ اجناس میں سات گُنے کا فرق پڑ گیا ہے۔ سنہ ۱۶۰۰ اور سنہ ۱۶۶۰ کے درمیان کے زمانے کے، شمالی ہندوستان کے متعلق اعداد مجھے نہیں ملے لیکن گجرات کی منڈی کے حسب ذیل حالات تحریری موجود ہیں: سنہ ۱۶۰۹ء میں فنچ لکھتا ہے کہ بہترین قسم کا چاول سورت میں یک ریال فی قنطار کے نرخ سے مل سکتا ہے۔ جو تقریباً ۵۶ پونڈ (= ۳۲ سیر) فی روپیہ کے مساوی ہوا۔ اور اس سے یہ اندازہ کرنا خلاف احتیاط نہیں ہو سکتا کہ معمولی قسم کا چاول کہیں زیادہ ارزاں ہوگا۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں ایک انگریزی جہاز کے واسطے چاول ۳۲ سیر، گیہوں ۲۶ سیر اور دال مونگ کوئی ۳۵ سیر فی روپیہ کے حساب سے خریدے گئے۔ اور غالباً یہ قیمتیں عام نرخ سے زیادہ تھیں کیونکہ خریدنے والے جہاز کے لئے اشیائے خوردنی بہم

---

[1] حسابات آگرہ جن کا دوسری جگہ حوالہ دیا گیا ہے، صرف دو سال کے حساب ہیں اور ان میں سے بھی ایک سال کے نرخ بالکل معمول کے خلاف تھے؛

پہنچانے کی جلدی میں تھے اور ملک سے انھیں ہنوز بہت کم واقفیت تھی۔ دوسری خرید اکتوبر میں ہوی جب کہ گیہوں کا نرخ سب سے زیادہ چڑھا ہوا ہوتا ہے؛ ۱۶۱۹ء میں بنتم کو گیہوں کا ایک چالان روانہ کیا گیا جس کی قیمت جہاز پر پہنچ کہ ۸۰ ¼ پونڈ (= ۴۰ سیر) فی روپیہ نکلتی ہے جسے منڈی میں ۸۰ پونڈ (یا من بھر سے کچھ ہی کم) سمجھنا چاہیئے۔ ۱۶۲۳ء میں جہازوں کے لئے روٹی پکوانے کی غرض سے گیہوں خرید اگیا۔ اصل عبارت میں خوراک کا حساب تحریر ہے اس کی اصل وزن سے جو نسبت رہتی ہے، اسے پیش نظر رکھئے تو ایک من سے کچھ زیادہ (یا ۸۵ پونڈ) فی روپیہ کا نرخ برآمد ہوتا ہے۔ ولندیزی گماشتے فان ٹوسٹ کا بیان ہے کہ ۱۶۳۰ء کے قحط سے پہلے ۱۰ ⅔ اسٹوبر کا ۳۳ ¼ پونڈ ولندیزی گیہوں آتا تھا جو قریب قریب روپیہ من ہی کے برابر ہوتا ہے[1]۔ ان سب صورتوں کی نسبت یہ شکایت بھی نہیں ہے کہ نرخ معمول کے خلاف تھا اور نہ مجھے ان اوقات میں کسی قحط سالی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ خود فان ٹوسٹ کے حالات اور اس کی اپنی تحریروں سے ثابت ہے کہ وہ گجرات سے بہت تفصیلی واقفیت رکھتا تھا لہذا میں سمجھتا ہوں کہ جملہ قرائن سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ سترھویں صدی کے پہلے ربع میں گیہوں کی عام یا معمول کے مطابق قیمت ۸۰ یا ۸۵ پونڈ فی روپیہ رہتی تھی۔ چاول کی عام قیمت کا بجز اس قول کے کہ وہ بڑوچ میں ۶۵ پونڈ فی روپیہ بکتا تھا، کچھ زیادہ پتہ نہیں چل سکا۔ ۱۶۱۱ء کی محولہ بالا خریداری میں وہ گیہوں ۱۷۲ سے کسی قدر سستا تھا اور مقامات بہم رسانی کو پیش نظر رکھئے تو اس تناسب کا اندازہ کر لینے میں سہولت ہوگی، لیکن چاول کی مختلف قسموں کے نرخ میں اسقدر فرق تھا اور اب بھی ہے، کہ ان اعداد کی بنا پر کوئی قطعی نتیجہ نکالنا یقیناً مخدوش ہوگا۔

---

[1] گجرات رپورٹ مرقومہ ۱۶۲۹ء میں بڑوچ کے جو نرخ دئے گئے ہیں ان سے گیہوں ۷۵ ½ پونڈ فی روپیہ نکلتا ہے۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ ٹوسٹ کی تحریر کے وقت یہ رپورٹ اس کے سامنے تھی، اور گو یہ ممکن ہے کہ اس نے سارے گجرات کیلئے جان کر ذرا زیادہ اوسط تحریر کیا ہو تاہم یہ فرق کچھ اہم نہیں ہو سکتا۔

قحط کے زمانے میں بے حد گرانی ہوگئی تھی۔ نومبر ۱۶۳۰؁ء میں انگریز گماشتوں نے تقریباً ۶½ سیر روپیہ کے بھاؤ سے گیہوں خریدا اور ایک مہینے بعد انھیں معلوم ہوا کہ "پہلی قیمت سے سات گنی قیمت بھی ادا کریں"، تو بھی غلہ میسر نہیں آسکتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلا نرخ ۸۵،۸۰ پونڈ فی روپیہ تھا تو اب ۱۲ پونڈ یا اس سے بھی گراں تر ہوگیا۔ ۱۶۳۱؁ء میں اور بھی آفتوں کا سامنا رہا اور ستمبر میں ہم ۲½ سیر محمودی کا نرخ پڑھتے ہیں جو تقریباً ۳ سیر فی روپیہ کے برابر ہے۔ اسی سرما میں کچھ غلہ آگیا اور جنوری میں ۶ سیر کا بھاؤ ہوگیا لیکن اس کے ختم ہوتے ہی پھر گرانی ہوگئی۔ اس کے بعد کا نرخ ۱۶۳۵؁ء کا ملتا ہے جب کہ گوآ بھیجنے کے واسطے ۳۳ پونڈ فی روپیہ کے حساب سے گیہوں خریدا گیا مگر معلوم ہوتا ہے یہی قحط سالی کا آخری وقت تھا۔ نرخ عام طور پر اتر رہے تھے۔ بروقت بارش سے ہر قسم کا غلہ کثرت سے پیدا ہوا تھا حتی کہ ۱۶۳۶؁ء میں اتنی ارزانی ہوئی کہ قحط سے پہلے بھی اتنی نہ تھی۔ ہم ایک گذشتہ فصل میں پڑھ چکے ہیں کہ نیل کا نرخ ۱۶۳۸؁ء تک چڑھا ہوا رہا اور ۱۶۳۹؁ء و ۱۶۴۰؁ء میں کم ہو کے معمول کے مطابق ہوا۔ اس سے بھی بظاہر تصدیق ہوتی ہے کہ نیل سے پہلے لازماً غلے کا نرخ معمول کے مطابق ہوگیا ہوگا اور نیل کی کاشت کے بحال ہونے میں قدرتاً ایک دو سال کی تاخیر ہوئی ہوگی۔

الغرض یہ قیاس کرنے کی قطعی وجوہ موجود ہیں کہ گجرات میں سترھویں صدی کے پہلے ربع میں گیہوں کا نرخ ۸۵،۸۰ پونڈ فی روپیہ کے قریب رہتا تھا اور ۱۶۳۰؁ء کے قحط سے بھی اس میں مستقلاً کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ کم سے کم ۱۶۴۰؁ء تک یہی نرخ رہا۔ اس کے بعد سے اگلے بیس برس تک کا مواد نہیں ملتا اور کسی گرانی کی فصل کے سوائے مجھے کوئی یقینی شہادت اس بات کی میسر نہیں آئی کہ گجرات میں ۱۶۴۰؁ء سے ۱۶۶۰؁ء تک گیہوں کا کیا نرخ تھا۔ لیکن مواد کا موجود نہ ہونا بھی خاص معنی رکھتا ہے۔ دراصل انگریز گماشتوں کے لئے یہ زمانہ وہ تھا کہ تا امکان تخفیف مصارف کی کوشش ہو رہی تھی اور اگر نرخ اجناس میں گرانی کے باعث ان کے خانگی اخراجات اور مزدوری وغیرہ میں اضافہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ان کی

تحریروں میں لازمی طور پر اس کا ذکر آتا۔ اور اس بارے میں کسی شکایت کا پیدا نہ ہونا دلیل ہے کہ اس قسم کے اسباب ہی پیدا نہیں ہوئے اور نرخ انھی حدود کے اندر رہا، جنھیں انگریز گماشتے معمول کے مطابق سمجھتے تھے۱؎

نرخ کا براہ راست حساب نہ ہونے کی صورت میں ہم اس کا کچھ اندازہ ملازمین کی اُجرت سے جو سورت میں ادا کی جاتی تھی، کر سکتے ہیں سنہ ۱۶۳۶ء کے ایک خط میں تحریر ہے کہ چپراسیوں کو سابق میں ۵ تا ۷ محمودی ماہانہ تنخواہ دیجاتی تھی سنہ ۱۶۳۴ء میں بقدر ۳ محمودی اضافہ کیا گیا تھا اور پھر جو چند سال بعد کوشش کی گئی کہ حسب سابق ۵ تا ۷ محمودی ہی تنخواہ کر دی جائے تو چپراسیوں نے اس عذر پر کہ گو اجناس خوردنی کی قیمت گھٹ گئی ہے لیکن کپڑا اسی طرح مہنگا ہے نہیں مانا چنانچہ سنہ ۱۶۴۳ء میں انھیں ۸ تا ۱۰ محمودی ملتی تھی اور اپنے پیش نظر عہد کے باقی سنین میں اس کا کوئی ذکر نہ آنے سے میں خیال کرتا ہوں کہ آئندہ اس شرح میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا حتی کہ اووِنگٹن جو سنہ ۱۶۹۰ء میں سورت پہنچا چپراسیوں کی تنخواہ ۴ روپیہ ماہانہ ہی بتاتا ہے اور ہمارے عہد کے آخر میں جو شرح مبادلہ تھی اس کے حساب سے یہ ۹ محمودی کے برابر ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نصف صدی تک شرح اُجرت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور خود یہی واقعہ اس امر کی دلیل ہے کہ اجناس میں ایسی کوئی گرانی نہیں پیدا ہوئی جس سے اُجرت کی شرح میں کوئی بیشی ضروری ہوتی۔ پس یہ کہنا درست ہوگا کہ جس طرح سنہ ۱۶۱۰ء سے ۱۶۴۰ء تک نرخ معمول کے مطابق رہا اسی طرح آئندہ بیس برس میں بھی اس میں کسی تغیر کی شہادت نہیں ملتی بلکہ جو کچھ قرائن موجود ہیں وہ دلالت کرتے ہیں کہ عام طور پر نرخ وہی رہا جو پہلے تھا۔ شمالی ہندوستان میں گیہوں کا ۱۸۵ پونڈ فی روپیہ ہونا اور اسکے چند سال بعد ہی گجرات میں صرف ۸۵ پونڈ کا نرخ ہونا پڑھ کر کچھ حیرت کرنی نہ چاہیے حمل و نقل کے جو مصارف تحریر ہیں انکے حساب سے آگرے سے گیہوں کے گجرات لانے میں تقریباً ۳ روپیہ من باربرداری کا خرچ پڑتا تھا اور ظاہر ہے کہ صرف چند روپے تک فائدے کی خاطر یہ زحمت کوئی گوارا ابھی نہ کر سکتا تھا

۱؎ سنہ ۱۶۵۸ء اور پھر سنہ ۱۶۵۹ء میں اتنا ضرور لکھا ہوا ملتا ہے کہ خشک سالی سے گرانی ہو گئی لیکن کسی ایسے فرق کی شہادت موجود نہیں ہے جس سے عام شرح بدل گئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ گجرات اور شمالی ہندوستان کی منڈیاں بالکل ایک دوسرے سے الگ تھیں اور جب تک مذکورہ بالا نرخوں میں بہت ہی زیادہ گرانی نہ ہو جاتی، اس وقت تک دُور کے مقامات سے غلے کی بہم رسانی کی کوئی صورت نہ تھی۔ بحری حمل و نقل میں بے شک بڑا فائدہ تھا اور اس کے ثبوت کے لئے یہی دو مثالیں لکھنی کافی ہونگی کہ قحط عظیم کے زمانے میں سورت کے انگریز ایران سے گیہوں خرید لاتے تھے اور پندرہ سال بعد مدراس میں قحط پڑا تو وہ (سورت سے) غلہ وہاں لے گئے۔ اس طرح ساحل ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے لیکن اندرونی علاقوں میں یہ ممکن نہ تھا اور سوائے انتہی سخت قحط سالی کے جیسی کہ گجرات میں ہوئی، معمولی گرانی کے وقت دُور سے غلہ نہیں پہنچایا جا سکتا تھا؛

غلے کی قیمتوں پر بحث کرنے کے ساتھ ہی روپے کی قوت خرید کا سوال چھڑ جاتا ہے اور زمانۂ حال سے بھی زیادہ، زمانۂ سابق کے متعلق یہ مسئلہ اہمیت رکھتا ہے۔ زمانۂ حال یعنی سنہ ۱۹۱۰-۱۲ء میں جسے میں نے اس بحث میں بنائے حساب قرار دیا ہے، غلے کا جو نرخ ہے اس کے حساب سے سنہ ۱۵۹۵ء کی نسبت روپے کی قیمت $\frac{1}{2}$ رہ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گجرات میں ہمارے پیش نظر عہد کا نرخ سنہ ۱۹۱۰-۱۲ء کے نرخ سے صرف چوگنا یا سوا چوگنا تھا اور اس صورت میں روپے کی قیمت میں بھی تین صدی میں گویا ۱ : ۴ - یا ۱ : $4\frac{1}{4}$ کا فرق پڑا۔ اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے پیش نظر عہد میں بھی روپے کی قوت خرید کی یہ کمی کسی حد تک وجود میں آئی یا نہیں؟ کیونکہ جب تک یہ ٹھیک نہ معلوم ہو جائے اُس وقت تک ہم اس زمانے کی مالگذاری کے متعلق صحیح نتائج نہیں نکال سکتے اور مالگذاری اس زمانے میں بارش کے بعد اقتصادی زندگی کا سب سے اہم عنصر تھی۔ یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دنوں گجرات کی قریب قریب ساری تھوک کی خرید فروخت چاندی کے سکے میں ہوتی تھی اور یہ قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ روپے کے دور میں کوئی خاص فرق پڑ گیا تھا۔ مشرقی ساحل کی لونگ کی تجارت کا حساب تو ہم نے پگوڈا میں لکھا ہے ورنہ تمام قیمتیں چاندی

کے سکتے ہیں مذکور رہیں)۔ پھر، یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سوائے مصالحے کے جو ولندیزوں کی اجارہ داری مکمل ہو لینے کے بعد گراں ہو گئے تھے، باقی درآمد یا کسی نمو لینے کی برآمد یا خوردنی اجناس کی قیمتوں میں گرانی کے آثار نہیں پائے جاتے اور اتنا کہنا ہی یہ بتا لینے کے لئے کافی ہے کہ چاندی کے سکے کی قوت خرید میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا تبصرہ تمام اجناس تک وسیع نہیں ہے تاہم کپاس، سوتی پارچہ اور روغنی تخم کو چھوڑ کر باقی اکثر اشیا اس کے احاطے میں آگئی ہیں۔ کپاس اور روغنی تخم کے اعداد جیسا کہ اوپر بیاں ہوا میسر نہیں آ لتے۔ رہا سوتی پارچہ تو جو رقوم و اعداد ملتے ہیں، وہ نوعیت کے مبہم سوال پر اس قدر منحصر ہیں کہ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا دشوار ہے اور اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ مثالاً، یہ ثابت کرنا تو آسان ہے کہ انگلستان کے لئے جو تنگ و عریض بافتے اور گجرات کے لٹھے سنہ ۱۶۴۰ میں خریدے جاتے تھے وہ سنہ ۱۶۲۰ء کی نسبت کمتر قیمت میں ملنے لگے تھے[1]۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ شکایت بھی سنی جاتی ہے کہ قحط کے بعد بُناوٹ میں خرابی آگئی تھی لہٰذا نرخ کی ارزانی کی بنیاد پر کوئی دلیل قائم کرنا مخدوش ہے۔ اور اُدھر، جن اقطاع میں قحط کا اثر نہیں پہنچا۔ وہاں کے اعداد اتنی کافی مدت تک کے معرض تحریر میں نہیں ملتے کہ ان کی بنا پر کوئی نتیجہ نکالنا جائز ہو۔ غرض شہادت کے ناقص ہو لنے میں، تو کوئی کلام نہیں مگر سر دست غالباً ہمارا یہ نتیجہ نکالنا ناجائز نہ ہوگا کہ اُس نصف صدی میں جس سے ہم بحث کر رہے ہیں تمام قرائن روپے کی قوت خرید کم ہو لنے کے خلاف نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی کمی ثابت کرنے سے پہلے دو مقدمے ثابت کرنے لازم ہونگے اول

---

[1] ہم نے آخری بات کے ساتھ جو فہرست منسلک کی ہے اور جہاز پر چڑھنے کے بعد سنہ ۱۶۱۹ء کے بڑے بڑے چلانوں کی قیمت درج ہے، اُسمیں عریض بافتے ۳، ۶ و ۸، ۶ محمودی فی تھان اور کم عرض کے بافتے ۸، ۳ اور ۵ محمودی فی تھان، لکھے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دسمبر سنہ ۱۶۴۰ کے مطلوبے میں پہلی قسم بافتہ کا نرخ ۲، ۵ اور $\frac{1}{2}$ ۵ اور دوسری قسم کا ۸، ۳ اور ۴ محمودی (معہ مصارف باربرداری تا جہاز) تحریر ہے (اوریجنل کرس پونڈینس سنہ ۱۶۴۰)

تو یہ کہ بہت سی ایسی اشیا کا جنکی اہمیت اسی قدر ہے جسقدر کہ ہماری مذکورۂ بالا اشیا کی ہے، نرخ اس زمانے میں بہت چڑھ گیا اور اس گرانی کا کوئی دوسرا سبب بجز روپے کی قیمت گر جانے کے سمجھ میں نہیں آتا اور دوسرے یہ کہ اشیائے درآمد اور نیل اور غلے کی قیمتیں پہلے کی نسبت گھٹ گئیں اور اس کے اسباب ایسے معلوم ہونے چاہئیں جن کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ کیونکہ نرخ گھٹا نہیں تو پھر روپے کی قوت کم ہو جانے کے باعث اس کا بڑھ جانا لازم تھا۔ غرض جب تک ان مقدمات کو ثابت کرنے کے لئے شواہد بہم نہیں پہنچتے اس وقت تک مزید بحث بے سود ہے اور میں اپنے اس موقت نتیجے پر قائم ہوں کہ گجرات کی منڈیوں میں سنہ ۱۶۱۰ء سے ۱۶۶۰ء تک چاندی خاصی طرح ایک نا متغیر معیار قیمت تھی۔

اگر اس نتیجے کو گجرات کے بارے میں درست مان لیا جائے تو مجموعی طور پر پورے شمالی ہندوستان پر بھی یہی صادق آئیگا۔ شمالی ہند کو ہم چاندی کی واحد منڈی تصور کر سکتے ہیں کیونکہ چاندی اس ملک کے اندر قریب قریب بالکل برآمد نہیں ہوتی تھی اور جو باہر سے آتی وہ بری حدود سے باہر کبھی نہیں جاتی تھی بلکہ اس کی تمام تر بہم رسانی بنگالہ، سندھ اور گجرات کے سواحل سے ہوتی اور وہ ۱۸۶ اندرون ملک ہی میں کھپتی تھی۔ بنگالے کی بحری تجارت کا جو احوال ہم تک پہنچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد کے آخری دس سال سے قبل چاندی کی درآمد کچھ بہت زیادہ نہ تھی البتہ اس آخری عشرے میں ولندیزوں نے اسے بحال کیا اور اس قدیم کاروبار میں مزید وسعت دی۔ رہا سندھ، تو وہ اس اعتبار سے اور بھی کم وقعت تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ معاصر تحریروں کا مطالعہ کرنے والے یہی رائے قائم کریں گے کہ چاندی کی درآمد کا سب سے بڑا ذریعہ گجرات ہی کی بندرگاہیں تھیں۔ غرض چاندی سمیٹنے والے شمال کو وہ خزانہ سمجھنا چاہیے جس میں سب سے زیادہ مال تو گجرات سے پہنچتا تھا اور کبھی کبھی سندھ و بنگالہ سے بھی کوئی رو آجاتی تھی لیکن چاندی کو کہیں حقیقت میں کوئی تیز رو چیز سمجھنا نہ چاہیے کیونکہ اس کے حمل و نقل کے مصارف اور جوکھوں کچھ کم نہ تھے۔ ان حالات میں اگر مجموعی رسد خرچ کی

مجموعی قابلیت سے بڑھ جاتی اور چاندی کی مقدار جو دور میں تھی، اس میں بھی بیشی کا میلان پایا جاتا تو اس کی قیمت میں لامحالہ کمی آتی اور اس کمی کا اثر سب سے زیادہ گجرات میں ظاہر ہوتا جہاں سب سے زیادہ مقدار میں چاندی باہر سے آتی اور مسکوک ہوتی تھی۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ گجرات میں کوئی نمایاں کمی قیمت میں نہیں واقع ہوئی لہذا یہ نتیجہ نکالنا جائز ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کا نرخ اپنی جگہ قائم رہا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ولندیز اور دوسرے سوداگروں کے ذریعے جس قدر چاندی ملک میں پہنچتی تھی وہ شمالی اور مغربی ہندوستان کے مجموعی خرچ کی قابلیت سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

اس سلسلے میں سورت کے مغلیہ دارالضرب کی سرگزشت پر ایک نظر ڈال لینی بھی مناسب ہوگی ورنہ بعض واقعات سے بادی النظر میں ایسا مترشح ہوتا ہے کہ گویا سکے میں کوئی بہت بڑی بیشی ہو گئی تھی۔ واضح رہے کہ بیرونی سکے یا سکیہ (یعنی غیر مسکوک چاندی، سونا) جو بھی باہر سے آتا وہ براہ راست دارالضرب میں بھیجدیا جاتا اور روپے یا محمودی کی صورت میں مضروب ہو کر دوبارہ رائج کر دیا جاتا تھا[1] ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز میں گجرات کا صدر دارالضرب احمد آباد میں تھا جسے اکبر نے فتح گجرات کے بعد اس جگہ قائم کیا۔ اسی بادشاہ نے سورت میں بھی ٹکسال بنائی جو چند سال بند رہی اور پھر سنہ ۱۶۲۰ء میں، غالباً اس بندرگاہ کی ترقی پذیر اہمیت کی بنا پر
دوبارہ کھول دی گئی۔ مگر چند ہی سال بعد یعنی سنہ ۱۶۳۴ء میں سورت میں درآمدہ ۱۸۷
چاندی کی اتنی افراط ہوئی کہ یہ دارالضرب اس سب کو ڈھالنے سے قاصر رہنے لگا

---

[1] جیسا کہ ضمیمہ د میں صراحت کر دی گئی ہے، محمودی نام کا سکہ بگلانے کے مقام لہیر میں قریب قریب سنہ ۱۶۳۷ء تک مضروب ہوتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ سنہ ۱۶۲۰ء میں سورت کی ٹکسال دوبارہ کھلی تو یہ سکہ وہاں ضرب نہ ہوتا تھا۔ بہر نوع یہ یقینی ہے کہ سورت کا تعلق زیادہ تر روپیہ ڈھالنے سے تھا۔

باب پنجم

اور ۱۶۳۶ء میں انگریز گماشتوں نے جو تحریک کی تھی کہ انگریزی تجارت کا مستقر سورت کی بجائے احمد آباد کو بنالیا جائے، اس کا ایک سبب بھی یہی بتایا تھا کہ سورت میں کافی روپیہ میسر نہیں آتا۔ لیکن یہ دشواری جلد دُور ہوگئی۔ سورت کے دارالضرب میں توسیع کردی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ وہ عام ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے لگا۔ اسی طرح یہ یقینی ہے کہ سورت میں چاندی کی درآمد بہت بڑھ گئی تھی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجموعی طور پر گجرات کی درآمد میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تغیر کو اس بات کی علامت سمجھنا چاہیے کہ کھمبائت کا کاروبار سورت میں منتقل ہوگیا۔ پہلے پرتگیزوں کی تجارت کا بڑا مرکز کھمبائت ہی تھا اور وہ جو چاندی وہاں لاتے، وہ طبعاً احمد آباد کے دارالضرب میں بھیجدی جاتی تھی۔ لیکن جب تجارت ان کے ہاتھ سے ولندیزوں اور انگریزوں کی طرف منتقل ہوگئی تو سورت نے ترقی کی اور کھمبائت کو زوال آگیا۔ سورت میں تو سکے زیادہ تعداد میں ڈھلنے لگے لیکن اسی نسبت سے شمالی دارالضرب (واقع احمد آباد) میں کمی آگئی ۔

اس تغیر کا مغلیہ سکوں کے اُن ذخیروں سے بھی پتہ چلتا ہے جو ہندوستان کے مختلف عجائب خانوں میں جمع کئے گئے ہیں اور سب ملاکر اس قدر زیادہ ہیں کہ سرسری طور پر مختلف ٹکسالوں کی کیفیت کا بھی پتہ چل جاتا ہے اسی لئے ہم نے تین بڑی بڑی فہرستوں سے ذیل کے اعداد اخذ کئے ہیں[1]

ہندوستان کے عجائب خانوں میں چاندی کے سکوں کی تعداد

عہد	دارالضرب احمد آباد کے سکے				دارالضرب سورت کے سکے			
	لکھنو میں	لاہور میں	کلکتہ میں	میزان	لکھنو	لاہور	کلکتہ	میزان
اکبر	۱۵۳	۵۱	۵۳	۲۵۷	۰	۱	۰	۱

---

[1] عالمگیری عہد کے سکوں میں چند وہ نمونے بھی شمار کرلئے ہیں جو ۱۶۵۸ء میں مراد بخش نے ضرب کرائے تھے ۔

عہد	دار الضرب احمد آباد کے سکے				دار الضرب سورت کے سکے			
	لکھنؤ میں	لاہور میں	کلکتہ میں	میزان	لکھنؤ	لاہور	کلکتہ	میزان
جہانگیر	۷۹	۲۷	۳۲	۱۳۸	۱۴	۴	۵	۲۳
شاہجہاں	۳۴	۹	۱۲	۵۵	۸۸	۲۲	۳۱	۱۴۱
عالمگیر	۲۱	۵	۱۱	۳۷	۱۳۱	۵۵	۹۱	۲۷۷

۱۷۸ اکبر سے عالمگیر تک کا پورا زمانہ سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ٹکسالوں کے سکے" قریب قریب مساوی تعداد میں ہمارے ذخیروں میں محفوظ ہیں لیکن احمد آباد کی تعداد میں کمی اور اسی کے ساتھ سورت کے سکوں میں بیشی ہوتی جاتی ہے۔ سورت کے دار الضرب میں جس توسیع کا اوپر ذکر آیا وہ شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں ہوئی اور اسی وقت سے یہ گجرات کا صدر دار الضرب بن گیا چنانچہ عہد عالمگیر کے جو سکے" ملتے ہیں ان میں ۹/۱۰ اسی ٹکسال کے ضرب کئے ہوئے ہیں۔ ان اعداد سے ہمارے اس قیاس کی بھی تائید ہوتی ہے کہ پیش نظر عہد میں گجرات میں چاندی کی درآمد کچھ بہت نہیں بڑھی۔ یورپ سے براہ راست تجارت کا ہونا یقیناً ایک نئی آسانی تھی لیکن مجموعی تجارت کے مقابلے میں اس کی مقدار بہت کم تھی اور یہ ہم اوپر مطالعہ کر چکے ہیں کہ اس مجموعی تجارت کی نسبت یہ یقین کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی کہ اس میں کوئی خاص بیشی ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ اس حصۂ ملک کے پورے کاروبار پر نظر ڈالئے تو یہ نتیجہ نکالنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترقی ایسی نہ تھی جس سے عام طور پر اجناس کی قیمتوں میں بیشی واقع ہوتی[1]۔

---

[1] گمان غالب یہ ہے کہ ایران سے جو چاندی گجرات پہنچتی تھی، وہ ہمارے عہد میں اتنی مقدار میں کم آنے لگی کہ یورپ سے درآمد میں جو بیشی ہوئی تھی اسے مجموعی طور پر برابر سرابر ہوگئی۔ اگرچہ مجھے ایسا مواد نہیں ملا کہ اس بارے میں قطعی طور پر کوئی بات کہہ سکتا۔ لیکن تجارت کے توازن میں فرق آنے کا لازمی سبب ریشم کی تجارت کو سمجھنا چاہیے جو خلیج فارس سے باہر جانے لگا تھا۔

ہندوستان کے دوسرے حصے کی طرف نظر کیجیے تو سب سے پہلے یہ کہہ دینا مناسب ہوگا کہ مجھے ساحل کورومنڈل کی اجناس خوردنی کے معلوم کرنے کا مواد قریب قریب بالکل میسر نہیں آیا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس خطے میں قحط سالی کی اکثر شکایت رہتی تھی اور بری فصل کے زمانے میں نرخ بہت چڑھ جاتے تھے لیکن معمولی سنین کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ اسی کے ساتھ مصارفِ معاش کے بڑھنے کی کوئی شکایت نہیں پائی جاتی اور اسی واقعے کو ہم اپنے اس خیال کی تائید میں پیش کر سکتے ہیں کہ معمولی نرخوں میں کوئی خاص گرانی پیدا نہیں ہوئی تنخواہوں کی شرحیں جو چاندی کے سکے میں تحریر ہیں، یکساں رہنے سے بھی اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔ میتھوولڈ جو مچھلی پٹم سے ۱۶۲۲؁ میں روانہ ہوا، کارخانے کے نوکروں کی تنخواہ ۸ ریال ماہانہ بتاتا ہے جو تقریباً دو روپے کے مساوی ہوئے۔ چھتیس برس بعد، ۱۶۵۸؁ میں ولیم اسمتھ نے اسی نواح کے ملازمین کارخانہ کی اجرت ۴، ۵ شلنگ ماہانہ بتائی ہے۔ روپیہ اس زمانے میں ۲½ شلنگ کے مساوی مانا جاتا تھا لہٰذا اس میں اور میتھوولڈ کی بتائی ہوئی شرح میں کوئی فرق نہیں ہوا اور اسی سے یہ بات بہت خلافِ قیاس ہو جاتی ہے کہ اس دوران میں معاشرت کے اخراجات میں کوئی خاص تغیر ہوا ہوگا۔

۱۷۹ برخلاف اس کے، بنگالے میں ۱۶۵۰؁ اور ۱۶۶۰؁ کے درمیان اجناس خوردنی کی قیمتوں کے یک بہ یک بڑھ جانے کے قطعی شواہد موجود ہیں۔ اور اس حصۂ ملک کے ایسے اقتصادی حالات کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے لئے بڑی دلچسپی کا موجب ہیں۔ یاد ہوگا کہ بنگالے کی یورپی تجارت پوری شدومد سے اس وقت شروع ہوئی جب کہ ۱۶۵۰؁ کے قریب ولندیز اور انگریز ہگلی میں آ گئے۔ مگر دسمبر ۱۶۵۸؁ ہی میں انگریز گماشتوں نے درخواست کی کہ مصارف خانہ داری کا جو بھتہ مقرر ہے اس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ معاشرت بے حد گراں ہو گئی ہے۔ یہ درخواست محفوظ نہیں رہی لیکن کمپنی کی طرف سے جو جواب گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ گماشتوں نے اجناس خوردانی کا سہ گُنا ہونا بیان کیا تھا۔ اور کمپنی نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ تفصیلی حساب مانگا۔ قیاس چاہتا ہے کہ گماشتوں

لے گرانی کا بیان لکھنے میں مبالغہ کیا یا اس طرح بڑھا چڑھا کے لکھا کہ پورا اثر
پڑے۔ اور یہ خیال کرنا کہ واقع میں نرخ تگنا ہو گیا تھا، احتیاط کے خلاف ہوگا
لیکن اس حد تک ہمارا قیاس بالکل قرین صواب ہے کہ کوئی ایسی گرانی ضرور
ہوگئی تھی کہ دس برس پہلے جو بھتہ مقرر ہوا، وہ اب ناکافی رہ گیا تھا؛

لیکن اس گرانی کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے دوسرے
سواحل اور بنگالے کے درمیان نرخ میں کوئی فرق آنا شروع ہوا۔ بلکہ حقیقت
میں پہلے جو فرق غالباً بہت دن سے چلا آتا تھا، وہ اب دور ہوا۔ دسمبر ۱۶۵۸ء
کی جس مقامی گرانی کا ذکر آیا ہے اس کے مقابلے میں ۸ سال پہلے کی یہ اطلاع
بھی سامنے رہنی چاہیئے کہ چاول، مکھن، تیل وغیرہ اشیا ان دنوں "دوسرے
اقطاع ملک کی نسبت آدھی یا کچھ زیادہ قیمت پر" مل جایا کرتی تھیں۔ بالفاظ
دیگر ۱۶۵۰ء تک ان مقامات کی نسبت جن سے انگریز سوداگروں کو سابقہ پڑا،
یا کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کے سواحل کی نسبت بنگالے میں اشیا کا نرخ بہت ہی
سستا تھا۔ لیکن چند ہی سال میں اس کاروبار کے پھیلنے کے باعث جس کا سرمایہ
تقریباً تمام و کمال چاندی کے سکّے میں ہوتا تھا، قیمتیں دوسرے علاقوں کے برابر
یا ممکن ہے ان سے بھی کچھ زیادہ چڑھ گئیں۔ اس سے خواہی نخواہی یہ قیاس ہوتا ہے
کہ سواحل کی نسبت بنگالے میں چاندی کی کمی تھی اور اس کے عوض اشیا ارزان
مل جاتی تھیں لہذا ۱۶۵۰ء سے چاندی کی درآمد کے یک بہ یک زیادہ ہو جانے
سے یہ سبب دور ہو گیا اور بنگالے کے نرخ بھی ساحلوں کی سطح پر آگئے؛ اس قیاس
کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ پہلے اُن ملکوں میں جو طبعاً کورومنڈل سے
۱۸۰ اپنی ضروریات پوری کرتے، بنگالے ہی کا چاول دساور جاتا تھا۔ اس کی شہادتوں
میں سے ایک ہی کو نقل کرنا کافی ہوگا کہ فنچ لکھتا ہے کہ سنارگاوں (قریب ڈھاکہ)
تمام "ہندوستان" اور لنکا کو چاول بہم پہنچاتا ہے۔ ہندوستان سے اس کی مراد
بظاہر مغربی ساحل ہوگی کہ اور بھی اکثر ماخذوں میں اس علاقے کے ساتھ اجناس خوردنی
کی تجارت کا ذکر آیا ہے۔ لیکن قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنگالے سے
وہاں چاول جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ جب کہ کورومنڈل زیادہ قریب تھا اور

وہاں سے گجرات تک کا بحری سفر بھی اس قدر پُرخطر نہ تھا۔ اس کا معقول جواب صرف یہ ہے کہ بنگالے میں ضروری اجناس خوردنی کا نرخ اس درجہ کم تھا کہ باربرداری کے زائد مصارف پورے ہوجاتے تھے اور پھر بھی قیمت کم رہتی تھی جس کے ثبوت سیزر فریڈرک سے لے کے ولیم میتھوولڈ تک مختلف سیاحوں کی سرگزشت میں موجود ہیں۔ آخرالذکر کی سنہ ۱۶۲۰ء کی تحریر میں بنگالے سے مچھلی پٹم کو اجناس اور دوسری قسم کے مال آنے کا ذکر ملتا ہے کہ گو خود مچھلی پٹم میں ان اشیا کی افراط تھی اور وہاں ان کا لانا "اُسے بانس بریلی" کا مصداق تھا، تاہم وہ وہاں کافی نفع سے فروخت ہوجاتی تھیں۔ یہ ایک تعجب انگیز ثبوت ہے کہ ان دو ساحلی علاقوں میں جن کے درمیان آمدورفت کے وسائل ناقص تھے، چاندی کی قوت خرید میں کس درجہ تفاوت تھا۔

الغرض یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۵۰ء کے قریب تک بنگالے میں چاندی کی بہم رسانی کافی نہ تھی۔ اس کمی کا ایک سبب غالباً محکمۂ مالگذاری کے طریق عمل میں مضمر تھا۔ مالگذاری کی رقم زیادہ تر چاندی کے سکے میں ادا ہوتی تھی اور عموماً اسی شکل میں خزانۂ شاہی کو روانہ کردی جاتی تھی۔ پھر، باہر سے جو چاندی آتی وہ بظاہر مقامی ضروریات کے لئے مکتفی نہ ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ معمولاً گراں رہتی یا یوں کہئے کہ اجناس معمولاً ارزاں رہتی تھیں۔ آئین اکبری[۱] میں بنگالے کی پوری مالگذاری ڈیڑھ کروڑ روپیہ تحریر ہے لیکن یہ سمجھنے کی وجوہ موجود ہیں کہ یہ رقم اگر فرضی نہیں تو اصل سے کچھ نہ کچھ ضرور زیادہ ہے۔ عہد شاہجہانی سے متعلق مختلف بیانات کو سامنے رکھئے تو کل مطالبہ ایک کروڑ ۳۰ لاکھ نکلتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ لازماً اسی صوبے میں خرچ ہوتا ہوگا لیکن یاد رہے کہ سرکار

---

[۱] آئین اکبری میں بنگالے کی جو رقوم درج ہیں، ان میں ایسے اقطاع بھی محسوب کر لئے گئے ہیں جو آئین اکبری کی تالیف کے وقت سلطنت مغلیہ کی حدود میں داخل نہ تھے اور انھیں واقعیت پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسکوٹی (صفحہ ۲۵) سنہ ۱۶۵۸ء کی مالگذاری ایک کرور ۳۱ لاکھ بتاتا ہے۔ برطانی متحف کے تین مخطوطات میں مالگذاری ۵۲ کرور ۴۶ لاکھ دام تحریر ہے۔ اندر

باب پنجم

یا دوسرے مالکان اراضی عام طور پر مالگذاری زر نقد کی شکل میں دار الخلافت کو بھیجدیا کرتے تھے اور ہمیں ذہن نشین رکھنا پڑے گا کہ مقدار کثیر میں ہر سال روپیہ سمٹ سمٹ کر شمال مغرب کو ڈھل جاتا تھا جس کا اندازہ غالباً پچاس لاکھ سالانہ سے کم نہ ہوگا۔ کسی گذشتہ باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بنگالے کی بحری تجارت سنہ ۱۶۵۰ء سے پہلے بہت سُست تھی اور گو اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ ممکن نہیں ہے تاہم اگر چاندی کی درآمد اتنی زیادہ نہ ہو کہ مذکورہ زرکشی اور صوبے کی ضروریات کیلئے مکتفی ہوتی، تو اس میں کچھ بھی تعجب کی بات نہیں نظر آتی۔ ولندیزوں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۵۰ء سے پہلے ان کی بنگالے میں تجارت کم و بیش ایک لاکھ روپے کی حیثیت کی تھی لیکن سنہ ۱۶۶۱ء میں اس کا سرمایہ بیس لاکھ کے قریب پہنچ گیا اور جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں یہ بیشی نئے کاروبار جاری ہونے سے ہوئی اور اس میں زیادہ تر سرمایہ چاندی کی درآمد کا لگایا گیا۔ اسی طرح انگریز بیوپار پھیلا رہے تھے جس کا پیمانہ نسبتاً کم لیکن بجائے خود معقول تھا۔ غرض میرے نزدیک یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے عہد کے آخری سنین میں چاندی کا اس افراط سے بنگالے میں آنا جو مالیت میں زیادہ نہیں تو ۲۰ لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب ضرور تھا، صوبے کی اقتصادی حالت میں نمایاں تغیر پیدا کرنے کے لئے کافی ہوگیا۔ اس قسم کے اعداد مجھے کہیں نہیں ملے جن سے یہ مترشح ہوتا کہ اس زمانے میں سرکاری مطالبہ بڑھا دیا گیا تھا۔ لہذا شمال میں روپے کی کم و بیش سابقہ مقدار کا جانا اور دوسری طرف، چاندی کی درآمد میں اس قدر اضافہ ہو جانا، اس بات کے لئے بہت کافی تھی کہ صوبے میں، چاندی کی کمی پوری ہو جائے اور اجناس کی ارزانی کا سبب دور ہو جائے۔

اس کل بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ گو شہادت ناقص ہو جو ہے لیکن

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ ۴۰ دام فی روپیہ کے حساب سے یہ رقم بھی اسی قدر نکل آتی ہے جتنی کہ اسکوٹی نے تحریر کی ہے۔

[1] آسکوٹی (ایل۔ سی) مجلس منتخبہ کی جو سنہ ۱۸۰۰ء میں مقرر کی گئی تھی، پانچویں کیفیت کی تقلید

جتنی بھی میسر آتی ہے اس سے فی الوقت یہی استخراج ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد میں چاندی شمالی اور مغربی ہندوستان میں تو اپنی جگہ برابر برقرار رہی لیکن آخری دس سال میں بنگالے میں اس کا نرخ سرعت کے ساتھ گھٹا جس سے اشیا کے نرخ جو مدت سے دوسرے مقامات کی نسبت بہت کم تھے، بڑھ گئے اور مہنگی میں بھی اسی سطح پر آگئے جو ہندوستان کے دوسرے سواحل میں تھی۔

۶۔ سونا اور تانبہ

چاندی کے متعلق تو ہم اس وقتیہ نتیجے پر پہنچ گئے کہ ہمارے پورے عہد میں سوائے بنگالے کے وہ ہر جگہ نرخ کا ایک استوار معیار تھی۔ مگر ابھی سونے اور تانبے کی قیمتوں کا اندازہ کرنا باقی ہے کہ یہ دونوں بھی اپنی اصلی قیمت کے مطابق بطور سکہ ملک میں رائج تھے۔ ضمیمہ د میں میں نے اشارہ کیا ہے کہ ہمارے عہد میں سونے کے سکے کی (جسے نیا نگوڑا کہتے تھے) قیمتیں چاندی کے حساب سے مشرقی ساحل پر بڑھ گئی تھیں۔ اور یہ توقع کرنا بالکل واجبی ہے کہ اسی نسبت سے گجرات میں بھی سونے کا نرخ چڑھ گیا ہوگا۔ لیکن اس قیاس کی تصدیق یا تکذیب کے لئے کافی مواد میسر نہیں آتا۔ وسط عہد میں قحط کے باعث دوسری اشیا کی طرح سونے کی منڈی بھی کچھ عرصے کے لئے درہم برہم رہی۔ کیونکہ دولتمند تو آمدنی کم رہ جانے کے باعث خریداری نہ کر سکتے تھے اور غریبوں کو شکم پری کے واسطے اپنے زیور فروخت کرنے پڑے لیکن اس کے سوا اور کوئی تفصیل ہم معلوم نہیں کر سکتے۔ قحط کے بعد ۱۶۳۵ء میں انگریزی ۲۰ شلنگ کا سکہ ۲۰ محمودی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ میں لکھتا ہے کہ "گمان غالب یہ ہے کہ شاہجہاں کا تخمینہ مالگذاری (ایک کرور ۳۱ لاکھ روپیہ) کسی نئی تشخیص یا جدید بندوبست پر مبنی نہ تھا بلکہ محض دفتر کی نظر ثانی سے مرتب ہوا تھا"۔ بنگالے کا دوسرا بندوبست جہاں تک تحریری شہادت کا تعلق ہے ۱۷۲۲ء سے قبل نہیں ہوا۔

میں بِکا۔ ۱۶۴۲ء میں اس کی ۲۱½ محمودی قیمت ملی اور یہ اضافہ ضرور قابل
لحاظ ہے مگر سونے کی منڈی میں پیشہ وروں کی ہاتھا چھانٹی کا بھی دخل تھا لہذا
اور بھی ضرورت ہے کہ صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے مزید مواد مہیا ہو۔ ایک موقع پر
انگریز گماشتے شکایت کرتے ہیں کہ "ہم بالکل صرافوں کے بس میں ہیں جو اپنی
خوشی سے سونے یا چاندی جس کی چاہیں قیمت گھٹا بڑھا سکتے ہیں" دوسرے
بہت ممکن ہے کہ اوپر جو فرق مذکور ہوا وہ محض وقتی نرخ کی کمی بیشی کا نتیجہ ہو؛
۱۶۵۲ء میں سورت کے گماشتوں نے اطلاع دی کہ سونے کی قیمت غالباً
بڑھے گی۔ گھٹے گی نہیں۔ مگر مجھے اپنے عہد کے آخری سنین میں واقعی قیمتیں کہیں
نہ ملیں۔ بہر حال، سلطنت مغلیہ میں سونے کا رواج اس قدر محدود تھا کہ
اس کے نرخ کی کمی بیشی کا عام سکہ استعمال کرنے والوں پر کچھ اثر نہ پڑتا تھا۔
جنوبی ہند میں قیاس چاہتا ہے کہ سونے کی قیمت گھٹتی ہوگی لیکن یہاں بھی مواد
کی کمی ہے اور صرف مصالحے ایسی جنس تھے جن کے میں باقاعدہ نرخ نامے ۱۸۲
مرتب کر سکا اور یہ نرخ بھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ولندیزی اجارہ داروں
کے معین کردہ تھے؛

سونے کے خلاف، تانبے کی نسبت ہمیں زیادہ تفصیلی اور عام دلچسپی
کی معلومات میسر ہیں۔ ہمارے عہد کے آغاز میں حالت یہ تھی کہ شمالی ہندوستان
کا انحصار کلیتہً یا قریب قریب کلیتہً مقامی معادن پر تھا۔ بجالیکہ جنوب میں بیشتر
وہ تانبہ کام میں آتا تھا جو پرتگیز جاپان سے ادھر لاتے تھے۔ شمال میں اس
دھات کی گرانی اسی واقعے سے ثابت ہے کہ ٹکسال کے آدھ سیر مسی سکے کا
بدل تقریباً من بھر گیہوں ہوتا تھا۔ حالانکہ آج کل (یعنی ۱۹۱۰-۱۲ء میں) کوئی ۲½
سیر گیہوں ہوگا۔ اور جنوب میں بھی وہ کچھ زیادہ ارزاں نہ تھا ورنہ ملیبار و گوا
سے لازماً گجرات کی بندرگاہوں تک ڈھل ڈھل کر آجاتا۔ اس گرانی کی بدولت
یہ دھات ایک بیش بہا چیز ہوگئی تھی اور اس کے برتن آج کل کی نسبت بہت
کم دیکھنے میں آتے تھے۔ اہل حرفہ میں اس کی مانگ قلیل تھی۔ کبھی کبھی توپ
گولہ ڈھالنے کے لئے ضرورت پڑتی تھی ورنہ گمان غالب یہ ہے کہ مجموعی طور پر

اس کا خرچ صرف مختلف ٹکسالوں تک محدود تھا۔ شمالی ہندوستان میں سنہ ۱۶۲۰ء تک مجھے تانبے کی قیمت میں کسی خاص فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ اکبری عہد میں سرکاری نرخ ۴۰ دام فی روپیہ تھا جو گجرات کے اسی پیسوں کے مساوی ہوا۔ اور ایک محمودی کے ۳۲ گجراتی پیسے بنتے تھے۔ سنہ ۱۶۰۹ء میں فنچ نے محمودی کی یہی قیمت یعنی ۳۱ / ۳۲ پیسہ تحریر کی ہے جس میں تانبے کے نرخ کے ساتھ کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں ایل کنگٹن ۳۴ پیسہ فی محمودی کی خبر دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس نرخ میں تغیر ہوتا رہتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس سال تک تانبے کی قیمت میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ نہ گجرات میں اس کی درآمد کا سراغ ملتا ہے کیونکہ سنہ ۱۶۱۹ء میں سورت کے گماشتوں کو ایران بھیجنے کے لئے صرف ۳۳۰ پونڈ تانبے کی احتیاج ہوئی تو انھوں نے پہلے برہانپور سے دریافت کیا، یعنی مقامی معادن سے مدد چاہی اور ظاہر ہے کہ اگر براہ راست سورت میں باہر سے تانبہ آتا ہوتا تو اتنی ہی مقدار انھیں وہیں کے وہیں مل جاتی۔ اگلے عشرے کے کسی سال میں ہم اس دھات میں نمایاں گرانی ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس کی سب سے پہلی اطلاع ہمیں پلسارٹ کی تحریر مورخہ سنہ ۱۶۲۶ء سے ملتی ہے جس میں آگرے کا نرخ ۵۸ پیسہ فی روپیہ بتایا گیا ہے جو ۸۰ پیسہ فی روپیہ سے یقیناً نمایاں تفاوت رکھتا ہے۔ پھر سنہ ۱۶۳۶ء ۱۸۴ میں سورت کے انگریز گماشتوں نے لکھا ہے کہ قحط کے دو تین سال قبل سے محمودی ۲۰ / ۲۱ یا ۲۲ پیسے سے زیادہ کی نہیں رہی اور اس حساب سے روپے کے بھی ۵۰ / ۵۵ پیسے رہ جاتے ہیں۔ خود سنہ ۳۶ میں نرخ ۲۵ پیسے فی محمودی اور سنہ ۴۰ میں ۲۴ پیسے اور بیس برس بعد بھی ۲۴ / ۲۵ کے درمیان تھا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جزئی کمی بیشی کو چھوڑ دیجیے تو روپیہ جو کم سے کم سنہ ۱۶۱۶ء تک ۸۰ پیسے (یا ۴۰ دام) کے معادل تھا، سنہ ۱۶۲۷ء کے بعد سے کم و بیش ۶۰ پیسے (یا ۳۰ دام) کا ہم قیمت رہ گیا[1]۔

---

[1] چاندی اور تانبے کے درمیان منڈی کا نرخ مبادلہ بہت کچھ کم بیش ہوتا رہتا تھا۔ آگرہ اکاونٹس بابت سنہ ۱۶۳۷-۳۹ء میں جنوری سنہ ۳۷ء کا نرخ صرف ۵۰ پیسہ فی روپیہ اپریل

نرخ کی اس گرانی کے بعد سے جاپانی تانبے کی مسلسل درآمد گجرات میں شروع ہوئی۔ ولندیزوں نے جاپان میں قدم جماتے ہی بلا تاخیر مشرقی ساحل کو تانبے کی بہم رسانی شروع کر دی تھی لیکن سورت میں ان کے تانبہ لانے کی سب سے پہلی تحریری شہادت سنہ ۱۶۳۵ء کی ہے[1]۔ اور آیندہ چند سال تک ان کی فروخت جس اطمینان کے ساتھ ہوتی رہی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں واقعی مانگ تھی جو ولندیزوں نے پوری کی[2]۔ سنہ ۱۶۴۰ء میں جاپان سے تانبے کی برآمد ممنوع کر دی گئی اور سات آٹھ سال جب تک یہ امتناع نافذ رہا، ولندیز سویڈن اور دوسرے یورپی مقامات سے تانبہ لا لا کے مچھلی پٹم اور سورت دونوں جگہ فروخت کرتے رہے۔ جاپان سے برآمد سنہ ۱۶۴۸ء میں دوبارہ جاری ہوئی اور پھر معلوم ہوتا ہے یہ کاروبار بغیر کسی خلل کے ہوتا رہا اور جب ولندیز مینگالے میں پہنچے تو وہاں بھی تانبے کی بہم رسانی وہی کرنے لگے[3]۔

رسالہ ہناوبہ بابت سنہ ۱۶۶۱ء سے بھی ہمارے پیش نظر عہد کی منڈی کے کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ سورت کے ایک خط میں اس دھات کے یک بیک نرخ گراں ہو جانے کے دو سبب بیان کئے گئے ہیں:۔ ایک تو یہ کہ درآمدہ مال کم تھا اور دوسرے یہ کہ خانہ جنگی کے باعث شمالی معادن میں کان کن تھوڑے رہ گئے تھے۔ گجرات کے حکام نے اس کمی کا چارۂ کار یہ اختیار کیا کہ مسکوک یا غیر مسکوک تانبے کی برآمد کی ممانعت کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپے ۱۴۷
کی قیمت بڑھ کر ۳۰ تا ۳۲ دام ہو گئی۔ غرض ہمارے عہد کے اواخر میں تانبے کی قیمت چاندی کے حساب سے مستقلاً ۲۰ فیصدی کے قریب چڑھ گئی تھی اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ میں ۵۲ پیسہ، ستمبر میں ۵۴، جنوری سنہ ۳۰ء میں ۵۵ اور اکتوبر میں ۵۸ پیسہ تحریر ہے۔

[1] مغربی ہندوستان میں اس قدر دیر میں بہم رسانی کی توجیہ یہ ہوگی کہ سنہ ۱۶۲۹ء سے سنہ ۱۶۳۴ء تک ولندیزوں کا کاروبار جاپان میں قریب قریب معطل رہا کیونکہ بعض سیاسی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں مگر جب یہ بالآخر رفع دفع ہو گئیں تو اسی کے ساتھ تانبے کی ہندوستان میں درآمد شروع ہو گئی۔

روپے کے پیسوں کی تعداد ۸۰ کی بجائے، جو پہلا معیار تھا، قریب قریب آجکل کے مسلمہ معیار یعنی ۶۴ پیسہ فی روپیہ ہو گئی تھی۔ مزید برآں شمال ہندوستان میں تانبے کی رسد صرف مقامی معادن تک محدود نہ رہی بلکہ اس کا ایک حصہ جاپان کی کانوں سے بھی آنے لگا تھا۔

یہ تو تحریری شواہد تھے۔ لیکن تانبے کے نرخ میں دفعتہً اس گرانی کا کوئی سبب مجھے لکھا ہوا نہیں ملا۔ چاندی کی قیمتوں کے متعلق ہماری تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سبب چاندی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کا تعلق تانبے سے ہوگا یعنی یا تو اسکی مانگ میں مستقلاً بیشی ہو گئی تھی یا اس کی بہم رسانی میں مستقلاً کمی کا پتہ چلانا چاہیئے۔ مانگ کا بڑھنا بجائے خود غیر اغلب ہے اور اس عہد کی تاریخ سے بھی اس کی کوئی تائید مجھے نہیں ملتی۔ نہ میں اس بارے میں کچھ قیاس دوڑا سکا کہ اصلی واقعات کیا ہو گئے؛ لیکن مجھے زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۳۰ء سے پہلے کے سنین میں ہندوستانی معادن میں تانبہ کم رہ گیا اور نرخ میں مستقل بیشی کا ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ یہ کمی عارضی نہ تھی۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ راجپوتانہ اور وسط ہند کی کانیں اکبری عہد سے ختم ہو گئی تھیں جب کہ ساری مغلیہ سلطنت میں انھی کا تانبہ خرچ ہوتا تھا۔ لہذا میں خیال کرتا ہوں کہ ان میں سے بعض کے ختم ہو جانے کا زمانہ یہی تھا اور اسی سبب سے ولندیزوں کو موقع ملا کہ گجرات میں بھی باہر کا تانبہ لائیں اور نفع سے فروخت کریں۔

باب پنجم کے ماخذ

مجموعی طور پر اس بات کے وافغات انگریزوں کی ان تجارتی تحریروں سے اخذ کئے گئے ہیں جو لیٹرز ریسیوڈ اور انگلش فیکٹریز میں مندرج ہیں۔ اور داغ رجسٹر کی اطلاعات متعلق بہ ہندوستان کو سامنے رکھا ہے۔ ذیل میں حوالے کی کتابوں کی جو تفصیل لکھی ہے وہ جامع اور مانع نہیں بلکہ محض تصریح کے واسطے ہے ورنہ منڈیوں کی پوری پوری کیفیت سمجھنے کے لئے ان ماخذ کو بالتفصیل مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے؛

فصل اول

فنچ کی رائے ہندوستانی سوداگروں کی نسبت لیٹرز ریسیوڈ (جلد اول۔ ۳۰) میں موجود ہے۔ بیسنے کے اجارے کیلئے ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز (اول، ۱۳۴) شورے کے لئے ایضاً (ہشتم) اور داغ رجسٹر۔ ۳۱ مارچ ۱۸۶
۱۶۴۱ء؛

تانبے کی برآمد روکنے کا ذکر بھی اسی رجسٹر میں (بابت ۱۸ اکتوبر ۱۶۶۱) موجود ہے؛ احمد آباد کے نیل کے اجارے کا قصہ انگلش فیکٹریز میں ملتا ہے (ہشتم، ۱۳۰) مصالحے کے اجارے کا، داغ رجسٹر میں کپڑے کا اس میں اور انگلش فیکٹریز میں (چہارم، ۲۰۹) قحط میں اجناس خوردنی

کے متعلق دیکھو ایضاً (اول ۔ ۱۴۷) اسی جلد میں نیل کے بادشاہی اجارے کا تذکرہ ہے (۳۲۴) ہگلی کی عام اجارہ داری اور ولندیزی تجارت کے ٹھیکہ کا حال داغ رجسٹر سے لیا ہے۔ میر جملہ کے حالات اور اس کی تجارتی سرگرمیاں منوکی (اول)، اور انگلش فیکٹریز (نہم، دہم) سے مروی ہیں۔ اسی کتاب اور آگرہ اکاونٹس، اور منڈی (دوم) سے مصارف باربرداری کے اعداد لئے ہیں۔ مصنف نے شمالی ہندوستان کے نرخ اجناس پر ایک مستقل مضمون بھی ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء اور جنوری ۱۹۱۸ء میں تحریر کیا تھا۔

فصل دوم

تجارتی تحریروں میں انگریزوں اور ولندیزوں کی رقابت کا ہر جگہ تذکرہ آتا ہے (سوم، پنجم وغیرہ) ان کے ملکر کام کرنے میں جو دشواریاں تھیں ان کیلئے دیکھو ایضاً (پنجم)، ویرجی بوہرے کا ذکر انگریزوں اور ولندیزوں کی تحریروں میں اس کثرت سے آتا ہے کہ الگ الگ انکا حوالہ دینا طوالت کا موجب ہوگا۔ مختلف عنوانات کے تحت میں ذیل کے چند حوالے لکھنا کافی ہے:-

اُسکے تجارتی جتھے۔ داغ رجسٹر بابت اکتوبر ۱۶۴۱ء و جون ۱۶۴۵ء (سورت) انگلش فیکٹریز (ہشتم، ۲۰۶ و ۲۵۷) ممالک خارجہ سے اسکے تعلقات ایضاً (پنجم، ۲۴ و ۲۱۸) وغیرہ۔ حکام سے اس کی الجھنیں۔ ایضاً (چہارم) انگریزوں کو اس کا قرض دینا۔ ایضاً (چہارم، پنجم، ہفتم، نہم، دہم) اُسکا تمول تخمینے فور ۶۴۹ ملیا کا انگلش فیکٹریز میں کہیں کہیں اور داغ رجسٹر میں اکثر مقامات پر ذکر آتا ہے۔ اسکی موت کیلئے دیکھو رجسٹر بابت ۱۴ اگسٹ ۱۶۴۳ء۔ اسکے جانشین کی ملکی خدمات کیلئے، ایضاً یکم جون ۱۶۴۴ء۔ مالی حیثیت، ۱۴ مارچ ۳۷ء وغیرہ۔ اسکی تجارتی حکمت عملی، ۱۹ اگسٹ ۱۶۴۵ء۔

دلالوں کے کاروبار کیلئے خاص طور پر دیکھو فیکٹریز (پنجم) انکی بدمعاشی، ایضاً (سوم وغیرہ) صرافوں کیلئے ایضاً اور ٹے ورنیر (اول ۲۹۷) بحری بیمہ کا، فیکٹریز (دوم وغیرہ) میں ذکر ہے۔ منڈی اُٹھ جانے اور خسارہ ہونے

باب پنجم کے ماخذ

کیلئے، (عدن کے بارے میں) دیکھو رجسٹر ۲۲ مارچ ۱۶۳۶ء۔ (مخہ و بصرہ کیلئے) الیضاً ۸ جولائی ۱۶۴۴ء (سورت) نیز فیکٹریز (ہفتم وغیرہ) اجین کیلئے رجسٹر ۲۰ مئی اور ۱۵ ڈسمبر ۱۶۴۱ء وغیرہ۔

فصل سوم

نیل کے نرخوں کا حوالہ جو منقولہ نرخ نامے میں دے دیا گیا ہے۔ ابتدائی اوسط اور فتح کے تخمینوں کے لئے ملاحظہ ہو لیٹرز رسیوڈ (اول، ۲۳ وغیرہ) ۱۶۳۰ء میں قحط کے نرخ کے متعلق دیکھو فیکٹریز (چہارم، ۱۲۵) زراعت کی کمی کیلئے ایضاً آمیزش، ایضاً (ششم وغیرہ) لٹے ورنیر کا بیان نرخوں کے متعلق اس کی کتاب کی جلد دوم صفحہ ۹ پر درج ہے۔

فصل چہارم

پارہ: مانگ کے لئے دیکھو فیکٹریز (سوم وغیرہ) انفرادی
تجارت۔ ایضاً (چہارم) کورٹ منٹس بابت ۱۳ فروری ۱۶۲۹ء
وغیرہ۔ ۱۶۲۶ء تک کے نرخ لیٹرز رسیوڈ اور فیکٹریز کے مختلف
مقامات سے اخذ کئے ہیں۔ نیز دیکھو فیکٹری ریکارڈز (سورت) ۱۸۷
جزو ۱۰۲۔ لنشان ۴۷۸ء اور جنرل کرس پونڈینس، ۱۲۔۴۔۱۶۳۰ء
میں درآمد کی افراط اور نتیجتہً نرخ کی کمی فیکٹریز (چہارم و پنجم) میں مذکور
ہے بعد میں نرخ کی بحالی کے لئے دیکھو ایضاً (چہارم وغیرہ) اور
داغ رجسٹر یکم مئی ۱۶۶۱ء۔

سیسہ: سرکاری اجارہ داری کے لئے دیکھو فیکٹریز (اول۔ سوم وغیرہ) انتقال پذیر ہنڈیوں کے لئے، ایضاً (پنجم، ششم وغیرہ) منقولہ نرخ لیٹرز رسیوڈ اور فیکٹریز کی مختلف جلدوں، نیز اور جنرل کرس پونڈینس، ۱۶۹۴ء اور ۱۸۰۸ء سے لئے گئے ہیں۔

لونگ: مغل دار السلطنت کے نرخ آئین اکبری میں مذکور ہیں۔ (انگریزی ترجمہ۔ جلد اول، ۶۴) سورت کے سب سے پہلے کے نرخ

باب پنجم کے ماخ

کرس پونڈینس ۶۰۹ء، ٹرپ اسٹر از سورت (ضمیمہ ہفتم) اور فیکٹریز (دوم، ۲۵) میں درج ہیں۔ انھی ماخذوں اور داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں سے ۱۶۳۳ء تا ۱۶۴۹ء کی قیمتیں نقل کی ہیں۔ آخر میں ولندیزوں کے اجارے اور تعین قیمت کے لئے دیکھو، ایضاً بابت ۲۷ مارچ ۱۶۳۱ء وغیرہ وغیرہ۔

فصل پنجم

شمالی ہندوستان کے نرخ اجناس پر میں نے اپنے مذکورہ بالا مضمون (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی) میں بحث کی ہے۔ سورت کے نرخ لیٹرز ریسیوڈ (اول) فیکٹریز (اول، دوم) اور فان ٹوسٹ (سوم) سے منقول ہیں۔ زمانہ قحط کی گرانی اور بعد کی ارزانی کے لئے دیکھو فیکٹریز (چہارم، ۹۵ وغیرہ، پنجم ۴۶ وغیرہ) اسی کتاب (ہفتم، ہشتم، نہم) میں تخفیف مصارف کا ذکر آتا ہے۔ چپراسیوں کی تنخواہ کے بارے میں ملاحظہ ہو ایضاً (پنجم، ۱۵۱) اوِنگٹن، ۳۹۲۔ ۱۶۵۸-۵۹ء کی گرانی کے لئے دیکھو فیکٹریز (دہم، ۱۹۶ و ۳۰۶) اور سمندر کے ذریعے غلے کے لانے لے جانے کے متعلق، ایضاً (چہارم، ہشتم)۔

سورت کے دار الضرب کا اسی کتاب میں ذکر ہے (اول، پنجم، ششم)۔ نیز دیکھو آئین اکبری (ترجمہ۔ اول، ۳۱)۔ مشرقی ساحل پر تنخواہوں کے متعلق دیکھو میتھوولڈ ۱۰۰۱۔ فیکٹریز (دہم، ۲۹۱) بنگالے میں نرخ کی بیشی کے لئے۔ ایضاً (۴۰۷)، اور اس سے پہلے کی ارزانی کیلئے ایضاً، (ہشتم، ۳۳۸) اور جرنل کرس پونڈینس ۱۶۸۸ء پر چاس (دوم، دہم، ۲۰، ۱۷، ۳۷، ۱۲) میتھوولڈ ۱۰۰۵۔ بنگالے میں ولندیزی تجارت کی مالیت داغ رجسٹر بابت سنین متعلقہ کے مختلف داخلوں سے ماخوذ و ملخص کی گئی ہے۔

* * *

باب پنجم کے ماخذ

فصل ششم

سورت میں سونے کے نرخ پر جو کچھ رائے زنی کی گئی ہے، وہ انگلش فیکٹریز (سوم۔ چہارم وغیرہ) کے بیانات پر مبنی ہے۔ تانبے کے متعلق ہم تفصیل سے "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" میں بحث کر چکے ہیں (۱۴۸ و مابعدہا) مبادلے کے ابتدائی نرخ پلسارٹ (دوم) لیٹرز رسیوڈ (اول و سوم) فیکٹریز اول، ۱۰۰ وغیرہ) سے منقول ہیں۔ اور مابعد کے نرخوں کے لئے ملاحظہ ہو ایضاً (چہارم و پنجم) اور داغ رجسٹر بابت ۲۶ جولائی ؁۱۶۶۱ تانبے کی برآمد بھی اسی کتاب کے مختلف داخلوں میں صراحتاً یا ضمناً مذکور ہے۔ نیز دیکھو فیکٹریز (دوم، ۲۶۰ وغیرہ) ؁۱۶۶۱ کی تجارتی ہل چل کے لئے دیکھو۔ ایضاً (دہم، ۳۰۶) اور اسی سال کے داغ رجسٹر کی متفرق عبارات میں بھی بہت تفصیل سے اس کا ذکر آتا ہے۔

باب ششم

۱۸۸

پیدائش و خرچ

۱۔ پیدائش کے تغیرات

"ہندوستان بوقت وفات اکبر" کے تیسرے اور چوتھے باب میں پیدائش اشیا کی تنظیم بیان کی جا چکی ہے۔ ہمارے پیش نظر عہد کی ابتدا میں وہی تنظیم جاری تھی اور میرے لئے اسی بحث کو دہرانا تضیع اوقات ہوگا۔ سترھویں صدی کے نصف اول کی تاریخیں اس تنظیم کو باضابطہ یا مفصل بیان نہیں کرتیں لیکن ان سے ضمناً واقعی حالات کا بہت کچھ پتہ ضرور چل جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ کہنا کچھ بہت بیجا نہ ہوگا کہ تجارتی تحریروں میں پیدا آوروں (یا کاسبین) کی سرگرمی کی ہر جھلک اُن آرا کی مصدِّق ہے جو اپنی پچھلی کتاب میں میں نے پیش کی ہیں بحالیکہ مجموعی طور پر ان تحریروں کا کوئی دوسرا مطلب استخراج نہیں کیا جا سکتا۔ ملکی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین تھی اور چھوٹے چھوٹے قطعات ایسے مزارعین کاشت کرتے تھے جن کے پاس عموماً سرمایہ نہ تھا مگر سرکاری مالگذاری کا بڑا حصہ یہی لوگ ادا کرتے تھے۔ پیدائش کی دوسری صورتیں بھی خواہ کان کنی ہو یا صنعت بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانوں کی شکل میں منظم تھیں جن کی خصوصیت یہ تھی

کہ سرمایہ قلیل اور سرکار یا اس کے عمال کے مطالبات سر پر چڑھے رہتے تھے۔ کاسبین قدرتی طور پر مال کے خریداروں کے جویا تھے لیکن نئے خریداروں کو خود ڈھونڈ لینے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ مغربی ممالک میں آجکل صنعت و پیداوار کی جیسی سرگرم کوششیں نظر آتی ہیں اس قسم کی سرگرمی کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور ۱۸۹ ملکی انتظامات بھی، جیسا کہ ہم آگے مطالعہ کرینگے، اس نوعیت کے تھے کہ لوگوں میں ایسی حوصلہ مندی کا مادہ تھا بھی، تو وہ ترقی کرنے کی بجائے ان حالات میں اور بھی ٹھٹھر کے رہ جاتا تھا۔ خود اپنے پیش نظر عہد کی ابتدا کا انتہا سے مقابلہ کریں تو ہمیں اشیائے پیدائش یا تدابیر و وسائل پیدائش میں کوئی خاص تغیر نہیں نظر آئیگا۔ ہمعصر تحریروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ صرف خریداروں کے لئے مال کی بہم رسانی، اس کوشش میں جس حد تک کامیابی ہوئی، اور نیز عمال کی مختلف قسم کی کارروائیوں سے جو دقتیں اور موانع پیش آتے ان کی داستان ہے؁

جہاں تک زراعت کا تعلق ہے، بیوپار کے کام کی پیداوار میں صرف ایک تغیر ہوا اور وہ تمباکو کی جدید کاشت تھی[۱]۔ کسی گذشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کا خشک پتہ ساحل کورومنڈل اور گجرات دونوں علاقوں سے دساور جانے لگا تھا مگر معلوم ہوتا ہے خود ہندوستان میں اس کی کھپت نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کی۔ جہانگیر نے ۱۶۱۷ء میں تمباکو کشی کی ممانعت کر دی تھی

---

[۱] انگلش فیکٹریز (جلد اول، ۲۹۶۔ دوم، ۷۰) میں دو حاشیوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مکا (یا مکئی) کا بیوپار شروع ہو گیا تھا مگر اسی کتاب میں آگے چلکر اس کی تصحیح کر دی ہے (جلد ہفتم، ۶۶) کہیں کہیں آلو کا ذکر آیا ہے (ایضاً۔ دوم، ۹۱۔ ہینھو ولڈ ۹۹۵) لیکن اس کا کوئی اشارہ مجھے نہیں ملا کہ اس کی تھوک کی تجارت ہونے لگی تھی۔ اور یہ بھی یقین کے ساتھ کہنا غیر ممکن ہے کہ اس لفظ سے زمین قند ترکاری کی کونسی قسم مراد ہے کیونکہ سترھویں صدی میں "پٹیٹو" (= آلو) کے معنی میں کئی رد و بدل ہوئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے ماخذوں میں اس لفظ سے شکر آلو مراد ہوں؁

اس کا اثر تو جو کچھ ہوا ہو لیکن اس امتناعی حکم ہی سے ظاہر ہے کہ یہ عادت بہت عام ہوتی جاتی تھی۔ منوچی عہد اورنگ زیب کے ابتدائی سنین کے تذکرے میں لکھتا ہے کہ محاصل کا ستاجر صرف شہر دہلی کے تنباکو کا محصول پانچ ہزار روپیہ روزانہ ادا کیا کرتا تھا اور گو اس رقم کی صحت میں کلام ہے کہ اس قدر زیادہ محصول وصول ہونا بالکل ناممکن نظر آتا ہے تاہم اس کے بیان سے ہم اتنا ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ تمباکو کا استعمال بہت پھیل گیا تھا۔ آخر میں منوچی یہ بھی لکھتا ہے کہ محصل کی ایک بدعنوانی کی بنا پر یہ محصول منسوخ کر دیا گیا جس سے غریب غربا کو بہت فائدہ ہوا۔ اور اس آخری رائے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تمباکو عوام الناس تک میں مروج ہو گیا تھا۔ غرض یہ ایک جدید اور نفع آور تجارتی پیداوار ہونے لگی تھی مگر جیسا کہ میں نے لکھا فہرست اجناس میں یہ صرف واحد اضافہ تھا؛

وہ زرعی پیداواریں جن کی تجارتی مانگ میں اضافہ ہوا، نیل اور روئی تھیں اور انھی کے ساتھ ریشم کو بھی گن لینا چاہیئے کہ یہ زیادہ تر ان کیڑوں سے حاصل ہوتا تھا جو گھروں میں پالے جاتے تھے اور ان کے لئے شہتوت کاشت کیا جاتا تھا۔ ایک گذشتہ باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نیل، سوت اور لٹھے کی یوروپی خرید کا کم سے کم ایک بڑا حصہ یقیناً نئی برآمد میں داخل ہے اور ۱۹۰ اسی طرح بنگالے کے ریشم کی جاپان میں نکاسی نئی تھی اور یہ حقیقت کہ نئی مانگ پوری کر دی گئی، ثابت کرتی ہے کہ پیداوار کے حسب ضرورت بڑھنے میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ کاشتکار فصل کے معاملے میں رسم قدیم ہی کے پابند نہ تھے بلکہ منڈی کا رنگ دیکھ کر کام کرنا چاہتے تھے۔ قحط کے بعد گجرات میں سوتی کپڑے کی کمی کا سبب انگریز سوداگروں نے روئی کی کمی کو بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ،، ہمارے خیال میں اس کی بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ چند گذشتہ سال میں غلے کی قیمتیں بہت چڑھی رہیں اور یقیناً اس سے دیہات کے لوگوں کو تحریک ہوئی کہ وہی اجناس کاشت کریں جو سب سے زیادہ نفع رساں ہوں چنانچہ روئی کی زراعت انھوں نے موقوف کر دی ،، اسی طرح سنہ ۱۶۴۴ء میں ہم سنتے ہیں کہ سندھ میں نیل کی پیداوار سال بسال کم ہو رہی ہے کیونکہ مانگ میں تخفیف

ہوگئی اور نرخ گر گیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ ممکن ہے کہ طلب اور بہم رسانی کے مطابق ہونے میں تاخیر واقع ہوتی ہو یا یہ مطابقت کچھ نامکمل رہے۔ مثلاً گذشتہ باب میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ۱۶۲۲ء کے قریب گجرات میں نیل کی ارزانی کا سبب غالباً یہ تھا کہ مغربی یورپ کی نئی مانگ کا اندازہ اصل سے زیادہ کرلیا گیا تھا۔ اسی طرح دوسری صورتوں میں یہ ہوسکتا ہے کہ سرمائے کی قلت کاشتکاروں کو فائدے کے موقع سے کام لینے میں مانع ہوتی ہو جیسا کہ ۱۶۴۴ء میں سندھ میں یا ایک سے زیادہ بار کورومنڈل کے ساحل پر ہوا۔

اسی مضمون کی زیادہ وضاحت اُن اتفاقی واقعات سے ہوتی ہے جو ایک خاص جنس کی طلب کے یک بہ یک بڑھ جانے کے باعث وقوع میں آتے تھے۔ یاد ہوگا کہ انگریزوں کے بحر قلزم کی تجارت میں ہاتھ ڈالنے کی مزاحمت ہوئی تھی اور جیسا کہ ہم ایک ابتدائی باب میں لکھ چکے ہیں اس مزاحمت کا ایک جزئی سبب یہ اندیشہ تھا کہ تمام سوداگروں کے لئے سوتی مال کافی بہم نہ پہنچ سکیگا اور فی الواقع ۱۶۱۸ء میں ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ اسی طرح دس سال بعد سُورت کے انگریز خریداروں سے ہندوستانی جلاہوں نے متحد ہوکر مقاطعہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنے خام مال کی کھپت کے متعلق سخت اندیشہ مند ہوگئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں صورتوں میں یہ خوف بجا تھے۔ دراصل عام طور پر منڈی میں جو کپڑا یا سوت بیچنے کے لئے لایا جاتا تھا، وہ قلیل مقداروں میں ہوا کرتا تھا اور ان سب کے ایک دم باہر چلے جانے کی صورت میں تجارت پر بڑا اثر پڑسکتا تھا لیکن اصل بات جتانے کے لائق یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات آئندہ پیش نہیں آئے۔ انگریزوں کو ہم چند ہی سال بعد کہیں زیادہ مقداریں
سوتی پارچہ خریدتے دیکھتے ہیں اور ولندیز بھی اسی قدر کثیر مقداریں سوت کی ۱۹۱
خریداری کرتے ہیں۔ باوجود اس کے ایسی کسی مخالفت کے آثار نہیں پائے جاتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا عین قرین صواب ہوگا کہ کپاس اور سوت کی بہم رسانی اب اضافہ شدہ طلب کے برابر ہونے لگی تھی۔ انگریز سوداگروں کی نیل

کی خریداری کے متعلق ہم ابتدا میں بھی اس قسم کا کوئی قضیہ نہیں پڑھتے مگر اس معاملے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس وقت انگریزوں نے واقعی تندہی کے ساتھ خریداری شروع کی تو اس وقت جنگ کی وجہ سے پرتگیزوں کی خریداری رکی ہوئی تھی اور غالباً جتنا مال تیار ہوتا تھا، وہ زیادہ نہیں تو سب خریداروں کے واسطے کافی ضرور ہو جاتا تھا۔ رہا ریشم، تو اس تجارت کا جو زمانہ سب سے نازک دشوار تھا، اُن سنین کے رسائل بتاویہ غائب ہیں اور ہمیں کچھ علم نہیں کہ ولندیزوں کی خریداری میں ابتداءً کیا مزاحمت پیش آئی؟ لیکن جب یہ تجارت پوری طرح چل نکلی تو ریشم کی وسیع برآمد کی کسی مقامی مخالفت کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر اس کا اثر یہ ہوتا کہ ہندوستان کے کاریگروں کو مال ملنے میں دشواری پیش آتی تو ہم یقیناً مخالفت ہوتی دیکھتے۔ لہٰذا اغلب یہی ہے کہ اس صورت میں بھی پیداوار نئی مانگ کے مطابق زیادہ ہونے لگی تھی۔

مذکورہ بالا نتائج اس شہادت کی تائید کرتے ہیں جو بلاواسطہ ہم کو اس امر کی میسر آتی ہے کہ کاشتکار پوری کوشش کرتے تھے کہ منڈی کا رنگ دیکھ کر کام کریں۔ علیٰ ہذا ان نتائج سے یہ تصدیق بھی ہوتی ہے کہ ولندیزوں اور انگریزوں کی خریداری کی بدولت نیل، روئی اور غالباً ریشم کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا۔ باقی دوسرے کسی اعتبار سے مجھے کوئی شہادت نہیں ملی جس سے یہ مترشح ہو کہ ہمارے پیش نظر عہد میں زرعی پیداوار میں کوئی خاص تبدیلی ہوئی حقیقت میں اس عہد کی نمایاں خصوصیت پیداوار نہیں بلکہ تقسیم اجناس سے متعلق ہے اور اسے مالگذاری انتظامات کے سلسلے میں مطالعہ کرنا سب سے آسان ہوگا کہ یہی انتظامات زرعی پیداوار سے براہ راست اور سب سے قوی علاقہ رکھتے تھے

سردست اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ کاشتکار کی بچت میں کمی کے آثار نمایاں تھے بلکہ اکثر مقامات پر خرچ سے آمدنی کی بیشی بالکل غائب ہو چکی تھی اور اسی نسبت سے نئی پیداوار میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت بھی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے پیشے کا اصل اصول یہ آٹھیرا تھا کہ سال بہ سال منڈی کا رنگ دیکھ کر اسی کے مطابق کھیتی کرتا رہے اور منڈی میں آئے دن تغیر کے علاوہ ایک پیچیدگی

یہ آپڑی تھی کہ سرکاری مداخلت کا امکان تھا جس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں اور جس سے کاشتکار کے متوقعہ نفع میں رکاوٹ پڑسکتی تھی جیسا کہ نیل کی سرکاری اجارہ داری کی صورت میں ہوا۔ زیادہ دُور کے فائدے پر نظر رکھنا غالباً ۱۹۲ عقل کے خلاف تھا اور جو کچھ تحریری شہادتیں محفوظ ہیں، ان سے اس قسم کی کسی دوراندیشی کا پتہ نہیں چلتا؛

زراعت کے بارے میں جو کچھ اوپر بیان ہوا، پیدائش کی دوسری صورتوں پر بھی بہت کچھ صادق آتا ہے۔ معدنیات کی مد میں ہمارے زمانے کا سب سے ممتاز واقعہ شورے کی تجارت کو سمجھنا چاہیے جس کی پہلے مشرقی ساحل پر اور پھر بہار میں بہت کچھ قدرومنزلت بڑھی۔ اس کی کثیر برآمد میں مزدوروں کی بھی خاصی بڑی تعداد مصروف بکار رہتی تھی لیکن یہ نفع ایک چھوٹے رقبے کی آبادی تک محدود تھا۔ گولکنڈے کے آہن کنوں کو بتاویہ کی مانگ سے ممکن ہے کچھ فائدہ ہوا ہو کہ بعض اوقات ولندیز مچھلی پٹم سے معتدبہ مقدار میں لوہا اور فولاد خرید کر باہر لے جاتے تھے لیکن اول تو مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ کس حد تک نئی تجارت تھی اور دوسرے اس کا احاطۂ اثر لازماً مقامی تھا۔ اس کے مقابلے میں تانبے کی بعض کانوں کے غالباً ختم ہوجانے سے ہندوستان کو نقصان بھی ہوا جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں منڈی کے نرخ دیکھکر نتیجہ نکال چکے ہیں؛ اس بحث پر ہماری واقفیت انھی تین تغیرات تک محدود رہے؛

مغربی یورپ کی نئی مانگ پوری کرنے کے لئے لٹھے کی تیاری میں تو ضرور اضافہ ہوا لیکن اس کے سوا دوسری مصنوعات میں کسی خاصی تبدیلی کے

---

[1] ۱۶۶۰ء کے قریب ولندیز، گوداوری کے دہانے پر لوہے کے کاروبار کو ترقی دینے میں سرگرم نظر آتے ہیں، اور وہ باہر سے جن کاریگروں کو لے کر آئے، ان کی بدولت معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت میں واقعی ترقیاں ہوئیں، لیکن یہ حالات ہمارے عہد کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں؛

آثار نہیں پائے جاتے۔ جلاہوں کی حالت اس زمانے کی تجارتی تحریروں سے صاف نظر آتی ہے کہ ایک طرف تو ہر شخص صرف اپنے لئے کام کرتا ہے اور دوسری طرف وہ سرمایہ دار کے پنجے میں پھنسا ہوا ہے جو بسر اوقات اور ضروری ساز وسامان خریدنے کے واسطے اسے پیشگی روپیہ دیتا رہتا ہے، تاجروں کے پیشگی رقم دینے کا یہ ضابطہ بخوبی معلوم ہے اور اس کی مزید صراحت کی ضرورت نہیں نظر آتی۔ ولندیز اور انگریز ہندوستان آئے تو یہ طریقہ پوری طرح مروج تھا اور انھیں بھی مال بہم پہنچانے کے لئے اس کو اختیار کرنا پڑا۔ اس طریق عمل میں خاص خاص مشکلات بھی تھیں جیسا کہ ہم پہلے مطالعہ کر چکے ہیں لیکن جب تک زر اصل کی فراہمی کی کوئی دوسری صورت نہ نکلے، اس وقت تک اس طریق کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ بہر حال گمان غالب یہ ہے کہ ولندیزوں اور انگریزوں کی آمد جلاہوں کے حق میں مفید ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ ایک دفعہ پیشگی روپیہ لینے کے بعد پھر کوئی ردوبدل نہ ہو سکتا تھا تاہم خریداروں کی تعداد میں
اضافہ ہونے سے جلاہوں کو یہ موقع ضرور مل گیا کہ جہاں سب سے اچھے دام ۱۹۲
ملیں، وہاں معاملہ کریں اور باہمی قرارداد میں بھی کچھ بہتر شرطیں منظور کرا سکیں۔ ان حالات کی تفصیل دیکھنی ہو تو ان مختلف اطلاعات کا مطالعہ کرنا چاہئے جن میں کسی ایک ہی قسم کا مال فراہم کرنے کے امکانات پر بحث ہے۔ اب اگر کسی جگہ بہت سے خریداروں میں مقابلہ ہوتا تو جلاہے، کپڑے میں کسی قسم کا تغیر نہ کرتے تھے لیکن جہاں ولندیزوں یا انگریزوں کے سوا اور کسی کی خریداری کی امید نہ ہوتی وہاں وہ ان کے حسب دلخواہ یورپ کی منڈی کے مناسب کپڑا تیار کر دیتے تھے۔ چنانچہ ولندیزوں کو پولی کٹ میں اور کچھ مدت بعد انگریزوں کو مدراس میں ایک بڑا استجارتی فائدہ یہی حاصل تھا کہ مقامی پارچہ بافوں پر انھیں قابو حاصل ہو گیا تھا۔

جلاہے اپنے کام میں کلیتہً آزاد نہ تھے بلکہ جیسا کہ گذشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں ان کی خدمات کا مشرقی ساحل اور گجرات میں کبھی کبھی اجارہ لے لیا جاتا تھا۔ اسی طرح بنگالے میں باریک پارچے پر غالباً دربار شاہی کی طرف سے

بعض قیود عاید کی گئی تھیں کیونکہ ہم " بادشاہی جلاہوں کے ایک داروغہ " کا ذکر پڑھتے ہیں۔ اس کے عہدے کی کیفیت کسی ہمعصر تحریر میں میری نظر سے نہیں گزری لیکن ولندیز سوداگر شکایت کرتے ہیں کہ وہ ان کی تجارت میں رخنے ڈالتا رہتا تھا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ محلات شاہی میں ململ کی بہم رسانی اس کا کام تھا اور یہ ایسی ضرورت تھی کہ سوداگروں کی تجارتی ضروریات کو اس کے مقابلے میں نظر انداز کرنا پڑتا تھا۔

دوسری قسم کے اہل حرفہ کی نسبت ہماری معلومات ناقص ہے لیکن
پارچہ بافی میں جو اصول رائج تھے، بظاہر انھی پر دوسری صنعتوں میں بھی عمل ہوتا
تھا۔ مثلاً، شورے کی بہم رسانی بھی پٹنے کی نواح میں پیشگی رقوم پر مبنی تھی۔ بیانہ،
سندھ اور مشرقی ساحل کے علاقوں میں نیل کے لئے بھی پہلے سے روپیہ ادا
کرنا ہوتا تھا گو گجرات میں اس کی نیاری مقامی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں
تھی اور وہی کاشتکاروں کو روپیہ دیتے رہتے ہونگے۔ تیاری کے طریقوں میں
خود بخود کسی اصلاح و بہتری کی امید نہ تھی اور وقتی حالات اس کے مساعد
نہیں نظر آتے۔ کچھ تھوڑا بہت رد و بدل ہوا بھی، تو وہ ولندیزوں یا انگریزوں
کی کوشش کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ شورہ صاف کرنے کے لئے تانبے
کے برتنوں کا استعمال، گجرات میں اس قسم کے نیل بنانے کی کوشش جیسا
شمالی ہندوستان میں ہوتا تھا۔ رنگنے، رسی بنانے اور شاید جہاز سازی میں
بعض اصلاحات، بس ہندوستان کی صناعات میں ترقی کی کل کائنات یہی ہے ۱۹۴
اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہاں کی زراعتی اور صنعتی دنیا کس قدر جمود
کے عالم میں تھی[1]۔

---

[1] نیل اور شورے کی تیاری میں جو اصلاحیں کی گئیں یا اصلاح کی کوشش ہوئی، اس کا ذکر چوتھے اور پانچویں باب میں ہم کر چکے ہیں۔ احمد آباد میں مقامی رنگ ریزوں کی نالائقی سے اس قدر نقصان ہوتا تھا کہ اس سے بچنے کے لئے ۱۶۴۷ء میں ایک علاحدہ کارخانہ رنگنے کا قائم کیا گیا تھا (انگلش فیکٹریز، ہشتم، ۵۹) مشرقی ساحل پر ولندیزوں کے

شہروں میں مزدوری کی شرح مختلف تھی لیکن کسی خاص علاقے میں ہر جگہ یکساں اجرت ادا کی جاتی تھی اور طرفہ تر یہ کہ اس تعین میں کام کی نوعیت کا بھی قریب قریب کوئی لحاظ نہ ہوتا تھا۔ آگرے کے حالات میں پلسارٹ ہر قسم کے صناعوں کی ایک ہی شرح اجرت نقل کرتا ہے اور اس سے چند سال پہلے میتھوولڈ نے مشرقی ساحل کے بارے میں اسی قسم کی اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس یکسانی کی بنا پر، اگر کسی خاص جماعت کے متعلق ہمیں مواد مل جائے تو ہم اسی علاقے کے جملہ کاریگروں کی اجرت کا استخراج کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ کسی خاص پیشے کے متعلق بھی ایسے صحیح اعداد میسر نہیں آتے کہ کوئی عام نتیجہ نکالا جا سکے اور ہمیں توازن کی غرض سے صرف ان تنخواہوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو فرنگی کارخانوں میں ہندوستانی چپراسیوں کو ملا کرتی تھیں حالانکہ یہ چپراسی کسی خاص فن سے نابلد اور محض خانگی ملازمین کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ماہانہ تنخواہوں پر قیاس آرائی کرنے میں ایک بڑے مغالطہ کا بھی خدشہ ہے۔ پلسارٹ کا بیان ہے کہ آگرے میں اکثر مہینے کے چالیس دن لگائے جاتے تھے اور اسی حساب سے بہت سے کاموں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ باقاعدہ رسیاں بنانے کا تذکرہ یوں ہی لئے گیا ہے (۱۰۲ و ۱۰۵) اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہاں کے جہاز بنانے والوں نے یہ فن (جہاز سازی) زیادہ تر انگریزوں سے سیکھا۔ لیکن میرا گمان ہے کہ اس صنعت میں کوئی ترقی ہوئی تو دراصل وہ ولندیزوں کے ابتدا کرنے کی بدولت ہوئی۔ ریشم کو چرخی چڑھانے میں بھی اصلاح کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن اس کا نتیجہ ہمارے عہد کی حدود سے باہر ہے۔

[1] آگرہ اکاونٹس سے مترشح ہوتا ہے کہ آئین اکبری (اول، ۲۲۵) میں اکبری عہد کی جو شرحیں درج ہیں ان میں اور پیش نظر عہد میں مشکل سے کوئی فرق پڑا تھا۔ عہد اکبری میں معمولی مزدوری کی اجرت ۲، اور ۳ دام یومیہ تھی۔ سنہ ۱۶۳۷ء میں ولندیز عام مزدوروں کو عموماً ۴ پیسہ (یعنی ۲ دام) اور کاردان آدمیوں کو ۶ پیسہ یومیہ ادا کرتے تھے۔ بڑھئی کی مزدوری ولندیز ۱۲، ۱۳ پیسہ یومیہ دیتے رہے اور اکبر کے عہد میں بھی کاریگروں کی اجرت ۶ اور ۷ دام سے زیادہ نہ ملتی تھی۔

کے نوکر ۳، ۴ روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ اور اس پر بھی بعض بعض مہینوں کی تنخواہ کپڑے یا دوسری اشیا کی صورت میں ادا ہوتی تھی۔ اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ للوٹہ دو ماہانہ” حقیقت میں تیسے ماہانہ سے بھی کم پڑتے تھے اور چونکہ ان معاملات میں ہندوستان کے اکثر علاقے آگرے کی تقلید کرتے تھے، لہٰذا ہماری یہ بدگمانی بیجا نہ ہوگی کہ بعض اور مقامات میں بھی ماہانہ تنخواہ کی شرح میں اسی قسم کا مغالطہ
۱۹۵ موجود ہے۔ اسی طرح جنس دینے کا بُرا طریقہ گولکنڈے تک میں معروف تھا چنانچہ ایک ولندیزی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے صوبہ دار اپنے عملے کو تنخواہ میں چاول اور نمک دیا کرتے تھے اور ان کی قیمت اصل لاگت سے ایک تہائی زیادہ لگاتے تھے۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ اور اشخاص بھی اپنے خانگی ملازمین سے اسی قسم کا سلوک کرتے ہونگے۔

مشرقی ساحل پر ۱۶۲۰ء کے قریب اُجرت کی جو شرحیں رائج تھیں، ان کو میتھو ولڈ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ”کاریگر مستری کی بڑی اُجرت ۳ پینی یومیہ ہے اور اس کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے ایک پینی یا کچھ کم پاتے ہیں“۔ معمولی شاگرد پیشوں کو ایک ریال یعنی دو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اب اگر روپیہ کو $2\frac{1}{4}$ شلنگ کے معادل سمجھا جائے اور یہ بھی فرض کرلیں کہ مزدوری برابر ملے چلی جاتی تھی تو بہترین کاریگر مستری کی ماہانہ اجرت $3\frac{1}{2}$ روپیہ خانگی ملازمین کی، عام معمولی کاریگروں کی (جو مستری کے ”نوکر“ ہوتے تھے) $\frac{1}{9}$ یا اس سے بھی کچھ کم تنخواہ تھی۔ گذشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس علاقے میں آیندہ تقریباً چالیس برس تک شرح تنخواہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور میں سمجھتا ہوں یہ قیاس کرنا بجا ہوگا کہ دوسرے کاریگروں کی شرح اجرت بھی اسی طرح اپنے حال پر قائم رہی۔ اگرچہ اس کی تصدیق میں کوئی قول مجھے اپنے ماخذ میں نہیں مل سکا۔ شمالی ہندوستان کے متعلق بھی ہمعصر اعداد و رقوم مفقود ہیں۔ گجرات کے صرف چپراسیوں کی تنخواہ کا پتہ چلتا ہے جس کا موازنہ ہم گذشتہ باب میں کرچکے ہیں خلاصہ یہ کہ ہمارے عہد میں شہری اجرتوں میں بیشی ہونے کی شہادت تو پائی نہیں جاتی اور اگر خانگی نوکروں کی تنخواہ پر قیاس کیا جائے تو

یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فی الواقع کوئی بیشی نہیں ہوئی[1] ؎

سلطنت مغلیہ میں ہمارے پیش نظر عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ سرکاری عمارتوں پر بہت کچھ روپیہ خرچ ہوا۔ اگرچہ یہ عمارات فائدۂ عامہ کے واسطے تعمیر نہیں ہوئی تھیں۔ فائدۂ عام کے تعمیری کام، جہاں تک مجھے علم ہے، صرف برہانپور میں آب رسانی کی اور پنجاب میں آب پاشی کی نہریں تھیں جن میں سے پہلی جہانگیر کے زمانے میں بنیں اور دوسری کی تعمیر یا مرمت شاہجہاں کے عہد میں ہوئی۔ لیکن برہان پور کی نہریں محض مقامی تھیں اور غالباً انھیں فوجی کہنا زیادہ ۱۹۶ صحیح ہوگا کہ برہانپور کئی سال تک محاربات دکن میں فوجی مرکز بنا رہا اور غالباً عام رعایا کی بجائے فوج کے واسطے آب رسانی کا یہ انتظام کیا گیا۔ رہی پنجاب کی نہریں تو وہ پردیسی تحریک کا نتیجہ تھیں یعنی ان کا بیڑا علی مردان خاں نے اٹھایا تھا جو ۱۶۳۷ء میں ایران کا تعلق چھوڑ کر آیا اور چند ہی روز بعد پنجاب کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا[2]۔ ۱۶۳۹ء میں اس نے دریائے راوی سے ایک نہر نکالنے کی تجویز کی جسکی ایک لاکھ روپیہ تخمینہ کے خرچ پر منظوری دی گئی۔ پھر چند سال بعد جمنا سے دہلی تک کی نہر اسی امیر کی نگرانی میں از سر نو تعمیر ہوئی۔ اس کے خرچ کا حساب کہیں میری نظر سے نہیں گزرا لیکن گمان یہ ہے کہ اس پر بھی پہلی نہر کے مماثل خرچ ہوا ہوگا

---

[1] ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۶۳۶ء میں جب گجرات کے نرخ حسب معمول ہو گئے تھے، ایک ہرکارہ سورت میں کچھ روز ٹھیرا لیا گیا تھا اور اسے ۳ پیسہ یومیہ بھتہ ملتا تھا۔ اسے انگلش فیکٹریز (پنجم، ۲۹۴) میں ایک ”دبلے پتلے مریل ٹٹو“ کے حقارت آمیز الفاظ سے یاد کیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے اس قسم کے آدمی کے گذارے کے واسطے کم سے کم اتنے پیسے درکار ہوتے تھے جو حساب سے ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کے برابر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اکبر کے دربار کے غلاموں کی قلیل ترین تنخواہ ایک دام یومیہ یا پون روپیہ ماہانہ تحریر ہے اور مقامی نرخ غلہ کے لحاظ سے یہ دونوں رقمیں قریب قریب برابر ثابت ہوتی ہیں ؎

[2] علی مردان خاں کو اکثر مہندس (انجینئر) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن ’نہر‘ کا لفظ

اور بہر حال یہ ان عمارات کے خرچ سے کوئی نسبت نہ رکھتا تھا جو محض آرائشی قسم کی تعمیر کی جارہی تھیں۔ انھی کی فہرست زیادہ طویل ہے۔ ان کی تعمیر میں جہانگیر نے آگرے اور لاہور میں بہت سا روپیہ صرف کیا لیکن سب سے بڑھ کر ترقی شاہجہاں کے عہد میں ہوئی۔ اس کی بعض عمارات کے خرچ کا ہمعصر مصنف یہ حساب لکھتے ہیں کہ دس لاکھ، دولت آباد کی مسجد پر۔ ساٹھ لاکھ دہلی کے شاہی محلات پر۔ اور نو کروڑ، ۱۷ لاکھ روضہ ممتاز محل آگرہ پر صرف ہوئے۔ اور اگرچہ ممکن ہے کہ یہ درست نہ ہوں تاہم لاہور کی نہر کا خرچ بھی انھیں ماخذ سے ماخوذ ہے اور ان اخراجات کا نہر کے خرچ سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے ان وسیع عمارات کا کام چھیڑنے سے لازماً پہلا اثر یہ ہوا ہوگا کہ عام تجارتی سرگرمی میں رکاوٹ واقع ہوئی چنانچہ دہلی کی عمارات بننے کے زمانے میں آگرے کے سارے چھکڑے پکڑ لئے گئے تھے اور ایک مرتبہ وہ تمام مال جو ساحل کی طرف لایا جارہا تھا "بادشاہی عمال نے اٹھا کے کھیتوں میں پھکوا دیا اور سرکاری کام کے لئے چھکڑے پکڑ کے لے گئے،" اور یہ مال مہینوں تک وہیں راستے میں پڑا رہا۔ مگر اس طرح کی بیگار اس عہد کی معمولی بات تھی اور افسوس ہے کہ جو چیز ہمارے لئے زیادہ کام کی ہوتی، یعنی ان عمارات کے ہزارہا مزدوروں کی اُجرت اور ان کے ساتھ برتاؤ اس کی کوئی کیفیت مجھے نہیں ملی ہے۔ ۱۹۷

فن تعمیر کی سرگرمیاں سرکاری عمارتوں تک محدود نہ تھیں بلکہ عمارات بنوانا روپیہ خرچ کرنے کا ایک امیرانہ مشغلہ بن گیا تھا جیسا کہ ہندوستان کا ہر شہر و قریہ گواہی دیتا ہے۔ فرانسسکو پلسارٹ نے اس بارے میں بعض دلچسپ مشاہدات جہانگیر کے آخر عہد کی نسبت تحریر کئے ہیں۔ اعتماد الدولہ کے مقبرے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اس کے لئے زیادہ صحیح ہوگا۔ عبد الحمید بادشاہ نامے میں لکھتا ہے کہ "علی مردان خاں نے حضور میں عرض کیا کہ میرے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نہر کادی میں بڑا کمال رکھتا ہے" پھر جب نہر کی منظوری مل گئی تو "خان نے اس کی تیاری اپنے ایک معتمد علیہ کے تفویض کی،" اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ اصلی بنانے والا

(واقع آگرہ) کے متعلق لکھتا ہے کہ ۱۶۲۶ء تک اس پر ۳½ لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا تھا اور تکمیل کے لئے دس لاکھ اور درکار تھے۔ ملکہ نور جہاں کی سرائوں اور محلات کا بھی اس نے ذکر کیا ہے کہ انھیں اس ملکہ نے اپنا نام نیک یاد رہنے کی غرض سے بنوایا تھا۔ پھر امرا کی دولت کی ناپائیداری بیان کرنے میں تحریر کرتا ہے کہ:-

“کوئی چیز حتیٰ کہ یہ عالیشان عمارتیں یعنی باغ، مقبرے اور محلات، بھی زیادہ دن رہنے والی نہیں ہیں اور ہر شہر کے قریب ان کے کھنڈر دیکھکر حیرت و عبرت طاری ہو جاتی ہے۔ جب تک بنانے والے زندہ اور آسودہ حال رہتے ہیں، ان عمارتوں کی دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے لیکن بانی کی آنکھ بند ہوتے ہی پھر کوئی ان کی خبر نہیں لیتا بلکہ ہر شخص اپنی الگ عمارت بنانی چاہتا ہے۔ ورنہ ان سب عمارتوں کی خبر گیری اور مرمت ہوتی رہے تو سو برس کے اندر ملک کا ہر شہر بلکہ ہر گاؤں ان آثار سے معمور ہو جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شہروں کے ہر راستے میں شکستہ آثار و مینار کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں”

اس عہد کی بعض عمارات صنعت و فن کے اعتبار سے جیسی کچھ قابل قدر ہیں، اس میں کوئی کلام نہیں مگر اقتصادی حیثیت سے وہ پیدائش کی بجائے خرچ کی مد میں داخل ہیں اور آئندہ فصل میں جن مباحث پر گفتگو کی گئی ہے ان کی گویا ابتدا انھی سے ہوتی ہے۔

۲۔ خرچ

اپنی سابقہ کتاب میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ سترھویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی آبادی میں ایک تو نہایت قلیل التعداد مگر نہایت دولتمند اور مسرف طبقۂ اعلیٰ تھا، ایک قلیل التعداد اور کفایت شعار

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کوئی ایرانی شخص تھا جو علی مردان خاں کے ساتھ ہندوستان آیا (ایلیٹ ششم، ۶۷)

طبقۂ متوسط مگر تیسرا ادنی طبقہ تعداد میں نہایت کثیر اور افلاس میں اسی سطح پر تھا جہاں آج کل نظر آتا ہے لیکن اور اعتبارات سے آج کل سے بھی کہیں زیادہ خراب حالت میں بسر اوقات کرتا تھا۔ اس وقت کے بعد سے جو مزید شہادتیں میرے مطالعے میں آئیں ان سے بھی اسی نتیجے کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔ جو ۱۹۸ کچھ پہلے شائع کرچکا ہوں اسے دہرانا بے سود ہوگا اور اس فصل میں میں صرف اس مواد سے کام لونگا جو تمثیل و تشریح کے لئے کافی ہو۔ یہ اس لئے اور بھی موزوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہادت ایک ہی قسم کی ہے اور اس میں کوئی تضاد و تخالف نہیں ہے۔ جس قدر نتیجے ابتک استخراج کئے گئے ہیں انکی تکذیب و ابطال میں ایک لفظ بھی مجھے ان کتابوں میں نہیں ملا جو پیش نظر عہد سے بحث کرتی ہیں۔ بجالیکہ بہت سی شہادتیں ملیں جو ان کی تصدیق کرتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جو شخص ہمارے ماخذ کو مجموعی طور پر دیکھیگا وہ مذکورہ بالا نتائج کو ثابت و صحیح تسلیم کئے بغیر نہ رہیگا ؛

ہمارے عہد میں شمالی ہندوستان کے معیار معاشرت کی سب سے مفصل کیفیت فرانسسکو پلسارٹ نے ۱۶۲۶ء میں قلم بند کی ہے۔ وہ آگرے کے ولندیزی کارخانے کا صدر اور سات برس تک ہندوستان میں رہا تھا۔ ذیل میں اسکے بیان کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ اس میں بعض الفاظ ایسے پُرزور نظر آئینگے کہ متن سے علیحدہ کرکے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شورش افزا مصنف کی عبارت آرائی ہے لیکن پوری تحریر کو پڑھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ خاص ٹھنڈے مزاج کا ایک لائق سوداگر تھا جسے اپنے گرد و پیش کے معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور جو کچھ دیکھا اسے صاف صاف بیان کر دیتا ہے اگرچہ بیان میں کہیں کہیں بازاری محاورے کا رنگ ضرور آگیا ہے یا اپنے آس پاس افلاس اور جبر و تعدی کو دیکھکر وہ بہت متاثر ہوا اور اس کی تحریر میں کہیں کہیں جو شدت نظر آتی ہے اسے لازم ہے کہ ہم فرانسسکو کی اپنے غریب ہمسایوں کے ساتھ قومی ہمدردی کی دلیل سمجھیں۔ سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کا طریقہ بیان کرنے کے بعد وہ عوام و خواص کے طرز زندگی پر بحث کرتا ہے جن میں ''خواص یا دولتمند تو مفرط دولت اور

اقتدار کامل سے بہرہ مند تھے اور عوام الناس کامل محکومی اور افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور افلاس بھی اس بلا کا اور ایسا دردناک کہ یہاں کی زندگی کا صحیح نقشہ دکھانا ممکن نہیں ہے جہاں بے برگ و نوائی کا گھرانہ اور مصائب تلخ کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ بایں ہمہ لوگ صبر کے ساتھ یہ سب برداشت کرتے ہیں کیونکہ کوئی صورت بہتری کی نظر نہیں آتی۔ کوئی شخص مشکل سے اصلاح کی کوشش کرسکتا ہے جب کہ وہ زینہ ہی ہاتھ نہ آئے جس کے ذریعے کچھ اوپر چڑھنا ممکن ہو۔ ایک کاریگر کے بچے سوائے اس پیشے کے جو ان کے باپ کا تھا، دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتے اور کسی دوسری جماعت یا ذات میں شادی بیاہ تک نہیں کرسکتے؛

عوام الناس کی تین قسمیں ہیں جو نام کو تو آزاد ہیں لیکن ان کی حیثیت اور
۱۹۹ خوشی خواہ غلامی میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔ ان میں اہل حرفہ۔ چپراسی یا شاگرد پیشہ
اور دکاندار شامل ہیں۔ اہل حرفہ کے حق میں دو باتیں، یعنی کم اُجرت اور تعدی،
عذاب جان ہیں۔ یوں بھی ہر پیشے کے کاریگروں کی وہ کثرت ہے کہ وہی کام جو
ہالینڈ میں ایک آدمی کرتا ہے، یہاں تکمیل سے پہلے چار کاریگروں کے ہاتھ سے
گزرتا ہے اور ان کی صبح سے شام تک محنت کرنے کی اُجرت صرف ۵، ۶
ٹکے[1] ہوتی ہے جو ہمارے ۴ یا ۵ اِسٹیور کے مساوی ہوئی۔ دوسرا عذاب صوبہ دار
امرائے دیوان، کوتوال، بخشی اور دوسرے بادشاہی عمال کی وہ تعدی ہے کہ اگر
ان میں کسی کو کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بغیر پوچھے گچھے اسے گھر یا بازار
سے پکڑوا بلاتے ہیں اور اگر کسی شامت زدہ کاریگر نے حجت کی تو اسے خوب
پیٹا جاتا ہے اور شام کو آدھی مزدوری مل جاتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ دی جائے۔
ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ کیا کھاتے اور کس طرح بسر اوقات

---

[1] ٹکہ ایسی اصطلاح ہے کہ بعض دفعہ اس کا صحیح مفہوم سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر ولندیز ہندوستان کے روپیہ کو اپنے ۲۴ اسٹیور کے برابر سمجھتے تھے لہٰذا یہاں ٹکہ سے اکبری دام مراد ہے کہ ان دنوں ایک روپیہ تقریباً ۳۰ دام کے برابر تھا؛

کرتے ہونگے۔ گوشت تو شاذ و نادر ہی انھیں میسر آتا ہے باقی روزمرہ کی غذا وہی ایک چیز یعنی موٹھ کی کھچڑی[1] ہے کہ تھوڑی سی آگ پر پانی میں اُبال لیتے اور ذرا سا مکھن ملاکے گرم گرم کھا لیتے ہیں۔ یہ شام کا کھانا ہے ورنہ دن کو وہ دال یا اور کوئی غلہ بھون کر چباتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے۔

ان لوگوں کے گھر مٹی کے اور چھتیں پھوس کی ہوتی ہیں۔ گھروں میں ساز و سامان بہت کم یا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پانی کے دو ایک گھڑے، پکانے کی ہانڈیاں، اور دو پلنگ ہوتے ہیں کیونکہ اس ملک میں میاں بیوی ایک بستر پر نہیں سوتے۔ بستر بالکل مختصر اور اس میں بعض دفعہ صرف ایک چادر اور کبھی دو ہوتی ہیں انھی کو اوڑھتے اور بچھاتے ہیں اور گرمی میں یہ کافی ہو جاتی ہیں لیکن سردی کی سخت راتیں گزارنا حقیقت میں مصیبت ہو جاتا ہے اور یہ لوگ گھر گرم رکھنے کے لئے تھوڑے سے اپلوں کی آگ دروازے کے باہر سلگا دیتے ہیں کیونکہ دُود کش یا آتش دان نہیں ہوتے پھر ان آگوں کا دھواں سارے شہر میں اس طرح پھیل جاتا ہے کہ آنسو بہنے لگتے ہیں اور سانس رُک رُک جاتا ہے۔

اس ملک میں چپراسی یا خانگی ملازم کثرت سے ہوتے ہیں.....[2]
۲۰۰ ان کی سستی اور نکمے پن کی وجہ سے مُغل امرا ان کی تنخواہ میں سے بڑا جزو وضع

---

[1] اصل عبارت میں کھچڑی کا لفظ موجود ہے لیکن موٹھ کے بجائے "سبز دال" کے مرادف لفظ لکھا ہے مگر آگرہ اکاونٹس میں لفظ موٹھ کی تشریح انھی الفاظ کے ساتھ آئی ہے لہذا ہم نے یہاں موٹھ ترجمہ کرنا جائز سمجھا

[2] اس جگہ جو عبارت حذف کر دی گئی ہے اس میں نوکروں کی مختلف قسمیں اور ان کے فرائض کی بہت باریک تقسیم تحریر تھی۔ پھر اس کی مثال میں پلسارٹ نے پرتگیزوں کے جہاز کو پیش کیا ہے کہ "اس میں اگر مستول تختے پر گر پڑے تو ناخدا کبھی آگے بڑھنے کی ذلت گوارا نہ کرے گا گو ایسا کرنے سے وہ مستول کو گرنے سے بچا لیتا"۔ پرتگیزوں کے یہ آداب اور طور طریق اس زمانے میں عام طور پر نشانہ تضحیک رہتے تھے۔

کر لیتے ہیں۔ اکثر بڑے امیروں کے ہاں مہینے کے ۴۸ دن لگائے جاتے ہیں اور مے سے للعہ تک تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اکثر تنخواہیں کئی کئی مہینے تک چڑھتی رہتی ہیں اور پھر پھٹے پرانے کپڑے یا اور کسی چیز کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں۔ ان ملازموں میں سے بہت کم ہیں جو دیانت کے ساتھ کام کرتے ہوں ورنہ جب اور جتنا موقع ملتا ہے، چوری کرتے ہیں اور پیسے کی بھی چیز خریدینگے تو اس میں اپنا حصہ یا دستوری ضرور وصول کرینگے ... اور ایسا نہ کریں تو اس قدر کم تنخواہ میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے چنانچہ مجموعی طور پر ان کی حیثیت اور مرتبے میں عام کاریگروں سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے کہ یہ بھی انھی کی طرح دولت احتیاج سے بہرہ مند ہیں؛

دکانداروں کی حالت اہل حرفہ سے نمایاں طور پر بہتر ہے بلکہ بعض تو خوب مالدار ہیں خواہ مصالحے، ادویہ، کپڑا یا اور کسی چیز کی دکان کرتے ہوں لیکن انھیں اپنی خوشحالی کو چھپانا لازمی ہے ورنہ مصنوعی الزام لگا کے ان کا مال متاع قانوناً ضبط کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ حکام کے گرد و پیش مکھیوں کی طرح جاسوسوں کا ہجوم رہتا ہے اور وہ دوست دشمن کسی کا امتیاز نہیں کرتے بلکہ ضرورت ہو تو بے تکلف دغا دیتے ہیں کہ حکام کی نظر میں اچھے بنے رہیں۔ اس کے علاوہ ان دکانداروں پر تعدی کا یہ حال ہے کہ اگر پادشاہی امرا یا حکام ان کا مال لینا چاہیں تو دکانداروں کو نصف سے بھی کم قیمت پر بیچنا پڑتا ہے؛

ان مفلوک الحال بدنصیبوں کا مختصر حال یہ ہے اور بے دست و پائی کے اعتبار سے اگر انھیں بکر دہ کیچووں یا جھینگوں سے تشبیہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ ہزار اپنے آپ کو چھپائیں پھر بھی بے پناہ سمندر کے عفریت انھیں نگل جاتے ہیں؛ اس کے بعد ہم دولتمند اور بڑے لوگوں کے کچھ حالات لکھیں گے لیکن ایسا کرتے وقت ہمیں اپنا لب و لہجہ بالکل بدل دینا پڑے گا۔ وہ قلم جو اب تک ایسی بلائے افلاس و ناداری کا نقشہ کھینچ رہا تھا، جس میں ذلت و زاری اور بے کسی و گریہ و خواری کے سوا، کسی لطف و مسرت یا دوستی اور محبت کا شائبہ تک نہ تھا وہی قلم اب محلات و قصور اور دولت و حشمت کی تصویر

اتارے تو اس کی کشش لازماً دوسری ہو جائے گی مگر واضح رہے کہ امرا کے مال و زر کی یہ ساری چمک دمک محض مانگے کی اور غریبوں کی چھینی ہوئی کمائی کی ہے اور اسی لئے ان کا مرتبہ، ہوا کی طرح ناستقیم ہے۔ وہ کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں بلکہ محض گھاس پھونس پر اس کے آثار رکھے ہیں کہ دنیا کی نظر میں تو یہ عمارت پُر شکوہ معلوم ہوتی ہے مگر طوفان کا ایک جھونکا اسے برباد کر دینے کے لئے کافی ہے[1]؛

پھر پلسارٹ امرا کی پر تکلف معاشرت اور غیر محفوظ حالت کی بہت سی ۲۰۱ جزئیات بیان کرتا اور اس اقرار کے ساتھ کہ مستثنیات بھی موجود تھیں، اور امرا میں سے بعض دولت کے ساتھ کفایت شعار بھی تھے، زور دیتا ہے کہ اکثریت کا حال یہی ہے جو اس نے بیان کیا۔ دیہات کی معاشرت کے متعلق اس کا بیان ایسا مفصل نہیں ہے۔ ایک فقرے میں وہ لکھتا ہے کہ ”کسانوں کو اس قدر نچوڑا جاتا ہے کہ انھیں کھانے کے لئے سوکھی روٹی بھی مشکل سے پہنچتی ہے“ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ”زمیں کثرت سے بلکہ غیر معمولی پیداوار دے سکتی ہے بشرطیکہ کسانوں پر اس بے رحمی سے جبر و تعدی نہ کیجائے“ لیکن فرانسسکو پلسارٹ اصل میں شہری آدمی ہے اور دیہات کی نسبت یہ فقرے احیاناً اس کی تحریر میں آگئے ہیں؛

---

[1] عبارتوں کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جے ڈلایٹ نے سلطنت مغلیہ کے معیار معاشرت کی جو کیفیت لکھی ہے (De Imperio Magni Magolis, 116 P.) میں فقرے کے فقرے پلسارٹ کی محولہ بالا کیفیت سے لے لئے ہیں۔ لائٹ کے سامنے ”گجرات رپورٹ“ بھی تھی اور اس لئے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل انھی دو ماخذوں سے لیا گیا تھا اسی لئے ہم اس کی تحریر کو ثانوی سمجھ کر نقل کرنا فضول سمجھتے ہیں گو اس نے بہت صحت کے ساتھ ان ماخذوں سے عبارتیں نقل کی ہیں۔ آخر میں یہ لکھ دینا بھی مناسب ہوگا کہ پلسارٹ کی عبارتوں کا فرانسیسی ترجمہ کچھ بہت اچھا نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ میں نے اوپر جو ترجمہ خود کیا ہے وہ حتی الامکان بالکل صحیح پایا جائیگا؛

دوسرے ولندیز گماشتوں نے جو کیفیتیں اس زمانے میں تیار کی ہیں، ان کا رنگ دوسرا ہے اور ان میں لوگوں کی معاشرت وغیرہ کا خاص طور پر حال نہیں بیان کیا گیا البتہ کہیں کہیں کوئی بات اس قسم کی آگئی ہے تو وہ بھی پلسارٹ کے اقوال کی تائید کرتی ہے؛ وہ سوداگر جس نے گولکنڈے کے حالات لکھے کمال حیرت ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں سے اس قدر مالگزاری وصول کی جاتی ہے حالانکہ وہ نہایت مفلس اور مصیبت سے بسر اوقات کرتے ہیں اور وہ لکھتا ہے کہ اسی زیادہ ستانی سے ملک ویران ہو گیا ہے؛ گجرات کی اطلاعیں وہاں کے جلاہوں کو اس قدر کم استطاعت بتاتی ہیں کہ وہ قرض پر مال نہیں دے سکتے تھے بلکہ وہی کنواں کھودنے اور وہی پانی پینے پر ان کی گزر ہوتی تھی۔ سوت تک خریدنے کے لئے وہ پیشگی رقم کی محتاج تھے اور اسی طرح مالگزاری کی زیادتی نے کسانوں کو ایسا شکستہ حال بنا رکھا تھا کہ بمشکل سے اپنی محنت کی مزدوری میسر آتی تھی اور ان کی اور غلاموں کی حالت میں بہت کم فرق تھا کہ یہ غریب بھی امیروں کے مزے اڑانے کے لئے مشقت کرنے پر مجبور تھے؛ ولندیز سوداگر فان ٹوسٹ چند سال بعد اسی قسم کا قصہ گجرات کا سناتا ہے کہ کسانوں نے مجبور ہو کر زمین کی پیداوار سے ہاتھ اٹھا لیا اور حکام کو کافی تعداد میں کاشتکار میسر نہ آئے۔ ہبتھوولڈ اور اس کی مجلس انتظامی (واقع سورت) قحط کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہونے کی کیفیت کی ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ "دیہات بہت آہستہ ۲۰۲ آہستہ آباد ہو رہے ہیں (لیکن لوگوں کے حق میں)، یہ بھی بہتری کی صورت ہے اور اگر ہر قسم کے حکام کی حرص وتعدی غریب لوگوں کو صرف اتنا موقع دے کہ وہ ایک سال ہی ظلم وجبر سے کسی قدر بچے رہیں تو وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ مویشی جمع کر سکیں اور زمین کی زرخیزی میں اضافہ کر سکیں"؛ دس سال بعد انگریزی مجلس انتظامی سندھ کے متعلق لکھتی ہے کہ "لوگ اس قدر ستم رسیدہ اور افلاس کی مصیبت میں گرفتار رکھے جاتے ہیں کہ زمین جوتنے بونے کو نہ ان کا جی چاہتا ہے نہ اس کے وسائل ان کے پاس ہیں۔ اگرچہ زمین زرخیز اور موزوں ہے اور کثیر مقدار میں عمدہ قسم کا نیل پیدا کر سکتی ہے"؛

برنیئر اور ٹے ورنیئر نے ذاتی مشاہدے سے جو حالات لکھے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ہمارے عہد کے آخر تک یہی کیفیت رہی۔ برنیئر ۱۶۵۶ء سے ۱۶۵۸ء تک سلطنت مغلیہ میں رہا۔ وہ اپنے خط موسومہ کولبیر میں مزارعین کی دردناک حالت کا ان الفاظ میں نقشہ دکھاتا ہے:

"اچھی زمین کا بھی ایک معقول حصہ مزدوروں کے نہ ملنے سے غیر مزروعہ رہتا ہے کیونکہ بہت سے مزدور حکام کی بدسلوکی کے باعث ہلاک ہو جاتے ہیں یہ غریب جب اپنے طامع امیروں کے مطالبات پورے نہیں کرسکتے تو نہ صرف وسائل معاش بلکہ عیال و اطفال تک سے محروم کر دئیے جاتے ہیں جنھیں غلام بنا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اکثر کاشتکار اس قابل لعنت ظلم و جبر سے کوئی مخلصی کی صورت نہیں پاتے تو دیہات چھوڑ دیتے ہیں اور شہروں یا چھاونیوں میں جہاں زندہ رہنا اس قدر دوبھر نہیں ہے، بسر اوقات کرتے ہیں بعض اوقات وہ کسی راجہ کے علاقے میں بھاگ جاتے ہیں کیونکہ وہاں اتنا ظلم و ستم نہیں ہوتا اور کچھ زیادہ آرام مل جاتا ہے۔"

آگے چل کے یہی مصنف لکھتا ہے کہ:-

"جب تک جبر نہ کیا جائے، شاذ و نادر ہی زمین کوئی کاشت کرتا ہے۔ خندقوں اور رجبھون کی مرمت کرنی نہ کوئی چاہتا ہے نہ اس کی استطاعت رکھتا ہے۔ سارے ملک کی زراعت خراب و ناقص ہے اور ایک بڑا حصہ وسائل آب پاشی نہ ہونے کے باعث بنجر پڑا ہے ... لوگوں کے مصائب کا کوئی صحیح تخیل پیش کرنا غیر ممکن ہے۔ صرف ڈنڈا اور تازیانہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ دوسروں کے فائدے کے لئے پیہم محنت کئے جائیں[1]۔"

---

[1] ان اقوال کا دروغ بے فروغ ہونا بداہتہً ثابت ہے اور ان سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن دنوں فرنگی اقوام ہندوستان کے حال سے جس قدر زیادہ بے خبر تھیں اسی قدر ان کے سیاح جھوٹ بولنے میں زیادہ بیباک تھے ٹے ورنیئر، برنیئر سے زیادہ ممتاز آدمی تھا اور اسکا سفرنامہ بھی یورپ کے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے میں جلد روشناس ہوا لیکن اسکے متعلق خود یورپ کے اہل علم نے کہہ دیا کہ یہ بیانات "جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ" کے مصداق ہیں۔ مترجم

ٹے ورنیر جس نے سنہ ۱۶۴۰ء سے سنہ ۱۶۶۰ء تک وقفوں کے ساتھ ہندوستان کی کئی بار سیاحت کی، اسی رنگ میں سلطنت مغلیہ کا حال تحریر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "کسان بے حد مفلوک الحال ہیں کیونکہ حاکموں کو اگر خبر ہو جاتی ہے ۲۰۳ کہ کسی کے پاس مال متاع موجود ہے تو وہ اس کو بے تکلف بطور حق کے باجبراً چھین لیتے ہیں۔ صوبے کے صوبے ہندوستان میں آپ کو ویران صحرا نظر آئیں گے جہاں سے لوگ حاکموں کی تعدی کے باعث فرار ہو گئے۔"

یہ اقتباسات زراعت پیشہ آبادی کی حالت دکھانے کے لئے کافی ہونگے۔ رہے شہر کے کاریگر لوگ، تو ان کی نسبت برنیر لکھتا ہے کہ:۔

"یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کاریگر کی کوئی توقیر کی جاتی ہے یا وہ آزاد آدمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں صرف سخت احتیاج یا ڈنڈے کی مار اسے مصروف بکار رکھتی ہے۔ وہ کبھی آسودہ نہیں ہو سکتا اور اگر دوزخ شکم کو بھر لے اور برے سے برے کپڑے سے جسم ڈھانکنے کا بھی وسیلہ میسر ہو تو اسی کو وہ بڑی بات سمجھتا ہے۔ اور اگر روپیہ ہاتھ آئے تو یہ ذرا بھی اس کی جیب میں نہیں جاتا بلکہ صرف سوداگر کی دولت بڑھانے کے کام آتا ہے۔"

فان ٹوسٹ نے بھی اسی طرح سوداگروں کے عیش و آرام کے مقابلے میں اہل حرفہ کی فلاکت پر زور دیا ہے۔ اسی آبادی کا سب سے بڑا حصہ پارچہ باف تھے۔ ہولندیزوں اور انگریزوں کے مراسلات میں ضمناً ان کا جو ذکر آجاتا ہے اس سب سے مجموعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ سارے ملک میں انتہائی افلاس و ناداری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک سابقہ باب میں ہم ہندوستانی غلاموں کی تجارت برآمد پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اس تجارت کے واقعات ان مشاہدات کے عین مطابق ہیں جنھیں ہم نے اوپر نقل کیا۔ سب کا خلاصہ یہی ہے کہ آبادی کا حصہ کثیر آرام و راحت سے رہنا درکنار محض شکم پری کر لیتا تھا۔ اس میں سعی و کوشش کی سکت نہ تھی اور ترک وطن کی شکل میں بھی اس مصیبت سے بچ نکلنے کی صرف دو صورتیں ممکن تھیں کہ یا تو کسی ایسے علاقے میں بھاگ کر پہنچ جائے جہاں اس وقت کچھ بہتر حالات ہوں اور

یا کسی غیر ملک میں روٹی ملنے کے وعدے پر اپنی شخصی آزادی فروخت کر دی جائے۔

پیداوار کے اوسط کے مطابق ہونے کے زمانے میں یہ صورت تھی - اب اگلے باب میں ہم یہ جانچ کریں گے کہ پیداوار کی عام رفتار میں رکاوٹ پیدا ہونے کے زمانے میں کیا نتائج واقع ہوتے تھے۔

باب ششم کے ماخذ

فصل اول

تمباکو کے استعمال کا تذکرہ الیٹ (ششم، ۳۰۱) اور منوکی (دوم، ۱۷۵) کے ہاں موجود ہے۔ منڈی کی حالت کے مطابق زراعت ہونا مختلف عبارتوں سے ماخوذ ہے۔ خصوصاً ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز، پنجم، ۶۴ وغیرہ۔ داغ رجسٹر (سورت، ۱۳ جون سنہ ۱۶۴۴ وغیرہ۔ سرمایہ میسر نہ ہونے کی مثالیں بھی انھی دونوں کتابوں میں ملتی ہیں (فیکٹریز۔ ہفتم ۲۰۳۔ رجسٹر۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۶۳۴ وغیرہ) وسائل کی کمی کے اندیشے کے متعلق دیکھو فیکٹریز، اول، چہارم وغیرہ۔ اور خاص قسم کے مال کی بہم رسانی کی دشواری یا آسانی کے لئے، ایضاً۔ سوم، ۲۰۹ وغیرہ۔ رجسٹر، ۳۱ جنوری سنہ ۱۶۳۳ وغیرہ۔ اسی میں ان قیود کا ذکر ہے جو بنگالے کے جلاہوں پر عائد کی گئی تھیں (۲۹ نومبر سنہ ۱۶۶۱) ٹیلرزڈ کا میں بھی یہ ذکر آتا ہے (۱۷۳۔ ۱۸۹) شورے کے لئے پیشگی رقوم کے لئے ملاحظہ ہو رجسٹر۔ ۱۲ اپریل سنہ ۱۶۶۱ اور نیل کے لئے فیکٹریز۔ سوم، ۲۴۶ وغیرہ

تنخواہوں کے بارے میں ہماری معلومات پلسارٹ

(۱۶ و مابلیہا، اور ہیبتھو ولڈ، ۱۰۰۱ - بگین اینڈ وورٹ گینگ Begin end voortgangh) یعنی فان ڈین بروکے کے رسالہ دوم، ۷۷، و مابلیہا اور انگلش فیکٹریز، پنجم، ۱۵۱ - دہم، ۲۶۱، سے ماخوذ ہے۔ سرکاری عمارات میں برہانپور کے انتظام آب رسانی کا امپیریل گزٹیر میں صراحت سے حال لکھا ہے (دہم، ۱۰۵) نہروں کے لئے دیکھو الیٹ ہفتم، ۶۹ و ۸۶ - تخمینہ مصارف تعمیر کیلئے، ایضاً ہفتم، ۸۶ و ۲۴۲ اور سرکارز اسٹڈیز، ۳۰ - بیگار کے متعلق ملاحظہ ہو فیکٹریز، دوم وغیرہ - خانگی عمارات کے لئے دیکھو پلسارٹ - مخطوطہ، ورق ۲ و ۲۱۔

فصل دوم

پلسارٹ کی عبارت کا طویل اقتباس اس کے مخطوطہ، ورق ۲۳ و مابلیہا سے ترجمہ کیا گیا ہے کسانوں کے متعلق اس کے مشاہدات ورق ۸ اور ۲۰ سے لئے گئے ہیں۔ گولکنڈے کے متعلق بروکے کا قول نقل کیا ہے (۷۷)، گجرات کے بارے میں دیکھو گجرات رپورٹ۔ ورق ۷ وغیرہ - فان ٹوسٹ، سی و چہارم چہل و یکم اور فیکٹریز، پنجم - ۶۵ - سندھ کے لئے، ایضاً، ہفتم - ۲۰۹ - اور اواخر عہد کے متعلق دیکھو ٹے ورنیر، (اول، ۳۹۱) برنیر، ۲۰۵ و ۲۲۶ و ۲۲۸ و ۲۳۰۔

باب ہفتم

قحط کے معاشی نتائج

۱۔ قحط کی نوعیت اور تواتر

گذشتہ باب میں جو کچھ بیان ہوا اس سے عیاں ہوگا کہ ہمارے پیش نظر عہد میں پیداوار عامۃً ایک ہی ڈھرّی پر چلی جاتی تھی۔ اگر مانگ میں کوئی خاص تغیّر ہوا تو وہ متاثر ہوتی تھی لیکن از خود نشو نما یا نئی مانگ پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی اور حکومت کی دخل دہی یا قحط پڑ جانے سے وقتاً فوقتاً اس میں رکاوٹ بھی ہو جاتی تھی ؞ اہل نظم و نسق کی مداخلت کے نتائج پر تو ہم آیندہ بحث کریں گے سردست اس باب میں قحط کے تواتُر اور اثرات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ اس مضمون کو ذرا احتیاط سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس مانوس لفظ کے مفہوم و تعبیر میں فرق آجانے سے اب اس کا استعمال ایسے خیالات پیدا کر دیتا ہے جو ایک مغالطہ آمیز بنیاد پر مبنی ہیں۔ زمانہ حاضرہ میں ہندوستان کے جن قحطوں کا ذکر آتا ہے وہ دراصل ایک اتّفاقی حالت ہے جس میں حکومت تسلیم کرتی ہے کہ بہت سے لوگ بیکار رہ گئے ہیں اور چونکہ کوئی عام قانونِ مساکین ملک میں نافذ نہیں ہے لہٰذا ان لوگوں کی امداد و دستگیری کے لئے خاص تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ مگر سترھویں صدی کے جن

قحطوں کا ذکر اُس زمانے کی کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں وہ قحطِ کار نہیں بلکہ صحیح معنی میں قحطِ غذا ہوتے تھے کہ اُن میں وسائلِ معاش نہیں بلکہ خود معاش یا روٹی بہم پہنچانے کا سوال پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ عام پسند انشا پردازوں نے بعض اوقات اِن مختلف زمانوں کے قحطوں کے تواتر کی نسبت جو موازنے کئے ہیں وہ معنی کے بدل جانے کے باعث سرے سے غلط اور بے محل ہو گئے ہیں۔ ایک طرف تو سالہا سال ہندوستان میں کوئی بڑا قحطِ غذا نہیں پڑا اور دوسری طرف گذشتہ صدی کے وسط سے پہلے کی ایسی باضابطہ تحریریں موجود نہیں ہیں جن سے قرونِ ماضیہ کے قحطِ کار کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور اگر یہ واقعہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ گذشتہ زمانے میں قحط ہائے غذا اتنے عام اور متواتر نہ تھے جتنے آج کل قحط ہائے کار متواتر ہو گئے ہیں، ۲۰۶ تو بھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں، یہ دکھانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس زمانے کی تاریخوں (یا وقائع) میں قحط کے جو حالات لکھے ہیں وہ ناقص ہیں، کیونکہ ہم ولندیزوں اور انگریزوں کی تجارتی مراسلت میں کئی قحطوں کا تذکرہ پڑھتے ہیں جن کا مُلکی تاریخوں میں کوئی احوال موجود نہیں ہے۔ ایسی مثالوں میں سے ایک ہی مثال میں یہ پیش کرتا ہوں کہ مجھے سنہ ۱۶۳۲ء سے سنہ ۱۶۵۰ء تک ہندوستان کے وقائع میں کسی قحط کا ذِکر لکھا ہوا نہیں ملا، حالانکہ ولندیزوں کا بیان ہے کہ سنہ ۱۶۳۵ء میں گولکنڈے میں بہت سی موتیں واقع ہوئیں۔ سنہ ۱۶۴۶ء میں مشرقی ساحل پر جُلاہے بھوکوں مر رہے تھے اور ایک سال بعد راجپوتانہ آبادی سے بالکل خالی ہو گیا اور اس کا سبب قحط سالی ہی تھا۔ غرض براہِ راست موازنے کی کوشش میں بیکار سمجھتا ہوں۔ اسکی بجائے میں نے اپنے پیشِ نظر عہد کے صرف ان سنین کی فہرست مرتّب کر دی ہے جن میں پیداوار کی نسبت معلوم ہے کہ فصل کی خرابی کے باعث کم ہوئی، خواہ اجناس خوردنی کی خواہ دوسری خام اجناس کی۔

یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ اس قسم کی معلومات کا نہایت قیمتی اور بے مثل ماخذ رسائل بتاویہ ہیں اور چند سال خصوصاً سنہ ۱۶۴۷ء تا سنہ ۱۶۶۰ء کے سنین کے بعض رسالے یا مفقود ہیں یا ناقص رہ گئے ہیں اور ممکن ہے کہ ان گم گشتہ رسائل میں قحط یا گرانی کے ایسے حالات موجود ہوں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔ لیکن

اگر یہ تجارتی تحریریں پورے زمانے کی موجود بھی ہوں، تو بھی وہ سارے ہندوستان پر حاوی نہیں ہیں بلکہ صرف ان قطعات سے متعلق ہیں جن سے ان فرنگی سوداگروں کو سابقہ پڑتا تھا۔ مثلاً بندھیلکھنڈ کلیتہً ان کے احاطۂ علم سے خارج تھا حالانکہ یہ ایسا قطعہ ہے جو اکثر موسمی انقلابات کا شکار رہتا ہے۔ اور یہی قول پنجاب پر صادق آتا ہے جو جدید نہری سلسلہ تیار ہونے سے قبل بہت سی خصوصیات میں یقیناً بندھیل کھنڈ جیسا ہوگا۔ مختصر یہ کہ ہماری فہرست میں جو سنین پیش کئے گئے ہیں ان میں تو پیداوار میں ضرور فرق پڑا لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جن سنین کو ہم نے چھوڑ دیا ہے وہ سارے ہندوستان میں سرسبزی اور خوشحالی کے سال تھے؛ یہ بات بھی جتانے کے قابل ہے کہ ہمارے عہد کے آخری نصف میں گرانیوں کا زیادہ بار بار ذکر تحریر ہے ممکن ہے اس کے کوئی خاص معنی ہوں لیکن غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اب بیرونی سوداگروں کے تعلقات اور معلومات زیادہ وسیع ہوگئے تھے اور ولندیزوں کے معاملے میں، یہ بھی سبب ہوا کہ ان کے واقعات قلم بند کرنے کا انتظام زیادہ اچھا ہوگیا اور پانچویں عشر کے جو رسائل محفوظ ہیں وہ (سنہ ۱۶۳۰ء سے) پہلے کے رسائل سے زیادہ مفصّل ہیں؛ بہرحال، ہماری فہرست حسب ذیل ہے:۔

سنہ ۱۶۱۴-۱۵ء (۹)۔ — بادشاہ جہانگیر سال تمام ماہ مارچ سنہ ۱۶۱۶ء میں ایک وبا کا تذکرہ کرتا ہے جس کو بعض اہل الرّائے گذشتہ خشک سالی کے اثرات سے منسوب کرتے تھے جو پیہم دو سال تک رہی۔ اس سے علاقۂ پنجاب، مشرق میں دہلی تک متاثر ہوا مگر ظاہرا یہ خشک سالی پنجاب ہی کی حدود میں رہی؛ تحریر میں خشک سالی کے سنین کا تعیّن صراحتہً موجود نہیں ہے؛

سنہ ۱۶۱۸-۱۹ء — سنہ ۱۶۲۲ء میں مچھلی پٹم سے ایک ولندیز غلاموں کی کم خریداری کا سبب یہ بتاتا ہے کہ اس مراسلہ لکھنے کے زمانے میں نسبتہً خوشحالی ہوگئی تھی اور چار سال قبل جو کثرت سے غلام فراہم ہوئے اس کی وجہ جہاں تک اسے علم ہے یہ تھی کہ پولی کٹ اور نواح پولی کٹ میں سخت گرانی اور قحط رہا جس میں صدہا آدمی مرگئے لیکن آج کل حالت دوسری ہے، چاول کثرت سے آگیا ہے اور اس وقت (یعنی جب کہ یہ خط لکھا گیا ہے) غلاموں کی کوئی بڑی تعداد بہم نہیں پہنچ سکتی؛

اس خط سے ساحل کورومنڈل پر سنہ ۱۶۱۸ یا ۱۶۱۹ء میں سخت قحط واقع ہونے کا پتہ چلتا ہے ایم دفاریا یا سوسا بھی ۱۶۱۹ء کی نسبت لکھتا ہے کہ گرانی اور قحط نے بہت لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ اس نے ٹھیک مقام نہیں لکھا مگر اس کا اشارہ یقیناً جنوبی ہند کی طرف ہے۔ منتھوولڈ بھی، جو مشرقی ساحل سے ۱۶۲۲ء میں رخصت ہوا، تحریر کرتا ہے کہ وجیانگر کے بعض حصوں میں اس قدر سخت قحط اور نامیسری تھی کہ "والدین ہزاروں چھوٹے بچوں کو ساحل پر لے آئے تھے اور پانچ پانچ فنم چاول کے عوض میں ایک بچہ بیچتے تھے"۔ میں ان تینوں بیانات کا موضوع ایک ہی مصیبت کو سمجھتا ہوں اور یہ سنہ ۱۶۱۸-۱۹ء کے قریب کسی شدید قحط کی مصیبت تھی۔[1]

۱۶۲۳ء۔ بارش نہ ہونے سے اس سال میں جو بلائے قحط نازل ہوئی اس کا ہندوستانی، ولندیزی اور انگریزی سب ہی ماخذوں میں ذکر آتا ہے۔ اس کے ملک پر جو معاشی اثرات ہوئے، ان پر اگلی فصل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

---

[1] مسٹر لوڈے "ہسٹری اینڈ اکونامکس اوف انڈین فیمنز" ضمیمہ آ میں ۱۶۲۳ء اور ۱۶۲۸-۲۹ء کو قحط کے سال بتاتے ہیں لیکن یہ اندراج صحیح نہیں ہے۔ ۱۶۲۳ء کے متعلق ان کا ماخذ ایتھرج ہے (صفحہ ۴۰)، جس نے ۱۶۲۳ء کو غلطی سے سنہ ۱۰۴۰ ہجری کے مطابق سمجھا تھا۔ حالانکہ یہ ہجری سنہ دراصل جولائی ۱۶۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور اسی لئے اُس نے جو واقعات ۱۶۲۳ء سے منسوب کئے ہیں وہ دراصل ۱۶۳۰ء کے قحط عظیم میں ہوئے تھے۔ اسی طرح ۱۶۲۸-۲۹ء کے بھی جو واقعات اس نے تحریر کئے ہیں (صفحہ ۶۳) وہ بھی دراصل سنہ ۱۰۴۰ ہجری کے ہیں اور ۱۶۳۰ء میں شمار ہونے چاہئیں۔ ۱۶۲۸ء اور ۱۶۲۹ء کی فصلیں اچھی نہ تھیں اور نیل کی فصل کم رہ گئی تھی (انگلش فیکٹریز، چہارم ۲۰، خاصکر ۲۹ء میں بارش بہت دیر سے ہوئی اور آخر میں ضرورت سے زیادہ ہو گئی (ہیگ ٹرینس کرپٹس - اول ۰ ۱۲۹۰ بایں ہمہ تجارتی مراسلات میں کسی قسم کے قحط کا پتہ نہیں چلتا اور اپریل ۱۶۳۰ء تک ولندیز و انگریز دونوں قوموں کے تاجر اچھی امیدیں رکھتے تھے اور خریداری میں منہمک تھے۔

۱۶۳۵؁ ۔ سورت کے ولندیز گماشتوں نے اطلاع دی کہ گولکنڈے کی ساری مملکت میں اجناس خوردنی میسر نہیں آتیں اور قحط سے تعداد اموات بہت بڑھ گئی ہے ۔ یہ اطلاع مارچ ۱۶۳۶؁ میں بتاویہ پہنچی تھی لہذا قیاس چاہتا ہے کہ اس سے ایک سال پہلے خشک سالی ہوئی ہوگی ۔ اس کی وسعتِ اثر کے متعلق بظاہر مبالغہ کیا گیا ہے کیونکہ گو مچھلی پٹم میں چاول مشکل سے ملتا تھا اور آیندہ خریف تک کپاس کی رسد رسانی بھی ناقص تھی، تاہم ایسے سخت قحط کی کوئی اطلاع مشرقی ساحل سے نہیں بھیجی گئی ۔ غالب گمان یہ ہے کہ گولکنڈے کے مغربی اضلاع میں سخت قحط ہوگا جہاں سے خواہی نخواہی سورت خبر پہنچ گئی اور مچھلی پٹم کے رخ صرف کسی قدر گرانی رہی ہوگی ؎

۱۶۴۰ء ۔ اوائل ۱۶۴۱؁ میں ولندیزوں نے خبر دی کہ پولی کٹ اور مدراس کے قریب بارش کم ہے اور اس لئے سامان رسد سمندر کے راستے لانا پڑا ۔ لیکن ساحل سے بعد میں جو اطلاعات آئیں ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قحط نے کوئی شدت اختیار کی ؎

۱۶۴۱ء ۔ معلوم ہوتا ہے ؟ شمالی ہندوستان میں کپاس کی فصل اچھی نہیں ہوئی کیونکہ ولندیزوں نے اطلاع دی کہ کپڑے کی قیمت روئی کی کمی کے باعث یکایک بہت گراں ہوگئی ۔ احمد آباد میں بھی ۱۶۴۲؁ کی گرمیوں میں روئی کمیاب تھی جس سے قیاس ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کی طرح گجرات میں بھی اس کی گذشتہ فصل اچھی نہیں ہوئی ؎

۱۶۴۲-۴۳؁ ۔ جنوری ۱۶۴۳؁ میں چاول کی نسبت اطلاع دی گئی کہ پپیلی (اڑیسہ) کی نواح میں غیر معمولی خشک سالی کے باعث چاول بہت کمیاب بلکہ قریب قریب نایاب ہوگیا ہے ۔ ۱۶۴۲-۴۳؁ کے جاڑوں میں بنگالے میں مہاوٹ نہیں برسی ؎

۱۶۴۵-۴۶؁ ۔ ساحل کورومنڈل کے جنوبی حصے میں ان دنوں سخت قحط رہا اس زمانے کے انگریز گماشتوں کے چند خط جو ابھی تک محفوظ ہیں، ۱۶۴۵؁ میں بارش نہ ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے لیکن اکتوبر ۱۶۴۶؁ میں ایک خط اچین سے لکھا گیا تھا ۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہوا ضرور۔ اس خط میں تحریر ہے کہ "نگاپٹم سے فاقہ زدہ غلاموں کا ایک جہازہ آیا اور ان کے ذریعے معلوم ہوا کہ گذشتہ تیرہ مہینے سے سخت قحط ہے ...... حتیٰ کہ لوگ صرف کھلانے کے وعدے پر غلامی قبول کر لیتے ہیں" سنہ ۱۶۴۶ء میں بھی بارش نہیں ہوئی اور جنوری سنہ ۱۶۴۷ء تک ساحل کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی پولی کٹ۔ یہاں عموماً اور مدراس سے کثرت اموات کی اطلاعیں ملیں حتیٰ کہ "سارے چھیپرے[1] اور جلاہے مر گئے"۔ سورت سے جو چاول بھیجا گیا وہ بہت گراں نرخ سے فروخت ہوا اور سنہ ۱۶۴۷ء کی برسات تک یہ قحط جاری رہا۔ سنہ ۴۷ء کے اکتوبر میں مدراس کے گماشتوں نے اطلاع دی کہ اب قحط کو دو سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ قحط نگاپٹم تک محدود نہ تھا۔ انہی گماشتوں نے یہ بھی لکھا کہ ملک (گولکنڈہ) کے آدھے باشندے ہلاک ہو گئے اور "ہر مقام پر جو مُردے نہایت بھیانک حالت میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں' ان کی سخت بدبو" کا ذکر کیا اور لکھا کہ "مرنے والوں کی چیخ پکار بھی سننے والوں کے لئے سخت ہولناک ہے"۔

سنہ ۱۶۴۸ء۔ اس سال راجپوتانے کے بعض اقطاع میں بارش نہیں ہوی اور "قحط پڑ گیا۔ اتنا کہ یہ اقطاع لوگوں کے بھاگ جانے یا ہلاک ہو جانے کے باعث بالکل بے چراغ اور ناقابل گذر ہو گئے"۔

سنہ ۱۶۴۹ء۔ ساحل کورومنڈل پر بار دگر قحط کے ایسے آثار نظر آنے لگے تھے کہ سورت سے چاول بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ بارے عین وقت پر خوب مینھ برسا اور یہ خطرہ دُور ہو گیا۔

سنہ ۱۶۵۰ء۔ سورت کے گماشتوں نے اطلاع دی کہ "اس سال ہندوستان کے سب حصوں میں بہت کم بارش ہوئی اور وسط جولائی سے مینھ کم برسا یا بالکل نہیں برسا چنانچہ اکثر مقامات میں غلے کا نرخ ابھی سے دُگنا ہو گیا ہے اور آیندہ گرانی کا عام طور پر سخت اندیشہ کیا جا رہا ہے"۔ یہ خشک سالی اتنی عام تھی کہ ایک طرف اودھ اور دوسری طرف گجرات میں اس کا اثر ہوا اور قریب قریب "ہر جگہ فصل کم رہی"

---

[1] چھینٹ بنانے والے یا چھاپنے والے

لیکن ظاہراً اس میں کوئی خاص شدت نہیں آئی کیونکہ اموات یا خود غلام بننے کا ذکر نہیں آتا جس سے ہم مانوس ہو چکے ہیں۔

۱۶۵۸ء۔ اس فصل میں بارش کی کمی نے فروری ۱۶۵۹ء تک جملہ اشیائے خوردنی کی قیمت سورت میں دُگنی کر دی تھی لیکن سندھ میں بلائے قحط سب سے زیادہ تھی جہاں سے اسی سال کے ستمبر میں اطلاع آئی کہ قحط اور بیماری نے "آبادی کا اکثر حصّہ فنا کر ڈالا" اور سورت کے گماشتوں نے لاہری بندر کو غلّہ بھیجا کہ جلاہوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ وہ زندہ رہ سکیں۔

۱۶۵۹-۶۰ء۔ ۱۶۵۹ء کی گرمیوں میں مشرقی ساحل پر بارش کی کمی کے باعث گرانی ہوئی اور میدان جنگ میں فوج کے لئے سامان رسد طلب کئے جانے سے نرخ اور بھی چڑھ گیا۔ اکتوبر ۱۶۵۹ء کے ایک مچھلی پٹم کے خط میں لکھا ہے کہ لوگ خوراک میسر نہ آنے سے روزانہ ہلاک ہوتے تھے اور ۱۶۶۱ء تک ساحل پر اس قحط کا سلسلہ جاری رہا۔ گجرات میں بھی اس سال بارش کم ہوئی اور اپریل ۱۶۶۰ء میں نرخ بہت بڑھ گئے بحالیکہ سندھ میں برابر قحط کا تسلط رہا کہ "زندے مشکل سے مردوں کو دفن کر سکتے تھے"۔ مورخ خافی خاں ۱۰۷۰ ہجری کے حال میں (جو ستمبر ۱۶۵۹ء سے شروع ہوا) لکھتا ہے کہ بارش نہ ہونے اور جنگ چھڑنے اور فوجوں کی نقل و حرکت سے غلّہ کمیاب اور بہت گراں ہو گیا۔ بعض اضلاع ویران پڑے رہ گئے اور لوگوں کی کثیر تعداد پائے تخت میں آ گئی۔ انتہائے مغرب میں ٹھٹھہ سے بھی قحط سالی کی اطلاع ملی اور اس طرح ہمارا پیشِ نظر عہد ختم ہوا تو غیر معمولی وسعت کے ساتھ قحط مسلط تھا۔

---

۲۱۰ اوپر جو فہرست دی گئی اس کا مطالعہ یاس انگیز ہے اور اگر مآخذ کی کوتاہی پیش نظر رہے تو یہ نتیجہ نکالنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موسم کا سترھویں صدی میں بھی وہی حال تھا جو کہ آج کل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ۱۶۴۰ء سے ۱۶۵۰ء تک کے سنین کی جو کیفیت اوپر ہماری نظر سے گذری اگرچہ وہ غیر مکمل ہو لیکن زمانہ حال کے کسی دس سال کے اعداد قحط سے کم ہوگی۔ تفصیلی موازنے کو چھوڑ کر

بھی، ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقامی گرانیاں بار بار ہوتی رہی تھیں اور شدید یا عام قحط بھی اتنی کثرت سے ضرور پڑتے تھے کہ تاجروں یا مزارعین کے تخمینوں پر ان کا اثر پڑے بغیر نہ رہتا تھا۔ فرق کچھ ہے تو وہ نتائج میں ہے کہ اُن دنوں خشکی پر حمل ونقل کے مصارف اتنے زیادہ تھے کہ اجناس خوردنی کی مقامی کمی بھی دُور سے باہر کا مال لاکے پوری نہ کی جاسکتی تھی۔ کثرت سے لوگ مر بھی جائیں، جیسا کہ مشرقی ساحل پر سنہ ۱۶۴۷ء میں ہوا، تو بھی ان کی دستگیری ممکن نہ تھی گو دوسرے اقطاع میں کافی اجناس موجود ہوں۔ اور کسی خاص علاقے کے وسائل معاش ہلاکت اور ترک وطن سے اُن دنوں اس طرح تہ وبالا ہوسکتے تھے کہ زمانہ حال میں ریلوں نے اس حالت کو غیر ممکن بنادیا ہے آج کل مقامی کمی کا اثر دُور دُور تک پھیل جاتا ہے اور اسی نسبت سے اُس کی شدت میں تخفیف ہوجاتی ہے کیونکہ کافی مقدار میں باہر سے اجناس لائی جاسکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجناس خوردنی کی نامیسری کا تخیل بھی دماغوں سے محو ہوگیا ہے بجز اُن چند علاقوں کے جو تاجر کی دسترس سے ہنوز باہر ہیں۔ بحالیکہ جس زمانے سے ہم بحث کر رہے ہیں اس میں اجناس کی کمیابی کا ہمیشہ خطرہ رہتا تھا اگرچہ گرانی کا پیمانہ کم وبیش کیوں نہ ہو۔ اور چونکہ ہم آجکل ان اثرات سے بالکل ناآشنا ہوگئے ہیں لہذا مناسب ہوگا کہ عہد قدیم کے قحطوں کے اقتصادی عواقب کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں جو قحط پڑا تھا اس کے تحریری حالات کافی شرح وبسط کے ساتھ محفوظ ہیں اور اسی لئے ہم آیندہ فصل میں اسی قحط سے بحث کریں گے۔

۲- سنہ ۱۶۳۰-۳۱ء کا قحط

اس قحط عظیم کا قریبی سبب تو یہ تھا کہ سنہ ۱۶۳۰ء میں مینہ نہیں برسا۔ اصل میں تو وسط ہند کے بعض اقطاع میں بارش نہیں ہوئی اور نہ صرف وادی گنگا میں اس کا کوئی اثر نہ تھا بلکہ پیٹر منڈی نے صورت کے شمال میں جو سیاحت کی اس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مالوے کے اکثر اضلاع بھی محفوظ رہ گئے تھے۔

باب ہفتم

عہد شاہجہانی کا وقائع نگار لکھتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے گجرات اور دکن کے صوبوں میں مطلق مینھ نہیں برسا اور ان کے متصلہ اقطاع میں بھی بارش کی کمی رہی۔ مشرقی ساحل کے انگریزی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلا ہندوستان کے دوسرے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی اور ایک تاجر جو ماہ جولائی سنہ ۱۶۳۱ میں مچھلی پٹم گیا، تحریر کرتا ہے کہ ”جلاہوں اور دھوبیوں کی زیادہ تعداد مرگئی ہے اور ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے“ جنوب میں ہمیں اتنا علم ہے کہ قحط سالی کا اثر ارم گاؤں تک محسوس ہوا لیکن اس کے آگے کے علاقے کی نسبت کوئی تحریر نہیں ملتی۔ سندھ بھی متاثر ہوا مگر وہاں سے جو خطوط سنہ ۱۶۳۵ میں لکھے گئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہاں یہ بلا کچھ بہت شدید نہ ہوگی کیونکہ اسوقت تک جیسے اثرات گجرات میں موجود تھے، ایسے سندھ میں نہیں پائے جاتے۔ زیادہ تفصیلی کیفیت جو محفوظ رہی وہ گجرات سے متعلق ہے اور سردست ہمیں اس کی حدود میں رہنا چاہیے؛

سابقہ تین فصلوں سے بارش ناکافی ہوتی رہی تاہم اتنی کم نہ تھی کہ تجارت پر کوئی خاص اثر پڑتا اور اپریل سنہ ۱۶۳۰ میں آثار بہت اچھے سمجھے جا رہے تھے۔ لیکن اس سال بارش نہ ہوئی اور اس کے فوری نتائج، بہتر ہے کہ ہم فان ٹوسٹ کی زبان سے سنیں جو ولندیزوں کا صدر سوداگر تھا اور جس نے گجرات کے مختصر احوال میں اس قحط کی سرگذشت بھی شامل کر دی تھی۔ اس کی کتاب اول مرتبہ سنہ ۱۶۳۸ میں بتاویہ میں طبع ہوئی اور پھر دوبارہ ایمسٹرڈم سے شائع کی گئی[1]۔ اس کا طرز تحریر خشک

---

[1] فان ٹوسٹ کے رسالے کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احمد آباد، کھمبائت، بڑوچ، اور بڑودہ میں صدر سوداگر تھا۔ سنہ ۱۶۳۱ سے آگے کے داغ رجسٹر میں اس کا ضمناً برابر ذکر آتا ہے۔ سنہ ۱۶۳۶ میں وہ ایک خاص سفارت پر دربار بیجاپور کو بھیجا گیا۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ملکا کا ناظم یا گورنر مقرر ہوا جہاں اس نے وفات پائی۔ اس رسالے کی طبع بتاویہ کا کوئی نسخہ میری نظر سے نہیں گذرا لیکن بیگن .... (Begin ende Voortgangh) میں طبع ثانی کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ بتاویہ کے نسخے مطبوعہ سنہ ۱۶۳۸ سے دوبارہ چھاپا گیا ہے۔ انگریزوں کے اس قحط کے متعلق بیانات کو منڈی نے جمع کر دیا ہے (جلد دوم، ضمیمہ ۱) اور وہ انگلش فیکٹریز

اور عبارت آرائی سے معرّا ہے۔ اصل میں یہ ایک تاجرانہ تحریر ہے جسے ایسے آدمی نے لکھا جو ملک سے خوب واقف تھا اور جس کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ چند ہی روز بعد وہ زیادہ اہم خدمات پر مامور کیا گیا۔ اس نے جن ہولناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے، ان میں مذکورہ بالا خصوصیات کے باعث اور بھی قوت آگئی ہے اور ادھر ان کے وقوع کی انگریزوں کے جستہ جستہ بیانات اور اسلامی وقائع نگار کی مرصّع عبارات سے بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے؛

فان ٹوسٹ کہتا ہے کہ "بارش اس قدر کم ہوی کہ جو بیج زمین میں ڈالا تھا وہ ضائع ہو گیا اور گھانس تک پیدا نہیں ہوئی۔ مویشی مرنے لگے۔ قصبات و دیہات میں راستے اور کھیتوں پر کثیر تعداد میں لوگ مردہ پڑے تھے اور ان کے تعفّن سے راستہ چلتے خوف آتا تھا۔ گھانس نہ ہونے کے باعث مویشی نے مردوں سے شکم پُری کی اور آدمیوں نے مُردہ جانوروں کا گوشت کھایا۔ بعض حالتِ یاس میں کتّوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں ڈھونڈتے پھرتے تھے ....

قحط میں اور زیادتی ہوئی تو لوگ بستیاں چھوڑ کر نکل پڑے اور کمال بے بسی کے ساتھ آوارہ پھرنے لگے۔ ان کی حالت معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ آنکھیں بہت اندر گھس گئی تھیں۔ ہونٹ زرد اور ان پر پٹریاں جمی ہوئی تھیں۔ کھال خشک و سخت اور اندر کی ہڈیاں صاف نظر آتی تھیں۔ پیٹ ایک خالی تھیلی کی طرح لٹکتا تھا۔ رُخسار اور گھٹنوں کی ہڈیاں الگ اُبھری ہوی تھیں۔ ایک بھوک سے چیختا اور ڈکراتا تھا تو دوسرا زمین پر پڑا دم توڑتا تھا۔ جدھر جاؤ اُدھر لاشوں کے سوا کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی؛

لوگوں نے بیوی بچوں کو چھوڑ دیا۔ عورتوں نے اپنے آپ کو اور ماؤں نے بچّوں کو، اور جن بچوں کو والدین نے چھوڑ دیا تھا، انہوں نے خود کو فروخت کر دیا بعض گھرانوں نے زہر کھا لیا اور سب کے سب مر گئے۔ بعض ندیوں میں جا گرے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:- جلد چہارم میں بھی موجود ہیں عبدالمجید کا بیان ایلیٹ میں (جلد ہفتم ۲۴) ترجمہ کیا ہے؛

مائیں بچوں کے ہاتھ میں ہاتھ لئے ندیوں کے کنارے گئیں اور ڈوب مریں چنانچہ ندیوں میں لاشیں بہتی پھرتی تھیں۔ بعض لوگ مُردوں کا سڑا ہوا گوشت کھاتے اور بعض ان کی انتڑیاں نکال کے، (اس کے اندر کی) غذا سے اپنے پیٹ بھرتے تھے۔ سچ سمجھئے گا کہ گلی کوچوں میں جو لوگ دم توڑ رہے تھے اور ابھی پورے مرے نہیں تھے، ان کو لوگوں نے کاٹ کاٹ کے کھالیا اور زندوں کو کھا کھائے پیٹ بھرا جس سے نہ صرف باہر راستوں بلکہ گلی کوچوں پر چلنے والوں کو خطرہ ہوگیا کہ کہیں انھیں مار کے لوگ کھا نہ جائیں ……

روزانہ ہولناک واقعات دیکھنے میں آتے تھے۔ کافرِ مطلق تک یہ سنکر حیرت و تاسف کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو مارا اور پکا کے کھا گئی۔ پھر ایک مسیحی قلب پر تو ان اطلاعات سے کہ شوہروں نے اپنی بیویوں کو اور بیویوں نے اپنے شوہروں کو اور بچوں نے اپنے ماں باپ کو کھالیا، جو کچھ صدمہ گزرتا ہو وہ کم تھا۔ لیکن ان باتوں کو تفصیل سے بیان کرنا مفت کی زحمت ہوگا۔ لاکھوں نفوس بھوک سے ہلاک ہوئے[۱] کہ سارے ملک میں لاشیں بے گور و کفن پڑی رہیں جن سے ایسی بُو پیدا ہوئی کہ تمام ہوا اس سے متعفن ہوگئی۔ ہمارے بعض ولندیز ہموطنوں نے احمد آباد سے آتے ہیں چند آدمیوں کو دیکھا کہ مختصر الاؤ کے گرد بیٹھے (انسانوں کے) ہاتھ پاؤں پکا رہے تھے۔ جو ایک ہول انگیز نظارہ تھا۔ اس سے بھی بدتر مثال سوسنترا گاؤں کی ہے جہاں آدمی کا گوشت علانیہ منڈی میں فروخت ہوا، یہ خوفناک قہر الٰہی زیادہ تر غریب غربا پر نازل ہوا[۱] جن کے پاس کوئی جمع جتھا نہ تھی؛

اس کے بعد فان ٹوسٹ کی سرگزشت میں نرخ اجناس کی تفصیل درج ہے

---

[۱] اس تعداد کو لفظاً لفظاً صحیح نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ محض محاورے کے طور پر لکھدی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے حساب موتیں واقع ہوئیں؛

(نہ صرف یہ تعداد بلکہ پورا بیان بداہتہً مبالغہ آمیز سنی سنائی روایات پر مبنی ہے اور تاریخی طور پر اس کو مطلق وقعت نہیں دی جاسکتی۔ مترجم)

جو گذشتہ باب میں زیر بحث آچکی ہیں۔ پھر ۱۶۳۱ء کی فصل کا ذکر آتا ہے جب کہ شروع میں امید افزا بارش ہوئی اور نرخ گرنے لگے۔ لیکن، فان ٹوسٹ اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ ’یہ بہتری پائے دار نہ تھی اور معلوم ہوا کہ ابھی عذاب الٰہی کا سلسلہ ختم ہونے نہ آیا تھا۔ چنانچہ خدا کی طرف سے ٹڈی، چوہے، اور دوسرے کیڑے نازل ہوئے جنھوں نے نئی فصل کو سخت نقصان پہنچایا۔ پھر مسلسل تیز بارش ایسے وقت میں ہوئی کہ فصل تیار ہو گئی تھی، اور اس سے بہت سا غلہ کھیتوں میں ضائع ہو گیا۔ ندیوں کی طغیانیوں نے قصبات اور دیہات میں اور بھی نقصان پہنچایا۔ اور نرخ پہلے سے بھی زیادہ چڑھ گئے۔ اس طرح تمام سال قحط کا تسلط رہا اور اس کے عقب میں وبا اور تپ کا وہ حملہ ہوا کہ ملک بھر میں مشکل سے کوئی شخص تندرست بچا ہوگا۔ لاشیں دنوں تک گھروں کے اندر پڑی رہیں کیونکہ انھیں باہر نکلوانے کے لئے اُجرت میسر نہ تھی۔ لاشے جلانے کے لئے لکڑیاں نہ ملتی تھیں لہذا بے جلی لاشیں یا دبا دی گئیں یا ندی میں پھنکوا دی گئیں۔ اللہ تعالےٰ ان خوفناک مصائب سے تمام مسیحی ممالک کو محفوظ رکھے!

ہندوستان کے اس قسم کے قحطوں کا جواب قصۂ ماضی ہو چکے ہیں۔ جن صاحبوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ فان ٹوسٹ کی مذکورہ سرگذشت کی نمایاں خصوصیات پڑھکر کچھ ”متحیر“ نہ ہونگے۔ خاندان اور کنبے کی زندگی کا تہ و بالا ہونا، زرعی سرمائے کی بربادی، بے ٹھکانے آوارہ گردی، از خود غلام بننا، خودکشی یا محض فاقہ کشی سے اموات واقع ہونا، مردم خواری۔ ان سب آفتوں کی مثالیں ہندوستانی یا بیرونی لوگوں کے بیانات سے جنھوں نے اسی قسم کی بلائے آسمانی کے حالات لکھے ہیں، پیش کی جاسکتی ہیں[1]؛ واضح رہے کہ فان ٹوسٹ نے سرکاری امداد و دستگیری کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن ہندوستانی بیانات سے ہم ایسی تدابیر اور ان کی نوعیت و وسعت کا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں۔ سرکاری لنگر خانے قائم کروئے جاتے تھے۔ محاصل معاف ہو جاتے تھے۔ مفت روپیہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ مگر تحریری واقعات سے ظاہر ہوتا ہے

---

[1] اگر نہ اتنی کثرت سے اور ایسی ہول انگیز شکل میں، جیسی کہ فان ٹوسٹ کے بیان میں مذکور ہیں۔ مترجم۔

کہ ان تدابیر کا اثر بہت خفیف ہوتا تھا اور معاملہ کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ان تدبیروں سے اجناس خوردنی کی واقعی کمی کا کوئی تدارک ممکن نہ تھا۔ ان سے یہہ ہوسکتا تھا کہ ملک میں جو ذخیرے موجود ہیں، ان کی تقسیم ذرا بہتر طریق پر ہونے لگے، لیکن یہہ تدبیریں ملک میں غلہ نہیں لاسکتی تھیں۔ اور گو ان کا ناقص ہونا بدیہی بات ہے، لیکن یہہ تجویز کرنا کچھ آسان نہیں کہ ان کے سوا اور کیا کیا جاسکتا تھا۔ سنہ ۱۶۳۱ اور سنہ ۱۶۳۲ کے مراسلات میں ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انگریز سوداگروں نے ایران سے غلے کی کثیر مقدار طلب کی تھی مگر جہاز رانی کی دقتوں سے یہہ ذریعہ رسد رسانی بہت محدود و تنگ ہوگیا تھا۔ رہا سندھ، وہاں خود قحط کا اثر تھا۔ ساحل ملیبار پہلے ہی اشیاے خوردنی کثیر مقدار میں باہر سے منگوایا کرتا تھا۔ ساحل مشرقی پر فاقہ کشی کی نوبت تھی اور یہ بات کم سے کم مشتبہ ضرور ہے کہ دنیا کی کوئی بہترین اور سب سے خداترس حکومت بھی سمندر کے راستے اشیاے خوردنی کی آمد و رآمد کا انتظام کرسکتی تھی جو اس موقع پر کافی ہوجاتیں۔ شمال میں زائد از ضرورت غلہ موجود تھا لیکن بری حمل و نقل کے مصارف ہم بتاچکے ہیں کہ نہایت گراں تھے اور یہہ بھی عقل میں نہیں آتا کہ باربرداری کے جانور کیونکر اتنی بڑی مقدار میں جو ضرورت کے مطابق ہوتی، ایسے علاقے سے مال لاسکتے ہیں جہاں دُور دُور تک دانہ چارہ اور پانی میسر نہ تھا۔

نظر برایں سلطنت مغلیہ کے انتظام کو الزام دینا کہ وہ لوگوں کو بلاے قحط سے نجات نہ دلاسکا، انصاف کے خلاف ہوگا جبکہ یہ قہر الٰہی اس زمانے کے حالات کے اعتبار سے گویا ایک ناگزیر چیز تھی۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو تدبیریں کی گئیں وہ نہ صرف ناکافی بلکہ بے دلی سے تھیں اور سربرآوردہ اشخاص کا طرز عمل ایسا تھا کہ مصیبت کم ہونے کی بجائے کچھ اور بڑھ گئی۔ اس قول کی بنا ہیٹر منڈی کے بیان پر ہے جس نے سورت سے برہان پور تک راستے کے مشاہدات بیان کئے اور زور دیا ہے کہ ان مصائب کو دُور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔ بلکہ "دولت مند اور مقتدر لوگ جو کچھ تھا، اسے خود سمیٹ لینے کی فکر میں تھے"۔ یہی راوی لکھتا ہے کہ شمال سے مدد ملنے کی کوئی امید نہ ہوسکتی تھی

کیونکہ مغلیہ فوجیں برہانپور میں اس راستے پر پڑی تھیں جس سے غلّہ آسکتا تھا۔ اور گو بہروچ کے قریب کے علاقے میں اجناس خوردنی کے ذخیرے خوب بھرے ہوئے تھے لیکن "غریب گجرات"، جسے سب سے زیادہ ضرورت تھی، اسے کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ یہ سب مال برہانپور بھیج دیا جاتا تھا کہ بادشاہی لشکر کی سربراہی ہوسکے"۔ لیکن یہ رکاوٹ عارضی تھی۔ ۱۶۳۱ء کے اخیر میں بنجارے آنے لگے۔ بحری تجارت سے مدد ملنے لگی اور اس کے بعد سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آبادی بچ گئی تھی اس کی ضرورتیں اتنی نہ رہیں کہ معمولی وسائل تجارت سے پوری نہ ہو سکتیں۔ گو نرخ ابھی تک عام اوسط سے کہیں زیادہ چڑھے ہوئے رہے"۔

اس مصیبت کبریٰ کا تجارت و صنعت پر جو اثر فوری پڑا، اس کی تمثیل ذیل کے چند واقعات سے کی جا سکتی ہے جو اس عہد کے انگریزی مراسلات سے چنے گئے ہیں۔ اکتوبر ۱۶۳۲ء تک سورت میں آئندہ نیل کی کمیابی کا اندازہ کرلیا گیا اور احمد آباد کی بجائے آگرے سے خریداری کے انتظام کئے جانے لگے اسی مہینے میں یہہ ضروری معلوم ہوا کہ مال کے جہازوں تک لانے میں حفاظت کا خاص انتظام کیا جائے کہ راستے میں وہ "فاقہ زدہ لوگوں کے حملے" سے محفوظ رہے"۔ نومبر میں پچھلی پٹھ سے سوتی مال کی کمیابی، اور سونے وغیرہ اشیاے درآمد کے نرخ گرنے کی اطلاع ملی اور ادھر سورت کے گماشتوں کو یہ موقع جو شاذ و نادر ہی نصیب ہوتا تھا، پیش آیا کہ سوتی مال اور نیل کی کمی کے باعث روپیہ ہاتھ میں رہا اور اسے صرف کرنے کے لئے وہ مکاسر سے چاول خریدنے کی تجویزیں کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ انگریزی جہازوں پر جو خوراک مقرر تھی اس میں کمی کی جانے لگی۔ اس عرصے میں شرابوں کا بھی قحط پڑگیا کیونکہ شراب کھینچنے والے "ان علاقوں میں بھاگ گئے جہاں زیادہ خوشحالی کی امید تھی۔ ایسا ہی حال اور بہت سے لوگوں، جلاہوں، دھوبیوں، رنگریزوں وغیرہ کا ہوا جس سے ہم لوگ قریب قریب مایوس ہوگئے ہیں کہ آئندہ سال وطن کے لئے واپسی کے جہاز کس طرح بھر سکیں گے"؟ دسمبر میں ارم گاؤں نے خبر دی کہ کپڑے کی قسم ادنی ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ روئی کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے۔ اور سال کے آخری دن سورت سے لکھا گیا

کہ پیشہ ور ہزاروں کی تعداد میں گھر چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کھیتوں میں ہلاک ہو رہے ہیں۔ سونے کے نرخ گھٹ جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ غریب فروخت کر رہے تھے اور امیروں کو خریدنے کی استطاعت نہ تھی۔ نیل کی پیداوار گجرات میں معمول کی نسبت تقریباً ۱/۴ حصہ رہ گئی تھی، اور منڈی میں پرانے کوڑے کے سوا کچھ نہ ملتا تھا۔ روئی اور سوت کا نرخ دُگنا ہو گیا۔ رہزنوں نے جو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوئے تھے، راستہ چلنا مخدوش کر دیا اور ہرکاروں تک کی جان کے لالے پڑ گئے۔ غرض قحط اور دکن کی جنگ نے مل کر "سارے بیوپار کو پراگندہ کر دیا۔"

سالِ نو کے اوائل میں ہم خرچ باربرداری میں بیشی ہونے کا حال پڑھتے ہیں۔ یہ تنبیہ بھی کی جا رہی ہے کہ مقامی محصول خانوں میں شورے کو شکر نہ بتایا جائے کہ مبادا اسے خوردنی شئے سمجھ کر پکڑ لیا جائے اور پھر یہ فریب بھی کھل جائے۔ انگلستان سے آنے والے جہازوں کو بھی مشورے دئے گئے کہ راستے سے چاول بھر بھر کے لائیں۔ لیکن ممکن ہے کہ اس عرصے میں یہ گماشتے بھی تن بہ تقدیر ہو بیٹھے ہوں کہ آخر میں ان کی مکاتبت بہت مختصر ہو گئی ہے۔ جون میں بارش سے اچھی امید پیدا ہوئی اور پھر کاروبار میں سرگرمی آ گئی۔ بڑوچ اور بڑودہ میں دو ہر تھان پر ایک سیر غلہ دینے سے "سوتی پارچہ ہاتھ آنے لگا اور اس بات کی توقع ہو گئی کہ کچھ نہ کچھ مال جہازوں میں بھر کر انگلستان روانہ کیا جا سکے گا لیکن ستمبر میں معلوم ہوا کہ سوتی مال اور نیل کا نرخ ناقابل برداشت ہے اور ادھر اشیائے خوردنی کی قیمتیں انتہائی درجے کی گراں ہو رہی تھیں۔ (یعنی تقریباً ۲ سیر فی روپیہ غلہ ملتا تھا) طرح طرح کے بخار اور وبائی امراض ہر گھر میں پھیلے ہوئے تھے انگریز سوداگر بھی ان بیماریوں سے محفوظ نہ رہے۔ اکتوبر میں سوائے صدر نشین کے ہر شخص یا مر گیا یا بیمار پڑا تھا اور اگلے مہینے میں خود صدر نشین راہی ملک بقا ہوا گجرات جو "دنیا کا گلزار" تھا، ویران بیابان رہ گیا جس میں، تھے تو چند ہی کاشتکار دکاریگر رہ گئے تھے۔ نیل زمین میں پڑا خراب ہو رہا تھا کہ اُسے چُننے والے نہ ملتے تھے۔ اور وہ مقامات جہاں کپڑے کے پندرہ پندرہ گٹھے ایک دن میں تیار ہو جاتے تھے، اب ایک مہینے میں مشکل سے تین گٹھے تیار کر سکتے تھے۔ اس

زمانے کے ایک ولندیزی گماشتے نے اپنے خط میں تین سال تک تجارت بحال ہونے سے نا امیدی ظاہر کی ہے اور ختم سال ۱۶۳۱ء تک اسی تباہ حالی کا دَور دَورہ تھا۔"

۱۶۳۲ء کے آغاز سے مصائب کی رَو پلٹا کھانے لگی۔ فان ٹوسٹ کے بیان سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ۱۶۳۱ء کی آفتیں گذشتہ سال کی نسبت، محدود اور مقامی نوعیت کی تھیں۔ اسی لئے جو علاقے بہت دُور نہ تھے، وہاں سے رسد میسر آنے لگی اور باہر سے غلہ پہنچنے کے باعث نرخ گرنے شروع ہوئے۔ بدترین تکلیف و پریشانی کا وقت گزر گیا لیکن صنعت و تجارت کی بحالی کے لئے ایک مدّت درکار تھی۔ اس کی سُست ترقی کا انگریز سوداگروں کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے۔ فروری ۱۶۳۲ء تک بڑے درجے میں گیہوں ملنے لگا مگر سورت میں سارے مال پر والیٔ شہر اور ایک یا دو تاجروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سال مشرقی ساحل پر خوب بارش ہوئی اور سورت سے فصل کے متعلق کوئی شکایت نہیں سُننے میں آئی۔ بایں ہمہ ختم سال پر نیل، سوتی پارچہ، اور دوسری اشیا ہنوز نہایت گراں تھیں، اور باہر کے مال کو کوئی خریدنے والا مشکل سے ملتا تھا۔ نومبر ۱۶۳۳ء تک نرخ اتنے چڑھے ہوئے تھے کہ انگلستان میں فائدے سے مال بکنے کی کوئی توقع نہ تھی اور اکتوبر ۱۶۳۴ء میں بھی ہندوستان میں بہت کم ایسی اشیا ملیں بلکہ بالکل نہ ملیں کہ جن کا کوئی نفع رساں بیوپار کیا جا سکتا۔ تجارت کے لئے مشرقی ساحل پر بھی نرخ زیادہ گراں تھے لیکن اس سال فصل اچھی ہونے سے یہ امید کی جا رہی تھی کہ منڈی جلد اصلی حالت پر عود کر آئے گی۔ دسمبر میں سورت کے گماشتوں نے کمپنی کو لکھا کہ نقصانات اتنے بے اندازہ ہوئے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجارت کی بحالی کی کیا صورت ہوگی۔ اور آخر میں اپنا اندازہ یہ بتایا کہ جیسی بحالی ہونی چاہیئے اس میں کم سے کم پانچ سال درکار ہوں گے۔" لیکن حسن اتفاق سے ۱۶۳۴ء کی بارش غیر معمولی طور پر اچھی ہوئی۔ پیشہ ور واپس آنے لگے اور شہر دوبارہ آباد ہونے لگے۔ اس کیفیت کو گذشتہ باب میں بھی جزءً ہم نقل کر چکے ہیں لیکن امید ہے اس کا دوبارہ نقل کرنا گراں نہ گزریگا۔"

باب ہفتم

"دیہات بہت آہستہ آہستہ آباد ہو رہے ہیں۔ لیکن لوگوں کے حق میں یہہ بھی بہتری ہے۔ اور اگر ہر قسم کے حکام کی حرص و تعدّی صرف اتنا موقع دے کہ یہہ غریب ایک ہی سال تک ظلم سے بچے رہیں تو وہ اس کے قابل ہو جائیں گے کہ وہ مویشی جمع کر سکیں اور اس طرح زمین کی زرخیزی میں اضافہ کر سکیں اور سوائے وقت کے اور کسی چیز کی احتیاج اس بارے میں نہ رہے گی کہ بچے اپنے آباو اجداد کی خدمت انجام دینے لگیں"۔

یہہ آخری جملہ قابل لحاظ ہے۔ اس قسم کے قحطوں کا ایک دیرپا اثر یہہ بھی ہوتا تھا کہ مشاق و ماہر مزارعین اور کاریگروں کے مرجانے سے کاموں کی نوعیت میں خرابی آجاتی تھی چنانچہ اسی سبب سے گجرات کے سوتی مال کی شہرت کئی سال تک بگڑی رہی۔ تدریجی بحالی کی رفتار ہر جگہ یکساں نہ تھی۔ ستمبر ۱۶۳۵ء میں احمد آباد اور بڑودہ میں تو انگریزوں نے دوبارہ کوٹھیاں کھولنے کا انتظام کیا مگر بڑوچ میں اس وقت تک "پوری طرح جلاہے آباد نہیں ہوئے تھے" لہذا وہاں علیحدہ کارخانہ قائم کرنا بے سود سمجھا گیا۔

بیوپار کی پوری بحالی کی اطلاع دسمبر ۱۶۳۵ء کے ایک خط سے ملتی ہے جس میں سورت کے گماشتے خبر دیتے ہیں کہ غلّے کی ارزانی اور باشندوں کے دوبارہ آنے سے نرخ اشیا کم ہونے لگے ہیں اور ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نئے سرے سے کام شروع کر دیں، بایں ہمہ گجرات سے ہر چیز جس کی ضرورت تھی مہیّا نہ ہو سکی اور کافی مقدار میں مال بہم پہنچانے کے لئے وہ اپنا کاروبار سندھ و شمالی ہندوستان تک پھیلا رہے تھے۔ جنوری ۱۶۳۶ء میں ہندوستانی سوداگروں نے اپنا مال کرائے پر ایران بھیجنے کی آمادگی ظاہر کی اور اس زمانے سے مراسلات میں تجارت کی پھر وہی گہما گہمی دیکھنے میں آتی ہے جیسی قحط کے قبل تھی۔ مارچ تک غلّے کی قیمت معمولی اوسط سے بھی کم رہ گئی اور اپریل میں سورت سے غلّہ اور کپاس مچھلی پٹم بھیجی جانے لگی کہ وہاں گولکنڈے کی ۱۶۳۵ء کی خشک سالی کے اثرات محسوس ہو رہے تھے۔ اب بڑودہ اچھے کپڑے تیار کر رہا تھا مگر بڑوچ ابھی تک "شکستہ" تھا کیونکہ ستمبر کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "لوگ مفرور و ہلاک

باب ہفتم

ہو گئے ہیں اور اب اس لئے بھی واپس آنے سے ڈرتے ہیں کہ روزگار نہ ملے گا"۔

۱۶۳۳ء کی مراسلت سے واقعات کی رفتار کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ دسمبر ۳۸ء میں ایک گماشتے نے لکھا ہے کہ "ملک قحط کے اثرات سے نجات پا گیا۔ افراط سے ۲۱۸ مال مل سکتا ہے اور بیوپار کی ترقی کی امیدیں اچھی ہیں"۔ بنظر بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۶۳۹ء تک گجرات میں پھر خوشحالی کا دَور دَورہ تھا۔ اگرچہ آبادی کم ہو گئی اور صنعت میں کسی قدر زوال آ گیا جس کی وجہ سے سوتی مال اور دوسری مصنوعات کی نوعیت پر بُرا اثر موجود تھا"، پھر بھی دوسری مصنوعات سرعت سے اصلی حالت پر آ رہی تھیں۔ بڑوچ تک ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتا تھا گو بیرونی ممالک میں شہرت ایسی بگڑ چکی تھی کہ گجرات کو یورپ کی منڈیوں میں جو فضیلت حاصل تھی، وہ جانے کے بعد پھر ہاتھ نہ آئی"۔

اس قحط کا ممالک دکن میں جو کچھ اثر ہوا ہو، اس کی تفصیلی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہاں یورپ والوں کی دکانیں نہ تھیں۔ لیکن بعض قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ عذاب شدّت کے اعتبار سے وہاں بھی گجرات ہی کے برابر رہا ہو گا۔ بادشاہ نامہ ۱۶۵۰ء کے قریب تحریر ہوا ہے، وہ مغلیہ سلطنت کے صوبوں کی جو حالت تھی، اس سے گجرات اور گجرات کے ساتھ دکن کے چار صوبوں کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ مصنّف نے اعداد سے بادشاہی مالگزاری کی وہ توفیر دکھائی ہے جو شاہجہاں کے پہلے بیس سال میں ہوئی لیکن لکھا ہے کہ یہ پانچ صوبے اپنے حال پر رہے بلکہ ان میں اُلٹی کچھ کمی ہو گئی۔ اور مصنّف صراحۃً ۱۶۳۰-۳۲ء کے قحط کو اس کا سبب بتاتا ہے۔ ۱۶۵۳ء میں جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرّر ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ گو مالگزاری کم کر دی گئی لیکن اس پر بھی وہ زیادہ ہے اور ان صوبوں کے مداخل سے بادشاہی خزانے کو رقم جانا تو درکنار خود مقامی انتظام کے مصارف پورے نہیں ہو سکتے۔ غرض کم سے کم ایک نسل تک ملک دکن کی مالی حالت خراب رہی"۔

۱۶۳۰ء کے قحط کے حالات و اثرات پر یہ طویل تبصرہ اس لئے جائز ہے کہ تاریخ ہند میں اس قسم کے حوادث بار بار رونما ہوتے رہتے تھے۔ قحط کی شدّت

اور وسعت میں بہت کچھ فرق ہوتا تھا لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ گو قحط کے اثرات کے مدارج میں فرق ہو مگر ان کی نوعیت یکساں ہوتی تھی۔ جب ایک مرتبہ سامان خوردنی کی واقعی کمی کا علم ہو جائے یا محض شبہ پھیل جائے، اور کافی درآمد کا امکان نہ ہو تو یہہ یقینی بات ہے کہ لوگ اس مقام سے نکل جائیں گے، اور اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھئے تو اس قسم کے ۲۱۹ نکل جانے کا سوائے اس کے کیا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ "غذا کی تلاش میں بے ٹھکانے مارے مارے پھریں" اور یہہ ترکِ وطن کی رسم اس قدر مروّج ہو گئی تھی کہ گذشتہ صدی تک اس کے ابتدائی آثار دیکھتے ہی سمجھ لیا جاتا تھا کہ فوری امداد کا وقت آگیا ہے[1]۔ گاوں، قصبہ ہو یا ضلع، جب ایک مرتبہ کوی آبادی ترکِ وطن، بیماری اور اموات سے تہ و بالا ہو جائے تو پھر اس کی معاشی زندگی کا جلد حسب سابق درست ہو جانا غیر ممکن ہے۔ اور اس زمانے کی کتابوں میں امداد کی ایسی نتیجہ خیز تدابیر کا کوی ذکر بھی نہیں آتا جو اس قسم کی بحالی کے جلد عود کرنے میں ممد ہوتیں۔ آوارہ پھرنے والے اچھی فصل کی خبر سن کر خود ہی واپس آجاتے اور آہستہ آہستہ سابقہ معاشرت درست ہو جاتی تھی۔ لیکن یہہ درستی کم سے کم بہت دیر کا کام ضرور تھا اور جیسا کہ ہم گجرات میں دیکھ چکے ہیں ہو سکتا تھا کہ حکّام کی تعدّی اور حرص و آز نے اس میں اور بھی تاخیر پیدا کر دی۔ ان حالات میں معاشرت کی تاریخ لکھنے والا تو زیادہ تر نفوس کے اتلاف اور مصائب کی شدّت پر توجّہ کرے گا جو مختلف پیمانے پر پیہم ظہور میں آتی رہتی تھی۔ لیکن ماہر اقتصادیات سے براہ راست جن چیزوں کا تعلّق ہے ان میں سرمائے کی بربادی، خاصکر کسان کے کام کے مویشیوں کا ضائع ہونا، کاریگری اور واقفیت کا گھٹ جانا، اور بیرونی منڈیوں میں شہرت کا بگڑنا، سب سے ممتاز عنوانات ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو روداد انڈین فیمن کمیشن ۱۹۰۱ء، صفحہ ۱۴۔

باب ہفتم کے ماخذ

فصل اوّل؛ قحطوں کی فہرست کے ماخذ حسب ذیل ہیں:۔

سنہ ۱۶۱۴-۱۵ء کے لئے، ایلیٹ ششم، ۳۴۶؛ تزک، اوّل، ۳۳۰؛

سنہ ۱۶۱۸-۱۹ء کے لئے، ہیگ ٹرینس کرپٹس۔ اوّل، ۱۶۲؛ فاریا یا سوزا۔ سوم، ۲۹۸؛ میتھوولڈ، ۳ ۹۹۳؛

سنہ ۱۶۳۵ء کے لئے، داغ رجسٹر۔ مارچ، جون، اکتوبر سنہ ۳۶ء۔

سنہ ۱۶۴۰ء کے لئے ایضاً۔ مارچ سنہ ۱۶۴۱ء؛

سنہ ۱۶۴۲ء کے لئے ایضاً (کورومنڈل) فروری، اکتوبر سنہ ۱۶۴۳ء؛

سنہ ۱۶۴۵-۴۶ء کے لئے انگلش فیکٹریز ہفتم، ۴۶ وغیرہ

سنہ ۱۶۴۷ء۔ سنہ ۱۶۴۹ء۔ سنہ ۱۶۵۰ء۔ سنہ ۱۶۵۸ء۔ اور سنہ ۱۶۵۹-۶۰ء کے لئے، ایضاً۔ نیز داغ رجسٹر۔ ۱۳ جنوری وغیرہ سنہ ۱۶۶۱ء ایلیٹ ہفتم، ۲۶۳۔

فصل دوم۔ سنہ ۱۶۳۰ء کے قحط کی وسعت کے متعلق ملاحظہ ہو انگلش فیکٹریز۔ چہارم، عبارات مختلف؛ منڈی۔ دوم، ۵۵؛ ایلیٹ۔ ہفتم، ۲۴؛ اوّل الذکر کتاب میں جابجا یہ ذکر آتا ہے۔ فان ٹوسٹ کا منقولہ بیان تیسرے باب میں ہے؛ امدادی تدابیر کے لئے ملاحظہ ہو، ایلیٹ۔ ہفتم، ۲۴؛ ایتھرج، ۳۹-۶۳؛ منڈی۔ دوم، ۹۴ وغیرہ؛ صنعت و تجارت پر جو اثرات مذکور ہیں وہ انگلش فیکٹریز کی

چوتھی اور تدریجی بحالی کے متعلق چوتھی اور پانچویں جلد کے مختلف اجزا سے لئے گئے ہیں دکن کے حالات کا ماخذ بادشاہ نامہ۔ دوم، ۱۰، ۷ اور سرکار ز اورنگ زیب اوّل، ۷۰، ۱ و مابعدہا، ہیں۔

باب ہشتم

نظم ونسق کے اقتصادی اثرات

۱۔ ہندوستانی ممالک میں بیرونی تاجروں کی حیثیت

ہم کو اب اپنے مضمون کے آخری شعبے کی طرف توجّہ کرنی چاہیئے اور پیش نظر عہد میں جو مالی اور انتظامی محکمے اور ادارے ہندوستان میں موجود تھے، ان کو اقتصادی نقطۂ نظر سے جانچنا چاہیئے۔ ہمیں اُس زمانے کے نظم ونسق کی عملی کیفیت کا علم بہت کچھ ولندیزی اور انگریز تاجروں کے مشاہدات ہی سے ہوا ہے لہذا سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خود ان مشاہدہ کرنے والوں کی مُلک میں کیا حیثیت تھی۔ خصوصاً اسلیے بھی کہ آج کل ہندوستان میں اس کے مماثل کوئی شئے موجود نہیں ہے۔ آج اگر بیرونی سوداگروں کی کوئی جماعت، مثلاً امریکی، یا جاپانی زمانہ حاضرہ کے کسی بڑے شہر جیسے کلکتہ یا بمبئی میں اپنی کوئی دکان قائم کرنے کا فیصلہ کریں تو ان کو اپنے حقوق اور ذمہ داریاں پہلے سے بخوبی معلوم ہو جائیں گی۔ انھیں دفتر یا گودام کھولنے کے لئے کسی سرکاری اجازت کی ضرورت نہ ہوگی نہ انھیں اپنے مال کے متعلق کروڑگیری یا میر بحری کے محاصل اور باربرداری کے مصارف کے واسطے پہلے سے شرائط طے کرنے پڑیں گے۔ شہر اور بندرگاہیں اُن کے لئے کھلی ہوئی

ہونگی البتہ ان کا یہاں قیام پذیر ہونا از خود انھیں ہندوستان کے ایک بڑے حصہؔ قانون کا پابند بنادے گا۔ وہ عام دیوانی یا فوجداری عدالتوں کی حدودِ قانونی سے باہر نہ ہونگے اور محاصل وغیرہ کے متعلق جو ضوابط نافذ ہیں، انھیں بھی انکی تعمیل کرنی پڑے گی مگر یہ انتظام جو آج کل قدرتی اور اتنا ہی آسان و مناسب نظر آتا ہے، کم سے کم ایشیا میں بالکل نئی چیز ہے۔ جس عہد کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اس زمانے میں کسی شہر یا بندرگاہ میں پردیسی سوداگروں کو بس جانے کی اجازتِ عام نہ تھی بلکہ اس قسم کا قیام خاص خاص معاہدات یا اقرار ناموں پر مبنی ہوتا تھا اور عام قانون کی بجائے حکام اور بیرونی سوداگروں کے تعلقات انہی معاہدات کے مطابق قائم ہوتے تھے۔ (یورپ کے) مصنفوں نے بعض جگہ یہ دعوے کیا ہے کہ پردیسی سوداگروں کو جو امتیازات ہندوستان میں حاصل تھے وہ سب سے پہلے فرنگی تاجروں نے جبراً لئے تھے مگر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرنگی جہازوں کے ہندوستانی سمندروں میں آنے سے قبل اسی قسم کے امتیازات ایشیائی سوداگروں کو حاصل تھے اور نئے آنے والوں نے جیسا عمل درآمد دیکھا اسی کے مطابق خود بھی رہنے سہنے لگے۔

ان خالص ایشیائی انتظامات کی نوعیت دو مثالوں سے واضح ہو سکتی ہیں جن کے واقعات صاف طور پر تحریر میں موجود ہیں۔ ایک مشرق اقصیٰ کی بندرگاہ ملکاؔ کی مثال، اور دوسری کالی کٹ کی، جو پرتگیزوں کی آمد کے تغیرات سے پہلے غالباً ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ ۱۵۱۱ء میں جب البوکرک ملکاؔ پہنچا تو شہر میں پہلے سے چند پردیسی تاجروں کے کارخانے موجود تھے اور ہر قوم کے لوگ اپنے جداگانہ قوانین و رواج کے مطابق رہتے سہتے تھے۔ ہر قوم کا اپنا سرگروہ یا مکھیا ہوتا تھا جو اپنے ہم قوموں میں حاکم یا گورنر کے فرائض ادا کرتا تھا۔ البوکرک کی آمد کو ان پردیسی بستیوں میں مختلف نظروں سے دیکھا گیا۔ چین و جاوا کے لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن مغربی ساحلِ ہند کے مسلمانوں نے پرتگیزوں کی بستی بسنے کی سخت مخالفت کی اور ان کے ملایا والے ہم مذہبوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان مخالفین کو بادشاہ کے

مزاج میں درخور حاصل تھا اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ وجدال کی نوبت پہنچی فریقین میں وجہ مخاصمت کیا تھی؟ اس کو باضابطہ کسی نے تحریر نہیں کیا ہے لیکن مسئلہ متنازعہ فیہ صریحاً تجارت سے تعلق رکھتا تھا۔ ملکا، مشرق و مغرب کے درمیان مال منتقل کرنے کی بندرگاہ تھی لہٰذا چین اور جاوا کے تاجر طبعاً خوش ہوئے ہونگے کہ خود مغرب کے خریدار منڈی میں دام لگانے آئیں۔ برخلاف اس کے ہندوستانی مسلمانوں کا پہلے سے پرتگیزوں کے ساتھ جھگڑا چلا آتا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں مغربی تجارت کا اجارہ حاصل تھا، اور قدرتی طور پر انھوں نے اسے قائم رکھنے کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ہوگا۔ غرض بلا شرط تو پرتگیز ملکا میں تجارتی کارخانہ قائم نہ کرسکتے تھے اور انھیں بادشاہ سے اجازت لینی ضروری تھی لیکن ان کے تجارتی حریفوں نے اس اجازت کی بھی مخالفت کی اور معاہدے کی شرطیں طے کرنے کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ تب البوکرک نے جبراً بستی بسائی اور یہ شہر ہی پرتگیزوں کے قبضے میں منتقل ہوگیا جن کے تسلط نے رفتہ رفتہ پردیسی سوداگروں کی قدیم مراعات کا خاتمہ کردیا۔

اس سے چند سال قبل کالی کٹ کی حالت بھی اصولاً ایسی ہی تھی۔ جب پرتگیزوں نے یہاں کارخانہ قائم کرنا چاہا تو سامری (یعنی وہاں کے مقامی بادشاہ) کی رعایا میں اُن لوگوں نے تو تائید کی جو مشرقی ممالک کا مال خریدتے تھے مگر عرب اور مصری سوداگروں نے جن کے ہاتھ میں بحر قلزم کی تجارت برآمد تھی، مخالفت کی۔ گویا ملکا کی طرح یہاں باہر کا مال خریدنے والے تو نووارد سوداگروں کے آنے سے خوش ہوئے لیکن یہاں سے مال دساور لے جانے والوں نے نئے حریفوں کو دور رکھنے کی پوری سعی کی اور اس معاملے میں بھی انہی تاجرانِ برآمد کی بات حکام نے مان لی۔ پرتگیزوں کو معلوم ہوگیا کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوسکتا۔ یہ عرب اور مصری کالی کٹ کے سامری (Zamorin) کے ماتحت نہ تھے بلکہ ان کا اپنا مقامی حاکم الگ تھا اور اسطرح کالی کٹ میں پہلے سے پردیسی سوداگروں کی ایک بستی موجود تھی جو اپنا انتظام

خود کرتی اور مقامی قانون کے اثر سے آزاد تھی جس طرح کہ ملکا میں اسی قسم کی آزاد تجارتی بستیاں موجود تھیں۔

پھر یہ کہ سولھویں صدی کے ابتدائی سنین میں صرف کالی کٹ ہی ایسی ہندوستانی بندرگاہ نہ تھی جہاں ایسے غیر معمولی حقوق تاجرانہ کا آئین جاری اور مسلّم تھا بلکہ باربوسا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کے اکثر حصّوں پر یہی کیفیت تھی۔ مثلاً ہم پڑھتے ہیں کہ ملیبار میں مشرقی ساحل کے چیٹی "اپنے معاملات کا انتظام خود کرتے ہیں۔ بادشاہ ان کے جرائم کی تحقیق تفتیش نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور بادشاہ اس کو جائز رکھتا ہے" اسی خطّے میں پردیسی مسلمانوں کا "خود بستی کے اندر مسلم حاکم الگ ہے جو اپنے ہم قوموں پر حکومت کرتا اور خود ہی انھیں سزا جزا دے لیتا ہے۔ بادشاہ اس میں مداخلت نہیں کرتا بجز اس کے کہ ۲۲۳ خاص خاص معاملات کی یہ حاکم بادشاہ کو اطلاع دے دیتا ہے" اسی طرح کاہل میں موتی نکالنے کا مسلمان گتّہ دار "مسلمانوں کے معاملات میں بغیر بادشاہ کی مداخلت کے خود فیصلے کرتا اور ان پر عمل کراتا ہے" غرض باربوسا کی تحریر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پرتگیزوں کو ابھی اتنا اثر حاصل نہ ہونے پایا تھا کہ وہ ملک کے آئین و قوانین میں کوئی تغیّر پیدا کر سکتے، جب کہ ہندوستان کے سواحل پر بیرونی سوداگروں کو ماورائے قانونِ مُلکی حقوق میسّر تھے۔ اور یورپ سے جو لوگ اوّل ہی اوّل آئے، ظاہر ہے کہ یہ اصول ان کے لئے کوئی اجنبی شئے نہ تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ولندیز اور انگریز تاجروں نے ہندوستان اور اس کے آگے مشرق کے جزیروں میں اس انتظام کو بلا قیل و قال قبول کر لیا۔ لیکن یہ خیال کہ اس طریق عمل کو وہ اپنے ساتھ باہر سے لائے، غیر تاریخی سمجھکر ترک کرنا پڑے گا۔

بایں ہمہ، یاد رہے کہ پرتگیزوں کی اوّل اوّل جو بستیاں ہندوستان میں بسیں، وہ مذکورہ بالا ایشیائی رواج کے کلیۃً مطابق نہ تھیں کیونکہ حقیقت میں انھیں خالص تجارتی نہیں کہہ سکتے۔ ان کی ابتدائی مہمات کے سردار عموماً اصرار کرتے تھے کہ انھیں علٰحدہ زمین دے دی جائے اور یا جبراً زمین حاصل کر لیتے تھے۔ مگر یہ کام وہ تاجروں کی حیثیت سے نہیں کرتے تھے بلکہ شاہ پرتگال کے نائب کی حیثیت سے۔ کچھ عرصے

کے بعد انھوں نے جو تجارتی بستیاں بسائیں، جیسے ہگلی میں، ان میں ایشیائی رواج کی قریب قریب پابندی کی جاتی تھی، پھر بھی انھیں اپنے ملکی اقتدار کا دعوے تھا اور حاصل شدہ مقبوضات سے بھی اس دعوے کی تائید ہوتی تھی۔ مورّخ خافی خان لکھتا ہے کہ پرتگیزوں کو سکونت اور گودام بنانے کے لئے ہگلی میں زمین عطا ہوئی تھی مگر ایک مدت گزرنے کے بعد انھوں نے حدود سے تجاوز کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں عام طور پر دیکھئے تو یہ قول صحیح ہوگا کہ پرتگیز تاجر اس بحری قوّت کے بھروسے پر، جو ان کی قوم نے ایشیا میں قائم کرلی تھی، اپنی بستیوں میں شاہانہ اقتدار جمالیتے تھے؎

اس کے برخلاف، ولندیزوں کی سب سے پہلی بستیاں خالص تجارتی تھیں اور ایشیائی رواج کے مطابق قائم ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں تجارتی اسفار اور کارخانے کا وہ فرق، جسے کسی گذشتہ باب میں بیان کیا جاچکا ہے یاد دلانا ضروری ہے کہ تجارتی اسفار کی صورت میں ابتداءً صرف ایسی بندرگاہوں سے کام پڑتا تھا جہاں کوئی جہاز صرف اتنی دیر ٹھہر سکے کہ خرید و فروخت کرلی جائے اور اس کے لئے کسی مستقل معاہدے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی بلکہ زیادہ سے زیادہ کروڑگیری اور بندرگاہ کے محاصل کے متعلق عارضی قول و قرار کافی ہوتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ولندیزوں کے سب سے پہلے بیڑے کی سرگذشت میں جاوا کے پردیسی سوداگروں کے حقوق کی نسبت کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ بیڑا جو ہاوٹ مین ۲۲۴ کے ماتحت روانہ ہوا، محض تجارتی سفر کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ اس کے حالات میں بھی ایک اشارہ یہ درج ہے کہ ممکن ہے جاوا میں چینی تاجروں کو وہ امتیازات حاصل ہوں جو دوسری ایشیائی بندرگاہوں میں پردیسیوں کو میسر ہیں[1]؎ مگر ولندیزوں

---

[1] ہاوٹ مین کے بحری سفر کے رسالے میں بنتم کی جو کیفیت لکھی ہے اس میں چینی تاجروں کی جداگانہ بستی ہونے کا تو ذکر ہے لیکن ان کے حقوق کے متعلق تفصیلی حالات نہیں لکھے ہیں (دیکھو جلد اول، ۱۰۸) لیکن اس واقعے سے کہ ولندیزوں نے بتاویہ میں ایک چینی ناخدا یا کپتان کو تسلیم کیا، مترشح ہوتا ہے کہ جاوا میں چینیوں کی ابتدائی بستیاں مقامی طور پر خود مختار تھیں؎

کے لئے اس قسم کے امتیازات حاصل کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا جب کہ محض تجارتی سفر ان کی ضروریات کے لئے ناموزوں پایا جاتا اور انھیں مستقل کارخانہ بنانے کی ضرورت پیش آتی کہ اس صورت میں جو ولندیز سوداگر کسی بندرگاہ میں سکونت اختیار کرتے ان کے رہنے سہنے کا انتظام کرنا پڑتا اور مقامی حکام سے صحت کے ساتھ ان کے حقوق کا مسئلہ طے کیا جاتا کیونکہ وہ اپنے جہازوں کی عدم موجودگی میں انہی حکام کی حفاظت کے بھروسے پر وہاں رہ سکتے تھے۔ ہاوٹ مین کے بعد جو تجارتی بیڑے روانہ کئے گئے، ان کی مطبوعہ سرگذشتیں ناتمام ہیں اور مجھے یہ پتہ نہ چل سکا کہ سب سے پہلے ولندیزوں نے اپنا مستقل کارخانہ کب اور کس طرح قائم کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ستمبر ۱۶۰۲ء سے بھی پہلے ولندیز گماشتے اچین میں مقیم تھے اور اسی سال دسمبر میں بعض گماشتے بنتم میں بھی مقرر کئے گئے۔ یہ فرض کرنے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ اندرونی خود مختاری کے حقوق انھیں شروع سے حاصل تھے کیونکہ کارخانوں کے واسطے سب سے پہلے جو ضوابط ۱۶۰۳ء میں جاری کئے گئے، انہی میں آزادانہ عدالتی اختیارات سے کام لینے کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا وہ کوئی نئی چیز نہ تھے بلکہ پہلے سے چلے آتے تھے اور ان ضوابط میں کارخانے کے عمّال کو مقدمات کرنے اور سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ گویا ۱۶۰۳ء سے اور غالباً کچھ مدت پہلے سے ولندیزوں کو وہی مراعات حاصل ہوگئیں جو ایک صدی سے عرب تاجروں کو ہندوستان میں حاصل تھیں۔ اور ان کی غیر ملکی بستی یا کارخانہ اندرونی طور پر بااختیار ہو چکا تھا۔ رہے انگریز، تو ان کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے سب سے پہلے تجارتی بیڑے کے ناخدا نے اچین میں کاروبار ہی اس طرح شروع کیا کہ پہلے مقامی حکومت سے ایک معاہدہ طے کر لیا جس میں قطعی طور پہ اندرونی آزادی کی شرط تھی اور انگلستان میں بعد کے بیڑوں کو جو ہدایات دی گئیں، ان میں اسی اچین کے معاہدے کو بطور نظیر پیش کیا جاتا تھا۔

ہندوستان کے دونوں ساحلوں پر یہی طرز عمل اختیار کیا گیا۔ ۱۶۰۶ء میں ولندیزوں نے کوشش کی کہ پولی کٹ میں بستی بسائیں لیکن پرتگیزوں نے مخالفت کی

اور کوئی معاہدہ طے نہ ہوسکا۔ اسی لئے ولندیزی جہاز وہاں سے مچھلی پٹم روانہ ہوا جہاں پہلے مقامی حکام اور بعد میں شاہ گولکنڈہ سے گفتگو ہوئی اور ایک معاہدہ ہوگیا جس کے مطابق کارخانے قائم کئے گئے۔ چند سال بعد، آگے جنوب میں ہندو حاکموں کے ساتھ اسی قسم کے عہد و پیمان ہوئے اور تگنا پٹم اور پولی کٹ میں کارخانے بن گئے۔ کالی کٹ سے بھی معاہدہ ہوگیا تھا لیکن پھر کوئی کارخانہ بنانے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ مشرقی ساحل پر جو تجربہ حاصل ہوا تھا، اسی سے ولندیزوں نے سورت میں کارخانے بناتے وقت کام لیا اور اسی کے مماثل شرطیں پیش کیں، جن میں تحقیقات جرائم کا حق شامل ہے اور اسے اندرونی با اختیاری کا ممتاز نشان سمجھنا چاہیئے۔ مگر سچ یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے علاقے میں راستہ دکھانے والے انگریز تھے اور انھیں یہاں وہ مرتبہ میسر نہ آیا تھا جو ایشیا کی دوسری بحری ریاستوں میں پردیسی سوداگروں کو حاصل تھا۔ کالی کٹ، مچھلی پٹم اور پولی کٹ کے حکام بنتم اور اچین کے حاکموں کی طرح تاجروں کے امتیازی حقوق سے بخوبی واقف تھے لیکن سلطنت مغلیہ میں وسط ایشیا والوں کے خیالات مسلّط تھے اور وہاں ایسے آئین سے چنداں واقفیت نہ ہوسکتی تھی لہذا سلطنت مغلیہ میں بھی اس قسم کی مراعات کا ہاتھ آجانا عام معمول نہ تھا۔ پہلا انگریزی جہاز جو سورت پہنچا، اس کا سردار ہاکنس تھا۔ مقامی عمّال نے اسے اطّلاع دی کہ انگریز تاجروں کو تجارت کی اجازت ہے لیکن مستقل قیام یا کارخانہ بنانے کے لئے شہنشاہ کی منظوری درکار ہوگی چنانچہ "امتیازات" حاصل کرنے کے لئے کوشش کی غرض سے اسے آگرے تک سفر کرنا پڑا اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس کی گفت و شنید ناکام ثابت ہوئی۔ تاآنکہ ۱۶۱۲ء میں بیسٹ اور ایلڈورتھ نے مقامی عمّال سے قول و قرار کرلئے اور انھیں وہ منظوری مل گئی جسے وہ غلطی سے بادشاہی تصدیق سمجھے۔ اس غلط فہمی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے پھر گفتگو شروع کی جو تفصیل سے تامس رو کے رسالے میں مذکور ہے۔ رو بہت دن تک ایک مستقل عہد نامے کی تگ و دو میں رہا اور بالآخر چند مراعات پر قانع ہوگیا جو اصولاً معاہدے ہی کے مرادف تھیں گو رسماً اس کے اصلی مقصد سے بہت کم نکلیں۔ ان میں ہمارے پیش نظر

مقصد کے اعتبار سے اہم ترین دفعہ وہ تھی جس میں انگریزوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنی بستی میں اپنے دین و آئین کے مطابق رہیں گے اور اس میں کوئی تعرّض نہ کیا جائے گا۔ اور اس سے انھیں ماورائے قانون ملکی حیثیت حاصل ہوگئی۔

اسی طرح یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دوسری بستیوں میں بھی جو ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں نے ہندوستان میں قائم کیں، انھیں خاص خاص شرطوں کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی جن کی بدولت وہ تجارت اور نیز اپنے ہم قوموں کے معاملات طے کرنے میں با اختیار تسلیم کر لئے گئے۔ لیکن جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ ولندیزیوں اور انگریزوں کی حیثیت ہندوستان میں اصولاً وہی تھی جیسی کہ ایشیائی پردیسیوں کی ملکّا اور کالی کٹ وغیرہ مقامات میں تھی۔ یعنی ان فرنگیوں نے ہندوستان کی حدودِ اختیاری کی متابعت نہیں کی جیسی کہ آج کل پردیسی سوداگروں کو کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ وہ ملک میں ان خاص خاص شرطوں پر رہنے اور تجارت کرنے لگے جو حکام سے طے ہوگئی تھیں اور جن کے دونوں فریق پابند تھے یہ بات ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اسے ذہن میں رکھے بغیر بہت سے داد و ستد کے معاملات کی نوعیت سمجھنی مشکل ہو جاتی ہے جو ہمارے زمانے کی تحریروں میں جا بجا مرقوم و مذکور ہیں اور جن کا ٹھیک مطلب اسی وقت واضح ہوتا ہے جبکہ واقعی شرطوں کا علم ہو۔ مختلف ہندوستانی ریاستوں میں حکّام نے کئی موقعوں پر معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی ریاست عہد شکنی کرتی ہے تو گویا جنگ چھڑنے کے جوکھوں میں پڑتی ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ کسی تجارتی کوٹھی کے معدودے چند انگریز یا ولندیزی سلطنت مغلیہ یا بادشاہ گولکنڈہ کے ساتھ خشکی پر جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم سمندر میں جنگ کرنا اور بعض اوقات کامیاب ہونا ممکن تھا کیونکہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ہندوستانی حکومتوں کے پاس کوئی بحری فوج نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان جنگی کارروائیوں

سے جنھیں ہمعصر تحریروں میں "ادلے کا بدلہ" موسوم کیا ہے، تجارت میں بار بار رکاوٹ ہوتی رہتی تھی۔ اور اس بدلے کی شکل یہ ہوتی تھی کہ فرنگی تاجر ہندوستان والوں کے جہازوں پر جبر و تعدی شروع کر دیتے تھے ان افعال کو لازماً جنگی کارروائیاں قرار دینا چاہیے کیونکہ جب ایک سلطنت نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو نقصان اٹھانے والے فریق کو یہ جائز ہوگیا کہ اس زمانے میں بین الاقوامی اخلاق کا جو معیار تھا، اس کے مطابق جبراً تلافی نقصان کی کوشش کرے۔ پھر جس طرح جنگ کے افعال اپنے نتائج، کارگر ہونے کی بنا پر جانچے جاتے ہیں اسی طرح ان کارروائیوں کے اچھے برے ہونے کا بھی یہی معیار ہوگا اور اسی اعتبار سے ولندیزیوں کو قطعی طور پر فوقیت حاصل تھی۔

انگریزوں کے بدلے لینے کی مثال میں، ہم ۱۶۲۳-۲۴ء کے واقعات
پیش کر سکتے ہیں جن کا واضح حال انگلش فیکٹریز ان انڈیا کے مجلدات
۲۲۷ بابت ۱۶۲۲-۲۳ء اور ۱۶۲۴-۲۹ء کے مقدموں میں ملے گا۔ غیر ضروری تفصیل کو چھوڑ کر
اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورت کے انگریز گماشتوں کی حجت یہ تھی کہ عہد و پیمان
کے خلاف ہم کو ستایا گیا۔ لہذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ گجرات کے چند جہاز
جو بحر قلزم سے قیمتی مال لئے ہوئے آرہے تھے، پکڑ لئے جائیں اور جبتک
ان کے نقصان کی تلافی نہ کر دی جائے اس وقت تک انھیں نہ چھوڑا جائے
اس تجویز کے مطابق عمل ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کا
یہ فعل سلطنت مغلیہ کے خلاف کھلی ہوئی مخالفت تھی۔ مگر فوری نتیجہ یہ ہوا کہ
مغل حکام دب گئے۔ ایک نیا عہد نامہ مرتب اور منظور ہوا جس میں گذشتہ
نقصانات کی تلافی اور آیندہ کے لئے بہتر شرطیں درج تھیں۔ اس پر
ہندوستانی جہاز ان کے مالکوں کے حوالے کر دئے گئے اور انگریزی
بیڑے کے کل چار جنگی جہاز انگلستان، ایران اور سماٹرا کو الگ الگ روانہ
کر دئے گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ اس تماشہ کا صرف پہلا حصہ تھا اور جونہی کہ جہازوں
کے چلے جانے کے باعث انگریزوں کے ہاتھ میں حملہ کرنے کا کوئی ذریعہ

نہیں رہا، اسی وقت مغل عمال نے پھر لڑائی چھیڑ دی اور ۱۶۲۴ء کے اوائل میں مختلف کارخانے چھین لیئے۔ پھر گفتگو شروع ہوئی اور بالآخر ایک تازہ عہدنامہ تیار ہوا جس کی رو سے انگریزوں نے جو کچھ مراعات پہلے حاصل کی تھیں، ان میں سے اکثر منسوخ کردی گئیں۔ گو تجارت اور اندرونی بااختیاری کا حق پھر بھی اُن کے پاس رہا۔ انگریزوں نے جنگ جاری رکھنے کے مسئلے پر بھی غور کیا مگر اس خیال کو ترک کردیا لہذا ۱۶۲۴ء کا عہدنامہ بحال رہا۔ اور کئی سال تک اس قسم کا کوئی جھگڑا فساد نہ ہوا۔ سورت کے انگریزوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی جہازوں کو گرفتار کرکے ایک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن اسے جنگ کا فعل تصور کریں تو یہ بے شبہ جائز کارروائی تھی۔ البتہ انھوں نے اپنی حیثیت کا اندازہ غلط کیا یعنی انھیں صریحاً جاننا چاہیے تھا کہ جو کچھ قوت ان کے پاس ہے وہ صرف جنگی جہازوں کی بدولت ہے اور چونکہ تجارت کی ضروریات کے باعث یہ جہاز بندرگاہوں میں عرصے تک ٹھیرے نہ رہ سکتے تھے لہذا ایسے دشمن سے جنگ چھیڑنا ناعاقبت اندیشی کی بات تھی جو ان جہازوں کے نہ ہونے کی صورت میں کہیں زیادہ قوی تھا۔ اطالی سیاح دی لادیل جو ان دنوں گوآ میں مقیم تھا، اس کی بھی رائے یہی تھی اس کی اطلاعات پرتگیزوں کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں، جو انگریزوں کے فعل کی جزئیات ایک بُرے پیرائے میں پیش کرتے تھے، تاہم ایک عام مسئلے کی حیثیت سے اسکا فیصلہ حسب ذیل تھا۔

مُجھ سے پوچھئے تو انگریزوں نے اس معاملے میں دانائی سے ۲۲۸ کام نہیں کیا۔ کیونکہ چند پردیسی اور مہاجرین کے لیئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے بادشاہ سے خود اس کے ملک میں لڑیں اور کامیاب ہوں۔ اختلافات پیدا ہونے کی صورت میں، سب سے بہتر شکل میرے خیال میں یہی ہوگی کہ انھیں بادشاہ موصوف سے مصالحت کے ساتھ اور اچھے الفاظ سے طے کرلیا جائے .... اور اس پر بھی دادرسی نہ ہوسکے تو پھر علانیہ لڑائی سے پہلے مناسب یہی ہے کہ اس کے احاطۂ اقتدار سے

باہر اور محفوظ ہو کر جنگ کی جائے نہ کہ خود اس کے ملک میں رہ کر، جہاں اتنے زیادہ آدمی موجود ہیں اور بادشاہ کو بلا شبہ سب سے زیادہ قوت حاصل ہے"۔

غرض اُس زمانے میں غیر جانب دارانہ رائے بھی یہی تھی کہ بدلہ لینا جائز ہے لیکن انگریزوں نے ناساعد حالات میں جو کوشش بدلہ لینے کی کی یہ اُن کی نادانی تھی۔ انگریزوں کی اس کارروائی کے مقابلے میں ہم ولندیزوں کا طرز عمل پیش کرتے ہیں جب کہ چند سال بعد وہ شاہ گولکنڈہ کی تعدی سے تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنا مچھلی پٹم کا کارخانہ وہاں سے اٹھالیا اور پھر اپنے مرکز پولی کٹ سے بیٹھکر جنگ اس طرح شروع کی کہ دشمن کی بندرگاہ کی ناکہ بندی کرلی یہ تدبیر کامیاب ثابت ہوئی۔ ناکہ بندی کرنے والے بیڑے کے سردار سے حکام نے نامہ و پیام شروع کیے۔ مچھلی پٹم کا حاکم برطرف کردیا گیا اور ایک شاہی فرمان میں ولندیزوں کو واپس آنے اور دوبارہ تجارت کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس کامیابی کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ولندیزوں کے قبضے میں ایک باموقع مرکز جنگ گولکنڈے کے علاقے سے باہر موجود تھا۔ شاہ گولکنڈہ کے پاس کوئی بحری فوج نہ تھی اور اسی لئے مچھلی پٹم گویا پولی کٹ کی مٹھی میں آگیا تھا جس کے سارے ساحل کو زد میں رکھنے کے لئے چند توپ دار کشتیاں کافی تھیں۔ مختصر یہ کہ سورت کے انگریزوں کو جو بات حاصل نہ تھی، وہ ولندیز گماشتوں کو حاصل تھی کہ وہ خود بڑے خطرے میں پڑے بغیر دشمن کے ایک کھلے ہوئے مقام پر حملہ کرسکتے تھے اور اسی لئے ان کو یہ موقع تھا کہ اپنے عہد نامے کی شرطوں کی پابندی پر زور دیں۔

پولی کٹ کا قلعہ جو اس موقع پر اس قدر کارآمد ثابت ہوا، فرنگیوں کے ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کی دوسری منزل پیش کرتا ہے۔ یعنی جس طرح بحری سفر سے ساحلی کارخانے کی نوبت آئی، اسی طرح اب کارخانے سے قلعے کی نوبت پہنچی۔ کیونکہ ایک غیر محفوظ کارخانے میں اس کے

رہنے والوں کی حفاظت یا جن شرائط کے ساتھ کارخانہ قائم ہوا ہے، انکی پابندی کا کوئی اطمینان نہ ہو سکتا تھا۔ نظر برایں، تجارتی تاریخ کے طلبہ کی نظر میں پولی کٹ کی قلعہ بندی بہت ممتاز واقعہ ہے کہ ہندوستان میں یہی پہلا قلعہ تھا جو یورپ کے تاجروں کی ایک جماعت نے بنایا اور جو ارم گاؤں اور مدراس کا پیش خیمہ ثابت ہوا؛ اس قلعے کی تعمیر کا کوئی مربوط بیان میرے علم میں نہیں ہے لیکن جہاں تک ہمعصر تحریروں سے ظاہر ہوا یہ قبضہ کسی منصوبے کا نہیں، بلکہ محض اتفاقات کا نتیجہ تھا۔ ہم دوسرے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ ولندیزوں کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو گئی کہ ان کے سب سے ابتدائی کارخانے، جو کرشنا کے شاخدار دہانے پر بنائے گئے تھے، ان سب ہنڈیوں میں کام نہیں دے سکتے جن سے ولندیزوں کو لین دین کرنا منظور تھا، لہذا انھیں آگے جنوب میں نظر دوڑانی پڑی؛ اول انھوں نے ایک نائک یا رئیس سے درخواست کی کہ تگناپٹم کے قریب انھیں بستی کی اجازت مل جائے۔ نائک نے ایک علیحدہ گڑھی دینی چاہی مگر انھوں نے انکار کیا اور اسی کی حفاظت میں رہنا پسند کیا۔ بالفاظِ دیگر وہ اسوقت محض کارخانے پر قانع تھے[1]۔ سال دو سال بعد انھوں نے اپنا بیوپار پولی کٹ میں پھیلانا چاہا اور راجہ چندراگیری سے کم و بیش انہی شرطوں پر جو تگناپٹم میں کی تھیں وہاں بسنے کی منظوری لی۔ گویا ابتدا میں پولی کٹ میں بھی خالی کارخانہ تھا۔ اس کا بعد میں تغیر سان تھامی کے پرتگیزوں کی دشمنی کے باعث ہوا جہاں ان کی ایک مشتبہ نوعیت کی بستی تھی[2]۔ یہیں کے

---

[1] میری نظر سے جو تحریریں گزری ہیں، ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ نائک نے گڑھی کیوں پیش کی تھی۔ بظاہر اُسے یہ گمان ہوا کہ ولندیزے بھی وہی حرکتیں کریں گے جیسی کہ پہلے پرتگیز اس نواح میں کر چکے تھے۔ بہرحال، جتانے کی بات یہی ہے کہ انھیں گڑھی دی جاتی تھی اور خود انھوں نے لینے سے انکار کیا؛

[2] میرا قیاس یہ ہے کہ سان تھامی بھی انہی مقامات میں سے تھا، جہاں پرتگیزوں نے

پرتگیزوں نے پولی کٹ پر ۱۶۱۲ء میں حملہ کیا اور ولندیزوں کو نکال باہر کیا۔ راجہ
قول قرار کے موافق ان ستم رسیدوں کی حفاظت کرنیکا متمنی تھا مگر وہ ستم کرنیوالوں
کے خلاف کوئی کارگر تدبیر نہ کرسکتا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ولندیزی
۲۳۰ قائم مقام سے ایک اور عہد نامہ کرلیا۔ اس میں قرار پایا کہ مقامی حکام اپنے خرچ
سے ایک قلعہ تیار کریں گے اور اس کے ایک حصے میں ولندیز رہیں گے، اور
ایک حصے میں راجہ کے آدمی۔ لیکن مقامی حکام نے اقرار کے مطابق اپنا
کام انجام دینے میں غفلت کی اور قلعے کو آدھا بنا کے چھوڑ دیا اور ولندیز
قائم مقام نے کمپنی کے خرچ سے اس کی تکمیل کی۔ پھر مشترک قبضے سے خواہی نخواہی
جھگڑا پیدا ہوا۔ آخر ہندوستانی سپاہی ہٹا لیے گئے اور ایک عہد نامے کی رو سے
اس قلعے کا بلا شرکت قبضہ ۱۶۱۶ء میں ولندیزوں کو مل گیا جنہوں نے اسے
قلعۂ جل ڈریا موسوم کیا؛ کچھ عرصے تک یہ محض قلعہ تھا اور میتھوولڈ جو یہاں
رہا ہے، لکھتا ہے کہ ولندیز دیسی باشندوں پر حکومت کا دعوے نہیں رکھتے
تھے نہ کسی قسم کا محصول وغیرہ وصول کرتے تھے اور نہ خود قانون نافذ کرتے
تھے بلکہ پرتگیزوں کا مقابلہ اور اپنا لین دین کرنے پر قانع تھے۔ یہ سچ ہے کہ
آگے چل کے انھیں زیادہ وسیع رقبہ مل گیا لیکن قلعہ جس کی وجہ سے یہ اراضی
ہاتھ آئیں، کسی خاص حکمت عملی کا نہیں بلکہ محض اتفاقی واقعات کا نتیجہ تھا۔ انھوں
نے تو ابتدا میں چندرا گری کے راجہ سے صرف محافظت چاہی تھی لیکن
بتدریج وہ اس قلعے کے مالک ہو گئے جو آیندہ ہر جگہ کے لئے (ہندوستان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اجازت کے خلاف کچھ زیادہ اختیارات حاصل کر لئے تھے۔ گو تو اسے مغربی ساحل کے شاہی مقبوضات میں شمار نہیں کرتا بلکہ لکھتا ہے کہ یہاں اس کے باجگذار آباد تھے اور اس کی مملکت کے قوانین نافذ تھے۔ (دہم۔ اول۔ ۴۹) میتھوولڈ (۹۹۴) لکھتا ہے کہ "یہاں پرتگیزوں کی عملداری تھی بایں ہمہ انھیں نائک کی کچھ نہ کچھ ماتحتی ماننی پڑتی تھی"۔ اس میں شک نہیں کہ اس قصبے میں جو پرتگیز آبسے تھے، وہ اپنا انتظام خود کرتے تھے لیکن وہ اس رقبے پر حقوق مالکانہ نہیں رکھتے تھے؛

میں) ایک نئی مثال بننے والا تھا۔

مچھلی پٹم کے قبضے میں پولی کٹ کے قبضے سے ولندیزوں کو جو فائدہ ہوا وہ ہم اوپر مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ۱۶۲۶ء میں ولندیز کمپنی نے خواہش کی کہ اسی قسم کی قلعہ بند بندرگاہ مغربی ساحل پر ان کے ہاتھ آجائے جس کی زد میں خود سورت ہو۔ ادھر اسی زمانے میں انگریز جزیرہ بمبئی کو پرتگیزوں سے لینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔[1] کچھ روز میں یہ تجویزیں تو ترک کر دی گئیں لیکن مشرقی ساحل پر ارم گاؤں میں جو قلعہ انگریزوں نے بنایا وہ پولی کٹ ہی کی نقل تھی اور اس کا مدعا یہ تھا کہ تجارت کی سہولت کے ساتھ گولکنڈے کے حاکموں پر بھی رعب جمایا جائے اور بعد میں اسی مقصد سے ارم گاؤں کی بجائے مدراس کا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ انڈرو کوگن جو اس قلعے کے بانیوں میں تھا، لکھتا ہے کہ:-

> کمپنی کو واجب ہے کہ ہندوستان میں اپنی املاک کی حفاظت کے لئے ایک اچھی جگہ بنانے کا حکم دے۔ جس کی صریحاً سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ کیا ہم کو طرح طرح کے مطالبات اور احکام ماننے نہیں پڑتے، خواہ وہ بجا ہوں یا بیجا؟ اور دوسرے اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ولندیزوں اور پرتگیزوں کے ساتھ ہمیشہ ہماری صلح ہی رہے گی؟ نہیں۔ جو صلح ہمیں میسر ہے اس پر تو وہ اپنی ہی غرض سے قائم ہیں۔ ان سب باتوں پر قرار واقعی غور کرنے ۲۳۱ سے عین مناسب معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے ایک اچھی جگہ بنانے کا خیال عمل میں لانا چاہئے جس سے یہ فوائد حاصل ہونگے" کہ آپ کی املاک کا بڑا حصہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا اور اگر کوئی زیادتی آپ پر کی جائے تو آپ اپنا بخوبی بندوبست کر سکیں گے۔

اس طرح ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں نے مشرقی ساحل کے قلعوں پر

---

[1] چند سال قبل رو کو بھی اس خیال کی ترغیب ہوئی تھی کہ گجرات کے ساحل پر کوئی قلعہ بنا لیا جائے۔ لیکن خرچ زیادہ ہونیکے باعث اسے چھوڑ دیا (رو، ۳۴۴)۔

قبضہ پایا[1]۔ مدراس کی تعمیر کے دس پندرہ برس بعد سورت کے انگریز بھی فکر میں تھے کہ اس کی تقلید کریں جس کے بڑے مقصد دو تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ ہندوستانی عہدہ داروں سے آزاد ہونا چاہتے تھے اور دوسرے یہ کہ انھیں ولندیزوں کے ہاتھ سے بچنا مقصود تھا جس طرح پولی کٹ کے ولندیزوں کو پرتگیزوں کے ہاتھ سے بچنے کی ضرورت پڑی تھی۔ ۱۶۵۳ء میں ہم بمبئی کو لینے کی تجویز سنتے ہیں۔ ۱۶۵۸ء میں کمپنی اپنے صدر گماشتے کو اجازت دیتی ہے کہ وہ بمبئی، بسین یا اور کوئی مناسب مقام حاصل کرنے کی سلسلہ جنبانی کرے اور گو ہمارے پیش نظر عہد میں کوئی قطعی نتیجہ اس کوشش کا نہیں نکلا، تاہم اس عہد کے ختم کے چند سال بعد ہی جزیرہ بمبئی انگریزوں کے ہاتھ آگیا اور ولندیز کوچین کے مالک ہو گئے۔ اس وقت سے سمجھنا چاہیئے کہ قلعہ بھی فرنگیوں کی سواحل ہند پر تجارت کا ایک لازمہ ہو گیا۔ آیندہ ارضی مقبوضات کی منازل ہماری کتاب کے احاطے سے خارج ہیں۔

عبارات بالا میں، مَیں نے تجارتی اصول عمل کا تدریجی ارتقا دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بحری اسفار سے کارخانوں کی اور کارخانوں سے قلعہ گیری کی نوبت آئی۔ اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں فرنگی تاجروں کے خیالات اس سے آگے نہ جاتے تھے کہ تجارتی جہاز بھیجکر خرید فروخت کرتے رہیں لیکن مشرقی منڈیوں کے حالات کی بنا پر مستقل کارخانے بنانے کی ضرورت داعی ہوئی اور جب کارخانے بن گئے تو سیاسی اور گردوپیش کے نظم ونسق کی حالت نے خواہی نخواہی سواحل پر قلعے بنوائے مگر یاد رہے کہ ولندیز اور انگریز سوداگر خواہ کارخانوں میں رہتے ہوں خواہ قلعوں میں انھوں نے ہندوستانی آئین و قوانین کی نہ متابعت کی نہ ان سے متابعت کرائی گئی۔ بلکہ حکام سے معاہدے کر کے وہ بااختیار گروہوں کی صورت میں رہتے ہتے ۲۲۳

---

[1] ڈینمارک والوں نے بھی قلعہ ٹرنکوبار حاصل کرلیا تھا مگر مجھے کسی ایسی تحریر کا علم نہیں جس میں اس کے حصول کی کیفیت تفصیل سے مرقوم ہو۔

تھے اور ان حکّام کے طرز عمل کو علٰحدہ رہ کے معاینہ کر سکتے تھے۔ ہندوستانی ممالک کی رعایا کے ساتھ وہ مشترک سیاسی اغراض بھی نہیں رکھتے تھے! اسی لئے ہندوستان کی حکومتوں کے اپنی اپنی رعایا سے جو تعلقات تھے، ان کے متعلق اِن فرنگی تاجروں کی شہادتیں اُسی وقعت کی مستحق ہیں جو عام طور پر آزاد و بے لاگ گواہوں کے بیانات کو دی جاتی ہے۔ یہ ہماری معلومات کی ایک بڑی کمی کو پورا کرتے ہیں کیونکہ پیش نظر عہد کی جس قدر کتابیں ملتی ہیں وہ قریب قریب سب سرکاری نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں اور معاملے کا صرف ایک پہلو دکھاتی ہیں جس کے بیان میں حکام کی رسمی خوشامد سے اکثر رنگ آمیزی آجاتی ہے۔ دربار یا پایۂ تخت میں رہ کر اس زمانے کے آئین و ادارات جس شکل میں نظر آتے تھے، اس کے لئے تو ہم انہی کتابوں کے محتاج ہیں لیکن اگر ان آئین کی واقعی عملی حالت یا وہ قصبات و دیہات میں جس نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان باتوں کو معلوم کرنا ہو تو ہمیں لازم ہے کہ انگریزوں اور ولندیزوں کی تحریروں کی طرف توجہ کریں۔

تمہید میں ایک اور امر قابل گذارش ہے۔ آیندہ جو بحثیں آتی ہیں ان میں ہندوستان کی مختلف حکومتوں کو میں نے خالص معاشی نظر سے جانچا ہے اور جو نتیجے استخراج کئے ہیں وہ اس قدر ناخوشگوار ہیں کہ ان سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک معمولی آدمی کے حق میں سترھویں صدی کا ہندوستان ضرور دوزخ کا نمونہ ہوگا۔ شاید یہ حجت پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ رائے تمام ایشیا پر صادق آتی ہے لیکن ایشیائی ممالک میں جہانگیر و شاہجہاں کی حکومتوں کو قطعی طور پر فضیلت دینی چاہئے۔ یہ چین سے تو بے شک گھٹی ہوئی تھیں ورنہ مختلف اقوام کے سیاحوں اور تاجروں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان کی بناء پر سلطنت مغلیہ کو خاصی طرح اسی سطح پر سمجھ سکتے ہیں جو جاپان اور ایران کے نظم و نسق کی تھی اور مغرب میں ترکوں سے، جنوب میں اچین سے اور مشرق میں ارکان، پیگو یا سیام کی حکومتوں سے یہ یقیناً بہت بلند و بہتر تھی۔ اگر میرا مقصد مختلف ملکوں کے آئین و قوانین کی بالمقابل قدر و قیمت جانچنا ہوتا تو میں اس موضوع پر تفصیل سے

بحث کرتا لیکن ایسی کتاب میں جو صرف ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی اجمالی رائے کافی ہے قارئین کتاب جن کے نزدیک ہندوستان کی حکومتوں کے حالات اس درجہ خلاف ہوں کہ ان پر یقین نہ آتا ہو انھیں میں مشورہ دونگا کہ جن ملکوں کا میں نے نام لیا ان میں سے بعض کے حالات کا خود مطالعہ فرمائیں ”

۲۔ ہندوستان کے انتظامی طریقے ۲۲۲

جن شواہد اور مآخذ کا گذشتہ فصل میں مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے، انکا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیش نظر عہد میں، ہندوستان کی معاشی زندگی کا مدار، بارش کے بعد، بہت کچھ یہاں کے نظم و نسق پر تھا۔ ملک کے مداخل کی تقسیم جس حد تک حکومت کے ہاتھ میں تھی اس کا آج کل اندازہ بھی مشکل سے ہوتا ہے کیونکہ عملاً بعض حکومتیں قریب قریب زمین کی نصف پیداوار سے خود کام لیتی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ پیدا کرنے والوں کے پاس بہ مشکل مایحتاج یا کچھ زیادہ بچ رہتا تھا۔ بحالیکہ آبادی کے وہ طبقے جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے تھے، ان کی ساری محنت اس کشمکش میں صرف ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دولت کا حصہ ہمارے قبضے میں آجائے۔ اس کا لازمی طور پر پیداوار پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ اصلی کاسبین سے محنت و سرگرمی سے کام کرنے کا قدرتی شوق مفقود ہو جاتا تھا کیونکہ آمدنی میں اضافے کا کوئی معقول حصہ ہاتھ آنے کی انھیں امید نہ تھی۔ لائق اور ہنرمند اشخاص کو پیداوری کے کام کرنے کی زیادہ ہمت نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تقسیم دولت کی کشمکش کے عمدہ صلے دیکھکر اسی طرف جھکتے تھے۔ کسان ہونیکی نسبت چپراسی ہونا بہتر نظر آتا تھا۔ اور وہ نکتہ چین جو آج حیرت کرتے ہیں کہ ہندوستانی دماغ اور کوشش سرکاری ملازمت ہی کے حصول میں خرچ ہوتی ہے، انھیں گذشتہ تاریخ میں جواب باصواب ملیگا کہ صدیوں سے اور کوئی طریق معاش ہی نہ تھا۔ اسی لئے آج کل کے حالات سے بحث ہوتی تو ہمیں نظم و نسق

کی نوعیت اور عملی صورت پر اس قدر تفصیل سے نظر ڈالنے کی ضرورت نہ ہوتی جس قدر اُس عہد کے حالات کو باریکی سے جانچنا پڑے گا۔ اور میں پہلے مروجہ طریق نظم ونسق کا اجمالی خاکہ پیش کرکے پھر ان کے واقعی عمل سے تفصیلی بحث کرونگا۔

ہندوستان کی جن حکومتوں سے ہمیں سروکار ہے، وہ بلا استثنا شخصی اور مطلق العنان تھیں اور ملک میں کسی ایسے ادارے کا پتہ نہیں چلتا جس کے ذریعے عام لوگ کوئی سیاسی اقتدار یا اثر سے کام لے سکتے ہوں۔ ملک کا دارالحکومت حکومت کا مستقر ہوتا اور اصولاً جو کچھ ہوتا وہ فرماں روا کے حکم سے ہوتا تھا، گو درحقیقت وہ اُس کے نام سے کسی ماتحت کا کام ہو اس زمانے کے خیال کے موافق کوئی تحریری مجموعۂ قوانین موجود نہ تھا۔ اور نہ اس قسم کا کوئی آلہ موجود تھا جو حکومت کے احکام یا ضوابط میں ترتیب و تدوین یا باہمی مناسبت پیدا کرتا۔ سوائے مذہبی قیود کے، فرماں روا بالکل بے قید تھا اور آج ایک حکم دے کر کل اُس کے خلاف حکم دے سکتا تھا[1]۔ اس طرح وضع قوانین یا مشورے کا تو کوئی محکمہ نہ تھا، البتہ ہر ملک یا ریاست میں ایک مرتب تنظیم موجود تھی کہ فرماں روا کے احکام عمل میں لائے۔ ہر مقام اور کام کے لئے عہدہ دار متعین تھے اور اُس مقتدر گروہ کی نگرانی اور ہدایات وزرائے دربار کرتے تھے۔ عہدہ داروں کا اصلی فریضہ تو مالگزاری وصول کرنا تھا لیکن اور جو حکم دیا جائے اُس کی تعمیل انھیں کرنی پڑتی تھی اور وہ اہل ملک کے نہیں، بلکہ فرماں روائے ملک کے تابع ہوتے تھے۔ نظر بر ایں، ملک کے حقیقی طرز حکومت کی سب سے اچھی تعریف یہ ہوگی کہ اسے "اتحاد مطلق العنانی و اہلکاری" کہا جائے جس کے ایک جزو کا کسی خاص ۲۳۲

---

[1] ہندوستان کے بڑے حصے میں اسلامی شریعت کا قانون، اصولاً مسلم تھا لیکن وہ بھی اس طرح کہ اہل حکومت کی عملی آزادی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے پائے۔ (پلسارٹ۔ مخطوطہ۔ ورق ۲۱)۔

وقت میں قوی تر ہو جانا، فرماں رواکے شخصی اوصاف پر مبنی تھا۔ مثلاً جہانگیر کے زمانے میں مقامی عمّال کے ہاتھ میں عملاً بہت وسیع اختیارات آگئے تھے، کیونکہ یہ بادشاہ جزئیات میں پڑنا پسند نہ کرتا تھا؛ گولکنڈے کی مملکت میں بارہا ایسا ہوا کہ بادشاہ کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا اور دربار کے ایرانی اُمرا وزرا قریب قریب خود مختار ہوتے تھے؛ ہندو ریاستوں کی حالت اس اعتبار سے مختلف نظر آتی ہے کہ وہاں راجہ کا اثر و اقتدار مقامی رئیسوں یا نائکوں کی شخصیت کے مطابق ہوتا تھا کہ بعض اُس کی اطاعت کرتے اور بعض اُسی زمانے میں عملاً خود مختار ہوتے تھے۔ لیکن حکم کا اصل سرچشمہ جہاں کہیں بھی ہو، رعایا کا فرض یہ تھا کہ وہ اُن عہدہ داروں کا حکم مانے جس سے اسے براہ راست واسطہ ہو۔ حکم، خواہ بادشاہ کا ہو یا وزیر کا یا کسی ماتحت کا، دکاندار، اہل حرفہ اور کسان کی نظر میں یہ سب قریب قریب یکساں تھا کیونکہ انھیں تو اس شخص سے کام تھا جو موقع پر موجود ہو۔ اس قسم کی مثالیں تحریر میں ملتی ہیں، جن میں کسی شخص یا گروہ نے مقامی عمّال کی جور و تعدّی کی فریاد کی اور اوپر سے ان کی دادرسی کی گئی۔ لیکن ایسی مثالیں بھی تعداد میں شاید مساوی ہونگی کہ جس عہدہ دار پر اعتراض کئے گئے تھے، وہ اپنے اثر یا رشوت کے زور سے جملہ الزامات سے بری ہو کے پھر اسی عہدے پر بھیج دیا گیا۔ اور مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ جور و تعدّی کا ہمیشہ امکان تھا اور دادرسی کی امید مشتبہ ضرور تھی۔[1] اس طرح لوگوں کی

---

[1] پیرجی بوہرے کی جو سرگذشت باب پنجم میں بیان ہوئی وہ مقامی عمّال کی زیادتی کے مقابلے میں فریادرسی کی مثال ہے۔ اس کے برخلاف، دوسری ہی فصل میں ہم یہ مثال بھی پڑھ چکے ہیں کہ ایک حاکم کو سزا کے لئے دربار میں طلب کیا گیا اور وہ رسوخ و رشوت کے زور سے بری ہو کے اپنی جگہ واپس آیا اور الزام لگانے والوں کو دھمکی دی کہ انتقام لونگا۔ منوکی نے شاہجہاں کی حالت قید کے قصے میں لکھا ہے کہ یہ بوڑھا بادشاہ اپنے عہد حکومت کی خوبی کے ثبوت میں یہ واقعہ

سود بہبود ایک حد تک مقامی عہدہ داروں کی خو خصلت پر، ایک حد تک طریق نگرانی کی عمدگی پر اور ایک حد تک خود فرماں روا کے مزاج و مطمح نظر پر منحصر تھی۔

نگرانی کے دو الگ الگ طریقے رائج تھے۔ بعض صورتوں میں سرکاری عہدے ٹھیکے پر دے دئے جاتے تھے۔ یعنی عہدہ دار اقرار کرتا تھا کہ اتنی رقم سرکار میں ادا کر دے گا اور زائد جو محاصل ملیں وہ خود لے لیتا تھا۔ یہ طریقہ جسے ہندوستان کی دفتری اصطلاح میں پکّا یا پختہ عہدہ کہتے تھے، ہمارے پیش نظر عہد میں سارے جنوبی ہند میں مروّج تھا[1]۔ اور میں جانتا ہوں کہ سلطنت مغلیہ میں بھی، جہاں اکبر نے دوسرا یا براہ راست ذمہ داری کا طریقہ جاری کرنے کی کوشش کی تھی، رائج ہوتا جاتا تھا۔ اس طریقے میں جسے اہل ہند کچّا یا خام عہدہ کہتے تھے، عہدہ داروں کو مقررہ مشاہرہ ملتا اور جو کچھ محاصل وہ وصول کرتے اس کا اپنے بالا دست کو حساب دیتے تھے۔ اس کی بھی بہ اعتبار ادائی مشاہرہ دو شکلیں تھیں۔ اکبر کا مطمح نظر زمانہ حال کا طریقہ تھا کہ خزانے سے نقد تنخواہ دے دی جائے لیکن اس کے جانشین عموماً ہندوستان کے پرانے رواج پر عمل کرتے تھے کہ جاگیر کی صورت میں تنخواہ ادا کی جائے۔ جاگیر سے مطلب اس قطعہ زمین کی مالگزاری کا بطور تنخواہ و راتب عہدہ دار متعلقہ

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ۔ پیش کرتا تھا کہ اس کے پاس مہینوں کبھی دادخواہ کی عرضی تک نہ آتی تھی، مگر اس کا یہ مفہوم کہ کسی شخص کو اس کے عمال سے کوئی شکایت ہی نہ تھی، اس عہد کے طالب علموں میں مقبول ہونا دشوار ہے (منوکی۔ دوم ۱۹)۔

[1] اپنی پہلی کتاب "ہندوستان بوقت وفات اکبر" میں میں نے جنوبی ہند میں اس ٹھیکے یا مستاجری کے طریقے کا رواج ہونا بطور قیاس کے تحریر کیا اور اس نتیجے کا استخراج صرف بالواسطہ شہادتوں سے کیا تھا۔ اس وقت تک میری نظر سے وہ مواد نہیں گزرا تھا جس سے اگلی فصل میں کام لیا گیا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ سترھویں صدی کے آغاز میں فی الواقع زیر عملدر آمد تھا۔

کے تفویض ہوتا تھا جو اسی طرح اس کا انتظام کرتا گویا وہ خود اوس کی ملک ہے اور اس سے وہ کم از کم اتنا روپیہ جس کے عوض میں جاگیر دی گئی ہو وصول کرتا بلکہ بعض اوقات بہت کچھ زیادہ بھی وصول کر لیتا تھا؛ مالگزاری کے عطیات دوسری اغراض کے لیئے بھی، جنھیں سرسری طور پر خیرات سے منسوب کر سکتے ہیں، کیئے جاتے تھے۔ مثلاً مسجد یا مندر کے متولی کے نام، یا کسی شخص یا ۲۳۶ خاندان کو جس نے سابق میں اچھی خدمات انجام دی ہیں بطریق انعام جاگیر دے دی جاتی تھی اور بعض مغلیہ صوبوں میں ان کا مجموعی رقبہ نسبتةً بہت زیادہ تھا۔ ایک اور صورت یہ تھی کہ وسیع قطعات اراضی کسی مقام کے سربر آوردہ زمینداروں کے تفویض کر دئیے جاتے تھے اور جب تک وہ سرکاری مالگزاری ادا کرتے رہیں، انکا علاقے میں کافی اقتدار رہتا تھا۔ زمیندار کی اصلی حیثیت قریب قریب مستاجر جیسی ہوتی تھی لیکن قبضہ کی میعاد زیادہ اور میں سمجھتا ہوں یہ منصب موروثی ہوتا تھا اگرچہ ظاہر ہے کہ فرماں روا کا حکم تو اسے ایک لحظے میں ختم کر سکتا تھا؛ الغرض ہندوستانی کسان کے پانچ مختلف قسم کے آقا ہو سکتے تھے۔ یعنی مستاجر۔ تنخواہ دار عہدہ دار۔ عارضی جاگیردار۔ کوئی متولی یا جماعت جس کا قبضہ مدید اور ممکن ہے کہ دوامی ہوتا ہو اور پانچویں، زمیندار۔ اور ان کا اقتدار اتنا زیادہ اور بالادستوں کی مداخلت کا موقع ایسا کم ہوتا تھا کہ اس کی سود بہبود زیادہ تر اسی آقا پر منحصر تھی، جس کے تحت میں تقدیر نے اسے پہنچا دیا ہو؛

نظم ونسق کی ترقی نے مستاجری طریق کو اس قدر تقویم پارینہ سا بنا دیا ہے کہ اس کی نوعیت کے متعلق چند الفاظ کہنے مناسب ہوں گے جیسا کہ معلوم ہے یہ طریقہ ہندوستان سے مخصوص نہ تھا بلکہ ایک زمانے میں تو اسے بالکل عام و عالمگیر طریقہ کہہ سکتے تھے۔ یاد ہوگا کہ خود انگریزی کمپنی لنڈن کے مستاجران کروڑگیری سے اسی طرح باقاعدہ معاملت کیا کرتی تھی جس طرح اس کے گماشتے سورت یا مچھلی پٹم کے کروڑگیری کے مستاجروں سے معاملہ کرتے تھے؛ بہرحال، اس طریقے کے وجود کے دو معنی نکلتے

ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرکاری طور پر جزئی نگرانی میں دشواریاں تھیں اور دوسرے یہ کہ انتظام کی درستی اور خوبی سے بڑھکر، زور وصول زر پر دیا جاتا تھا۔ نگرانی کی دشواریوں کا بڑا سبب ذرائع رسل ورسائل کا ناقص ہونا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ فن ملکداری کی تاریخ کا ایک اہم باب ہی اُن وسائل نگرانی کے تدریجی ارتقا پر مشتمل ہے جنھوں نے زمانۂ حاضرہ کے ڈاک، تار اور جدید ذرائع سفر کے طفیل ترقی پائی ہے؛ جب تک کوئی ماتحت دور دراز فاصلے پر ہے، کہ اس تک پہنچنا دشوار ہے، اس وقت تک جزئی نگرانی ممکن نہیں اور اس لحاظ سے کہ مستاجری میں اصلی پہلو، یعنی ایک مقررہ رقم کا وقت پر ادا ہوتے رہنا، ہاتھ سے جانے نہیں پاتا اور ایسی بات کی کوشش نہیں کی جاتی جو عمل میں آ نہ سکتی ہو، اس طریقے کی فی الجملہ وکالت کی جاسکتی ہے؛ ۲۳۷ اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے کہ خود انتظام کی صفائی اور بہتری کا خیال بہت کچھ زمانۂ حاضرہ میں پیدا ہوا ہے۔ اگر کوئی پردیسی مبصر اعتراض کرے کہ حاکم ضلع کے لئے آج کل لفظ "کلکٹر" استعمال کرنے کے کیا معنی ہیں، تو اسکا اعتراض بیجا نہ ہوگا لیکن ہمارے پیش نظر زمانے میں حاکم ضلع کا پہلا اور مسلمہ فرض خزانے کو معمور رکھنا تھا اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ بعض صورتوں میں اس فرض کو ادا کرانے کا بہترین طریقہ یہی ہوسکتا تھا کہ حاکم مذکور کو بہرحال ایک معین رقم ادا کرنے کا پابند بنادیا جائے اور جس وقت تک یہ اصلی شرط پوری ہوتی رہے، اس وقت تک اسے کافی آزادی سے کام کرنے کی اجازت دی جائے۔

زمانۂ حاضرہ کے ارباب نظم ونسق مستاجری طریق کو یقیناً پسند نہیں کریں گے لیکن اس کے واقعی اثرات میں بہت کچھ فرق و اختلاف ضرور ہوسکتا تھا۔ ہندوستان کے سب سے پہلے انگریز عہدہ دار جس مالی نظام کے وارث ہوئے تھے، جب اس کی تنظیم کرنے بیٹھے تو انھیں مستاجری طریقے کی بدولت بہت کچھ عملی تجربہ بھی حاصل ہوا۔ وہ آخر میں جس نتیجے پر پہنچے اس کا خلاصہ ایک جملہ میں آسکتا ہے اور آج کل اس میں مطلق کوئی

ندرت نظر نہ آئے گی؎۔ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مستاجری میں جو خرابیاں ہیں وہ کم ہو سکتی ہیں بشرطیکہ مستاجر کو احتیاط سے منتخب کیا جائے، اس کے ذمے جو رقم واجب الادا قرار دی جائے وہ کسی قدر ہلکی ہو اور نیز یہ کہ ٹھیکے کی میعاد اتنی طویل ہو کہ وہ زمین کو ترقی دے سکے۔ اس کے برخلاف، اگر ٹھیکہ صرف تھوڑی مدت کے لئے محض روپے کے لالچ میں دیا جائے گا تو یہ لوگوں کے لئے پوری مصیبت کا باعث ہوگا کیونکہ اس صورت میں مستاجر کو زیادہ سے زیادہ رقم فوراً وصول کرنے کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ ہوگی یہی سبب ہے کہ مملکت گولکنڈہ میں سالانہ نیلام کے ذریعے ٹھیکے پر زمین دینے کا جو طریقہ رائج تھا، وہ جیسا کہ آگے آتا ہے نظم و نسق کا سب سے جابرانہ اور لوگوں کے حق میں اتنا تکلیف دہ تھا کہ اس سے بدتر کوئی طریقہ آج تک ایجاد نہ ہوا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ گولکنڈے کی مثال دیکھ کر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی کسانوں پر لازماً اسی قسم کے مظالم ہوتے ہوں گے، تاہم یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جہاں کہیں مستاجری کا طریقہ رائج تھا وہاں اس قسم کے جور و جبر کا واقعی خطرہ ضرور موجود تھا؎

کسی جاگیر میں کاشتکار کی خوش قسمتی یا بد قسمتی اس جاگیر کی نوعیت پر مبنی تھی۔ اگر جاگیر استمراری طور پر دی گئی ہے اور صاحب جاگیر اسے ترقی دینے کی کوشش کر سکتا ہے تو کاشتکار نسبتاً اچھے رہیں گے جیسا کہ ہم سولھویں صدی میں فرید خاں کی جاگیر قریب بنارس یا پیش نظر زمانے کے اواخر میں شائستہ خاں کی جاگیر بنگالہ کے حالات میں پڑھتے ہیں لیکن جب جاگیروں میں جلد جلد ردّ و بدل ہو، جیسا کہ جہانگیر کے زمانے میں ہوتا تھا، تو چند روزہ مالک کو صرف یہ فکر رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کسانوں کا خون چوس لے۔ ہاکنس کے الفاظ ہیں "وہ غریبوں پر سخت ظلم توڑتا ہے کہ جو کچھ مل سکے وصول کر لے کہ ہر گھڑی اسے جاگیر سے ہٹا دیئے جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے"[1]

[1] ملاحظہ ہو ص۳۳۷

وہ کسان جس کی زمین نہ مستاجر کی تحویل میں ہو نہ جاگیر میں، اصولاً خوش نصیب تھا کہ اس کے محصّل کو جور و ظلم کرنے کی ایسی براہ راست کوئی ترغیب نہ ہوتی تھی لیکن عملاً، کافی نگرانی نہ ہو سکنے کے باعث، تشدّد کا امکان موجود تھا۔ اور گو ہماری معلومات اس معاملے میں خواہی نخواہی ناقص ہے، تاہم غالب قیاس یہی ہے کہ سب سے اچھی حالت انہی کاشتکاروں کی تھی جو کسی قدیم خاندان کے زمیندار کی زمین جوتتے ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایسے کسانوں کی زندگی کچھ بہت ہی اعلیٰ درجے کی تھی البتہ ایسی شہادتوں سے جیسی کہ برنیر کی ہے، (اور اسے ہم کسی آیندہ فصل میں نقل کریں گے) یہ پتہ چلتا ہے کہ زمینداروں کے علاقے میں جور و تعدّی کا اوسط، سرکاری عہدہ داروں اور مستاجروں یا جاگیرداروں کے علاقے کی نسبت کم تھا۔

کسان کا تعلق تو زیادہ تر مالگزاری وصول کرنے والے سے تھا لیکن دوسری طرف، تاجروں اور پیشہ وروں کو مختلف انتظامات سے سابقہ پڑتا تھا جو مصنوعات و باربرداری کے لاتعداد محصول، وصول کرنے کی غرض سے کیے جاتے تھے۔ کروڑگیری کے واسطے تو معلوم ہوتا ہے، ٹھیکہ دینے کا طریقہ عام تھا کیونکہ ہم اسے سندھ و گجرات کی طرح مشرقی ساحل پہ مروّج

حاشیہ صفحہ (۳۳۶) ۱ ہاکنس نے عطائے جاگیرات کے طریق کا جو سیدھا سادھا بیان تحریر کیا ہے، وہ پرچاس (سوم۔ ۳۔ ۲۲۱) اور ارلی ٹریولز (۱۱۴) میں ملے گا؛ فرید خاں سے کاشتکاروں کی خوش حالی ایلیٹ، چہارم، ۳۱۳، میں اور شائستہ خاں کی بنگالے میں فیاضی سرکارز اسٹڈیز (۱۵۵) کے ایک مترجمہ وقائع میں مذکور ہے گو یہ دونوں مدحیہ تحریریں ہیں اور ان کی عبارات سے رنگ آمیزی کا عنصر خاص طور پر کم کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال خود ان سے بآسانی ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مقامات میں جور و تعدّی کس قدر عام تھی، جن سے ان خوش قسمت علاقوں کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

پاتے ہیں اور جیسا کہ آگے آئے گا ٹھیکہ داری کی وضع ہی ایسی تھی کہ انہیں جبر و زیادہ ستانی کا ہونا ناگزیر تھا۔ رہے مصنوعات اور بار برداری کے محصول تو انہیں ایک فقرے میں بیان کر دینا ممکن نہیں۔ اس مبحث پر ہم ۲۳۹ اگلے باب میں غور کریں گے سر دست یہ لکھنا کافی ہے کہ اس قسم کے محصول قریب قریب عام تھے اور ان کی تشخیص مقامی عمال کے ہاتھ میں چھوڑ دی جاتی تھی لہذا تاجروں اور پیشہ وروں کی خوش حالی کا مدار بہت کچھ ان عمال کے طرز عمل پر منحصر تھا؛

مذکورۂ بالا خلاصۂ احوال سے ظاہر ہوگا کہ پیداوار و مصنوعات پر حکومت کا اس درجہ اثر تھا کہ آج کل اس کی کوئی مثال برطانوی ہند میں نہیں ملتی۔ آیندہ فصلوں میں اسی مضمون کو ہم زیادہ تفصیل سے مطالعہ کرینگے اور مناسب ہوگا کہ اس کا آغاز مستاجری طریقے کے عملی حالات سے کیا جائے جو تمام جنوبی علاقے میں رائج تھا؛

۳۔ مستاجری طریقہ جنوب میں

پیش نظر عہد میں گولکنڈے میں جو نظام حکومت مروج تھا، اسکی سب سے مفصل کیفیت ایک رسالے میں درج ہے جس کا نام:-

“ A Description of the Domains of the King Kotebipalying on the Cormandel coast ”

ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے پیٹر بروکے کے بحری اسفار کی سرگذشت میں کسی بعد کی طبع کے وقت شامل کر دیا گیا تھا[1]۔ متن کی ترتیب سے مترشح ہوتا ہے

---

[1] بروکے کی جو سرگذشت ۱۶۳۲ء میں یعنی مصنف کی ہالینڈ کی واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد شائع ہوئی، اس میں مذکورہ بالا کیفیت درج نہیں ہے۔ بظاہر وہ پہلی مرتبہ "بیگن اینڈ ورٹ گیانگ" جلد دوم، طبع ثانی کے صفحہ ،، پر چھاپی گئی

کہ یہ کیفیت کسی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی ہے اور اندرونی شہادت سے بھی اس کی قطعی توثیق ہو جاتی ہے کیونکہ لکھنے والا چھ سال مشرقی ساحل پر رہا ہے حالانکہ بروکے صرف چند ہفتے کے لئے وہاں گیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص نے کتاب کی بعد میں تدوین و اشاعت کی اس نے بروکے کی سرگذشت کی تکمیل کی غرض سے مناسب سمجھا کہ کورومنڈل کا زیادہ مفصل احوال درج کر دیا جائے اور اس غرض سے مذکورہ بالا رسالہ یا کیفیت بھی داخل کتاب کر دی۔ لکھنے والے کا نام تحریر نہیں لیکن ریاست احمد نگر اور پرتگیزوں کی چَول پر "دو سال پہلے" جو لڑائی ہوئی تھی اس کے تذکرے سے تاریخ تحریر کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس لڑائی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ صرف ایک ہی لڑائی ہو سکتی ہے جو مذکورہ بالا علاقے میں ۱۶۱۲ء اور ۱۶۱۴ء کے درمیان ہوتی رہی اور اس بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کیفیت کو کسی ولندیزی گماشتے نے جو پٹیاپلی (= نظام پٹم) میں تقریباً ۱۶۰۸ء سے ۱۶۱۴ء تک مقیم رہا، قلم بند کیا ہے۔ اور جیسا کہ سرگذشت سے معلوم ہوتا ہے، اس کے فرائض میں دیہات کا دورہ بھی داخل تھا بنظر بریں ۲۴۰ یہ ایسے شخص کے مشاہدات ہیں جسے نظم و نسق کی روز مرہ کی عملی حالت کو دیکھنے اور جانچنے کا موقع حاصل تھا؛

بہر حال، اس تحریر کی رو سے، اُن دنوں ریاست گولکنڈہ کا اصلی اقتدار ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا جنھیں مصنف "ہندوستان کی سب سے مغرور قوم" بتاتا ہے جو عام طور پر کوئی مقامی عہدہ قبول نہ کرتے تھے بلکہ صدر، مستاجر یا ماتحت عہدہ داروں کے ناظر مقرر ہوتے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور پھر ۱۶۲۳ء کی علٰحدہ طبع کے ساتھ شائع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مسودہ کہیں محفوظ نہیں رہا۔ "Kotebipa" بدیہتاً قطب شاہ کی غلط املا ہے اس سے بھی زیادہ صحیح قطب الملک ہے جو شاہان گولکنڈہ کا خاندانی لقب تھا؛

پوری مملکت عاملوں (یا گورنروں[۱]) کے ماتحت اضلاع میں تقسیم تھی۔ عامل کا سب سے بڑا فرض وصول مالگزاری تھا۔ اور یہ عہدے ہر سال سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو مل جاتے تھے۔ اکثر مقامی عامل، ”ہندوستان کی سب سے چالاک اور عیار قوم“ یعنی بنئے یا برہمن لوگ تھے جو اپنے بالادست ارباب حکومت کو جی کھول کے نذرانے دیتے تھے تاکہ غریبوں کی کوئی شکایت یا فریاد کبھی بادشاہ تک نہ پہنچ سکے؛ کسانوں سے جو مالگزاری وصول کی جاتی تھی، اس کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ خود راوی کو تحیر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اکثر اوقات ”جب میں اس ملک میں سفر کرتا، تو حیران ہوتا تھا کہ اتنا زیادہ روپیہ کہاں سے آجاتا ہے کیونکہ لوگ نہایت مفلس اور مصیبت سے زندگی بسر کرتے ہیں“۔ پھر دوسرے مقامات پر وہ عمال کی سختی اور ٹھیکے کے مطابق روپیہ بھرنے کی دشواریوں کا ذکر کرتا ہے جس کا نتیجہ ملک کی مفلسی ہوتا تھا۔ مالی انتظامات کی مثال میں، جو زیر عملدرآمد تھے، ہم پیپلی کے ضلعے کو لیتے ہیں اس کا اصلی ٹھیکہ ۵۵ ہزار پگوڈا تھا۔ لیکن عامل سے ایک ہزار پگوڈا زیادہ لیکر اس کے نام کر دیا گیا تھا۔ اس رقم میں سے ۵ ہزار سرکاری ملازمین کی تنخواہ کے لئے عامل کے پاس چھوڑ دئیے جاتے تھے اور وہ ایک مقامی کر کے

---

[۱] اس کتاب میں گورنر کا لفظ میں نے اس لئے رہنے دیا کہ ہمعصر تحریروں میں ہر جگہ یہی استعمال ہوا ہے ورنہ حقیقت میں اس عہدہ دار کو صاحب ضلع کہنا زیادہ قرین صواب ہوگا۔ مغلیہ صوبوں کے بڑے عہدہ دار کو فرنگی لوگ وائسرائے یا کسی ہندوستانی لفظ جیسے ”صاحب صوبہ“ وغیرہ سے یاد کرتے ہیں۔ سب سے اول پرتگیزوں نے مقامی عہدہ دار کو جس سے ان کا سابقہ پڑتا تھا ”گورنیڈور“ کہنا شروع کیا اور بلاشبہ انہی کے ترجمانوں کی بدولت اس کا مرادف ولندیزوں اور انگریزوں میں رائج ہوگیا۔ سلطنت مغلیہ میں اس کا مفہوم عموماً عامل ہوتا ہے جو صوبہ دار کے ماتحت ہوتا تھا؛

ذریعے بھی اسی غرض سے پانچ ہزار پگوڈا اور وصول کرتا تھا۔ یہ تنخواہیں، اگرچہ زرنقد کے حساب سے مقرر تھیں، لیکن اکثر غلے اور ادنے درجے کے نمک کی صورت میں ادا کی جاتی تھیں اور ان کی قیمت اصل سے کم از کم ایک تہائی زیادہ لگائی جاتی اور اس معاملے میں بھی نفع پیدا کیا جاتا تھا۔ اس کیفیت ۲۴۱ میں تشخیص مالگزاری کا طریقہ مذکور نہیں اور دوسرے بیانات بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ لہذا ہمیں عمال کی، جن پر ادائے رقوم کی سخت پابندیاں عائد تھیں، ضروریات دیکھکر ادائے رقوم کی نسبت قیاس پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ مقررہ رقم عاملوں کو سال کے اندر تین قسطوں میں ادا کرنی ہوتی تھی اور وہ ایسا نہ کرسکیں تو سزائے تازیانہ کے مستوجب ہوتے تھے۔ ہمارے راوی کا بیان ہے کہ بعض مثالیں اس کے ذاتی علم میں آئی ہیں کہ قصوروار عاملوں کو سزا نے عمر بھر کے لئے کنونڈا کردیا۔ مگر سزائے تازیانہ سے بچنے کی بھی ایک صورت تھی کہ دربار کے ایرانی امیروں سے قرض روپیہ لے لیا جائے جو سود خواری کا باقاعدہ کاروبار کرتے اور کسی عامل سے جو مصیبت میں گرفتار ہو پانچ فیصدی ماہانہ سود لینے سے نہ شرماتے تھے اور اس طرح اس کی تلچھٹ تک سُونت لیتے تھے"۔

اس بیان کی معناً ایک اور ولندیز سوداگر، انٹونی شورر کی کیفیت سے بھی تصدیق ہوتی ہے جو اس نے مچھلی پٹم سے ۱۶۱۵ء میں لکھکر وطن ارسال کی اور اسی طرح اس بیان کے سارے اہم پہلو ولیم میتھوولڈ کی کچھ بعد کی سرگذشت سے یکسانی رکھتے ہیں جو اس نے مشرقی ساحل کی چند سالہ ملازمت سے واپس انگلستان آکے تحریر کی تھی۔ میتھوولڈ کی داشت ہیں، شاہ گولکنڈہ کی ساری رعایا اس کی کرایہ دار تھی جسے بھاری سے بھاری کرایہ بھرنا پڑتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "سارا ملک بادشاہ، معزز اشخاص کو ٹھیکے پر دے دیتا ہے اور وہ اپنے زیردستوں کو۔ اسی طرح یہ سلسلہ جب دیہات کے باشندوں تک پہنچتا ہے تو شرح (مالگذاری)، اتنی بھاری ہوجاتی ہے کہ وہ مصیبت اور مشقت دیکھکر جو بدنصیب غریبوں کو برداشت کرنی پڑتی ہے

رونا آجاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ لگان کا کوئی حصہ ادا نہ کر سکیں تو جو چیز انکی اراضی
نہیں ادا کر سکتی وہ اُن کے جسموں کو ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ بعض اوقات اتنا
پیٹے جاتے ہیں کہ ہلاک ہو جاتے یا اگر چھُپ کر جان بچاتے ہیں تو ان کے
جورو بچے، باپ، بھائی اور سب رشتہ داروں کو قرض یا سزا بھگتنی پڑتی ہے
حتیٰ کہ بعض اوقات سب سے بالادست مستاجر بھی روپیہ ادا نہ کر سکنے کی
صورت میں اسی قسم کی سزا پاتا ہے جیسی کہ ایک شخص باسّ بل راؤ کو دیکھئے
کہ پوری رقم ادا نہ ہونے کے باعث ہاتھ، پاؤں اور پیٹ پر اتنی بیدیں
ماری گئیں کہ بالآخر وہ مر گیا (یہ باسّ بل) جب سے انگریزوں نے تجارت
شروع کی، مچھلی پٹم کا عامل (یا گورنر) تھا پھر ان علاقوں کا کوئی (دوامی) پٹہ
بھی نہیں ہوتا بلکہ ہر سال جولائی کے مہینے میں یہ علاقے ہراج کئے جاتے ہیں
اور سب سے اونچی بولی بولنے والے کے نام چھوٹ جاتے ہیں۔ جس کا
نتیجہ یہ ہے کہ ہر عامل اپنے زمانے میں راستے ہی کے بہت سے محصول
وصول کرتا اور ہر قسم کی جور و تعدی کے ذریعے جس قدر ممکن ہے غریب
باشندوں کا خون چوس لیتا ہے۔ اور وہ اپنے علاقے میں جو ظلم چاہے
۲۴۲ کرے، اپنے وقت میں تو وہ اپنے من کا راجہ ہے"۔

جیسا کہ میں نے گذشتہ فصل میں کہا، نظم و نسق کا یہ طریقہ غالباً
سب طریقوں سے جو اب تک ایجاد ہوئے ہیں، زیادہ ظالمانہ ہے۔ ایک
سال کی مدت، عہدوں کا ہراج اور قصورواروں پر شدت، پائے تخت کی
زیادہ ستانی اور سود خواری کے ساتھ مل کر ایک ایسا نظام بن جاتی ہے
جس میں کاسبین کے پاس قریب قریب کچھ باقی نہیں بچتا اور ہمیں ولندیز
راوی کے اس قول پر حیرت نہ کرنی چاہئے کہ کوئی روپے والا اپنی دولت
کا بھید ظاہر، یا علانیہ معاشرت کا معیار بلند نہیں کر سکتا کیونکہ اس صورت میں
حاکم فوراً اس کے تباہ کرنے کا کوئی حیلہ تراش لے گا۔ دوسرے مشاہدہ
کرنے والوں کے ضمنی اقوال سے بھی مذکورہ بالا کیفیت کی عام صحت کا
ثبوت ملتا ہے۔ رہا صدر حکومت کا معاملہ، تو ہم ایک جگہ پڑھتے ہیں کہ

بادشاہ کے دیوان اور دوسرے مختار اُمرا انگریزوں کی ایک درخواست کی محض
اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ انھیں کچھ رشوت ہاتھ آجائے "جو اِن خطوں
میں ہر کام کر سکتی ہے .... اس ملک کی دردناک حالت ایسی ہے
کہ غریبوں پر دولتمند انتہا درجے کے ظلم کرتے ہیں جس کی کوئی داد فریاد
نہیں اور انصاف اور سچائی مدت ہوئی کہ یہاں سے کوچ کر چکے ہیں"؛
کچھ روز بعد کی روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ دربار کے عہدہ دار بادشاہ
کو اصل حال کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حق رسی کر دی گئی حالانکہ
لوگ محروم ہیں اور برابر اپنا حق پیش کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک
ولندیزی تحریر میں بتایا گیا ہے کہ ایک مقامی حاکم کی شکایتیں فی الواقع بادشاہ
تک پہنچ گئیں تو بھی مجرم نے نذرانوں اور اثرات کے ذریعے برائت حاصل
کر لی اور واپس اپنے مستقر پہ آگیا اور شکایت کرنے والوں سے بدلہ لینے
کی دھمکیاں دیتا تھا؛ مقامی حاکموں کی سختی اور زیادتی کی بھی تصدیق ہوتی
ہے۔ ۱۶۳۲ء میں پٹاپلی کے حاکم نے اپنے ہاتھ سے گاؤں کے پٹیل کو
دو پارہ کر دیا کہ اس نے حاکم کی زمین کاشت نہیں کی تھی اور اس تشدد
نیز دوسرے مظالم نے سارے علاقے میں شورش و بغاوت پیدا کرا دی
تھوڑے دن بعد مچھلی پٹم میں اسباب سوداگری کی کم رسانی کو بھی اس
حاکم کی ناقابل برداشت زیادہ ستانیوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اصل بات
یہ معلوم ہوتی ہے کہ گولکنڈے میں کسی عامل یا حاکم علاقہ سے ممکن ہی
نہ تھا کہ علاقے کی ساری زائد آمدنی کھینچ لینے کے ماسوا اور کسی مصلحت
کا لحاظ کرے اور عادۃً وہ آمدنی کے ہر ممکن وسیلے کو زیادہ سے زیادہ
بولی لگانے والے کے ہاتھ بیچ دینا چاہتا تھا۔ مچھلی پٹم میں سونے چاندی
۲۴۳ کے بیوپار کا یک بہ یک اجارہ دیا گیا تو اس کی وجہ بھی انگریز گماشتوں نے
یہی بیان کی کہ "یہ علاقہ بہت بھاری شرح کے عوض ٹھیکے پر ملا ہے۔ لہٰذا
صدر حاکم (یا مستاجر) کی نظر میں سب سے مقبول وہی شخص ہے جو
وصولِ نذر کے نئے نئے طریقے سمجھا سکتا ہو؛ صریحاً یہی توجیہ اُس واقعے

کی بھی ہے جو ہم کسی گذشتہ فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ ایک بار ولندیز تاجر ہی ٹھیکے پر دے دیئے گئے تھے اور ٹھیکہ دار کے اجازت نامے کے بغیر اِن کی دُکان تک کوئی شخص نہیں آجا سکتا تھا۔ تو اصل یہ ہے کہ ولندیز نفع کما رہے تھے اور گولکنڈے میں نفع کی صورتیں سب سے پہلے حکام کے کام آتی تھیں؛ اسی سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قصبات اور دیہات کی مستاجری بارہا ولندیزوں یا انگریزوں کو بھی مل جاتی تھی اور کبھی تو وہ کمپنی کی طرف سے یہ معاملہ کرتے اور کبھی شخصی طور پر اپنے نفع کے لیے اور اِس سے بھی میتھوولڈ کے قول کی کہ مستاجری کا طریقہ سارے ملک میں جاری و ساری تھا، تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی حاکم علاقہ بہت بڑی شرح پر ٹھیکہ لیتا اور پھر اپنی حدود میں بے شمار تحتانی مستاجروں پر اس ذمہ داری کو تقسیم کر دیتا تھا؛ اس نظام کی سختی کی ایک آخری مثال ہم اُس مراسلت سے جو خاص مچھلی پٹم کے ٹھیکے کی نسبت محفوظ ہے، پیش کرتے ہیں۔

سنہ ۱۶۲۶ء میں ولندیز حکام اس بندرگاہ کی مشکلات سے اس قدر دق ہوئے کہ انہیں اس علاقے کو خود مستاجری پر لے لینے کا خیال ہوا اور ہالینڈ سے اس کی تحریک کی گئی لیکن بتاویہ کے صدر ناظم نے اس تجویز کو خاص اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ ولندیزی سوداگروں سے یہ ممکن نہیں کہ ظلم و ستم سے اس قدر روپیہ وصول کر سکیں جس قدر کہ حکومت گولکنڈہ مطالبہ کرتی ہے؛ اور یہ فیصلہ اس اعتبار سے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ مشرقی ممالک میں ولندیزوں کا انتظام جیسا کچھ باضابطہ اور کارگر تھا اُس سے اِس مضمون کے طالب علم بخوبی آگاہ ہیں؛

جو مثالیں میں نے نقل کیں، وہ ہمارے پیش نظر عہد کے بہت بڑے عرصے سے لی گئی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے آغاز میں جو کیفیت تھی، جہاں تک مملکت گولکنڈہ کا تعلق ہے، آخر تک وہی حالات رہے۔ تجارتی مراسلات میں بیجاپور کی ہمسایہ سلطنت کے متعلق بہت کم معلومات تحریر ہے لیکن جب کبھی اس کا سرسری ذکر آتا ہے تو وہاں بھی

وہی اسباب کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ اس ملک میں مقامی حکام بادشاہ کے حکم پر اس وقت تک کوئی اعتنا نہ کرتے تھے جب تک کہ اُن کے بالادست عہدہ دار انھیں ہدایت نہ کریں ؎ ایک ولندیزی اطلاع میں درج ہے کہ بیجاپور ۲۴۴ کا ایک بڑا حاکم تین سال میں ایک لاکھ پگوڈا ادا کرنے کا ذمّہ لے کر وینگرلا آیا لیکن زیادہ عرصہ زرستانی اور شدت کرنے نہ پایا تھا کہ یکایک دوسرے حریف کے مقابلے میں جس نے ۲۵ فیصدی زیادہ پر ٹھیکہ لیا تھا، اسے نکالدیا گیا ؎ ان واقعات سے کم از کم اتنا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دکن کے لوگ اپنے مشرقی ہمسایوں سے کچھ بہت بہتر حالت میں نہ تھے اور جادوناتھ سرکار کا یہ قول بھی سند میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ محمد عادل شاہ کے عہد میں عمداً ایسی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی کہ بیجاپور کی ہندو رعایا پست و پس ماندہ رہے ؎

رہے جنوب کے ہندو علاقے، تو ولندیزی تحریروں میں بہت سے حوالے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پولی کٹ سے لے کر کم از کم نگاپٹم تک برابر مستاجری طریقے پر عملدرآمد ہوتا تھا، اور بعض اوقات تو ان کی مدت بھی بہت کم ہوتی تھی چنانچہ ہم پڑھتے ہیں کہ تنجور کا نائک قریب ہر مہینے نئے حاکم مقرر کرتا تھا۔ (بے شبہ یہ مبالغہ ہے) اور یہ عہدہ تنجور نیز پولی کٹ میں اُسے ملتا تھا جو زیادہ دام لگائے۔ وقتاً فوقتاً ہم سختی اور استحصال زر کی روایتیں سنتے ہیں۔ کائل کی تجارت محض حکام کے جور و تعدّی سے ستیاناس ہوئی۔ پولی کٹ کی نواح کے پرگنے ایسے لوگوں کے قبضے میں بیان کئے گئے ہیں جو کمینے اور مکار زرستان تھے اور اسی لئے لوگوں کو امن و اطمینان مشکل سے میسّر آتا تھا۔ اسی علاقے میں حاکم کے مطالبات نے بالآخر بہت سے اہل حرفہ کو مجبور کیا کہ چھپ کر بھاگ گئے اور تنجور میں غیر معمولی محصولات اور جبری وصول زر نے کتنے سو جلاہوں کو بھگا دیا اور وہ کچھ بہتر سلوک کی امید میں دوسرے مقامات پر چلے گئے۔ اس قسم کے مواد سے دشوار ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے

تنظم ونسق کا فرق معلوم کیا جائے مگر اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت کی
کمزوری لوگوں کے حق میں اور بھی بلائے جان ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ہم بعض
قصبات کا حال سنتے ہیں کہ وہاں ایک ہی وقت میں دو یا زیادہ حاکم مقرر
کر دئے گئے جنھیں امرائے دربار کے حریف جتھے الگ الگ نامزد کرا دیا کرتے
تھے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً ان دیہات پر بھی جو ولندیز ٹھیکے پر لیتے، کسی
نائک کی فوجیں حملہ کر دیتی تھیں کیونکہ اس نائک کو بھی بظاہر اپنے قبضے کا
دعوےٰ ہوتا تھا۔ ان قضیوں میں کسی داد فریاد کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ ایکدفعہ
جب حملہ آوروں نے گاؤں جلا دیا پیداوار اٹھا کے لے گئے اور گاؤں والوں
کو نکال باہر کیا تو ولندیزوں کی نالش پر چندراگری کے راجہ نے صرف ایک
عنایت آمیز جواب لکھ بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم اپنے سوداگروں کا اس طرح ۲۴۵
نقصان اٹھانا جائز نہیں رکھ سکتے اور اس نائک سے کہہ دیا گیا ہے کہ آئندہ
ایسی حرکت نہ کرے ٭ اس میں شک نہیں کہ حکام کی طبیعتیں مختلف تھیں اور
بعض نائک اور حاکم غالباً دوسروں سے بدتر ہوتے تھے۔ لیکن سارے ملک
میں جو طریقہ رائج تھا، وہ عملاً جور و تعدی اور زرستانی کو ناگزیر بنا دیتا تھا۔
حکمرانوں کو اصرار تھا کہ روپیہ بہم پہنچایا جائے۔ مقامی عمّال کو کہیں نہ کہیں سے
روپیہ لانا پڑتا تھا اور تاجر، پیشہ ور اور مزارعین روپیہ بھرتے تھے۔ اس طریقے
میں اختیار کرنے کے بعد شدت ہوتے جانا، طبعی بات ہے کیونکہ وصول
زر کی جو تدبیر اختیار کی جائے اسے تو پھر ترک نہیں کیا جائے گا اور آئندہ
نئی نئی صورتیں ایجاد ہوتی رہیں گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عام باشندوں
کے پاس محض مایحتاج کے سوا اور کچھ نہ بچے۔ اور بجز بغاوت کے اصلاح
حال کا کوئی امکان تھا تو یہ کسی طاقتور فیض رساں مطلق العنان کا دور
آجائے ٭

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ہمارے ماخذوں میں یہ کہیں تحریر نہیں کہ
کل پیداوار کا کتنا حصہ سرکار وصول کرتی تھی۔ اور ان کی خموشی پر معنی ہے۔
وہ حاکم جسے اپنے علاقے کے عوض میں زیادہ سے زیادہ رقم ادا کرنی

پڑتی تھی، ایک ایک گاؤں پر مستاجروں سے لازماً بھاری سے بھاری لگان وصول کرسکتا تھا اور اِدھر حاکم اور مستاجرین اپنا نفع لگانے کے علاوہ یہ بھی جانتے تھے کہ مقررہ رقم نہ بھری گئی تو ان کی خیریت نہ ہوگی۔ ایسے حالات میں یہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ مالگذاری کا کوئی سابقہ معیار عملاً قائم رکھا جاے۔ مستاجر کی ذاتی ضرورت اور حرص اس نظم و نسق کے سب سے ممتاز عنصر تھے اور وصول زر کی صرف یہ خوف، حدبندی کرتا تھا کہ کہیں لوگ زراعت نہ چھوڑ بیٹھیں یا ترک وطن یا بغاوت پر آمادہ نہ ہوجائیں؛ مستاجری کی مدت قلیل ہونے کے باعث ترقّی پیداوار کا طریقِ عمل اختیار کرنا محال ہوگیا تھا اور میرے نزدیک یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ مجموعی طور پر جنوبی ہند کے لئے سترھویں صدی کا نصف اوّل ایسا زمانہ تھا جس میں عوام الناس طریقِ نظم و نسق کی وجہ سے مجبور تھے کہ فاقہ کشی یا بغاوت کے کنارے پر زندگی بسر کریں “

۴۶

۴۔ سلطنت مغلیہ کے انتظامی تغیرات

شمالی ہندوستان کی طرف توجہ کیجے تو سترھویں صدی کے آغاز میں حکومت مغلیہ کے عملی انتظامات کے متعلق سب سے پہلے ایک تذبذب اور عدم تیقّن کی کیفیت نظر آئے گی۔ اکبر نے اپنی سلطنت کے بڑے حصّے میں وہ طریقِ مالگزاری رائج کیا جو زمانہ حاضرہ کے معیار سے سخت تو ضرور تھا، تاہم اصولاً بڑی حد تک منصفانہ تھا۔ مگر اس کے لئے گہری نگرانی ضروری تھی اور اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ خود بانی کی حین حیات میں عمل، اصول کے ہمقدم نہ تھا۔ اسی کے ساتھ ہمیں اکبر کی بہ حیثیت منتظم، قابلیت کو کم سمجھنا چاہئے۔ اس کی اعلیٰ قابلیت کی نسبت جو روایات مشہور چلی آتی ہیں، ان کی آزاد شہادتوں سے بہت کچھ تصدیق ہوتی ہے اور میرے خیال میں یہ رائے کہ اکبری قواعد و ضوابط محض کاغذ پر محدود

رکھتے تھے، تسلیم کرنی غیر ممکن ہے۔ زیادہ معقول قیاس یہ ہوگا کہ اُن پر کامل طور پر تو نہیں، مگر بڑی حد تک عمل بھی ہوتا تھا۔ نیز یہ کہ گو بہت سی پرانی خرابیوں کی اصلاح ہوئی، پھر بھی بعض باقی رہ گئی ہونگی اور بد دیانت ماتحتوں نے قدیم طریقوں کی بجائے لوگوں کو ستانے کی نئی تدبیریں اختیار کر لی ہونگی۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے، کہ اکبری قوانین پر عملدرآمد کس حد تک ہوتا تھا، یا محض نظری اعتبار سے وہ کس پائے کے ہیں، وہ سرکاری کتاب جو آئین اکبری موسوم ہے، بالکل صحیح اور معتبر رہنما نہیں مانی جا سکتی۔ البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کس معیار کا نظم و نسق ملک میں رائج کرنے کا خواہشمند تھا؛ ہم یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ آئین اکبری میں جو ضوابط درج ہیں، ہر جگہ بالکل انہی کے مطابق مالگذاری تشخیص کی جاتی تھی لیکن بعد کے بادشاہوں نے جو شرحیں مقرر کیں، اُن سے مقابلے کے لئے وہ ضوابط ضرور پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایسا مقابلہ معیار مالگزاری کے تغیرات ظاہر کر دے گا اور ضمنی اقوال سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہو سکے گا کہ مختلف زمانوں میں اصول اور عمل میں کس قدر فرقِ عظیم رہا کرتا تھا اگرچہ خود اس اندازے میں بہت کچھ اختلاف کی گنجائش رہے گی۔ یہ بات مسلم ہے کہ اکبر بہ حیثیت انتظامی قابلیت کے، جہانگیر اور شاہجہاں سے (جہاں تک اُن کے آخری عہد حکومت کا تعلق ہے) اور اسی طرح اورنگ زیب سے (جس میں اس کے عہد حکومت کا بہت بڑا حصہ داخل ہے) نمایاں فضیلت رکھتا تھا[1]۔ نظر بریں ہمارا یہ قیاس کرنا بالکل بجا ہوگا کہ جو شرح مال گذاری ۲۴۷

---

[1] جہانگیر کے انتظامی رتبے کا اندازہ خود اس کے اقوال مندرجہ تزک جہانگیری سے، نیز رو اور دوسرے ہمعصر مصنفین کے بیانات سے ہو سکتا ہے۔ پلسارٹ (ص۲) آگرے کے تجارتی انحطاط کو اس زمانے سے منسوب کرتا ہے جب کہ اس بادشاہ نے عیش و عشرت کی خاطر نظم و نسق کی دردسری کو خیرباد کہی اور جور و جبر نے عدل کی جگہ لے لی؛ شاہجہاں کے بارے میں بھی میں سمجھتا ہوں

سنہ ۱۶۰۰ء میں تھی، وہی سنہ ۱۶۶۶ء میں عملاً زیادہ جور آمیز ہوگئی ہوگی۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سنین میں مالگزاری کی شرح بجائے خود سابق کی نسبت زیادہ سخت کردی گئی، تو پھر یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ ہمارا پیش نظر زمانہ عوام الناس کے لئے روز افزوں افلاس و فلاکت کا زمانہ تھا۔

اکبر کا نظام ملکداری اس کی ساری سلطنت میں یکساں نہ تھا[1]۔ اس کا خاکہ یہ ہے کہ پورا ملک صوبوں میں اور صوبے، اضلاع (یا سرکاروں) میں اور اضلاع، محلات یا چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم تھے۔ محل ہمیشہ تو نہیں مگر عموماً ان قدیم مقامی رقبوں کا جنھیں پرگنہ کہتے تھے، قائم مقام ہوتا تھا۔ تشخیص کے طریقے مقامی حالات کے مطابق اختیار کئے جاتے تھے اور ایک ہی صوبے بلکہ ضلعے کے اندر مختلف ہو سکتے تھے۔ بنگالہ[2]، برار، خاندیس اور سندھ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اس رائے کو تسلیم کرنے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ عمر کے ساتھ اس کی قابلیت میں انحطاط آتا گیا۔ مگر اس بات کی شہادتیں پیش کرنے میں بہت طوالت ہو جائے گی۔ سنہ ۱۶۳۶ء میں ہم پڑھتے ہیں کہ "ہر شخص بادشاہ کی عزت کرتا ہے لیکن کوئی اس کا حکم نہیں مانتا"۔ سنہ ۱۶۴۵ء میں ہم بڑے عہدہ داروں کے روزانہ تقرر و برطرفی کے واقعات دیکھتے ہیں اور ایک سال کے بعد یہ سنتے ہیں کہ "بادشاہ کا متلون مزاج، مرغ بادنما کی طرح ہے جو ہوا کے ساتھ ساتھ رخ بدلتا رہتا ہے" (انگلش فیکٹریز۔ پنجم، ۲۰۴۔ ہفتم، ۳۰۲۔ ہشتم، ۵۱) منوچی نے اس بادشاہ کو بہت سراہا ہے (اول، ۱۰۸) لیکن زمانہ گزر جانے کے باعث اس میں صریحاً مبالغہ آگیا ہے۔ البتہ اورنگ زیب کے طریقوں کی جو اس نے خبر لی ہے (دوم، ۳۸۲) وہ غالباً اصلی واقعات کی بہتر شہادت ہے۔

[1] کشمیر اور موجودہ افغانستان کا تذکرہ نظر انداز کردیا گیا ہے۔ یہاں کے نظم و نسق میں بہت پیچیدگیاں تھیں دوسرے ان صوبوں کی آبادی اتنی کم تھی کہ اس سلسلے میں ان صوبوں پر بحث کرنا بیکار معلوم ہوا۔

[2] بنگالے کی حالت قدرے مبہم ہے۔ اٹھارھویں اور ابتدائی انیسویں صدی کی

صوبوں میں وہی طریق انتظام رہنے دیا گیا جو فتح کے وقت وہاں نافذ تھا۔
مثلاً سندھ میں قدیم طریقے کے مطابق واقعی فصل کا بٹوارہ کر لیا جاتا تھا اور باقی
تین صوبوں میں بھی کوئی سہل تر اور سرسری سے طریقے، جن کی نوعیت تحریر نہیں
۲۴۸ ہے، مروج تھے۔ البتہ بہار سے ملتان تک شمالی میدانوں میں، اور اسی طرح
راجپوتانہ، مالوہ اور گجرات کے اکثر اقطاع میں مالگزاری اسی خاص اصول کے
مطابق تشخیص کی جاتی تھی جو اکبر ٹوڈرمل کے نام کی یادگار ہے اور جسے اصطلاحاً
ضبط کہتے تھے۔ اگرچہ قریب قریب ہر صوبے میں ایسے رقبے موجود تھے
جہاں دوسرا طریقہ رائج پایا جاتا ہے یا شبہ کیا جا سکتا ہے کہ رائج تھا۔ ان
علاقوں میں اصول مالگزاری کا انحصار چودھریوں یا دوسرے مقامی معززین
پر تھا جو مجموعی طور پر زمیندار کہلاتے تھے۔ انھیں سرکاری لگان کی یکمشت رقم
مقرر کر لینے کی اجازت تھی اور بعض صورتوں میں وہ سرکاری بندوبست کی
شرح کی نسبت کم پر مالگزاری مقرر کرا دیا کرتے تھے۔ اس بندوبست کی
سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر مزروعہ رقبۂ محدود یا کھیت پر بحساب
فصل سرکاری لگان مقرر کر دیا جاتا جو تغیر پذیر مقدار جنس کی بجائے زر نقد

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ طویل بحث (جس کا ایسکولی نے خلاصہ کر دیا ہے) ٹوڈرمل کے بندوبست نافذہ ۱۵۸۲ء سے آغاز ہوئی تھی لیکن ٹوڈرمل نے بنگالے میں کیا عمل کیا، یہ صاف طور پر آج تک نہیں بتایا گیا۔ آئین اکبری کی اس بارے میں عبارت (ترجمہ انگریزی۔ دوم۔ ۱۲۲) صاف نہیں ہے۔ قلمی نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے اور مجھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملا جس کا مفہوم ٹھیک بیٹھتا ہو۔ بایں ہمہ یہ قیاس کہ اکبر نے سابقہ انتظام کو بحال رہنے دیا، جائز نظر آتا ہے اور اعداد کی صورت بھی بتاتی ہے کہ ٹوڈرمل نے بنگالے میں جو کچھ عمل بھی کیا ہو، وہ بندوبست تو یقیناً جاری نہیں کیا جو عام طور پر اس کے نام سے موسوم ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ اٹھارھویں صدی میں جبکہ ہندوستانی عہدہ دار ازراہ حسد اصول مالگزاری کے اسرار (انگریزوں سے) چھپانا چاہتے تھے، آئین اکبری کے قلمی نسخوں میں تحریف کر دی گئی ہو۔

کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح کاشتکار کو پہلے سے علم رہتا تھا کہ سرکار کو کتنی رقم ادا کرنی ہے اور وہ جملہ مصالح کو، جن میں شرح مالگزاری بھی شامل ہے، سوچ سمجھ کر فصل تیار کرتا تھا؛ شرح مالگزاری مقرر ہونیکے بعد پھر تشخیص کرنے میں صرف اتنا کام رہ جاتا تھا کہ ہر فصل کے مزروعہ رقبے کو ناپ کر قلمبند کر لیا جائے۔ شرح اور رقبے کا حال سامنے ہو تو ہر کاشتکار کے ذمے جو لگان واجب الادا ہے، اس کا بلا دقت حساب ہو جاتا تھا۔ یہ شرحیں کل اوسط پیداوار کی ایک تہائی قیمت کے مساوی مقرر کی جاتی تھیں اور پیداوار کا اوسط مقامی تحقیقات سے ہمیشہ کے لئے معین کر دیا جاتا تھا اس طرح، مالگزاری کا معیار اتنا اونچا تھا کہ اِس زمانے میں اسے دانشمندی کے خلاف سمجھا جائے گا۔ لیکن دوسرے اعتبارات سے ضبط کے اصول بالکل درست مانے جا سکتے ہیں۔ اس کے عمل میں لانے میں جو سُقم تھے، وہ زیادہ تر اس لئے پیدا ہوتے تھے کہ کام کرنے والے اہلکار اچھے نہ ملتے تھے ہر فصل پر کھیت کی پیمائش کرنا بھی بہت محنت اور خرچ چاہتا تھا یہ خرچ بظاہر مقررہ مالگزاری کے علاوہ کاشتکاروں کو ادا کرنا ہوتا تھا لیکن اصلی اعتراض کے قابل یہ بات تھی کہ پیمائش کرنے والوں کو رشوت ستانی کا بہت موقع مل جاتا تھا اور ادھر اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ متوسط درجے کے عہدہ دار مزید رقوم کا بار مزارعین پر نہ ڈال دیں گے؛

اس بارے میں اکبر کے فرامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو عام اصول کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ ایک تو یہ کہ تشخیص کا طریقہ جو کچھ بھی ہو، عہدہ داروں کو اراضی اور جاگیر کی بجائے نقد روپیہ تنخواہوں میں دیا جایا کرے، اور دوسرے اُس کی تاکید تھی کہ جہاں تک ممکن ہو براہ راست کاشتکاروں سے منفرداً معاملہ کیا جائے؛ اکبر کے جانشینوں کے متعلق، اکثر معاملات میں ہماری معلومات ناقص ہے لیکن یہ ثابت کرنا ممکن ہے کہ آئندہ نصف صدی میں مذکورہ بالا دونوں اصول غائب ہو گئے۔ جاگیروں میں اضافہ ہوا، مستاجری طریقہ پھیلنے لگا اور اس قسم کی جمع بندیوں سے

جنھیں سرسری کہنا غلط نہ ہوگا، دیہات میں ظلم و ناانصافی کا میدان کشادہ ہوگیا ان تینوں تغیرات ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام کاشتکاروں کی حالت گر گئی لیکن اس کے ماسوا یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ مزروعہ رقبے کو اتنا بڑھانے پر زور دیا جانے لگا جتنا کہ اُس زمانے کی اقتصادی حدود میں نہ آسکتا تھا اور سب سے آخری خرابی یہ ہوئی کہ تشخیص مالگزاری کا اوسط ایک ثلث سے بڑھا کر کل پیداوار کا نصف کر دیا گیا۔ ان کارروائیوں کا مجموعی اثر صحیح اعداد کی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا مگر واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا جائز نظر آتا ہے کہ اکبر نے جو تھوڑی سی رقم چھوڑ دی تھی، وہ بھی سرکاری خزانے یا اہلکاروں کی جیب کے لئے سمیٹ لی گئی اور مزارعین کا گروہِ کثیر خالی مایحتاج زندگی کے خطرناک کنارے پر آگیا۔ اب لازم ہے کہ اِن تغیرات کی شہادتیں پیش کر دی جائیں۔

جاگیروں کے بارے میں یاد رکھنا چاہئے کہ عہدہ داروں کے مشاہرے کا یہ طریقہ بہت پہلے سے چلا آتا تھا۔ اکبر نے اس کو مٹانے کی کوشش کی لیکن قرائن کہتے ہیں کہ وہ بھی کلیتہً کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس کے شخصی اثر کے دُور ہوتے ہی پھر یہ طریقہ بہت جلد پہلے کی طرح مروج ہو گیا۔ تزک جہانگیری میں عطائے جاگیر کا جس طرح بار بار ذکر آتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہد حکومت میں یہی معمول ہو گیا تھا اور ولیم ہاکنس کے دربار جہانگیر کے تجربات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یعنی اگر نقد مشاہرے کا ذرا بھی رواج عام ہوتا، تو یہ قریب قریب یقینی بات ہے کہ ایک پردیسی کے معاملے میں اسی پر عمل کیا جاتا۔ برخلاف اس کے ہاکنس کو معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سلک ملازمت میں داخل ہوتے ہی اسے بھی جاگیروں کی اسی حسین جھپٹ میں حصہ لینا پڑیگا جس کی اُس نے بہت دلچسپ کیفیت بیان کی ہے اس کی سرگذشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جاگیروں میں آئے دن ردّ و بدل ہوتے رہتے تھے۔ ایک شخص ۲ مہینے بھی جاگیر پر متصرف

نہ رہنے پاتا تھا کہ اس سے لیکر وہ دوسرے کے نامزد کردی جاتی تھی۔ لہذا جاگیردار خواہی نخواہی یہ چاہتا تھا کہ ہر نئی جاگیر سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے۔ ٹیری بھی پیہم ردّوبدل کا خصوصیت سے ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سرکاری عہدہ دار عموماً ایک سال میں بدل دیئے جاتے تھے۔ اور گو ہاکنس کی عبارت غالباً مبالغہ آمیز ہے تاہم اس کے بیان میں معتدبہ صداقت ہونے میں شک کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی؛

جیسا کہ پیٹر منڈی کے وادی گنگا کی سیاحت کے احوال سے معلوم ہوتا ہے، عطائے جاگیر کا دستور شاہجہاں کے زمانے میں بھی برقرار تھا چنانچہ منڈی اپنے راستے میں بہت سی جاگیروں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اُن دنوں زیادہ ردّوبدل نہ ہوتے تھے بلکہ تین یا چار سال کا وقفہ ہوا کرتا تھا لیکن اسی زمانے کے قریب فان ٹوسٹ نے گجرات میں اس کثرتِ تغیر کا ذکر کیا ہے اور تجارتی مکاتیب کے ضمنی اقوال سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ جس قدر بادشاہ کی قوتِ ارادی میں ضعف آیا، اسی نسبت سے مزارعین کے لئے یہ ذریعۂ خطر قوی ہوتا گیا یہ تو بخوبی عیاں ہے کہ عہد شاہجہانی میں مالگزاری کا بہت بڑا حصہ جاگیروں ہی سے وصول ہوتا تھا۔ سنہ ۱۶۵۰ء کے قریب عبدالحمید نے بادشاہ نامے میں سلطنت کا احوال بہت احتیاط سے قلمبند کیا ہے، اس میں کل مالگزاری ۸ ارب ۸۰ کرور دام بتائی ہے جس میں سے خالصہ یا وہ رقم جو خزانہ شاہی میں آتی تھی، صرف ایک ارب ۲۰ کرور دام تھی اور اس حساب سے مالگزاری کا تقریباً سات آٹھواں حصہ جاگیردار یا دوسرے شکمی مالک وصول کرتے تھے اور عہد اورنگ زیب کے اعداد میں اس سے بھی زیادہ حصہ اسی مد کے تحت میں نظر آتا ہے۔ اس طرح عام کاشتکار سرکاری محصّل کی بجائے زیادہ تر کسی جاگیردار ہی کے تحت میں آجاتے تھے؛

مجھے اکبر کے آخر زمانے میں ارضی مالگزاری کے ٹھیکے پر دیئے

جانے کی مثال کا پتہ نہیں چلا۔ اور گو شہادت کا میسر نہ آنا بجائے خود قطعی دلیل نہیں ہو سکتا، تاہم اس میں زیادہ قوت اس لئے آجاتی ہے کہ یہ بادشاہ کاشتکاروں سے منفرداً براہ راست تعلق رکھنا چاہتا تھا اور مستاجری کا طریقہ اس نصب العین کی ضد تھا۔ بہرحال، سلطنت مغلیہ میں مستاجری کی سب سے پہلی مثال جو مجھے ملی وہ فان راوس ٹین کے احوال گجرات میں ۱۶۱۵ء کی ہے جس میں مختلف سرکاروں کا باضابطہ مستاجری پر دیا جانا مرقوم ہے۔

اسی کے قریب زمانے میں رو سورت کے حاکم کا "جسے مستاجر کہنا
زیادہ صحیح ہوگا" ذکر کرتا ہے اور اس کی پٹنے کے صوبہ دار سے ملاقات
کا جو احوال تحریر ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۱۶ء تک عام طور
پر صوبوں میں اسی طریقے کے مطابق انتظام کیا جاتا تھا۔ اس ملاقات میں
رو کو اطلاع دی گئی کہ "ہر صوبے کی حکومت سالانہ ایک رقم ادا کرتی ہے ۲۵۱
اور پٹن کی حکومت کو صرف ۱۱ لاکھ روپے دینے ہوتے ہیں۔ باقی جو
مداخل ہوں، وہ سب صوبہ دار مذکور کے ہیں اور اسے شاہانہ اختیار حاصل ہے
ان میں سے جتنا چاہے وصول کرے"؛ آیا یہی عملدرآمد عام تھا؟ اس کی
کوئی بلاواسطہ شہادت مجھے نہیں ملی لیکن سلطنت کا وہ واحد صوبہ (گجرات)
جس کے تفصیلی حالات ہم تک پہنچے ہیں، وہاں تو یقیناً شاہجہاں کے زمانے
میں کسی نہ کسی حد تک یہ عمل چلا آتا تھا۔ رسائل بتاویہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ
۱۶۳۶ء میں سورت اور کھمبائت دونوں ٹھیکے پر تھے اور کھمبائت کے
مستاجر کی نسبت اطلاع تحریر ہے کہ وہ پانچ لاکھ کے چکر میں تھا اور کسی نہ کسی
طرح یہ رقم اسے پوری کرنی تھی۔ کاشتکار اس کی ناقابل برداشت زیادہ ستانی
کے شاکی تھے اور زیر کاشت رقبہ کم ہوتا جاتا تھا؛ دو سال بعد سورت کے
انگریزوں نے خبر دی کہ مقامی والی نے "معز ملک" (= معز الملک معروف
بہ میر موسیٰ) کو بہلا پھسلا کے زیادہ لگان پر سورت کا ٹھیکہ دے دیا ہے
اور حال میں معز الملک اس کی جگہ آگیا ہے"۔ بعد کے خط میں یہ صراحت
بھی موجود ہے کہ ٹھیکے میں "قریب کا علاقہ، ٹکسال اور محصول خانہ" بھی

داخل تھے اور ان کے معاملات میں بادشاہی وزرا کوئی مداخلت نہ کرسکتے تھے مگر میر موسیٰ بھی ٹھیکہ پورا نہ کرسکا اور ۱۳ لاکھ کا مقروض ہو کے دست بردار ہوگیا خط میں لکھا ہے کہ ”یہ رقم ابھی تک اس پر واجب الادا ہے اور اسی لئے وہ دربار میں طلب کیا گیا ہے کہ حساب دے اور یہ معلوم ہے کہ وہ حساب نہیں دے سکتا۔ لہذا بادشاہ کو خیال ہوگیا ہے کہ کوئی دوسرا طریق عمل اختیار کیا جائے“۔ چنانچہ اس نے سرکاری عہدہ دار مقرر کردئیے ”انھیں شاہی خزانے سے سالانہ تنخواہیں دی جاتی ہیں اور مالگزاری، محصولات یا ٹکسال سے جو کچھ وصول ہو، وہ بادشاہ کے حساب میں جمع کرلیا جاتا ہے“۔ انگریز گماشتوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ گو اس انتظام سے کام بڑھ گیا اور تاخیر ہونے لگی ہے پھر بھی ہم اور سب سوداگر اس تغیر سے بے حد خوش ہیں۔ ولندیز گماشتوں نے بھی اس قسم کی اطلاع بتاویہ روانہ کی۔ اور یہ واقعہ کہ دونوں نظم و نسق کے اس بلاواسطہ طریقے کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ اُن کے تجربے میں یہ نئی بات تھی۔ یہ سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ یہ مستاجری طریقہ اس زمانے میں گجرات سے مخصوص تھا۔ کم سے کم سندھ کی لاہری بندر کا تو ۱۶۳۴ء میں ضرور ٹھیکہ دے دیا گیا تھا۔ اور اگر دوسرے صوبوں کے متعلق اس امر کی شہادتِ تحریری نہیں ملتی تو ہم اس کے خلاف بھی کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے جن صوبوں کی نسبت اتفاق سے قدرے معلومات محفوظ رہی؛ وہاں تو ہم مستاجری کا رواج سنتے ہیں لیکن باقی صوبوں کے بارے میں ہماری مفصل معلومات گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عہد جہانگیری کے اخیر میں جاگیر والے اکثر اپنی زمین مستاجری پر کاشتکاروں یا کروڑیوں کو دے دیا کرتے تھے اور فصل کے اچھے بُرے کے وہی ذمہ دار ہوتے تھے“۔

اب تک ہم یہ مطالعہ کرتے رہے کہ کس طرح عہدہ داروں کے تقررات کے اصول میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں، جن سے صدر حکومت کے

اختیارات میں کمی آگئی اور کسانوں کی تعداد کثیر ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی جن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو روپیہ وصول کریں۔ ان تغیرات کے ساتھ ساتھ تشخیص مالگزاری کے طریقے میں بھی انتظامی انقلاب واقع ہوا جس نے جاگیرداروں اور زمینداروں کے لئے مطالبات بڑھانے میں سہولت پیدا کر دی۔ اس عہد کے وقائع میں اس انقلاب کی تحریری شہادت مجھے نہیں ملی لیکن اکبر کے ضوابط کا اورنگ زیب کے ابتدائی عہد کے فرامین سے مقابلہ کیا جائے تو اس کا ثبوت مل جائے گا ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکبر انفرادی قبضے پر مالگزاری کی تشخیص چاہتا تھا اور مالگزاری کی شرحیں اس نے پہلے سے خود مقرر کر دی تھیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایسے سرسری بندوبست کی قطعی ممانعت کرتا تھا جس میں گاؤں کا مکھیا مجموعی رقبے کے لئے یکمشت رقم ادا کرنے کا ذمہ لے لے کیونکہ اکبر کے نزدیک اس دستور سے دراز دستی کرنے والوں کے ہاتھ میں ناواجب اختیار آجاتا ہے جسے وہ روا نہ رکھتا تھا[1]۔ اس کے مقابلے میں اورنگ زیب نے جو فرمان آٹھویں سن جلوس (۱۶۶۵ء ۔ ۱۶۶۶ء) سے نافذ کیے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طریق عمل کو اکبر نے روکا تھا، اب وہی معمول ہو گیا تھا۔ یعنی تشخیص کرنے والے ہر سال عام حالات کی بنا پر یکمشت رقم مقرر کر دیتے تھے۔ اور اکبر کے طریقے پر تفصیلاً صرف اس وقت عمل ہوتا تھا جب کہ گاؤں (۲۵۲) یا اس سے بڑے رقبے والے سرکاری تشخیص کو تسلیم نہ کریں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں خود اکبر کے طریقے میں زیادہ ستانی کا خطرہ موجود تھا۔ اب یہی طریقے جب دھمکی کی صورت اختیار کر لیں تو عام فطرت انسانی کا علم یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ وہ خطرہ قریب قریب یقینی شئے ہو جائیگا

---

[1] اس ضابطے یا آئین کا مطبوعہ ترجمہ صحیح مفہوم نہیں ادا کرتا۔ اصل متن میں کہیں نہیں لکھا کہ تشخیص کے لئے گاؤں کے مقدم پہ بھروسہ کیا جائے بلکہ صرف یہ مرقوم ہے کہ تشخیص کنندہ مقدم سے کوئی سرسری نسق (= بندوبست) طے نہیں کرے گا۔

لہذا ہمارا یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ سالانہ سرسری بندوبست کا رواج عام ہو گیا تھا اور اس سے معمولی کسان ناواجب زیادہ ستانی کی زد میں آ گئے تھے جس کا اکبر کو خوف تھا۔ بالفاظِ دیگر، مجموعی طور پر گاؤں پہلے سے زیادہ تشخیص کرنے والوں کے براہ راست تحت میں آ گیا اور کسان منفرداً اُن اشخاص کے دباؤ میں آ گئے جو گاؤں میں باثر تھے ؕ

اِدھر معلوم ہوتا ہے تشخیص کرنے والوں پر بھی زیادہ دباؤ پڑنے لگا ان کے بالادست خواہ مستاجر ہوں یا جاگیردار، انھیں یہ موقع حاصل ہو گیا کہ پہلے سے زیادہ مالگزاری کا مطالبہ کریں اور اسی کے ساتھ خود سرکار کی ضرورتیں بڑھیں۔ نظر براں، تشخیص کرنے والوں کا فرض ہو گیا کہ دونوں قسم کے یہ مطالبات پورے کئے جائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہجہاں کے ذوق اور طرز عمل نے سرکاری مصارف کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ اس بارے میں ہمعصر وقائع نگار کی یہ مدح نقل کر دینی کافی ہے کہ "گذشتہ بادشاہی زمانوں کا خرچ اس عہد حکومت کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھا[1]۔ اور باوجود اس کے اس بادشاہ نے تھوڑے عرصے میں جو دولت جمع کر لی وہ اس کے اسلاف سالہا سال میں بھی جمع نہ کر سکتے تھے"۔ اب اگر خرچ میں اس قدر بیشی ہوئی اور اس پر بھی بہت سا روپیہ پس انداز ہوتا رہا تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں: یا تو محاصل میں زیادتی کی گئی اور یا یہ کہ سابقہ وسائل کی آمدنی میں اضافہ ہوا اب محاصل میں بیشی کی تو کوئی اطلاع ہم نہیں پڑھتے اور جیسا کہ آگے بیان ہوگا متفرق ابواب و رسوم مقامی یا صوبوں ہی کے خرچ میں آ جاتی تھیں لہذا لازمی طور پر زمین ہی کی مالگزاری تھی جس سے یہ جدید مطالبات پورے کئے جاتے تھے ؕ

---

[1] اس تناسب میں غالباً مبالغہ کیا گیا ہے تاہم یہ مسلّم ہے کہ بادشاہی مصارف میں بہت کچھ بیشی ہو گئی ؕ

مالگزاری میں بیشی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ مزروعہ رقبے میں اضافہ ہو اور اوپر جو مدح نقل کی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں پوری کوشش کی جاتی تھی کیونکہ اس میں آگے ان عہدہ داروں کیساتھ شاہی حسن سلوک کا ذکر ہے جو زراعت بڑھانے میں کامیاب ہوئے لیکن اس کوشش کی نوعیت زیادہ وضاحت کے ساتھ اورنگ زیب کے ۲۵۴ فرامین سے معلوم ہوتی ہے جو ۱۶۶۸ء میں نافذ ہوئے اور جن میں عہدداران مالگزاری کے حاضرہ طرز عمل کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

سال کے شروع میں جہاں تک ہو سکے ہر کسان کے حالات کی اطلاع بہم پہنچاؤ اور یہ کہ وہ زراعت کرتے ہیں یا جان چرا رہے ہیں۔ اگر کاشتکاری کے وسائل ان کے پاس ہیں تو انھیں ہر قسم کی ترغیب اور لطف و مہربانی کی امیدیں اور جو حسن سلوک وہ چاہتے ہوں، وہ ان کے ساتھ مرعی رکھا جائے لیکن اگر معلوم ہو کہ وسائل زراعت اور عمدہ موسم ہونے کے باوجود وہ کھیتی کرنے سے بچتے ہیں تو تاکید و تنبیہ اور جبر و تازیانہ سے کام لیا جائے"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زراعت کا معیار، کاشتکار کی بجائے، تشخیص کنندہ مقرر کرے جس کا، اس موقع پر مدعا یہی ہوتا تھا کہ جہانتک ممکن ہو کاشت زیادہ ہو اور اسے اپنی رائے پر عمل کرانے کے لئے سزائے تازیانہ تک کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اگر اس ضابطہ کا مقابلہ اکبر کی ہدایات سے کیا جائے تو ترغیب و تاکید کی نوعیت کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔ اکبر مصالحانہ طریق پر زور دیتا ہے اور اورنگ زیب کو تازیانے پر اصرار ہے[ع۱]۔

[ع۱] اوپر کی عبارت سے، اگر وہ بلفظہ صحیح بھی ہو، یہ نتیجہ نکالنا کہ اورنگ زیب کو تازیانے پر اصرار تھا" صاف ظاہر کرتا ہے کہ تعصب نے مصنف کو اعتدال و معقولیت کی سرحد سے بہت دور پہنچا دیا ہے۔ مترجم۔

مزروعہ رقبے میں توسیع کی ان بلیغ کوششوں کے علاوہ، مالگزاری میں مطلوبہ اضافے کی ایک تدبیر یہ کی گئی کہ سرکاری لگان کا اوسط کل پیداوار کے ایک تہائی کی بجائے نصف تک بڑھا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ اضافہ ہر جگہ نہیں کیا گیا تھا اور اورنگ زیب کے فرامین ۱۶۶۵ء میں جہاں جدید اوسط کے عمل میں آجانے کا ذکر ہے، وہاں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ پہلا یا کمتر اوسط بھی بعض مقامات یا بعض قسم کے مزارعین سے قبول کیا جاسکتا ہے گو ان کے عام سیاق سے یہ نتیجہ نکالنا جائز ہوگا کہ محصّل یا تشخیص کنندہ معمولاً نصف پیداوار ہی کا مطالبہ کرتا تھا؛ کتب وقائع میں اس جدید اوسط کے شروع کرنے کا ذکر مجھے کہیں نہیں ملا لیکن مجھے شبہ ہے کہ ہو نہ ہو اس کا آغاز شاہجہاں کے اوائل عہد میں ہوا[1]۔ کیونکہ فان ٹوسٹ ۱۶۳۸ء سے قبل کی تحریر میں لکھتا ہے کہ گجرات میں حکّام نصف یا زیادہ پیداوار کا (لگان میں) مطالبہ کرتے تھے۔ وہی وقائع نگار جس کا قول اوپر ۵۵ نقل ہوا، ایک جگہ بہت زور دے کے لکھتا ہے کہ "زراعت کی ترقی اور وصول مالگزاری کی اصلاح پر التفات شاہانہ مبذول کی گئی" گمان غالب یہ ہے کہ اضافہ مالگزاری کو اسی جملے کی تہہ میں چھپایا گیا ہو؛ بہر حال، ۵۰ فیصدی کی عام اوسط متنو کی اور عہد اورنگ زیب کے دوسرے مصنفین میں بخوبی معروف ہے اور آیندہ صدی میں بھی اسی کا دوبارہ نفاذ ہوتا ہے لہذا اسے وقتی تدبیر نہیں کہہ سکتے۔ اور چونکہ اس سے مراد نصف پیداوار لی جاتی تھی، لہذا اجناس کی قیمت میں کمی بیشی کا اس پر کوئی اثر نہ تھا؛

غرض ایک عام کسان کی حالت میں جو تغیر ہوا، اسے ہم ان الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں۔

---

[1] آیندہ فصل کے بعض اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے جہانگیر نے اپنے آخر عہد میں یہ جدید اور مزید مالگزاری دو صوبوں میں جاری کی ہو۔ لیکن ان اعداد کی اور کئی طرح بھی تعبیر کی جاسکتی ہے؛

(۱) اس کے رو سے سرکاری لگان، تہائی سے بڑھکر کل پیداوار کا نصف ہوگیا؛

(۲) ہو سکتا تھا کہ اس شرح پر اُس سے اتنی زمین کی مالگزاری طلب کی جائے جتنی وہ اچھی طرح کاشت نہ کرسکتا تھا اور اِس طرح اُسے درحقیقت نصف سے بھی زیادہ پیداوار لگان میں ادا کرنی پڑے؛

(۳) گاؤں کے بااثر لوگ مجموعی لگان کو الگ الگ ہر کاشتکار پر تقسیم کر دیتے تھے۔ اس میں یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنا بار بھی عام کسان پر ڈال دیں؛

(۴) عہدہ داروں کے رود بدل سے، جس کا اوپر ذکر ہوا اور بھی زیادہ قرینہ پیدا ہوگیا تھا کہ محاصل میں اضافہ ہوتا رہے؛

عام کسانوں کی زبوں حالی کا اندازہ کرنے کے لیئے یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ گو مالگزاری کل پیداوار پر لگائی جاتی تھی، لیکن اُسے کسان کو خالص نفع میں سے ادا کرنا پڑتا تھا۔ یعنی کھیتی باڑی اور اپنے اور کُنبے کے خانگی مصارف دینے کے بعد جو کچھ بچتا تھا، اُس سے وہ سرکاری لگان ادا کرتا تھا؛ اپنی پہلی کتاب (ہندوستان، بوقت وفات اکبر" باب چہارم) میں یہ خیال میں نے ظاہر کیا ہے کہ ایک نمونے کے کاشتکار کو کل پیداوار کا تقریباً نصف حصہ ضرور درکار ہوتا ہوگا کہ وہ ایک مستعد مزارع کے فرائض بخوبی ادا کرسکے اور بُری فصلوں کا خسارہ برداشت کرنے کے لیئے، تھوڑی سی بچت بھی اسے ہو جائے۔ اس رائے کے مطابق سرکاری لگان کے نصف پیداوار تک بڑھا دینے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ کاشتکار معمولی فصل کے وقت تو صرف گزر اوقات کرسکے اور زندگی کی دلچسپی کا کوئی سامان اس کے ۲۵۶ پاس باقی نہ رہے لیکن معمولی نقصان کی صورت میں اس کی زندگی تباہ ہو جائے۔ اکبری آئین کی رو سے کل پیداوار کا قریب قریب نصف ضروری مصارف میں کام آتا تھا۔ ایک تہائی کی مالک سرکار ہوتی تھی اور باقی یک سُدس یا کچھ زیادہ حصہ اس لئے بچ جاتا تھا کہ کاشتکار اس سے آرام یا تفریح کا

سامان بہم پہنچائے اور یا خواب فصلوں کی کمی پوری کر سکے۔ مگر عہد شاہجہانی میں نصف، اس کی ضروریات کے، اور نصف یا کچھ زیادہ پیداوار سرکار اور درمیان کے حقداروں کے کام آنے لگی کاشتکار قریب قریب خالی ہاتھ رہ گیا۔ زمانۂ حاضرہ کے تجربے سے جانچیے تو اکبر، کاشتکار کے پاس جزو اقل چھوڑتا تھا جو زراعت جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اور شاہجہان اتنا بھی نہ چھوڑتا تھا۔ لہٰذا، انہی سرکاری احکام و ضوابط کی بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ پیشہ نامقبول ہوتا جاتا تھا اور جن مزارعین کو یہ زندگی دوبھر ہو گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر معاش کی دوسری صورتیں اختیار کرتے تھے۔

اس بات کی بلاواسطہ شہادتیں موجود ہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد کے ختم سے پہلے فی الواقع اس قسم کا تغیر ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب کے فرامین میں بہت سی جزوی ہدایتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ کاشتکار اتنی تعداد میں زراعت چھوڑ رہے تھے کہ سرکار کو پریشانی پیدا ہونے لگی تھی لیکن اس حقیقت کو سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ برنیئر کے خط موسومہ کولبیر میں بیان کیا گیا ہے، جو اس کے ۱۶۵۶ء کے قریب کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس خط میں مغل عمّال کی سخت گیری بیان کر کے، وہ اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ:۔

”اس طرح ایسے نفرت انگیز مظالم سے مایوس ہو کر بہت سے زراعت پیشہ وطن چھوڑ دیتے ہیں اور شہروں یا چھاؤنیوں میں ایسی وجہ معاش کی تلاش کرتے ہیں جو اتنی مصیبت ناک نہ ہو۔ یعنی تپہ داری، سقائی، یا بارگیری کی خدمت کرنے لگتے ہیں بعض اوقات وہ کسی راجہ کے علاقے میں بھاگ جاتے ہیں کہ وہاں اتنے جور و ستم نہیں ہوتے اور کچھ زیادہ آرام میسر آ جاتا ہے۔“

اور آگے چل کے لکھتا ہے کہ یہ مظالم“ کاشتکار سے اپنا بدنصیب وطن چھڑوا کر کسی ہمسایہ ریاست میں پہنچا دیتے ہیں کہ شاید وہاں کچھ نرم سلوک کیا جائے اور یا فوج میں پہنچاتے ہیں جہاں وہ کسی سوار کا

نوکر ہو جاتا ہے۔ چونکہ زمین سوائے جبر کے، خوشی سے شاذ و نادر ہی
کاشت کی جاتی ہے، اور پانی کی نالیاں اور رجبہے درست کرنے
کے لئے کوئی شخص خوشی سے تیار نہیں ہوتا، لہذا سارے ملک کی زراعت
خراب حالت میں ہے اور بڑا حصہ آبپاشی نہ ہونے کے باعث بیکار پڑا
ہے۔ مکانات بھی شکستہ حالت میں پڑے ہیں اور ایسے لوگ کم ہیں ۲۵۷
جو نئے مکانات بنواتے ہوں یا گرتے ہوئے مکانوں کی مرمت ہی کرا دیں۔
کاشتکار اپنے دل سے یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "میں اُس جابر
کے لئے مشقت کیوں کروں جو ممکن ہے کل ہی آدھمکے اور اپنے
حریص ہاتھوں سے میری کل مال و متاع چھین لے اور اس کا جی چاہے
تو میرے لئے اتنا اثاثہ تک باقی نہ چھوڑے کہ میں اپنی زار و نزار زندگی
بسر کر سکوں؟ اُدھر جاگیردار، حاکم، اور مستاجر یوں سوچتے ہیں کہ "ملک
کی خراب حالت سے ہمیں فکر و تشویش کیوں ہو؟ اور ہم اپنا روپیہ اور
وقت اسے بارور بنانے میں کیوں خرچ کریں جب کہ چشم زدن میں ہم
اس سے محروم کئے جا سکتے ہیں اور ہماری محنت نہ ہمیں فائدہ دے سکتی
ہے نہ ہماری اولاد کو۔ لاؤ، ہم تو جس قدر ہو سکے روپیہ سمیٹ لیں
خواہ کسان بھوکا مرے یا فرار ہو جائے ہمیں تو جب اسے چھوڑنے کا
حکم ملے، تو ویران چھوڑ کے جائیں"۔

طوالت کے باوجود ہم نے ان اقتباسات کو ان کی اہمیت کی بنا پر نقل کرنا جائز سمجھا کہ سرکاری ضوابط اور دوسری بالواسطہ شہادت سے جو نتائج ہم نے استخراج کئے تھے، یہ اقوال عینی واقعات کی حیثیت سے انھیں پیش کرتے ہیں۔ حکام کی ساری توجہ کا فوری نفع پر مبذول ہونا کاشتکاروں کے ساتھ سخت گیری، جبری کاشت، زراعت کی طرف سے غفلت، زمین چھوڑ کر کسانوں کا دوسرے پیشے اختیار کر لینا، ملک کا بتدریج مفلس ہوتے جانا، یہ سب امور اس قدر صریحی تھے کہ ایک پردیسی مبصر کی توجہ اپنی طرف منعطف کئے بغیر نہ رہے۔ بعض موقعوں پر خیال ظاہر

کیا گیا ہے کہ برنیئر مبالغے کا میلان رکھتا تھا لیکن جو واقعات اس نے بیان کئے ہیں، وہ نظم و نسق کے اُن تغیرات کا، جن کا ہونا مسلم ہے، لازمی نتیجہ تھے گو ان کا اتنا سنگین ہونا، جس قدر کہ برنیئر نے بیان کیا ہے، لازم نہ ہو اور شہادت کے دونوں طرزوں سے بجا طور پر یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ شاہجہاں کا عہد ختم ہونے تک سلطنت مغلیہ کا اقتصادی نظام قریب قریب کامل تباہی کے کنارے آ لگا تھا کیونکہ ملک کا سب سے بڑا پیشہ ناقابل برداشت ہو گیا اور جب کمانے والے کی زندگی ہی وبالِ جان ہو گئی تو پھر اپنی کمائی بھی اسے فضول و بے سود معلوم ہونے لگی تھی[1]۔

مذکورۂ بالا شواہد سلطنت مغلیہ کے اس علاقے سے متعلق ہیں، جو ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز میں مغلوں کی عملداری میں داخل تھا۔ اور اس بیان کے تکملے کی غرض سے ضروری ہے کہ اس جنوبی علاقے کے تغیرات کا احوال بھی بڑھا دیا جائے جس کا شاہجہاں نے بعد میں الحاق کیا تھا۔ واضح رہے کہ احمد نگر کی آزادی برقرار رکھنے کی جدوجہد کے زمانے میں، ملک عنبر نے مالگزاری کا ایک نیا نظام ملک میں رائج کیا جو بداہتہً اکبری نظام کے نمونے پر وضع کیا گیا تھا۔ لیکن احمد نگر کی بادشاہی کے ساتھ یہ نظام بھی ختم ہو گیا۔ پھر سنہ ۱۶۳۰ء کے قحط سے اس خطّے کو سخت نقصان پہنچا، اور کم و بیش بیس برس تک اس کی حالت ایسی خراب و ابتر رہی کہ کم ہوتے جانے کے باوجود سرکاری مالگزاری پوری وصول نہ ہوتی تھی سنہ ۱۶۵۳ء میں

---

[1] اس تحقیق دقیق سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار و بیجا نہ ہوگا کہ آئندہ سو، سوا سو برس میں ہندوستان کی دیہاتی آبادی قریب قریب معدوم ہو گئی اور جس وقت برطانوی حکومت قائم ہوئی تو شہروں کے ننگے بھوکے باشندوں کے سوا باقی ملک ویران و بے چراغ تھا! مگر افسوس ہے کہ فاضل مؤلف نے اِن صریحی نتائج پر غالباً اس لیے رائے آرائی نہیں فرمائی کہ یہ بحث اس کے "پیش نظر عہد" کی حدود سے خارج تھی۔ مترجم۔

جب شہزادہ اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ احمد نگر کا سابقہ علاقہ اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا کہ مقامی انتظامات کے مصارف پورے ہو جائیں۔ بادشاہ کی طرف سے پیہم احکام بھیجے گئے کہ زراعت میں توسیع کی جائے تاکہ مالگزاری میں اضافہ ہو اور صوبے کے انتظامات اورنگ زیب کے دیوان مرشد قلی خاں کے ماتحت از سر نو درست کئے گئے جس نے تشخیص کے وہی طریقے دوبارہ جاری کئے جو اکبر کے اختیار کردہ تھے۔ اس کے نتائج ہمارے زمانے کی حدود سے باہر ہیں، لیکن یہ واقعہ قابلِ لحاظ ہے کہ اس علاقے کے دو ممتاز اہل حل و عقد نے بھی اکبری آئین ہی کو قابلِ اتباع سمجھا۔ یہی تقلید اس علاقے کے انتظام میں، جو سیواجی نے حاصل کیا، نمایاں ہے اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شروع میں وہ اکبر کی تقلید میں کل پیداوار کی ایک تہائی کا مطالبہ کرتا تھا اگرچہ بعد میں یہ اوسط بڑھا کے کُل پیداوار کی ۲/۵ (یا چالیس فیصدی) کر دی گئی۔

مگر سیواجی کے ذاتی علاقے اور اُس علاقے میں فرق کرنا ضروری ہے جس کی وہ دولت تو سمیٹتا تھا مگر اس میں خود کوئی انتظام نہ کرتا تھا۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ نسبتہً اچھا برتاؤ کرتا تھا لیکن اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ ہمسایہ ریاستوں سے بہت سا روپیہ وصول کر لیتا تھا۔ مغلیہ علاقوں سے چوتھ اور سردیش مکھی کی وصولی ہمارے عہد کی حدود سے خارج ہے[۱] اور ان کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ کاشتکار کے ۲۵۹

---

[۱] دکن میں چوتھ بہت قدیم لگان تھا۔ ڈیل گیڈو میں اسکے متعلق بعض سولھویں صدی کے تذکرے موجود ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اصل میں اس سے کل پیداوار کی ایک چوتھائی مراد تھی لیکن اس تناسب میں عملاً کمی بیشی ہوتی رہتی تھی اور مرہٹوں کے زمانے میں اس سے عموماً لگان کی ایک چوتھائی مراد لی جانے لگی تھی۔ سردیش مکھی ایک زائد مطالبہ یا عشر تھا جو لگان کے دس فیصدی کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ منوکی (دوم۔ ۲۵) دعوےٰ کرتا ہے کہ سیواجی نے دکن کے مغل صوبوں کی چوتھ بہت پہلے یعنی ۱۶۵۰ء ہی میں حاصل کر لی تھی، لیکن یہ قول اس بیان کے مطابق نہیں ہے جو اس معاملے کے متعلق سرکار سیواجی (ص ۶۵) میں غور و تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

حق میں، جو پہلے ہی بوجھ سے دبا ہوا تھا، یہ مزید بار اُس آخری تنکے کے مماثل تھا جو انگریزی ضرب المثل کے مطابق اونٹ کی کمر توڑ دیا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ سیوا جی نے جو طریقہ آغاز کیا، وہ سلطنتِ ہندوستان کی جلد سے جلد اقتصادی تباہی لانے کا بہت کچھ ذمہ دار تھا لیکن جو شہادتیں ہم نے فراہم کی ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرہٹوں کے میدان میں آنے سے پہلے ہی یہ گھُن لگ چکا تھا اور میری فہم میں آیندہ تباہی کا سب سے مقدم سبب بلاشبہ مالگزاری میں اضافہ اور اس کی وصولی کے انتظامات کو قرار دینا چاہیے"

مغل بادشاہوں کے انتظامات مالگزاری کی بحث ختم کرنے سے پہلے، زمانۂ حاضرہ کی پٹہ داری کے طریق پر چند کلمے لکھنے مناسب ہونگے۔ اکبر کے آئین میں ایسی سالانہ پٹہ داری کا جس میں محض قبضۂ زمین کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے، کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ وہ سرکاری لگان قبضۂ زمین پر نہیں لیتا تھا بلکہ کاشت پہ لیتا تھا اور جو زمین بلا کاشت پڑی رہی اس پہ کوئی مالگزاری نہیں طلب کی جاتی تھی۔ جیسا کہ قدیم سے دستور چلا آتا تھا کہ جو زمین کاشت کی جائے صرف اس کی پیداوار میں سرکار حصہ دار ہو۔ یہ طریقہ اورنگ زیب کے زمانے تک عام طور پر رائج رہا۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری صورت یہ عمل میں آتی جاتی تھی کہ کاشتکار پوری اراضی کے لئے جو اسکے قبضے میں ہوں، حکّام سے ایک مالگزاری ٹھیرا کر سال بہ سال مقرّرہ رقم ادا کرتا رہتا تھا اور سرکار کو اس سے کچھ بحث نہ رہتی تھی کہ اس کو اپنی زمین سے فی الواقع کیا آمدنی ہوئی۔ اسے "خراج موظّف" موسوم کرتے تھے اور اورنگ زیب کے فرامین میں جیسی تفصیلی ہدایات درج ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اس وقت عملاً کافی وقعت پا گیا تھا۔ مجھے اس کی ابتدا کا پتہ نہیں چل سکا لیکن میں قیاس کرتا ہوں کہ کم سے کم اس کی توسیع کا سبب یہ ہوگا کہ تشخیص کے وہ طریقے جن کا اوپر ذکر ہوا بہت ظالمانہ بنتے جاتے تھے۔ اور جب ادائے رقم کا واقعی کاشت پر

انحصار نہ رہے تو پھر کسان سے جبراً کھیتی کرانے کی ضرورت نہیں رہتی
نیز چند سال کے لئے جو تعہد کیا جائے، گو آگے چل کے کسان کے حق
میں بہت مایوس کن ہی کیوں نہ ثابت ہو لیکن وقت کے وقت تو تشخیص کنندہ
اور کاشتکار دونوں کو اس میں سہولت نظر آتی تھی۔ بہرحال، اسباب جو کچھ
بھی ہوں، اورنگ زیب کے ابتدائی حکومت سے یہ طریقہ رائج ہو چلا تھا
۲۶۰ اور یہ اکبری انتظام اور اُن انتظامات کے درمیان کی کڑی ہے جو حکومت
برطانیہ کے قیام کے وقت مُلک میں مروج تھے۔ پھر جس وقت جاگیردار
یا مستاجر مستقل زمیندار بنایا گیا تو قول کی سالانہ رقوم جو اسے ملتی تھیں
خود بخود زمانہ حال کی اصطلاح میں (زمیندار کا) لگان کہلانے لگیں۔

۵۔ مغلیہ مالگزاری کے اعداد

گذشتہ فصل میں ہم نے دو قسم کی شہادتوں پر غور کیا جو نوعیت میں مختلف ہیں لیکن ایک ہی نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد میں کاشتکاروں پر سرکاری بار اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ سلطنت مغلیہ کے وسائل آمدنی پر انکا برا اثر پڑا۔ سرکاری بار کے بڑھنے کا حال مالگزاری کے اُن اعداد سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو دست بُرد زمانہ سے بچ رہے اور مضمون پر پورا تبصرہ کرنے کی غرض سے ان اعداد کو بھی جانچنا پڑے گا لیکن ان رقوم کے صحیح معنے نکالنے میں بہت سی جزوی دشواریوں سے سابقہ ہے جن کی بحث خواہی نخواہی فنی نوعیت رکھتی ہے اور صرف اُن ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہو سکتی ہے جو اس مضمون کا اور گہرا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ نظر برایں مجھے سب سے بہتر شکل یہ نظر آئی کہ ان تفصیلی رقوم اور اُن کی توضیح ضمیمہ ج میں ڈال دی جائے اور اس جگہ صرف اجمالی نتائج پیش کر دئے جائیں، جو مجھے ثابت شدہ نظر آتے ہیں۔ گو یہ تنبیہ نظر انداز نہ ہونی چاہئے کہ وہ قلمی نسخے جن سے میں نے کام لیا، ابھی تک

ناقدانہ طریق پر ان کی تدوین نہیں ہوئی ہے لہذا جو نتائج ان کی بنیاد پر قائم کئے جائیں، وہ بالکل قطعی اور آخری نہیں سمجھے جاسکتے تو

مگر ان رقوم کا جو نصف صدی سے زیادہ زمانے سے متعلق ہیں، مقابلہ کرنے سے پہلے یہ دریافت کرلینا ضروری ہے کہ آیا وہ سکہ جس میں ۲۶۱ یہ رقوم دکھائی گئی ہیں، بہ اعتبار قیمت مستقل بھی رہا یا نہیں۔ کیونکہ قیمتوں میں عام کمی یا بیشی سے کسانوں کی مالی حیثیت میں بہت کچھ فرق پڑ سکتا ہے۔ ایک سابقہ باب میں ہم نے جو وقتیہ نتیجہ مستخرج کیا، وہ یہ تھا کہ ہمارے زمانے میں، چاندی اور زرعی پیداوار کے تناسب قیمت میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا تھا۔ اسی نتیجے کو یہاں دُہرا دینا کافی ہوتا اگر سرکاری مال گذاری صرف چاندی کے سکے ہی میں لی جایا کرتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن رقوم سے ہم کو سابقہ ہے، وہ قریب قریب یقینی طور پر تانبے کے سکے کی ہوتی تھیں۔ اب چونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تانبے کے سکے سے چاندی کا نرخ ہمارے زمانے میں کم و بیش ۳۰ فیصدی بڑھ گیا تھا، لہذا بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری مطالبہ نہ بڑھایا گیا ہو، تو بھی مالگزاری کا حقیقی بار مذکورہ بالا نسبت سے زیادہ ہوگیا ہوگا۔ لیکن سرکاری فرامین و احکام کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قیاس نادرست ہے کیونکہ کسانوں کو اجازت تھی کہ جس دھات میں چاہیں مالگزاری ادا کریں۔ انکی باہمی قیمتوں میں جو فرق پڑا، سرکار نے اس کے مطابق مالگزاری میں کوئی ردو بدل نہیں کی۔ اکبر نے اہل خزانہ کو جو ہدایات کی ہیں، ان سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ کاشتکار سرکاری مالگزاری سونے، چاندی یا تانبے میں سے جس دھات میں چاہیں ادا کرسکتے تھے اور اورنگ زیب کے فرامین ۱۶۶۵ء میں شاہجہانی روپیہ وصول کرنے کی اجازت دی گئی جب کہ عہد عالمگیری کے سکے نہ ملتے ہوں جس سے ظاہر ہے کہ چاندی میں مالگزاری ادا کی جاسکتی تھی۔ سرکاری تناسب اکبر کے عہد میں ۴۰ دام فی روپیہ تھا۔ اور شاہجہانی عہد کے وقائع میں جہاں بار بار اس سکے کا

ذکر آتا ہے مجھے اس تناسب میں کسی تغیر کا پتہ نہ چلا۔ اسی طرح تھیونو کی پیش نظر عہد ختم ہونے کے کئی سال بعد، قطعیت کے ساتھ تحریر کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں تنخواہوں کے مبادلے کے موقع پر یہی قدیم شرح برقرار تھی۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر سرکاری شرح علیٰ حالہٖ رہی اور بازار میں روپے کی قیمت ۴۰ دام سے کم ہو گئی، تو کوئی کاشتکار دام کی صورت میں مالگزاری کیوں ادا کرنے لگا تھا؟ وہ لازماً بازار کے نرخ سے روپیہ خرید لے گا اور اس لئے گو دام کے عوض میں اپنی پیداوار بہ نسبت سابق زیادہ دیتا ہو، تاہم روپیہ خریدنے میں اسے کم دام خرچ کرنے پڑیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پر جو کچھ سرکاری بار ہے، اس میں کوئی کمی بیشی اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ چاندی کی قوتِ خرید میں تغیر نہ واقع ہو اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ چاندی کی قوت خرید اس زمانے میں غالباً غیر متغیر رہی۔ یہ قیاس کرنا بجا ہوگا کہ جس وقت تانبے کی قیمت بڑھ رہی تھی، اس وقت کچھ عرصے کے لئے کاشتکار نقصان میں رہا اور بازار کے نرخ کے رد و بدل کا سب سے بُرا اثر اسی پر پڑا جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے لیکن یہ نقصان مستقل یا جاری نہیں رہ سکتا اور جس وقت تانبے کی قیمت گراں ہو کر ایک نرخ پر قائم ہو گئی اس وقت کاشتکار کی مالگزاری بھی بحساب پیداوار کے، وہی ہو گئی جیسی کہ پہلے تھی۔ نظر برایں ہم مختلف سنین کی رقوم کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جس سکے میں یہ رقوم دکھائی گئی ہیں، اس کی قیمت کے تغیر کی بنا پر کوئی خاص کمی بیشی کی جائے۔ لیکن اگر ایسی کوئی شہادت سامنے آجائے جس سے معلوم ہو کہ تانبے کی گرانی کا بار بھی کاشتکار پر پڑا تو میں نے جو اسباب یہ ثابت کرنے کی غرض سے پیش کئے ہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد میں کسان کی حیثیت بہت ابتر ہو گئی تھی، ان کو مزید تائید و تقویت پہنچ جائے گی۔

تمہید میں ایک اور بات جتانی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ

ان اعداد کے کار آمد ہونے کے متعلق اس بنا پر اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کی مختلف جدولیں جو محفوظ ہیں، ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں۔ لیکن اس اعتراض میں یہ بات ملحوظ نہیں رکھی گئی کہ ان دنوں مالگزاری زمانۂ حاضرہ کی مثل کئی سال کے واسطے نہیں مقرر کی جاتی تھی بلکہ ہر سال تشخیص ہوتی رہتی تھی۔ اب اگر مالگزاری کی دو جدولیں کلیتہً باہم مطابق ہوں، تو ہمیں سمجھ لینا ہوگا کہ وہ ایک ہی سال سے متعلق ہیں۔ اور اگر کسی ضلع یا حصۂ ضلع کے مداخل میں نمایاں فرق نظر آئے تو بھی کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے بلکہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگ، قحط یا بغاوت کسی وسیع علاقے کی اقتصادی حالت میں یک بہ یک انقلاب ڈال سکتے تھے۔ میری دانست میں ان جدولوں سے ٹھیک ٹھیک طور پر کام لینے کی شکل یہ ہے کہ پہلے وہ سنہ معلوم کیا جائے جس کی یہ جدول ہے۔ اور پھر انہیں ترتیب زمانی کے ساتھ سامنے رکھکے دیکھا جائے کہ کوئی مفید معلومات بہم پہنچتی ہے یا نہیں؟ افسوس یہ ہے کہ بعض دفعہ سنہ کے تعیّن میں دشواری پیش آجاتی ہے۔ بہرحال، اپنے موجودہ مقصد کے لئے میں نے چھ جدولوں سے کام لیا ہے۔ پہلی سنہ ۱۵۹۴ کے قریب اکبر کی مشخصہ مالگزاری کے اعداد دکھاتی ہے۔ دوسری میں شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت کی رقوم تحریر ہیں۔ تیسری سنہ ۱۶۴۷ یا شاید دو ایک سال پہلے کی ہے۔ چوتھی اور پانچویں کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں لیکن ان میں شاہجہاں کے قریب قریب آخری سنین کی مالگزاری درج ہے اور چھٹی ایک ایسی تاریخ سے نقل کی گئی ہے جو سنہ ۱۶۶۸ کے احوال پر ختم ہوئی اور اس لئے اسے اورنگ زیب کے ابتدائی عہد حکومت کے کسی سنہ کا مالیہ فرض کر سکتے ہیں۔ اس جدول میں، جو میں نے اگلے صفحہ پر نقل کی ہے، جنوبی صوبوں کو چھوڑ دیا ہے کہ ان کی حدود مسلمہ طور پر بدلتی رہتی تھیں۔ اسی طرح بنگالے کے صوبے کی مالگزاری بھی شریک نہیں کی کیونکہ ابتدائی عہد میں اس کی جو مالگزاری تحریر ہے، وہ اتنی (زیادہ) ہے کہ اُس زمانے میں حکومت کی جو حالت بھی اُس سے صریحاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ سنہ کے

چھوٹے صوبے کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ اس کے اعداد مشتبہ اور ناقص ہیں۔ اب اگر سنہ ۱۵۹۴ء اور شاہجہاں کی تخت نشینی تک جو تغیرات ہوئے ان پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ۹ صوبوں کی مالگزاری میں ۲۹ فیصدی کا مجموعی اضافہ ہوا۔ لیکن یہ اضافہ ہر جگہ یکساں نہ تھا۔ بلکہ چار صوبوں میں ۲۰ فیصدی سے بھی کم کا اضافہ ہوا اور یہ اتنا نہیں ہے کہ اسے لازمی طور پر دباؤ کا نتیجہ سمجھا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ توفیر زراعت میں ایسی توسیع کے

۲۶۳

مغلیہ مالگزاری میں تدریجی اضافہ

(سنہ ۱۵۹۴ء کے قریب اکبر کی مشخصہ مالگزاری کو ۱۰۰ فرض کے اسی مناسبت سے بعد کی رقوم دکھائی گئی ہیں)

صوبہ	عہد اکبری	عہد شاہجہانی				عہد عالمگیری	
	سنہ ۱۵۹۴ء کے قریب	بوقت تخت نشینی	سنہ ۱۶۴۷ء کے قریب	مابعد	مابعد	قبل سنہ ۱۶۶۰ء	خانہ ۳ کی رقوم کو ۱۰۰ فرض کر کے
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
بہار	۱۰۰	۱۳۸	۱۷۶	۱۷۳	۱۷۵	؟	؟
الہ آباد	۱۰۰	۱۴۶	۱۹۴	۲۰۲	۲۱۴	۲۰۸	۱۴۲
اودھ	۱۰۰	۱۱۴	۱۴۷	۱۳۶	۱۵۵	۱۵۷	۱۳۸
آگرہ	۱۰۰	۱۵۱	۱۶۵	۱۵۸	۱۹۶	۱۹۳	۱۲۸
مالوہ	۱۰۰	۱۱۹	۱۶۰	۱۷۴	۱۶۶	۱۸۱	۱۵۲
گجرات	۱۰۰	۱۱۷	۱۲۲	۱۱۷	۱۰۵	۱۰۲	۸۷
اجمیر	۱۰۰	۱۴۸	۲۱۳	۲۱۳	۲۲۹	۲۲۴	۱۵۱
دہلی	۱۰۰	۱۱۰	۱۶۸	۲۰۵	۲۰۰	۱۹۶	۱۷۸
لاہور	۱۰۰	۱۳۷	۱۶۱	۱۹۰	۱۵۳	۱۹۴	۱۱۰
ملتان	۱۰۰	؟	۱۸۷	۱۴۷	۱۴۴	۱۶۴	؟
میزان	۱۰۰	۱۲۹	۱۶۶	۱۷۰	۱۷۵	۱۷۵	۱۳۶ آٹھ صوبے ۱؎

۱؎ ملتان کی رقم مندرجہ خانہ ۳۔ اور بہار کی رقم مندرجہ ۷ کے متعلق شکوک تھے لہذا

باعث ہوئی ہو جو قرین قیاس نظر آتی ہے۔ اس شرح سے زیادہ جن صوبوں میں اضافہ ہوا، ان میں سے بہار و الہ آباد کی نسبت ہمیں علم ہے کہ ان میں ۱۵۹۴ء کے قریب تک زراعت واقعی بہت کم تھی اور ان کی مالگزاری کی ۲۶۳ بیشی زیادہ تر ان کی ترقی کا نتیجہ ہے جو سابقہ کمی زراعت کے مقابلے میں انھوں نے کی۔ اجمیر میں ۴۸ فیصدی کی بیشی بھی غالباً وصول مالگزاری کی اصلاح و درستی کا نتیجہ ہے کہ اکبر کے عہد میں اس کا نظم و نسق کچھ زیادہ کارگر نہ تھا اور مالگزاری کا اوسط کل پیداوار کا ساتواں یا آٹھواں حصہ رہتا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں مغلوں کی عملداری میں جو توسیع ہوئی، اس سے ضرور مالگزاری میں اضافہ ہوا ہوگا کہ ایسی توسیع کا سب سے ضروری مقصد یہی سمجھا جاتا تھا؛ اب رہا لاہور و آگرہ کی بیشی کا معما کہ صوبہ دہلی جو ان کے وسط میں تھا، وہاں تو سب سے کم اضافہ نظر آتا ہے اور ان دو صوبوں میں اتنی بیشی ہو گئی؟ سو اس کی مختلف قیاسی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں اگرچہ ان کی کوئی قطعی بنیاد مجھے نہیں ملی اور جب تک کچھ اور واقعات روشنی میں نہ آئیں یہ پہیلی اسی طرح ان بوجھی رہے گی۔ اب اگر سب صوبوں پر مجموعی نظر ڈالیے تو اعداد کی بناء پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جہانگیر کے زمانے میں کوئی بڑی بیشی نہیں ہوئی اگرچہ بعض صوبوں کی مالگزاری عام اوسط کے مطابق کر دی گئی اور لاہور و آگرہ میں بہت معقول اضافہ ہوا جس کی ۲۶۴ کوئی وجہ ہمارے علم میں نہیں ہے؛ لیکن شاہجہانی عہد کی طرف توجہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نو صوبوں کی مالگزاری جو اس کی تخت نشینی کے وقت تک گذشتہ اوسط کے مقابلے میں ۱۲۹ فیصد ہوئی تھی، اس کے جانشین کے ابتدائی سنین ہی میں ۱۷۵ تک پہنچ گئی اور یہ بیشی جیسا کہ شاہجہانی عہد کے سنین مابعد کے حسابات سے ثابت ہوتا ہے، خود شاہجہاں کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لہٰذا ان صوبوں کے سنین مذکور کا حساب قلم انداز کر دیا گیا اور ان شکوک کا ذکر ضمیمہ کتاب میں نظر سے گزرے گا؛

زمانے میں ہوئی اور اِسی عہد کی حدود کے اندر اوسطِ مالگزاری اسقدر بڑھ چکی تھی؛ اس بیشی کا ٹھیک اندازہ کرنے کی غرض سے ہمیں شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت کی مالگزاری سے ابتدا کرنی چاہیے اور پھر اورنگزیب کے ابتدائی عہد کے جو اعداد ملتے ہیں، اُن سے مقابلہ کرنا چاہیئے جیساکہ جدول کے آخری خانے میں کیا گیا ہے۔ اس میں ملتان کی ایک سال کی اور دوسرے سال کی بہار کی مالگزاری مشکوک ہے، لہذا انھیں چھوڑ کر آٹھ صوبوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس میں پہلی عجیب چیز گجرات کے مداخل کی حقیقی کمی ہے لیکن اس کی معقول وجہ ۱۶۳۰ء کے قحط کے اثرات کو قرار دیا جاسکتا ہے جن کو کسی گذشتہ باب میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔ اور ہر چند ایک نسل کی مدت ملک کی اقتصادی حالت کو بحال کرنے کے لئے کافی ہوگئی تھی، تاہم اس وقت بھی مالگزاری میں عہد اکبری کی تشخیص سے کچھ زیادہ بیشی نہیں کی جاسکی تھی۔ بہرحال، اس صوبے کو شامل کرلیجے، تب تو عہد شاہجہاں میں کل آٹھ صوبوں کا اضافہ ۳۶ فیصدی نکلتا ہے اور اگر گجرات کو چھوڑ دیجے تو یہ مقدار ۴۴ فیصدی کے قریب ہو جاتی ہے؛ اس کے بعد دہلی کے کثیر اضافے کے مقابلے میں آگرے اور لاہور کی نسبتہً کم بیشی، ایک معمّا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور یہ بھی فوراً نظر آئے گا کہ جہانگیری عہد میں جن عجیب تغیرات کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اُن کے اثر کو ان شاہجہانی تغیّرات نے زائل کردیا ہے۔ غرض، مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شاہجہاں کے زمانے میں مالگزاری میں ۴۰ تا ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ مگر صوبہ دہلی میں جہاں سابقہ مالگزاری کم تھی، اس سے بھی زیادہ اور لاہور و آگرہ میں، جہاں اس کی مقدار پہلے غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی تھی، مذکورۂ بالا اوسط سے کمتر اضافہ ہوا؛

کل رقبے کی، جس کی مالگزاری تشخیص کی گئی، پیمائش کے اعداد ۱۵۹۴ء کے بعد کے کہیں نہیں ملتے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعداد اکبری بندوبست کے زمانے میں قلمبند ہوئے اور اس کے بعد یہ طریقہ

متروک ہوا تو پھر پیمائش کے اعداد بھی باقی نہیں رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم رقبۂ مزروعہ کے حساب سے تو سرکاری مالگزاری کا موازنہ نہیں کر سکتے لیکن اس کمی کے باوجود، میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعوٰے کرنا جائز ہے کہ جو اعداد میں نے اوپر جمع کئے ہیں، ان سے ظنِ غالب کے مرتبے میں اور بہت معقول معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے ۲۶۵ عہد میں مالگزاری کا دباؤ سوائے دو صوبوں کے، دوسری جگہ زیادہ نہیں بڑھا بحالیکہ شاہجہانی عہد میں اِن دو صوبوں اور گجرات کو چھوڑکر (جسے اس زمانے میں قحط نے ویران کر دیا تھا) باقی صوبوں کی مالگزاری میں قریب قریب نصف یا ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہو گیا، اس اضافۂ کثیر کی وجہ اجناس کی قیمتوں میں بیشی نہ تھی بلکہ لازماً اس کا ایک سبب تو زراعت کی توسیع کو اور دوسرا مالگزاری کی اوسط میں بیشی کو قرار دینا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ زراعت کی توسیع کے اُس زمانے میں یہ معنی نہ تھے کہ آبادی یا مداخل میں کوئی بیشی ہوئی، جیسا کہ آجکل ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ توسیع حکومت کے جبر سے عمل میں آئی۔ جیسا کہ برنیر نے لکھا ہے، شاہجہاں کے آخر عہد ہی میں زراعت کم ہوتی نظر آتی تھی جس کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ بیشی ہوئی تھی وہ لازماً حکومت ہی کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ رہا یہ امر کہ تشخیص کے اوسط میں پچاس فیصدی اضافہ کیا گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ قریب قریب اسی نسبت سے مالگزاری بڑھی۔ تو اس مطابقت کو قطعی سمجھنا نہ چاہیے کیونکہ جدید اوسط مقرر کرنے سے شاذ و نادر ہی ٹھیک اتنا روپیہ وصول ہوا کرتا ہے جتنا کہ کاغذ پر حساب کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ لہذا سرسری طور پر یہی کہنا درست ہوگا کہ کاشتکار پر جس دباؤ کا اشارہ سرکاری احکام اور ہمعصر مشاہدات میں ملتا ہے، اس کی مالگزاری کے ان اعداد سے بھی صریحی تصدیق ہوتی ہے جو ہمارے زمانے تک محفوظ رہے ؛

بعض اوقات یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا اعداد و رقوم سے حکومت کا دباؤ اصل حقیقت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ بہت ممکن ہے

باب ہشتم

کہ جو روپیہ واقعی وصول کیا جاتا ہو وہ تشخیص یا مطالبے سے کہیں کم ہو۔ لہذا اس شعبۂ مضمون کی بحث ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ چند کلمے اس بارے میں بھی تحریر کر دئے جائیں۔ یہ بات کہ جتنی مالگزاری عائد کی جاتی تھی، وہ سب وصول نہ ہوتی تھی، ایسی حقیقت ہے کہ غالباً ہر شخص جو اُس عہد کے حالات سے بخوبی واقف ہو، تسلیم کریگا۔ لیکن اصلی بات کہنے کی یہ ہے کہ اتنی تشخیص ضرور کی جاتی تھی۔ خود مَیں یہ خیال نہیں کرتا کہ شاہجہانی مالگزاری سالہا سال تک تمام و کمال وصول ہو سکی ہو گی۔ لیکن اس حقیقت سے اور بھی تصدیق ہوتی ہے کہ کاشتکار پر یقیناً بہت زیادہ بار ڈال دیا گیا تھا۔ اب مانا کہ کوئی سرکاری اہلکار پوری رقم وصول کرنے کی امید نہ رکھتا ہو لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ تا امکان بقایا کم چھوڑنے کی خاطر سارے علاقے میں جو کچھ ہاتھ آئے، اسے سمیٹ لے جائے۔ ادھر وصولی کے طریقوں کی شدتیں، جن میں قصوروار کے بال بچوں کو غلام بنا کے بیچ دینا تک شامل تھا، اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ رشوت بھی زیادہ مفید نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس طرح بھی اتنی قدر روپیہ دینا پڑ جاتا تھا جس قدر کہ خود سرکاری ۲۶۶ مانگ تھی؛ بہرحال، جو رقوم مَیں نے نقل کی ہیں، اُن کو واقعی وصول شدہ مالگزاری سمجھنا تو غالباً درست نہ ہوگا البتہ یہ ماننا بالکل قرین صواب ہے کہ دھکی کے لئے اتنی مالگزاری لگادی جاتی تھی جو فصل بہ فصل زراعت پیشہ آبادی پر برابر چڑھی ہوئی رہتی تھی؛

باب ہشتم کے ماخذ

فصل اوّل۔ ملکا میں بیرونی تاجروں کو جو مرتبہ حاصل تھا اس کی کیفیت البوکرک، سوم، ۹۲۔ بیروس، دوم، ۱۴۳۔ کوریا۔ دوم، ۲۵۳۔ کستن ہڈا۔ اول، سوم۔ اور باربوسا۔ دوم، ۷۶۔ سے لی گئی ہے؛ باقی ساحل کے متعلق ملاحظہ ہو۔ ایضاً، دوم۔ ۷۲–۱۲۲؛ ہگلی کے لئے، الیٹ ہفتم، ۲۱۱۔ اسمتھ اکبر، ۱۳۷۔ اور کمپوس، ۵۰؛

ولندیزی کارخانوں کے متعلق سب سے قدیم حوالے جو مجھے ملے بیگن اینڈ ووروٹ گانگھ میں ہیں۔ اچین کے کارخانے کا ذکر اسپل برگ کے بحری سفر، صفحہ ۴۴ پر ہے۔ ہفتم، پرمانز کے سفر، صفحہ ۲۳ پر مذکور ہے۔ کارخانے کے سب سے پہلے قواعد و ضوابط وارویک اور ڈی ویٹ کے سفرنامے میں چھپ چکے ہیں۔ انگریزوں کا اچین سے عہد نامہ پرچاس اول۔ سوم، ۱۵۶۔ اور فرسٹ لیٹر بک، ۶۹ میں درج ہے؛

ولندیزوں کی مشرقی ساحل پر آمد کی سب سے پہلی سرگذشت ٹریپ اسٹراز کورومنڈل میں ملتی ہے (۳۵ تا ۱۲۳) اور مغل حکام سے انکے عہد نامے کا مسودہ ٹریپ اسٹراز سورت ضمیمہ ششم میں مندرج ہے؛

مغلوں سے انگریزوں کے عہد و پیمان کا ذکر پرچاز۔ لیٹرز ریسیوڈ۔ رو۔ اور انگلش فیکٹریز کی مختلف جلدوں میں موجود ہے اور انہوں نے

جو انتقامی کارروائیاں کیں، اس کے لئے بھی ملاحظہ ہو فیکٹریز، اوّل و دوم وغیرہ (مقدمہ کتاب میں بھی ان واقعات کا خلاصہ لکھدیا گیا ہے) ولندیزوں کی انتقامی مساعی ہیگ ٹرنیس کرپٹس اور داغ رجسٹر سے ماخوذ ہیں؛

فصل دوم - یہ فصل زیادہ تر انہی نتائج کا خلاصہ ہے جو انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر میں اخذ کئے گئے ہیں اور آیندہ فصلوں کے نتائج مستخرجہ کا پیش خیمہ ہے۔ انہی کی ذیل میں مآخذ کا آگے ذکر آتا ہے۔ یہاں انہیں دھرانا بیکار ہے؛

فصل سوم - چول کی بحری جنگ کا فاریا یا سوزا - سوم، ۱۶۸ وغیرہ میں ذکر آتا ہے۔ نظم ونسق کی کیفیت نگاشتہ شورر صفحہ ۳ و ۴ پر تحریر ہے؛ میتھولڈ کا گولکنڈے کے متعلق بیان صفحہ ۹۹۶ پر مذکور ہے۔ گولکنڈے کی عملداری میں جو ظلم وستم ہوتے تھے، ان کی مثالیں فیکٹریز اور داغ رجسٹر کے مختلف مقامات سے لی گئی ہیں؛ فرنگی مستاجروں کے بارے میں ملاحظہ ہو ایضاً پنجم ششم - مچھلی پٹم کے ٹھیکے کی بحث ہیگ ٹرنیس کرپٹس میں ہے اور بیجاپور کی کیفیت، داغ رجسٹر اور سرکار کی کتاب سیواجی صفحہ ۳۴، کے ۲۶۷ بیان پر مبنی ہے؛ ہندو رئیسوں کے علاقے کا کوئی باضابطہ احوال مجھے نہیں ملا۔ جستہ جستہ واقعات جو بیان کئے گئے ہیں وہ فیکٹریز اور داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں سے ماخوذ ہیں؛

فصل چہارم - اس فصل کا بیشتر حصہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے کے دو مضامین پر مبنی ہے: (اول) "اکبرز لینڈ ریونیو سسٹم" جنوری ۱۹۱۸ء (دوم) "دی ڈی ویلپ مینٹ اوف دی لینڈ ریونیو سسٹم" جنوری ۱۹۲۲ء؛ اکبری بندوبست کا اصلی ماخذ آئین اکبری ہے۔ پیش نظر زمانے میں جو تبدیلیاں ہوئیں، انہیں از روئے قیاس اورنگ زیب کے دو فرمانوں سے معلوم کیا ہے اور ان فرمانوں کی اصل عبارت انگریزی ترجمے کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ بابت جون ۱۹۰۶ء میں چھپی تھی۔ ان کے ترجمے سرکارز اسٹڈیز میں بھی ملتے ہیں۔ صفحہ ۱۶۸ و مابعدہا۔ اکبر کی قابلیتوں کے بارے میں

ملاحظہ ہو ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ کی کتاب دی گریٹ مغل ؎ اسی کتاب میں اکبری تشخیص کا ذکر آتا ہے۔ صفحہ ۱۲۱۔ نیز ملاحظہ ہو اکبر نامہ (ترجمہ انگریزی)، دوم، ۹۵۔ اور تزک مختلف عبارات، ہاکنس کی سرگذشت کے لئے دیکھو پرچاس۔ اوّل، سوم، ۲۲۱۔ اور ارلی ٹریولز، ۱۱۴۔ ٹیری کا بیان بھی پرچاز میں ہے (دوم۔ نہم۔ ۱۴۸۰) شاہجہاں کے عہد میں جو بندوبست مروج تھا، اس کے لئے ملاحظہ ہو ہنڈی۔ دوم۔ تغیرات کا پیہم واقع ہونا۔ ایضاً۔ اور فان ٹوسٹ۔ ہژدہم ؎ اعداد کے لئے شاہجہاں نامہ، دوم، ۱۰۱۷، و مابعدہا ؎

راویس ٹائین نے گجرات میں مستاجری کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان کے لئے ملاحظہ ہو ٹرپ اسٹراز سورت۔ ضمیمہ ششم۔ رو کے مشاہدات، صفحہ ۱۲۴، ۲۳۹۔ نیز دیکھو داغ رجسٹر (سورت) انگلش فیکٹریز۔ ششم۔ ہفتم۔ اور پلسارٹ مخطوط۔ ورق ۲۰ ؎ شاہجہاں کے مصارف کا حال ایلیٹ میں ہے۔ جلد ہفتم۔ ۱۷۱ و ۱۷۲۔ نصف پیداوار کا مطالبہ فان ٹوسٹ، چہل و نہم۔ منوکی۔ دوم، ۴۵۱ اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔ مالگذاری کے معاملے میں کسانوں کی حیثیت کیا تھی، اس پر انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر میں بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ صفحہ ۲۹۵ و مابعدہا۔ مزارعین کا فرار ہونا اورنگ زیب کے اُن احکام سے ضمناً ظاہر ہوتا ہے جو سرکارز اسٹڈیز، ۱۷۲ وغیرہ میں منقول ہیں، برنیر نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ اس کے سفرنامے میں صفحہ ۲۶۵ سے شروع ہوتی ہے ؎

دکن کے نظم و نسق کے لئے ملاحظہ ہو سرکارز اورنگ زیب خصوصاً جلد اوّل، ۱۷۹۔ اور شیواجی، ۴۷۰۔ نیز سین کا مضمون، رسالہ کلکتہ یونیورسٹی (شعبہ ادبیات)، ۱۹۲۱ء، صفحہ ۲۳۷ ؎ زمیندار کے لگان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اورنگ زیب کے فرامین محولہ بالا پر مبنی ہے ؎

فصل پنجم۔ اس فصل میں جن اعداد و رقوم پر بحث کی ہے، ان کے ماخذ ضمیمہ ج میں درج ہیں۔ مالگزاری کو کسی دھات میں ادا کرنے کا اختیار آئین اکبری اور سرکارز اسٹڈیز میں مذکور ہے۔ سرکاری اوسط کا برابر قائم رہنا شاہجہاں نامے سے مترشح ہوتا ہے (دوم، ۱۲، ۱۵،۷) نیز ملاحظہ ہو مجالس السلاطین۔ ۱۱۵ تا ۱۱۸۔ اور منوچی۔ دوم، ۳۶۳۔ بہار و الہ آباد میں زراعت کی کمی پر رسالہ یوپی ہسٹوریکل سوسائٹی میں بحث کی گئی ہے؛ اجمیر کی کیفیت آئین اکبری (ترجمہ) دوم، ۲۶۷۔ سے ظاہر ہوتی ہے؛

باب نہم

نظام محاصل

۲۶۸

۱۔ مالی نظام پر ایک عام نظر

اس باب میں ہم زمین کی مالگزاری کے علاوہ، دوسرے مالی ادارات و محاکم کے اقتصادی پہلوؤں پر بحث کریں گے جو پیش نظر عہد میں ہندوستان میں قائم تھے اور اس کی سب سے بہتر ابتدا یہ ہوگی کہ سلطنت مغلیہ میں جو مالی نظام قائم تھا، پہلے اس کی کیفیت بیان کردی جائے۔ اس نظام کا حل اس بات پر مبنی ہے کہ دو قسم کے مداخل و مصارف ہیں جنھیں آج کل شاہی، اور صوبی یا مقامی کہا جاتا ہے، ٹھیک ٹھیک امتیاز کرلیا جائے۔ شاہی مداخل چند خاص خاص اور مسلمہ ابواب پر مشتمل تھے، جنھیں بادشاہ جس طرح چاہتا خرچ کرتا تھا اور ادھر صوبے کے حکام کو بہت معقول آزادی حاصل ہوتی تھی، کہ ان کے زیر اختیار جو علاقہ ہے، وہاں اپنی ضروریات کے مطابق محصول وصول کرسکیں۔ معلومات کے جو ذرائع میسر ہیں، ان سے مقامی مالیات کی نسبت مرکزی یا شاہی مالیات کا حال خواہی نخواہی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ سترھویں صدی کے وقائع نگاروں کی طرح فرنگی سیاح بھی

باب نہم

جو اس ملک میں آتے وہ بادشاہی مداخل کی وسعت و عظمت پر رہ رہ کر قلم فرسائی کرتے ہیں لیکن مقامی نظم و نسق کی جزئیات ان دونوں گروہوں کے لئے دلچسپی کا بہت کم سامان رکھتی تھیں لہذا جو کچھ اطلاعات ہمیں بہم پہنچی ہیں وہ بیشتر تجارتی مراسلات کے ضمنی اقوال سے ماخوذ ہیں۔

آمدنی کے مرکزی ابواب مالگزاری، کروڑگیری، ٹکسال، متروکات اور نذرانے تھے جنھیں خاص وسائل آمدنی کے مقابلے میں جیسے اجارے یا تاوان وغیرہ تھے، معمولی ابواب کہہ سکتے ہیں۔ ان میں مالگزاری پر گذشتہ ۲۶۹ باب میں بحث ہو چکی ہے اور آئندہ فصل میں دوسرے ابواب کو جانچا جائیگا۔ رہے غیر معمولی ابواب، تو ان کے بارے میں کوئی عام کلیہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور ان کی مثال میں نیل کے اجارہ ۱۶۳۳ء یا محاربہ ۱۶۳۶ء کے بعد ریاست گولکنڈہ پر خراج عائد کرنے کا ذکر کافی ہوگا۔ نیل کے مذکورۂ بالا اجارے سے بھی کئی لاکھ کی آمدنی وصول کرنے کا منصوبہ سوچا گیا تھا[1]۔

مرکزی یا شاہی آمدنی کی مجموعی مقدار معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس معتبر اعداد نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ زمین کی مالگزاری سب سے اہم مد تھی اور گذشتہ باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ پرانے صوبوں میں اس کی آمدنی، ہمارے پیش نظر زمانے میں ۷۵ فیصدی بڑھ گئی۔ مجموعی آمدنی میں نئے علاقے کے الحاق سے اور اضافہ ہوا اور اس تغیر کا سرسری اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آئین اکبری کے ۳۶۳ کرور دام کے مقابلے میں بادشاہ نامے میں محصول کی میزان ۸۸۰ کرور بتائی گئی ہے۔

اس مالگزاری کا بڑا حصہ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، فوج اور نظم و نسق کے

---

[1] اجارہ دار سے جو رقم ٹھیری تھی، وہ خزانہ شاہی کو دوبارہ ایک قرضہ ادا کرنیکے علاوہ ۴ اور ۶ لاکھ بتائی گئی ہے۔ (انگلش فیکٹریز۔ چہارم، ۳۲۴)۔

عام مصارف کے کام آتا تھا۔ مگر یہ دونوں مدیں الگ الگ نہیں کی جاسکتیں
کیونکہ ایک طرف تو قریب قریب ہر جاگیر یا منصب کی شرط ہی یہ ہوتی تھی کہ
مقررہ تعداد میں فوج رکھی جائے اور دوسری طرف نظم و نسق کی ہر شاخ
کا کام انہی عہدہ داروں کے تفویض تھا، جو فوجی مرتبہ رکھتے تھے[1]۔ ان
مدات کے علاوہ بادشاہی مصارف میں عموماً بڑا خرچ دربار کا ہوتا تھا اور
اس عنوان میں توپ خانہ اور خاص خاص فوجوں کے سوا خیرات و مبرات
اور متفرقات کی بہت سی مدات داخل ہوتی تھیں۔ ان معمولی خرچوں
کے ماسوا، شاہی خزانے پر جن غیر معمولی مصارف کا بار تھا، ان میں
سب سے مقدم جنگی مصارف اور دوسرے عمارات یا رفاہ عام کے
یا آرائشی کاموں کو سمجھنا چاہیئے۔ شاہجہاں کے زمانے میں جو خرچ بڑھا،
اس کا اندازہ عام شہادت اور اس مدح سے جو گذشتہ باب میں نقل کی
گئی، یہ ہوتا ہے کہ اُس کے مصارف پہلے کی نسبت چہار گنے ہو گئے
تھے۔ اس حساب میں عجب نہیں کہ مبالغہ ہو لیکن محاربات اور عمارات
کے تحریری احوال ہی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اس بادشاہ کے ۲۷۰
عہد میں سلطنت کا میزانیہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ دوسرے مصارف
دائرہ کی بیشی کا ایک سبب فہرست مشاہرات کے اضافے کو بھی سمجھنا
چاہیئے۔ خود اکبر اپنے عہدہ داروں کو جس پیمانے پر تنخواہیں دیتا تھا،
اسی کو خاصا مسرفانہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن شاہجہاں کے زمانے میں بڑے
درجے کے عہدہ داروں کی تعداد اور ان کے مشاہرے دونوں میں نمایاں
اضافہ نظر آتا ہے۔ ۱۵۹۴ء کے قریب یک ہزاری اور ان سے اونچے
درجے کے منصبدار ۵۰ سے زیادہ نہ تھے[2]۔ مگر ۱۶۴۷ء کے قریب یہ تعداد

---

[1] سلطنت مغلیہ کی یہ انتظامی خصوصیات "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر" باب دوم و سوم میں زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ یہاں انہی کا خلاصہ کر دیا ہے۔

[2] مغل عہدہ داروں کے مراتب منصب کے اعتبار سے مقرر ہوتے تھے

باب نہم

۲۱۸ ہوگئی۔ اور دونوں فہرستوں کا تفصیلی معاینہ کیجیے تو مشاہرے کے پیمانے میں بعض تخفیفوں کے باوجود، تنخواہوں کا مجموعی خرچ اس نصف صدی کے اندر بڑھتے بڑھتے سہ گُنا ہوگیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ ثابت کرنا محال ہے کہ سلطنت کی توسیع کے لحاظ سے اعلیٰ عہدہ داروں کی یہ افزونی مناسب تھی۔ پس بڑی حد تک بادشاہوں کی دریا نوالی اور مالیات پر کارگر نگرانی نہ ہونے ہی کو اس کا سبب قرار دینا پڑیگا۔

ان حالات کے پیش نظر، ہم کہہ سکتے ہیں کہ گو مرکزی آمدنی بہت معقول تھی، لیکن اس کا حصہ غالب بہت ہی گراں خرچ عمال یا اُس فوج کے مصارف دائرہ کے کام آجاتا تھا جس کی حقیقی تعداد رسمی شمار سے کہیں کم ہوتی تھی۔ اس خرچ کے بعد جو رقم باقی بچے وہ بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور اس میں سے جہاں تک ہو سکتا کشورستانی کی لڑائیوں میں روپیہ لگا دیا جاتا تھا[۱]۔ ان کاموں اور دوسری ضروریات کے لئے شاہی خزانے کی شاخیں جا بجا قائم تھیں اور صدر محکمۂ مالیہ کا ایک قائم مقام

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور ہر منصب کے ساتھ سواروں کی تعداد لکھی جاتی تھی۔ مثلاً "یک ہزاری ہزار سوار"۔ اور اس کے معنی ایسے ہی معین تھے جیسے آجکل کمشنر وغیرہ عہدوں کے ہوتے ہیں۔ مگر سواروں کی جو تعداد لکھی یا بتائی جاتی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی جتنی کہ فی الواقع منصبدار اپنے پاس ملازم رکھتے تھے۔

[۱] ہندوستان کا قدیم دستور یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ روپیہ بچا کر، زر نقد یا جواہرات کی صورت میں جمع ہوتا رہے۔ عبد الحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہاں کا بھی اس پر کامیابی سے عمل رہا۔ اس کے برخلاف برنیر کہتا ہے کہ شاہجہاں کی جمع جتھا ۶ کرور سے بھی کم تھی (صفحہ ۲۲۳) جو مدت بادشاہی کے لحاظ سے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس مصنف نے جواہرات اور دوسری گراں بہا اشیا کو محسوب نہیں کیا جنھیں باحوال ظاہر فارسی وقائع نگار نے شمار کرلیا ہے۔ لہذا ان اقوال میں کوئی بڑا تضاد نہیں پایا جاتا۔

جسے دیوان کہتے تھے، ہر صوبے میں مقرر ہوتا تھا۔ صدر خزانے کی شاخوں میں جو روپیہ وصول ہوتا، وہ صوبہ دار کے اختیار میں نہ ہوتا تھا بلکہ صوبے کے اندر خرچ کرنے کی غرض سے جو منظوریاں بادشاہ دیتا، ان کا نفاذ بھی دیوان کے دستخط سے ہوتا اور باقی ماندہ رقوم وقتاً فوقتاً پایۂ تخت کو روانہ ہوتی رہتی تھیں یا اُن قلعوں میں بھیج دی جاتی تھیں جہاں محفوظ خزائن رہتے تھے۔ فارسی وقائع کے پاشاں اقوال سے میں قیاس کرتا ہوں کہ ہر صوبے کو کچھ نہ کچھ روپیہ بچا کے بھیجنا پڑتا تھا اور شاہجہاں کی دکن کے مالیات پر خاص توجہ کرنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ سنہ ۱۶۳۰ء کے قحط کے بعد سے وہاں آمدنی میں غیر معمولی کمی ہوگئی تھی۔ بہرحال، یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بچت کی صورت میں خواہ وہ کسی قدر ہو، یہ روپیہ بالکل صدر حکومت کے اختیار میں آجاتا تھا اور بادشاہ کی خاص منظوری کے سوا، صوبے کی یا مقامی ضروریات میں کام نہ آسکتا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ مقامی ضروریات کیونکر پوری ہوتی تھیں یہ تو صحت کے ساتھ معلوم ہے کہ صوبوں کے عہدہ داروں کو تنخواہ میں جاگیریں دے دی جاتی تھیں[1]۔ رہے سپاہی جو کوتوالی یا تحصیل مالگزاری کے پیادوں کی خدمت انجام دیتے تھے، تو غالباً یہ انہی منصبداروں کی جمعیت کے سپاہی ہوتے ہوں گے جنھیں ملازم رکھنے کا ہر منصبدار پابند ہوتا تھا۔ یہ بھی قیاس ہوتا ہے، گو اس کی کوئی سند مجھے نہیں ملی کہ

---

[1] ان جاگیروں کی نوعیت عام طور پر وہی ہوتی تھی جس کی کیفیت ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ یعنی جاگیردار خود اپنی تنخواہ مالگزاری سے وصول کرلیتا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ نقد مشاہروں کا بھی قاعدہ رائج تھا اور دیوان کے حکم سے ایسی تنخواہیں شاہی خزانہ ادا کرتا تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار ہوا تو بہت بڑی جاگیر پانے کے علاوہ اسے ایک مقررہ رقم بصورت زر نقد بھی ملا کرتی تھی۔ (سرکار: اورنگ زیب۔ اوّل، ۱۶۹)۔

باب نہم
منشی متصدی کے دفتری کاموں کا خرچ عموماً جاگیروں کے اندر محسوب کر لیا
جاتا تھا۔ لیکن دو باتیں قابل غور باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بار بار بیش بہا
نذرانے اور تحائف اپنے بالادستوں کو پیش کرنا، عملاً لازمی تھا اور دوسرے،
انتظامی خدمات ذاتی نفع کمانے کا ایک جائز ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ ہمارے
پیش نظر عہد کے آخر میں مغل عمال مجموعی طور پر افلاس کا شکار تھے کیونکہ
فضول خرچی، تنخواہوں میں اضافے کے کم سے کم ہم قدم رہی تھی۔ اور
جیسا کہ برنیر نے طبقہ اعلیٰ کے افراد کی نسبت لکھا ہے ان میں سے "اکثر
پریشان حال اور قرض میں گرفتار تھے۔ اور ان کی تباہی کا سبب کھانے
۲۷۲ پینے کا اسراف نہ تھا جیسا کہ دوسرے ملکوں کے امیروں میں ہوتا ہے بلکہ
یہ لوگ خاص خاص سالانہ تہواروں پر جو گراں قیمت نذرانے بادشاہ کو
دیتے تھے اور بیویوں اور خدم وحشم کی جو تعداد کثیر رکھتے تھے، اس کے
خرچ نے انھیں سخت زیر بار کر دیا تھا۔" ایسے حالات میں یہ صریحی بات
ہے کہ جنگی یا انتظامی منصب کے فوائد پر سب سے پہلے نظر ہوتی تھی
اور ان اُمرا کو آمدنی کے مقامی ذرائع سے ترقی دینے کی نہایت قوی
تحریک ہوتی رہتی تھی۔ مجھے اس قسم کے شاہی احکام تو کہیں نہیں ملے
جن میں صوبہ داروں یا امرا کو مقامی محاصل عائد کرنے کی صراحتاً منظوری دی گئی
ہو، لیکن اس بات کی کثرت سے شہادتیں موجود ہیں کہ یہ عہدہ دار فی الواقع
ایسے محصول وصول کیا کرتے تھے، جو بادشاہی خزانے کے مداخل سے
جداگانہ ہوتے تھے اور یہ نتیجہ نکالنا بالکل درست ہوگا کہ عملاً انھیں مقامی
ضروریات یا ذاتی فائدے کے لئے روپیہ وصول کرنے کی اس حد تک
آزادی تھی جس حد تک کہ رعایا تنگ آ کر بغاوت پر نہ آمادہ ہو جائے یا اس
قسم کی بدنامی کی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ بادشاہ کو مداخلت کرنی پڑے۔
یہ رائے قائم ہو جانے کے بعد، ان متضاد اخبار و احوال کو سمجھنے میں کچھ دقت
نہیں رہتی جو اس زمانے کے تجارتی مکاتیب سے منکشف ہوتے ہیں
اصل یہ ہے کہ بادشاہی مداخل سے بالکل علیحدہ، بہت سے ابواب

ایسے تھے جو مقامی وسائل ممکنہ کو دیکھکر جاری کردئے گئے تھے اور ان میں سے اکثر اپنی نوعیت میں بہت ہی ناگوار بارگراں بن گئے تھے۔ ہر صوبیدار کے تبادلہ پر محاصل کے پیمانے میں تغیر کی جو مثالیں موجود ہیں، ان سے بھی میرے نزدیک مذکورۂ بالا نتیجہ یقینی ہوجاتا ہے۔

الغرض آئندہ فصلوں میں، اول تو ہم زمین کی مالگزاری کے علاوہ دوسرے مداخل شاہی پر نظر ڈالیں گے اور پھر ان وسائل اور تدابیر پر بحث کریں گے جو مقامی یا صوبے کی اغراض کے لئے روپیہ جمع کرنے میں اختیار کی جاتی تھیں۔ مگر ان مباحث کی جزئیات شروع کرتے وقت اُن ملکوں کے مالی نظام کا بہ اختصار تذکرہ کردینا مناسب ہوگا جو سلطنت مغلیہ کے جنوب میں واقع تھے کہ ان سب میں مستاجری طریقے نے کم سے کم سہولت کی شکل پیدا کردی تھی۔ صدر مستاجر جو زر نقد ادا کرتے، وہ شاہی آمدنی ہوتا تھا کہ بادشاہ اور اس کے وزرا جس طرح چاہیں خرچ کریں اور اُدھر صدر مستاجر کو اختیار تھا کہ اس سرکار یا ضلعے کے اندر جو اس کو مستاجری پر مل گیا ہے، مختلف وسائل آمدنی کا دوسروں کو ٹھیکہ دے دے پھر اپنے ٹھیکے کی مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد جو کچھ روپیہ بچتا وہ صدر مستاجر کا ہوتا تھا۔ اس کی مثال میں ہم پٹاپلی کے حاکم کا وہی واقعہ دہراتے ہیں جو گذشتہ باب میں بیان ہوا کہ اسے ایک سال کی حکومت یا مستاجری کے لئے ۴۸ ہزار پگوڈا نقد ادا کرنے پڑے ۱۷۳
اور یہی کل آمدنی تھی جو اس علاقے سے مرکزی یا شاہی حکومت کو حاصل ہوئی؛ اگرچہ ممکن ہے کہ نذرانوں یا رشوت کے طور پر کسی امیر وزیر نے خود بھی کچھ اور روپیہ وصول کرلیا ہو۔ مگر یہ رقم پوری کردینے کے بعد پھر ضروری انتظامات کے اخراجات دے کر جو روپیہ زائد رہے، وہ سب مستاجر یا حاکم کا ہوجاتا تھا۔ لہذا اس کا واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ جس قدر ہوسکے زیادہ روپیہ وصول کرے اور اپنے محدود و مختصر زمانۂ حکومت میں انتظامی مصارف کو جہاں تک ممکن ہو کم کرتا چلا جائے۔ جیسا کہ اس

مثال سے جسے میں نے گذشتہ باب میں نقل کیا، ظاہر ہوتا ہے۔ الغرض یہ اسباب تھے، جن سے جنوبی ہندوستان کا مالی نظام جس طرح سب سے زیادہ ظالمانہ تھا، اسی طرح غالباً اس قدر سہل و سادہ بھی تھا کہ اس سے بڑھکر سہل طریقہ کبھی ایجاد نہ ہوا ہوگا۔

۲۔ سلطنت مغلیہ کے شاہی مداخل

زمین کی مالگزاری کے علاوہ، بادشاہی موازنے میں، اگر اس قسم کی کوئی فہرست مرتب ہوتی ہو تو، آمدنی کے معمولاً چار ابواب ہوتے تھے، کروڑگیری، دار الضرب، متروکات اور نذرانے۔ بحری تجارت کا محصول بھی عام طور سے مالگزاری کے انتظامات کے ساتھ شامل ہوتا تھا اور وہ اس طرح کہ کسی علاقے کا صوبہ دار ہی وہاں کی بندرگاہ کا بھی مستاجر ہوتا تھا لیکن یہ تعلق لازمی نہ تھا اور مثال میں ہاکنس کی تحریر پیش کی جاسکتی ہے کہ جب وہ سورت پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ گو یہ علاقہ گجرات کے صوبہ دار کے تحت میں تھا لیکن بندرگاہ صوبہ دار دکن کے تفویض تھی۔ درآمد و برآمد کے محصول بادشاہ مقرر کرتا تھا اور ان کی وصولی کا ٹھیکہ ہوجاتا یا کبھی کبھی بطور منصب یہ آمدنی صوبہ دار یا اور کسی حاکم کو دے دی جاتی تھی۔ محصول کی شرحیں جو ہم پڑھتے ہیں، صریحاً کم تھیں۔ ۱۶۰۹ء میں سورت میں تجارتی مال پر ۲½ فیصدی، اجناس خوردنی پر ۳ فیصدی اور "نقود" پر دو فیصدی محصول لیا جاتا تھا اور نقود میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں مسکوک و غیر مسکوک چاندی سونا داخل تھے۔ ہمارے پیش نظر زمانے کے کسی سال میں یہ محصول بڑھا دیا گیا تھا پھر بھی آخر زمانے تک وہ پانچ فیصدی سے بھی کم رہا اور سورت کی فہرست کو ہم دوسرے مقامات کے لئے بھی نمونہ مان سکتے ہیں ان حالات میں مستاجر کا فائدہ اسی میں تھا کہ جہاں تک ہوسکے بیرونی تجارت کو ترقی دے کیونکہ اس کے ٹھیکے کی واجب الادا رقم تو پہلے معین

ہوجاتی تھی اور اس کے علاوہ جو کچھ محصول وصول ہو وہ ظاہر ہے کہ اس کا اپنا نفع ہوتا تھا بحالیکہ تجارت میں کوئی خاص کمی آجائے تو مستاجر کو سخت نقصان رہتا تھا۔ واقعۃً بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً شاہی عمال پردیسی سوداگروں کا خیر مقدم کرنے پر مائل تھے۔ لیکن انتظام سرکاری میں تسلسل نہ تھا ۲۷۴ اور کوئی ایک مستاجر کسی تعمیری منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً بعض بندرگاہیں بحری قزاقوں سے حفاظت کی محتاج تھیں مگر اس کام میں فوری خرچ کی ضرورت تھی اور اس کا فائدہ روپیہ لگانے والے کی نسبت اس کے جانشین کو زیادہ حاصل ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے عہد کی تحریروں میں کہیں ایسی تدبیروں کا پتہ نہیں چلتا جن سے آگے چل کے تجارت کو مستقل فائدہ پہنچتا۔ برخلاف اس کے ٹھیکے کی رقم کی وصولی کی کوشش اور فوری فائدے کی طبعی خواہش کے باعث اکثر ایسی کارروائیاں کی جاتیں، جن کے جواز میں گفتگو ہے اور جن میں سے بعض یقیناً آگے چل کے مضر پڑتی تھیں؛

ان چلتی تدبیروں میں سے شاید سب سے کم نقصان رساں ایک داؤ یہ تھا کہ کسی دوسری بندرگاہ کے تاجروں کو توڑ کر اپنی بندرگاہ پر آنے کا لالچ دلایا جائے۔ اس کارروائی کی ایک مثال سر تامس رو نے تحریر کی ہے کہ جب اسے سورت میں مشکلات پیش آئیں تو کھمبائت کے حکام نے سلسلہ جنبانی کی کہ ہو سکے تو انگریزی تجارت کو ادھر منتقل کرلیں اور تامس رو نے حریفوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرا کے خود خوب فائدہ اٹھایا۔ کچھ عرصہ بعد ہم گجرات کی مختلف بندرگاہوں میں اسی قسم کی رقابت کا ذکر پڑھتے ہیں۔ اور گو اس معاملے میں زیادہ تر وعدہ وعید ہی سے کام لیا جاتا تھا، تاہم گمان غالب یہ ہے کہ تجارت ہاتھ سے نکل جانیکا خوف حکام کی زیادہ گستاخی میں کسی حد تک رکاوٹ ڈال دیتا ہوگا اور سنہ ۱۶۴۲ کا یہ واقعہ کہ احمد آباد کے تاجروں نے اپنا سرمایہ سورت سے جہاں ظلم و تعدی ہو رہی تھی، لہاری بندر کو منتقل کر دیا، بتاتا ہے کہ یہ لوگ ایسی تدبیریں چل رہے

باب نہم تھے جس سے اُن دنوں عام طور پر کام لیا جاتا تھا۔ باقی دوسری تدبیریں جو صریحاً
تجارت کے حق میں مضر تھیں، وہ تاخیر، محصولی مال کی قیمت زیادہ تجویز کرنا
اور جبری فروخت کی صورتوں میں شمار ہوسکتی ہیں۔ مال چھوڑنے میں تاخیر کا ذکر
اس قدر بار بار آتا ہے کہ ضرور سارے ہندوستان میں اس کا تجربہ عام
ہوگا اور ضرور یہ کارروائی جان کر کی جاتی تھی کہ تاجر سے دبا کے رشوت وصول
کی جائے یا اسے مجبور کیا جائے کہ عمال کی رائے کے مطابق کام کرے۔
انگریز سوداگروں نے اس قسم کی تاخیریں عمال کی ”معتاد شرارت“ سے منسوب
کی ہیں اور اسی کے ساتھ لکھا ہے کہ ”یہ لوگ بغیر رشوت کے کوئی کام نہیں
۲۷۵ کرتے اور رشوت ایسی عادت جاریہ بن گئی ہے کہ مثل سرکاری محصول کے
وصول کی جاتی ہے“۔ اور ہمارا یہ نتیجہ نکالنا بالکل جائز ہوگا کہ مقررہ محصول میں
ان زوائد سے معقول اضافہ ہوجاتا تھا۔

زیادہ قیمت لگانے کا عمل اور بھی دشواری پیدا کرتا تھا۔ فہرست محصول جس طرح جی چاہے مرتب کردی جاتی تھی لیکن یہ شرحیں تو اعلیٰ حکام معین کرتے تھے اور خود مال کی قیمت عہدہ داران مقامی کی رائے پر چھوڑ دی جاتی تھی اور وہ اگر چاہتے تو محصول خانے میں جو چالان آتے ان کی قیمتیں دگنی تجویز کرکے دُگنے محصول کا مطالبہ کرسکتے تھے۔ ہر جگہ ایسا عمل نہ تھا اور لہاری بندر پر قیمتیں بھی معین تھیں لیکن سورت میں یہ چیز عام تھی چنانچہ یہاں سے ایک انگریز سوداگر تحریر کرتا ہے کہ ”یہاں حاکم کی مرضی، قانون ہے۔ وہی اشیا کی جو چاہتا ہے قیمتیں مقرر کردیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ تو ۳½ فیصدی کا محصول سمجھکر مال لاتے ہیں اور یہاں دُگنا ادا کرنا پڑتا ہے کیونکہ مال کی قیمت اکثر اصل لاگت سے دُگنی تجویز کردی جاتی ہے۔ جیسا کہ خود میرے نیل کے معاملے میں ہوا کہ میری آگرے کے لہ روپیہ من کی خرید یہاں معز الملک نے ماعہ قرار دی اور کہا کہ اس کی ایران میں اسیقدر قیمت ہوگی؛ مگر لہاری بندر پر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں قیمتیں پہلے سے معلوم اور ایک شرح نامے میں درج کردی گئی ہیں جسے کوئی لانچی یا

باب نہم نا انصاف حاکم اپنے حسب مرضی کم و بیش یا کاٹ پھانس نہیں کر سکتا، سورت
میں زیادہ قیمت لگانے کی مثالیں بہت پہلے یعنی ۱۶۱۵ء سے ہمارے
مشاہدے میں آتی ہیں اور اس کے بعد سے برابر ہم یہ شکایت پڑھتے
ہیں۔ اور یہ بات کہ اصل سے کم از کم دگنی قیمت محسوب کر لی جاتی تھی، ایک
ولندیز سوداگر کے بعض اعداد سے ظاہر ہوتی ہے جس نے ۱۶۴۱ء میں تحریر
کیا ہے کہ شورہ عہ کی بجائے للعہ فی من اور سوتی مال جس کی اصل قیمت
لعہر تھی، ہیہ کے حساب سے لگایا گیا۔ اس کا صریحی نتیجہ یہ تھا کہ حقیقت میں
جو محصول ادا کرنا ہوتا، وہ سرکاری شرح سے کہیں زیادہ پڑتا تھا۔ اور ادھر
شرح حساب کے متعلق یقین نہ ہونے سے ضرور ہے کہ تجارت میں رکاوٹ
پیدا ہوتی ہوگی۔

مستاجر کا مال کی قیمت بڑھانے گھٹانے کا اور اسی طرح مال کو جلد یا
دیر میں چھوڑنے کا اختیار اسے موقع دیتا تھا کہ جبراً رشوت وصول کر سکے یا
مالک کو مجبور کرے کہ جو مال محصول خانے میں آیا ہے اسے مستاجر کی رائے
کے موافق بیچا جائے۔ ۱۶۱۵ء میں ہم انگریز تاجروں کی یہ شکایت پڑھتے ہیں کہ
ان کا مال حاکم اور محصل اٹھا کے لے گئے اور یا تو کوئی قیمت ہی ادا نہ کی اور یا
بہت کم دام حوالے کئے۔ ۱۶۳۵ء میں ان کے جانشینوں نے اطلاع دی کہ ۲۷۶
محصول والے جو ناکافی قیمت لگاتے ہیں، اگر اس پر مال ان کے ہاتھ
نہ بیچا جائے تو دو دو سال بلکہ زیادہ عرصے تک اسے نہیں چھوڑا جاتا۔ اسی طرح
اور کئی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثالیں محض اتفاقی اور شاذ نہ تھیں۔ بعض
موقع پر ان مطالبوں کو رشوت دے کر چکا سکتے تھے جیسا کہ ۱۶۲۰ء میں ہوا
کہ درآمدہ مونگے کو کم داموں بیچنے کا تقاضا کیا گیا تو اس کو انگریز سوداگروں
نے اس طرح ٹالا کہ ”ایک ہزار ریال تو حاکم کو رشوت میں دئیے، تین سو ریال
دلال کو اور دو ہزار من سیسہ، عام قیمت سے جو ہم لیتے ہیں، ایک محمودی
فی من کم پر، شہزادے کے[1] مال خانے میں داخل کر دیا“۔ بہر حال کسی نہ کسی

---

[1] بندرگاہ کے محاصل ان دنوں شہزادہ شاہجہاں کی جاگیر میں داخل تھے۔ بقیہ بر صفحہ آئندہ

شکل میں روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا اور اگر ہم رشوت، جبری فروخت اور مال کے دام بڑھا کے محصول لگانے کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ مقررہ سرکاری محصول کی ان مطالبات کے آگے کچھ حقیقت نہ تھی جو معمولاً ادا کرنے پڑتے تھے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہمارے پیش نظر عہد میں تو ان مطالبات کے بارے میں کوئی خاص فرق پڑا نہیں۔ اس سے بدتر حالت تو ہو کیا سکتی تھی جیسی ۱۶۱۵ء کی مثال سے ظاہر ہے، لیکن اس قسم کی بھی کوئی شہادت مجھے نہیں ملی جس سے گمان ہو کہ مستقل طور پر کوئی اصلاح ہو گئی تھی[1]۔

ذریعہ آمدنی ہونے کے اعتبار سے دیکھیے تو ٹکسالوں کو کروڑگیری کے مقابلے میں عشر عشیر وقعت بھی حاصل نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ آمدنی اُن سے ہو جاتی تھی ورنہ وہ ٹھیکے پر نہ دئے جاتے۔ مگر ظاہر ہے کہ جبتک سکّے کا عیار قائم رہے کوئی جائز نفع کثیر نہ ہو سکتا تھا۔ اس سرشتے پر بادشاہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ (شہزادہ شاہجہاں لکھنا مصنف کا سہو ہے۔ یہ لقب بادشاہی کے بعد اختیار کیا گیا تھا اس سے پہلے وہ "شہزادہ خرم" کہلاتا رہا۔ مترجم)

[1] ان طریقوں کا، جن کی میں نے اوپر تصریح کی ہے، عام ہونا اسی سے ثابت ہے کہ مسافروں کا اسباب تک محصول سے مستثنیٰ نہ تھا۔ رسالۂ منڈل سلو کے جو نسخے ملتے ہیں، ان پر بھروسہ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ اکی تدوین کرنے والوں نے بہت کچھ اپنی طرف سے الحاق کر دیا ہے تاہم ذیل کی عبارت میں بظاہر منڈل سلو ہی نے اپنا ذاتی تجربہ جو سورت میں ہوا، تحریر کیا ہے:۔

"سلطان یا حاکم، اور وہ بھی نہیں بلکہ خود محصّلین سوداگروں اور مسافروں کو مجبور کرتے ہیں کہ جو مال اسباب ان (عمّال) کو پسند آئے، اسے ان کی منہ مانگی قیمت پر حوالے کر دیں خواہ یہ اسباب ان مسافروں کے ذاتی استعمال ہی کا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ سلطان کو میرے اسباب میں زرد عنبر اور ایک ہیرے کی چوڑی ملی تو وہ دونوں کو مجھ سے خریدے بغیر نہ رہا"۔ (صفحہ ۱۲)

حکام بہت باریک بینی سے نگرانی رکھتے تھے اور اسے اصولِ مالیات کی بجائے اصول ملک داری کی بنا پر اہم سمجھنا چاہیے۔ سکہ، بادشاہی کا امتیاز اور سب سے صریحی شہادت تھا اسی لئے ظاہر ہے کہ کسی مقامی عہدہ دار یا کسی شخص ۲۷۷ کو بھی یہ جرات نہ ہو سکتی تھی کہ بادشاہ کے احکام خاص یا اجازت نامے کے بغیر سکے میں کوئی ردّ و بدل کر سکے۔ تجارتی مکاتیب کا جہاں تک تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کی ٹکسالوں کی حالت محصول خانوں سے بہتر تھی کیونکہ سورت میں تاخیر کی شکایتوں کے علاوہ، جہاں کبھی کبھی کام بڑھ جاتا تھا جیسا کہ کسی گذشتہ باب میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے، باقی کوئی شکایت نہیں پائی جاتی اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد میں تجارتی فرقہ کھرے سکے کے چلن کے فوائد سے بہرہ مند تھا۔ اندرون ملک میں جو ٹکسالیں تھیں، ان کے حالات کسی ہمعصر تحریر میں میری نظر سے نہیں گزرے لیکن اس عہد کے ختم کے قریب ولندیز راج محل (بنگالہ) کے دار الضرب کی تاخیر و بدعنوانی کے سخت شاکی پائے جاتے ہیں لہذا یہ نتیجہ نکالنا احتیاط کے خلاف ہوگا کہ اور سب مقامات میں بھی ایسا ہی اچھا معیار تھا جیسا کہ گجرات میں ؂

مداخل شاہی کی آخری مد متروکات تھی مگر کوئی سرکاری بیان مجھے ایسا نہیں ملا جس سے ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا کہ سلاطین مغلیہ اپنی رعایا کے متروکات میں کس حد تک دعویدار تھے۔ فرنگی سیاحوں کے بیانات میں اختلافات پائے جاتے ہیں یعنی بعض تو یقین دلاتے ہیں کہ یہ دعوے عام و ہمہ گیر تھا۔ بعض نے اسے شاہی امرا تک محدود بتایا ہے اور بعض امرا کے ساتھ زیادہ دولتمند سوداگروں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے وسائل معلومات سے یہ امید رکھنی فضول ہے کہ ان میں قانونی صحت و باریکی کا لحاظ رکھا جائے گا اور اگر ہم تاریخی واقعات کو جو دوسرے ماخذوں میں مرقوم ہیں، سامنے رکھکے ان اقوال کو جانچیں تو قرائن غالب سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ یہ قاعدہ بالکل قطعی نہ تھا۔ امرا کی جاگیروں پر تو یقیناً بادشاہ دعوے

رکھتے تھے اور کبھی کبھی تاجروں کی جاگیریں بھی اس کی حدود میں شامل کرلی جاتی تھیں۔ لیکن غالباً اصلی فیصلہ اس امر پہ منحصر ہوتا تھا کہ زیر بحث جاگیر کی مالیت کیا ہے اور اس کو ضبطی سے بچانے کے لئے کس قدر روپیہ بطریق نذرانہ (یا رشوت) مل سکتا ہے۔ یہ خیال اس خط کے مطابق ہے جو اورنگ زیب نے شاہجہاں کو لکھا تھا اور جس کا ایک حصہ برنیر نے محفوظ کردیا ہے۔ اسمیں اورنگ زیب (بقول برنیر) تحریر کرتا ہے کہ ”معمولاً جب کبھی کوئی امیر یا مالدار تاجر مرتا ہے، بلکہ بعض اوقات دم نکلنے سے پہلے ہی، اس کے مال متاع پر مہریں لگادی جاتی ہیں اور اس کے نوکروں اور خانگی اہلکاروں کو قید میں ڈالا ۲۷۸ اور پیٹا جاتا ہے تاآنکہ وہ پوری املاک کا پتہ بنادیں اور چھوٹے سے چھوٹا زیور بھی فہرست سے نہ چھوٹنے پائے۔ یہ طریقہ بے شبہ فائدے کا ہے لیکن کیا ہم اس کے خلاف انصاف یا ظالمانہ ہونے سے انکار کرسکتے ہیں؟

اس عبارت میں لفظ ”مالدار تاجر“ میرے نزدیک بہت پُر معنی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گو عام طور پر سب سوداگر اس قاعدے کے تحت میں نہ تھے، تاہم کامیاب و خوشحال اشخاص کے دلوں میں یہ خطرہ برابر موجود رہتا ہوگا، باقی جس سختی کا ذکر اورنگ زیب نے کیا ہے وہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ پلسارٹ نے جہانگیر کے زمانے کا جہاں طرز عمل تحریر کیا ہے، وہاں ذیل کی عبارت میں بھی یہ شئے نمایاں ہے:۔

”کسی امیر کے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، مرتے ہی، اور بعض اوقات روح نکلنے سے قبل ہی، بادشاہی عمّال موقع پر پہنچ جاتے اور تمام املاک کی (بشرطیکہ وہ مقفّل نہ کردی گئی ہو) فہرست بنا لیتے ہیں۔ جس میں مستورات کے لباس و زیورات اور ایک پیسہ قیمت تک کی ہر چیز درج ہوتی ہے۔ بادشاہ تمام مال و متاع پر خود قبضہ کرلیتا ہے اور اگر متوفی نے زندگی میں اچھی خدمت انجام دی ہے تو عورتوں بچوں کو صرف اس قدر دے دیا جاتا ہے جو گذارے کے لئے کافی ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ اگر کوئی خیال کرے کہ بیوی بچّے یا

باب نہم

دوست اُس امیر کی زندگی میں اتنا مال متاع چھپا سکتے ہیں کہ بعد میں کافی ہو، تو حقیقت میں یہ بہت دشوار ہے کیونکہ امرا کے ہر فعل و املاک کی پوری طرح خبر رہتی ہے۔ ہر ڈیوڑھی میں ایک دیوان مقرر ہوتا ہے اور ہر کام اسی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ اس کے بہت سے ماتحت ہوتے ہیں اور ایک ایک کام پوری طرح ان کے تفویض رہتا ہے اور وہ اُس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سب اہلکار (امیر کے مرتے ہی) حراست میں لے لئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ جملہ کاغذات اور بہی کھاتے جن میں زر نقد اور جملہ املاک کا حال درج ہے، پیش کردیں اور بتائیں کہ ان کے مالک کا روپیہ کس کس طرح خرچ ہوتا تھا۔ پھر اگر ان کے بتائے ہوئے حالات میں کوئی شک شبہ باقی رہے تو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی ہیں تاآنکہ وہ سچ سچ بات کہہ دیں۔"

بادشاہی خزانے میں اس مد سے جو آمدنی ہوتی تھی، اس کی صحیح مقدار نہیں بتائی جاسکتی لیکن وہ یقیناً بہت معقول ہوتی ہوگی۔ ایک ولندیزی اطلاع میں یقین دلایا گیا ہے کہ ۱۶۴۱ء میں شاہجہاں کے مشہور امیر آصف خاں کا انتقال ہوا، تو بادشاہ نے ۱۹ کروڑ روپے وصول کئے۔ اس رقم میں غالباً بازاری گپ کا عنصر شامل ہے کیونکہ بادشاہ نامے میں اس جاگیر کی جو اشیا درج ہیں وہ ڈھائی کروڑ سے زیادہ مالیت کی نہیں۔ مگر بہرحال یہ نہایت اہم اور گویا غیبی مدد تھی اور جیسا کہ پادری سباس ٹین مین ریک نے لکھا ہے، "ہندوستان کے تمام بری راستوں کی بندش تھی کہ کوئی مال متاع ملک سے باہر نہ جانے پائے"۔ ۴۷۹ اس میں شک نہیں کہ اس پیمانے کی بڑی جاگیریں بہت کم ہوتی تھیں لیکن کمتر درجے کی جمع پونجیوں سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا، وہ بھی بقول اورنگ زیب نفع سے خالی نہ تھا۔ یہاں یہ بات بھی جتانے کے لائق ہے کہ گو اورنگ زیب اس کی مذمت کرتا ہے مگر اس نے یہ طریقہ ترک نہیں کیا۔ کیونکہ منوکی لکھتا ہے کہ اس بادشاہ کے عہد میں اگرچہ رسمی طور پر اس دعوے سے ہاتھ اٹھالیا گیا تھا لیکن سرکاری عہدہ دار جو املاک چھوڑ جاتے تھے، وہ اس حیلے سے کہ انکے

ذمے سرکار کا روپیہ واجب الادا ہے، باضابطہ ضبط کر لی جاتی تھیں؎

اس طریقے کی عملی کیفیت کسی حد تک تجارتی مکاتیب کے ضمنی اقوال سے بھی روشنی میں آتی ہے۔ مثلاً ۱۶۴۶ء میں ہم پڑھتے ہیں کہ دربار شاہی میں اُون نہ بک سکا جس کا ایک سبب یہ تھا کہ ”بعض امرا کے مرجانے سے اس قسم کا کپڑا افراط سے بادشاہ کو مل گیا تھا“؎ ایک زمانے میں یہ کوشش بھی کی گئی تھی کہ بیرونی سوداگر جو ہندوستان میں مریں، ان پر شاہی وراثت کا قانون نافذ کیا جائے۔ اور احمد آباد میں انگریزی دکان کا صدر فوت ہوا تو بلالحاظ اس کے کہ کمپنی کا مال کونسا ہے، دکان کی ہر شئے پر بادشاہی مہریں کر دی گئیں۔ لیکن جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے، ۱۶۲۴ء میں جب کہ دوسرے قضیے طے ہوئے تو یہ دعوے بھی حتماً ترک کر دیا گیا؎ ۱۶۴۷ء کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی سوداگروں کے مال ضبط کرنے کے دستور میں مزید وسعت کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ایک ممتاز سندھی تاجر کی املاک ضبط کر لی گئیں اور اسی سلسلے میں اس کے بھائی کے ساتھ بُرا سلوک ہوا جس پر وہاں کے لوگوں نے بہت بُرا مانا:-

”........ کہتے ہیں بادشاہ نے اس پر ایک لاکھ روپیہ جرمانہ کر دیا جو ٹھٹّہ میں ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ شہزادے اور دوسرے امرا کی رسوم میں کم سے کم پچاس ہزار اور درکار ہوں گے۔ اس زیادتی پر ہر شخص بگڑ رہا ہے کہ یہ سب سے بدتر بات ہے جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ذی وجاہت یا دولتمند سوداگر فوت ہو، تو اس کی ساری دولت ضبط کر لی جائے؛ گو اس کے بھائی اور بچے موجود ہوں۔ حالانکہ ایسی املاک پر بادشاہ کو خواہی نخواہی کوئی حق نہیں جتانا چاہیے“؎

اسی خط میں مذکور ہے کہ ایک مقامی حاکم کی وفات پر اس کا سارا مال اسباب بادشاہی عمّال نے ضبط کر لیا ”جیسا کہ امرا کی وفات پر دستور ہے“ اور ان سب عبارتوں سے جو میں نے نقل کیں ظاہر ہوتا ہے کہ

سرکاری عہدہ دار کے متروکات پر تو معمولاً قبضہ کرلیا جاتا تھا لیکن تاجروں کے ۲۸۰ معاملے میں یہ بات سندھ والوں کو نئی معلوم ہوئی اور بظاہر یہ ایک لاکھ جرمانہ وہ تھا جسے آجکل محصولِ تکملہ (Composition) کے نام سے یاد کیا جائیگا۔

سندھ کی اس مثال کے سوا[1]، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری مطالبات نئے علاقوں میں بڑھائے جارہے تھے، اور کوئی شہادت ہمارے عہد میں کسی خاص تغیّر کی مجھے نہیں ملی۔ اس طریق کے بُرے نتائج و عواقب پر زور دینا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ جہاں تک سرکاری عہدہ داروں کا تعلّق ہے، انصافاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ذمہ داری ملازمت کی شرطوں میں داخل ہوتی تھی۔ اور چونکہ نظم و نسق کی حالت ایسی تھی کہ عہدہ دار خواہی نخواہی لوٹ مار کیا کرتے تھے، لہذا اُن کی جمع جتھا کا واپس خزانہ شاہی میں لے لیا جانا بلاوجہ نہ تھا۔ لیکن دولتمند تاجروں کے معاملے میں ایسے قانون کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوسکتا تھا کہ تجارت کو نقصان پہنچے اور نفع آور کاروبار میں لوگ ہاتھ نہ ڈال سکیں۔ یہ خطرہ کہ مالک کے مرتے ہی تمام مادّی سرمایہ سرکار کی ملکیت ہوجائے گا، غالباً سارے تاجروں کو کچھ عرصے تک تذبذب میں ڈالنے کے لئے کافی ہوا ہوگا۔ جو مثالیں پیش کی گئیں، ان سے ظاہر ہے کہ یہ خطرہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی تھا اور سلطنت مغلیہ کی معاشی حالت کا اندازہ کرتے وقت اسے ضرور پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ جب تک یہ سرکاری حق موجود تھا، اس وقت تک نہ ایسے دولتمند خاندان پھل پھول سکتے تھے جو سرکاری تعلّق سے آزاد ہوں اور نہ کسی صورت میں ایسے کاروبار ترقی کرسکتے

---

[1] ۱۶۳۵ء تک سندھ میں غالباً کوئی دولتمند تاجر نہ تھا سوائے پرتگیزوں کے، جو اس صوبے کی تجارت کے گویا اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ اسلئے یہاں یہ ایک نئی بات معلوم ہوئی اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ گجرات و آگرہ وغیرہ میں اس قسم کی ضبطی ہوتی تو وہاں بھی لوگ اعتراض کرتے۔

تھے جن کی پیداوار سرمایہ داری پر منحصر ہو[1]۔

۲۸۱ بادشاہی مداخل کی آخری مد وہ نذوریں تھیں جو ہر ممکن موقع پر بادشاہ کو پیش کی جاتی تھیں۔ یہ رسم بظاہر تمام ایشیا میں عام تھی اور ہم کبھی کبھی ایسے ممالک کا ذکر بھی سنتے ہیں جہاں نذر کے ہم قیمت تحائف بدل میں ملجاتے تھے۔ لیکن ایسے ہم قیمت عوض کا قاعدہ سلطنت مغلیہ یا سلاطین دکن کے درباروں میں رائج نہ تھا، جہاں بدلے کی چیزیں بعض اوقات مقابلۃً بالکل کم قیمت ہوتی تھیں۔ شاہجہاں کے حالات میں مین ریک لکھتا ہے کہ اس کے سالانہ وزن کے جشن میں جو نذریں پیش کی گئیں وہ مالیت میں شاہی مصارف اور تحائف کی مالیت سے کہیں زیادہ تھیں اور رسائل بتاویہ میں آمد و خرچ کے جو حسابات لکھے ہیں، ان سے بادشاہ کی آمدنی کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً نذر میں تو کوئی ہاتھی، مسی جھاڑ، زربفت وغیرہ اشیا پیش کی گئیں جو ہزارہا روپے قیمت کی تھیں اور اس کے بدل میں خلعت اور ایک گھوڑا مل گیا اور ان سب کی قیمت تخمیناً ۵۲۰ روپیہ ہی تھی۔ ایک اور موقع پر ہم پڑھتے ہیں کہ انگریز تاجروں نے تقریباً تیرہ ہزار روپیہ مالیت کی نذر پیش کی اور بادشاہ کی طرف سے جو کچھ انھیں ملا وہ صرف ۳½ ہزار کا مال تھا۔ غرض نذر کی آمدنی زیادہ ہوتی تھی جیسا کہ تزک جہانگیری

---

[1] مسٹر بینی پرشاد کی کتاب "ہسٹری اوف جہانگیر" مجھے اس وقت ملی جب کہ یہ اوراق طبع کے لئے جا چکے تھے۔ اس کتاب میں (صفحہ۔ ۷۸۵) وہ میری نسبت تحریر کرتے ہیں کہ میں نے اپنی پہلی کتاب (انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر) میں "غلطی سے یہ گمان کر لیا ہے کہ سوداگروں کی لاوارث املاک بھی حکومت کا مال ہو جاتی تھیں"۔ مجھے اس کتاب میں کوئی ایسا دعوٰے نہیں ملا۔ البتہ صفحہ ۱۵ پر میں نے لکھا ہے کہ زیادہ دولتمند تاجروں کے متروکات کے ضرور بادشاہ دعویدار ہوتے تھے۔ اور میرے خیال میں جو شواہد موجود ہیں اور ان میں سے بعض اوپر متن میں درج کئے گئے ہیں، ان سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ بہر حال اگر یہ غلط بھی ہے تو اسکا اصلی ذمہ دار اورنگ زیب ہے۔

کے مطالعے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے جس میں مختلف تحائف کی قیمتیں درج
ہیں۔ اور بیرونی تاجروں کی نظر میں یہ رسم ایک مستقل مصیبت بن گئی تھی۔ بایں ہمہ
محض خلعت و انعام کے نذر سے کم مالیت ہونے کی بنا پر یہ خیال کرنا کہ
بادشاہ فائدے ہی میں رہتا تھا، درست نہ ہوگا۔ کیونکہ بڑی بڑی
نذریں پیش کرنے والے عہدہ دار عموماً بہت جلد ترقی سے سرفراز ہوتے
تھے اور چونکہ خدمات کی کوئی باقاعدہ تعداد مقرر نہ تھی اور نہ خاص خاص
مناصب محدود تھے، لہٰذا بادشاہ جسے اور جتنے اشخاص کو چاہے ترقی
دے سکتا تھا اور اس طرح نذر کی صورت میں جو کچھ اسے ملتا تھا، اس سے
زیادہ دوسرے پیرایوں میں وہ ادا بھی کر دیتا تھا۔ بیرونی تاجروں کو بھی عام طور
پر گراں قیمت نذور کے عوض میں کوئی نہ کوئی رعایت حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ
ولندیزوں کی اس مثال میں جو ابھی بیان ہوئی، انھیں بہت سی مراعات عطا
کر دی گئی تھیں جو تجارتی اعتبار سے معقول قدر و قیمت رکھتی تھیں۔ غرض سرسری
طور پر دیکھئے تو یہ طریقہ زمانۂ حال کی اس مالی تدبیر سے مشابہ تھا کہ حکومت
ایک سالانہ رقم دینے کے عوض میں یکمشت رقم نقد وصول کر لیتی ہے مگر
بڑا فرق یہ تھا کہ یہ معاوضہ کچھ لازمی اور مقررہ نہ ہوتا تھا بلکہ جو کچھ رعایتیں حاصل
ہوں، انھیں بادشاہ جب چاہے منسوخ کر سکتا تھا یا ترقی کے چند ہی
روز بعد ایسے عہدہ دار کو بلا تحقیق و تفتیش برطرف کر سکتا تھا؎۔ مجموعی طور پر یہ کہنا
مشکل ہے کہ اس نذر کے معاملے میں سلطنت مغلیہ آخر تک فائدے میں
رہتی تھی یا نقصان میں۔ کیونکہ فوری سرمایہ فراہم کرنے کے باوجود یہ نذور خاص ۸۲
خاص ذمہ داریاں بھی عائد کر دیتی تھیں۔ البتہ اس عہد کی مالی حالت ایسی تھی کہ
نقد سرمایہ ہاتھ آجانا اس رسم کے قیام کا معقول اور جائز سبب سمجھا جا سکتا
ہے؎۔

مداخل شاہی کے اس تبصرے کو پورا کرنے کی غرض سے چند اور
ابواب کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا جن کی رقوم آئین اکبری میں درج ہیں اور
معلوم ہوتا ہے کہ یہ روپیہ کبھی کبھی زمین کی مالگزاری ہی کی مد میں محسوب کر لیا

جاتا تھا۔ قریب قریب یہ جملہ ابواب، بنگالے کے مداخل میں لکھے ہیں جہاں کوئی بیس عنوانوں کے تحت میں، جیسے منڈی، نمک، اور حمل ونقل وغیرہ ہیں، قلیل رقوم درج ہیں۔ لیکن مین نے بنگالے کی نسبت یہ خیال پیش کیا ہے کہ اس کے جو مداخل قلمبند کئے گئے وہ درحقیقت صرف وہ تھے جنھیں وہاں کی پہلی حکومت وصول کیا کرتی تھی اور جو اکبر نے الحاق بنگالہ کے بعد بھی جاری رکھے۔ اسی خیال کی بنا پر، یہ رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا کہ دوسرے صوبوں میں بھی اسی قسم کا عملدرآمد ہوتا تھا؛ بنگالے کے باہر اس طرح کی صرف تین مثالیں مجھے ملیں۔ ایک تو برار کے ایک گاوں میں سڑک کا محصول۔ دوسرے اٹک (پنجاب) میں کشتیوں کا محصول۔ تیسرے گجرات میں بحری راہداری کا محصول۔ مگر اس آخری محصول کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ جہازوں سے جو کچھ محصول وصول ہوتا تھا وہ مالگزاری کے حسابات کے تحت میں درج کردیا جاتا تھا۔ باقی دو پہلی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو صورتوں میں اندرونی حمل ونقل کے محاصل بھی بادشاہی خزانے میں داخل کردئے جاتے تھے ورنہ جس تفصیل سے آمدنی کے ابواب تحریر کئے گئے ہیں، اسکی بنا پر یہ یقین کرنا بالکل درست ہوگا کہ یہی دو مستثنیٰ صورتیں ایسی تھیں جن میں براہِ راست شاہی خزانے کو محاصل وصول ہوجاتے تھے۔ البتہ عہد اکبری میں بنگالہ ایسا صوبہ تھا جہاں دوسرے ابواب بھی، علاوہ اُن بادشاہی مداخل کے جن کا اس باب میں ذکر ہوا، بادشاہی آمدنی میں محسوب ہوتے تھے ان کے علاوہ، یہ ممکن ہے کہ بعض متفرق ابواب اور ایسے ہوں جنکی آمدنی مالگزاری کے تحت میں شامل کرلی جاتی ہو لیکن جملہ رقوم کی مفصّل جانچ پڑتال کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایسا تھا بھی، تو یہ آمدنی بہت ہی قلیل تھی[1]۔ نظر بریں جن مداخل شاہی کا ذکر ہوا انھیں کو اگر مکمّل نہیں تو بہت کچھ مکمل فہرست مداخل

---

[1] اس مسئلے پر میں نے ایک مضمون میں بحث کی ہے جو اکبری سلطنت کے زراعتی اعداد پر لکھا اور یوپی کی ہسٹوریکل سوسائٹی کے رسالہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔

مان لینا چاہیے۔ دولتمندوں کے متروکات سے تو بادشاہ کو اختیار تھا کہ جسقدر چاہے خود لے لے۔ تجارت سے اس کی بلاواسطہ آمدنی کروڑگیری اور دارالضرب کے منافع پر مشتمل ہوتی تھی۔ اور اپنے ملک کی زرعی پیداوار میں سے وہ پہلے ایک تہائی اور آگے چل کے نصف کا دعویدار ہوگیا تھا۔ باقی معمولی تاجروں اور اہل حرفہ کی آمدنی، نیز کاشتکاروں کی باقی ماندہ آمدنی سے صوبے کی مقامی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

۳۔ صوبے کے مقامی مداخل

ہمارے ماخذوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی عہدہ داروں کو جو روپیہ درکار ہوتا، اسے وہ علیحدہ محصول لگا کے یا شاہی محاصل ہی پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا کرتے تھے اور نذرانے، جرمانے یا رشوت کے ذریعے جو کچھ مل جائے وہ ان کے علاوہ تھا۔ مقامی اغراض کے لئے مقررہ محاصل ہی میں مختلف ناموں سے بیشی کر دینے کا طریقہ ابھی تک ہندوستان میں متعارف ہے اور اورنگ زیب نے اس کے انسداد کی غرض سے جو فرامین جاری کئے انہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر عہد میں بھی اس کا رواج تھا۔ اس سلسلے میں گولکنڈے میں اسی دستور کی ایک مثال نقل کرنی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ وہ تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور محصول راہ داری سے اس کا تعلق ہے۔ ۱۶۰۶ء[عہ] میں ولندیزوں نے مچھلی پٹم میں تجارت کے لئے عہد و پیمان شروع کئے تو شاہی محاصل کے بارے میں کوئی دقت پیش نہ آئی جن کا عام معیار پہلے ہی معمولی تھا لیکن سوتی مال کی برآمد پر مقامی حکام نے ۱۶ فیصدی محصول کا مطالبہ کیا اور اسے اپنی آمدنی بتایا۔ ولندیزوں نے معاملہ دربار میں پیش کیا اور وہاں سے یہ حکم حاصل کیا کہ ان سے صرف چار فیصدی محصول لیا جائے اور سوتی مال پر ۱۲ فیصدی کا وہ محصول جو دیسی اور پردیسی سب سے یکساں لیا جاتا اور چھاپا دلالا کہلاتا تھا، ان کو

[عہ] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۰۰

معاف کر دیا جائے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ صدر حکومت نے جو محصول لگا رکھا تھا، مقامی عمّال نے اس کو چوگنا کر دیا تھا اور آیندہ چند سال تک کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولندیزوں کے مستثنیٰ کر دئے جانے سے بہت بگڑے اور طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہے کہ جو خسارہ ہوا تھا اسکی ۲۸۴ دوسری طرح کمی پوری ہو جائے۔ خود یہ قصہ اُن جھگڑوں کی کافی توجیہ ہے جو اس بندرگاہ پر ولندیزوں اور مقامی عمّال میں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ شاہی محاصل پر اضافوں کے علاوہ بطور خود جو محصول جگہ جگہ لگا دئے جاتے تھے، اُن کی تعداد اور نوعیت کا کچھ اندازہ اُن احکام سے ہو سکتا ہے جو ان کے انسداد کی غرض سے وقتاً فوقتاً جاری کئے جاتے تھے جہانگیر نے تخت نشینی کے وقت جو فرمان نافذ کئے ہیں، ان میں ایسے محصولات اور دوسرے ابواب جاری کرنے کو سخت مذموم اور ممنوع قرار دیا ہے جو "ہر صوبے اور ضلعے" کے جاگیردار یا والی، اپنے نفع کے لئے لگا دیتے تھے۔ اور ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا رواج کس قدر عام تھا۔ تقریباً ستر برس بعد اورنگ زیب نے اس معاملے میں زیادہ تفصیلی فرمان نافذ کئے[ع۱]۔ اُن کی عبارتوں میں جزوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تاہم پروفیسر سرکار نے ۶ عنوانات کے تحت میں ۵۴ محصول شمار کئے ہیں۔ یہ یقینی نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے محصول نہ تھے مگر اسی فہرست میں ہر قسم کے کاروبار جن میں عام لوگ مصروف رہتے ہیں، یعنی خرید و فروخت، حمل و نقل، سیر و سیاحت، نیز ایسے وقوع جیسے ولادت فرزند، حدبندی وغیرہ آگئے ہیں۔ اس طریقے کو معاصرین جس نظر سے دیکھتے تھے، اس کا شہاب الدین طالش کی تاریخ کے ایک اقتباس سے پتہ چلتا ہے جیسے

حاشیہ صفحہ (۳۹۹)۔ چھاپا سے سرکاری مُہر چھاپنا، اور دلالا سے دلاّلی مراد ہے۔

[ع۱] سرکار نے "لیکچرز آون مغل ایڈمنسٹریشن" (صفحہ ۱۲۰) میں وہ سب محصول بتائے ہیں اور ان پر بحث کی ہے جنھیں اورنگ زیب نے معاف کر دیا تھا۔

پروفیسر سرکار نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے:-

"جب سے ہندوستان اور اس کے سواحل مسلمانوں کے قبضے میں آئے، اس وقت سے شاہجہاں کے زمانے تک یہ قاعدہ اور دستور رہا کہ گل فروش سے لے کے گل فروش تک اور ململ باف سے لے کے گزی باف تک ہر تاجر و پیشہ ور سے حاصل لیا جاتا تھا۔ دائرہ و سائر تک سے محصول خانہ اور مسافر و تاجر و مویشی فروش سے زکات[1] وصول کی جاتی تھی جیسا کہ سعدی نے کہا ہے "ظلم کی بنیاد چھوٹی تھی مگر ہر نسل اس پر اضافہ کرتی گئی" حتیٰ کہ صوبوں میں، خصوصاً بنگالے میں یہ نوبت پہنچی کہ تاجر و پیشہ ور کاروبار چھوڑ بیٹھے اور اس مصیبت سے بچنے کے لئے وطن سے نکل گئے؛ حاکموں نے حاصل کی حرص میں انکی کچھ خبر نہ لی۔ سڑکوں اور معبروں ۸۵ کی یہ حالت ہو گئی کہ کوئی سواری والا بغیر ایک دینار اور کوئی پیادہ ایک درہم دئے بغیر نہ گزر سکتا تھا۔ دریائی راستوں کے متعلق اگر وہ ہوا بھی پا جاتے کہ ندی میں کوئی شکستہ کشتی جا رہی ہے جس نے حاصل ادا نہیں کیا، تو بس چلتا تو وہ ندی کو پابزنجیر کر دیتے۔........ فرسودہ اور بدن کے کپڑوں سے اگر اسی قدر زکات لی جاتی جس قدر کہ پھٹے کپڑوں پر تھی، تو یہ اُن کے نزدیک بہت بڑی رعایت تھی اور پکے ہوئے کھانے پر اگر خام اجناس سے کم خراج لیا جاتا تو یہ انتہائی فیاضی۔ سلاطین دہلی میں سے کسی نے، دین متین کو قوت دینے اور شریعت پر چلنے کی کوشش کرنے کے باوجود اِن ناجائز رسوم کا انسداد نہیں کیا بلکہ ان سے اغماض کرتے رہے۔"

---

[1] زکات، جو تجارتی مکاتیب میں مختلف صورتوں میں جیسے "جکات" وغیرہ مذکور ہے، دراصل آمدنی کا محصول ہے جسے اسلامی شریعت تسلیم کرتی ہے لیکن ہمارے پیش نظر عہد میں اس کے معنی محض محصول کے ہو گئے تھے جس میں مکان و زمان کی بھی پابندی نہ رہی تھی۔ (مصنف نے اِس عجیب اور ناقابل قبول قول کی افسوس ہے کوئی سند نہیں پیش کی۔ مترجم)

باب نہم

مصنّف کی عبارت آرائی کو پیش نظر رکھ کے، یہ بیان بہت کچھ اصلیت
پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شئے پر محصول تھا اور یہ طریقہ
روز بروز وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ شہاب الدین نے آگے لکھا ہے کہ اس
بلا کا اورنگ زیب نے ازالہ کر دیا لیکن یہ قول قبل از وقوع ثابت ہوا اور
بنگالے میں اٹھارھویں صدی میں جو متفرق محصولات فی الواقع وصول کئے
جاتے تھے، ان کی فہرستیں بالکل انہی محصولات سے ملتی جلتی ہیں جن کی
معافی کا سلاطین مغلیہ یکے بعد دیگرے حکم دیتے رہے تھے۔؎

اورنگ زیب کے انسدادی فرامین کا اکبر کے سابقہ احکام سے
مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دونوں قریب قریب ایک سے ہیں اور یہ قصّہ
درحقیقت پہلے سے، کم از کم، فیروز شاہ تغلق کے وقت سے چلا آرہا
ہے؎ بالفاظ دیگر یہ اس امر کی شہادت ہے کہ مرکزی حکومت میں جو اس
بار کو ٹھہر ٹھہر کے دور کرنے کی کوشش کرتی تھی، اور مقامی عمّال میں برابر
کشمکش ہوتی رہتی تھی کیونکہ یہ لوگ اپنی ضروریات کے لئے ان محصولات
کو جاری رکھنا اور توسیع دینا چاہتے تھے۔ اُن کی ضروریات سرکاری تھیں
یا شخصی، اس پر بحث کرنا بیکار ہوگا۔ اس لئے کہ ان دو شعبوں میں عملاً کوئی
صحیح امتیاز و فرق ہی نہ تھا۔ لیکن روپے بہم پہنچانے کی غرض جو کچھ بھی ہو،
یہ نتیجہ نکالے بغیر چارہ نہیں کہ اس قضئے کا فیصلہ مقامی عمّال ہی کے حق
میں ہوتا تھا اور وہ ممنوعہ محصولات برابر وصول کرتے رہتے تھے جب میں
ہوتی تو صرف یہ انتظامی مصلحت ان کے مانع ہوتی کہ اتنی رسوائی نہ ہونے
پائے کہ خود بادشاہ کی دخل دہی کی نوبت آئے؎ اس قسم کے مختلف
واقعات، نقل کئے جا سکتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حرص و آز ۲۸۶
لوگوں کی برداشت سے باہر ہو جاتی تھی تو بادشاہ مداخلت کرتے تھے،
لیکن رعایا صبر و برداشت کی عادی تھی اور ایسی نوبت آنے سے پہلے کہ
معاملہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے، ان کا بہت کچھ خون نچوڑا جا سکتا تھا؎
اہل حرفہ، خوردہ فروش دکاندار اور خریداروں پر جو قسم قسم کے

محصولات تھے، ان کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں۔ اور اس معاملہ کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ زیادہ علم نہیں ہو سکتا۔ پردیسی سوداگروں کے کاروبار پر انکا براہ راست اثر نہ پڑتا تھا اور ہماری معلومات کا بڑا ماخذ انہی کی اطلاعیں ہیں، اور وہ ان پر صرف اس وقت نظر ڈالتے ہیں جبکہ ان کا تجارت برآمد سے کوئی خاص تعلق ہو جائے۔ جیسا کہ مختلف اجارے دے دینے کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔

لیکن محاصل راہداری کی حیثیت دوسری تھی کیونکہ یہ ولندیزوں اور انگریزوں سے بھی لئے جاتے تھے اور اس کی معمولی عملی صورت کے بارے میں ہم ان کی شہادت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تجارتی مراسلات میں ان محاصل کا بار بار راہ داری اور "جکات" کے نام سے ذکر آتا ہے[1]۔ اور ان کی وصولی میں جو پیہم جھگڑے ہوتے تھے، ان سے ظاہر ہے کہ وہ تجارت کے حق میں واقعی رکاوٹ ہوں گے، نہ صرف پردیسی تاجروں کے لئے، جو ان سے بچنا چاہتے تھے بلکہ خود ہندوستانیوں کے لئے بھی جو انھیں ناگزیر سمجھکر ادا کرنے میں حجت نہ کرتے تھے۔ بہت پہلے، یعنی ۱۶۱۵ء ہی میں ہم انگریزوں کو شکوہ گزار پاتے ہیں کہ احمد آباد سے سورت لاتے میں تین مختلف محصول ان کو ادا کرنے پڑے۔ اور چند سال بعد برہانپور اور وہاں سے سورت کے راستے میں جو روپیہ اُن سے طلب کیا گیا، اس پر بھی وہ لڑتے رہے۔ ۱۶۲۴ء میں اُن سے سورت میں جو عہد و پیمان ہوئے، انھیں یہ شرط بھی تھی کہ اندرون ملک میں ان سے مقامی محصول نہیں لیا جائے گا اور جہانگیر کے فرمان سے بھی اس کی توثیق ہو گئی تھی بایں ہمہ برابر محصول ان سے لئے جاتے رہے اور ۱۶۲۷ء میں ان تاجروں نے لاہور لکھا کہ زیادہ با اثر بادشاہی احکام حاصل کئے جائیں" ورنہ ہم آئندہ بادشاہی فرامین

---

[1] "جکات" یا زکات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ راہ داری اصل میں وہ روپیہ معلوم ہوتا ہے جو مال کی راستے میں چوکیداری کے عوض لیا جاتا تھا مگر ہمارے زمانے میں وہ محض مال کے نقل مکانی کا محصول بن گیا تھا خواہ چوکیدار ساتھ کئے جاتے ہوں یا نہیں۔

کے لئے رشوتیں ادا نہ کریں گے"۔ ان سب باتوں کے باوجود ان سے محصول لئے جاتے رہے اور ۱۶۳۴ء میں ایک سفارت بادشاہ کے حضور میں بھیجی گئی لیکن اس موقع پر محصول سے بچنا مقصود نہ تھا بلکہ مال کی قیمت آنکنے کے متعلق عرض معروض کی گئی تھی۔ وقتاً فوقتاً ہم خاص خاص ۲۸۷ مقامات میں معافی مل جانے کا حال بھی پڑھتے ہیں لیکن یہ شخصی طور پر بعض عہدہ داروں کی مہربانیاں تھیں اور ان کے عہدے سے الگ ہوتے ہی ختم ہو جاتیں۔ اسی لئے ۱۶۵۰ء میں پھر عام معافی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور پھر ایک فرمان مل گیا جو کبھی کبھی کارگر ہوتا تھا اگرچہ ایک قافلے کو مجموعی طور پر اسی قدر محصول دینا پڑا جس قدر پہلے دیا جاتا تھا اور منفرداً تو عہدہ دار بارہا احکام کی پروا نہ کرتے تھے اور ہمارے عہد کے اخیر میں برہانپور اور دوسرے مقامات میں برابر روپیہ بھرا جاتا تھا۔

ولندیزوں پر بھی یہی گزری۔ ۱۶۳۴ء میں انھیں ایک فرمان عطا ہوا جس میں سورت کے راستے کے جملہ محصول و رسوم سے انھیں مستثنیٰ کیا گیا تھا لیکن سات سال بعد ہم انھیں یہ غور و بحث کرتے دیکھتے ہیں کہ آیا جدید احکام حاصل کرنے کی کوشش مفید بھی ہوگی؟ پرانا فرمان بیکار ہو گیا تھا محصول برابر لئے جا رہے تھے اور فی الوقت یہی مناسب معلوم ہوا کہ مقامی عمال سے نہ بگاڑی جائے۔ البتہ ۱۶۴۳ء میں پھر ایک فرمان حاصل کیا گیا اور اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہوا۔ یعنی گو خود آگرے میں جہاں سے فرمان نافذ ہوا تھا عمال نے اس کی پابندی نہ کی تھی لیکن بادشاہ سے زبانی عرض و معروض کرنے پر زرِ محصول کی واپسی کا حکم مل گیا۔ ادھر اس عرصے میں ہندوستان کے دوسرے کنارے پر شکایت بڑھتی جاتی تھی۔ ریشم کے محصول پہلے ہی بہت بھاری تھے۔ بنگالے میں ایک نیا صوبہ دار (نائب الممالک) مقرر ہوا تو ان میں اور زیادہ اضافہ کر دیا گیا۔ برخلاف اس کے، اڑیسے میں بعض حکام کو تجارت کی ترقی کا خاص خیال تھا۔ وہاں تین چوتھائی محصول کم کر دئے گئے مگر یہ رعایت چند روزہ ثابت ہوئی، اور پھر ہم سنتے ہیں کہ ہندوستانی

سوداگر محصول کی گرانباری کی بنا پر مال لانے لے جانے سے انکار کر رہے ہیں ؛

ان واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ راہ داری کے محصول، بادشاہی معافی ملنے کے باوجود وصول کرلئے جاتے تھے اور یہ نتیجہ نکالنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ دیسی بیوپاریوں کے حق میں جنھیں معافی وغیرہ بھی حاصل نہ ہوتی تھی؛ یہ سخت بار تھے ؛ اس طریقے کے رواج پر سلطنت مغلیہ کو الزام اس لئے نہیں دیا جاسکتا کہ یہ صرف انہی ممالک میں مروّج نہ تھے بلکہ آثار و قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جو علاقے سلاطین مغلیہ کی عملداری سے باہر اور خود مختار تھے، وہاں یہ محصول زیادہ بھاری اور زیادہ مرتبہ وصول کئے جاتے تھے ؛ سورت کے انگریزوں کی پریشانیاں پہلی دفعہ اور پھر آخری دفعہ جس طرح رفع ہوئیں ان کا مقابلہ کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہی معافی ان علاقوں سے متعلق نہ ہوتی تھی جو سلطنت کے اندر ۲۸۸ کسی راجہ یا ہندو رئیس کے زیر حکومت تھے ۔ چنانچہ پہلی دفعہ جو معافی نامہ ملا تو راجہ دھیتا کا علاقہ بھی اس میں شامل تھا حالانکہ اس وقت مغل حکّام کچھ عرصے کے لئے بے بس سے ہوگئے تھے لیکن دوسرے معافی ناموں میں جب کہ ان حکّام کو اختیار حاصل تھا، یہ علاقہ شامل نہیں کیا گیا اور صرف "بادشاہ کے اقطاع" تک معافی محدود کردی گئی جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن علاقوں کا انتظام ہندو رئیسوں کے ہاتھ میں تھا، انھیں مستثنیٰ کردیا گیا تھا۔ اور یہ امتیاز چند ہی سال پہلے اس وقت سے کیا جانے لگا تھا جب کہ دھیتا میں معافی کی درخواست پر یہ جواب ملا کہ شہزادہ (خرم)[۱] راجہ کے محصول لینے میں مداخلت نہیں کرسکتا کہ اسی رقم سے وہ (بادشاہ کو) خراج ادا کرتا ہے۔ آیندہ جو واقعات پیش آئے اُن سے بھی رفتہ رفتہ انگریزوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ رئیس، خاص کر راجپوتانے میں

---

[۱] مصنف نے یہاں بھی غلطی سے اسے "شاہجہان" تحریر کیا ہے ؛ مترجم۔

جو مطالبے کرتے ہیں ان کی وہ نوعیت نہیں ہے جو مغل عمّال کے مطالبات کی ہوتی ہے۔ لیکن راہ داری کا مطالبہ رئیسوں ہی کی طرف سے نہ ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات گاؤں والے تک یہ حق جتاتے تھے۔ ۱۶۳۷ء میں آگرے سے چند میل ہی کے فاصلے پر اس قسم کا مطالبہ کیا گیا اور اس میں مارپیٹ کی نوبت پہنچی تو ایک انگریز سوداگر مارا گیا۔ اسی طرح پیٹر منڈی نے کئی مثالیں لکھی ہیں کہ گاؤں والے حکومت کے قابو سے باہر ہو گئے اور انھوں نے اپنے اختیار سے محصول وصول کرنے شروع کئے۔

مگر سلطنت مغلیہ کے اندر غالباً یہ طریقہ اس قدر ایذا رساں نہ تھا جسقدر کہ اس کے باہر۔ چنانچہ تھی وسے نو جب گولکنڈے کے علاقے میں داخل ہوا تو سلطنت مغلیہ کے مقابلے میں یہاں کی شدت دیکھکر حیران رہ گیا کہ صرف ۲۳ فرسنگ کے سفر میں اسے سولہ محصول کی چوکیوں سے گزرنا پڑا۔ منوکی بیجاپور کے محصولوں کی سختی کا ذکر کرتا ہے اور مچھلی پٹم کے انگریزوں نے شاہ گولکنڈہ سے جو مختلف فرامین حاصل کئے، ان میں سب سے نمایاں "جنکنوں"[1] کی معافی ہے۔ آگے جنوب کے ہندو علاقے میں یہ مطالبہ اور بھی زحمت کا موجب ہوتا تھا اور ان حالات کو دیکھکر ہمارا یہ سمجھنا بجا ہوگا کہ یہ راہ داری کے محصول مغلوں کی ایجاد نہ تھے بلکہ یہ ہندوستان کا قدیم رواج تھا اور تمام ملک میں ہر شخص جسے کسی مقام کی حکومت حاصل تھی یا حکم چلا سکتا تھا، وہ اس محصول کا مطالبہ کرتا تھا[2]۔ ایک انگریز گماشتے نے

---

[1] جنکن بظاہر تامل لفظ "چنگم" (بمعنی محصول) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مشرقی ساحل کی خط کتابت میں یہ اسی قسم کے عام محصولات کے معنی میں مستعمل تھا، جیسے شمال اور مغرب میں لفظ راہ داری۔

[2] سلطنت موریا میں "سوداگر سے سرحد پر تاوان اور راستے میں راہ داری وغیرہ کے محصولات اور شہروں کے دروازوں پر محصول چنگی وصول کی جاتی تھی"۔ (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ اوّل۔ ۴۷۸)

راستہ بدلنے کی جو وجہ بیان کی ہے شاید وہ اس محصول کی اصل و بنا کو بھی اشارۃً بتاتی ہے۔ یہ جون پارکر تھا جو ۱۶۲۲ء میں تحریر کرتا ہے کہ "میرا ارادہ ہنڈیا کے راستے آنے کا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہاں کا راجہ جو پہلے محصول وصول کیا کرتا تھا، اب تھوڑے دن سے تاجروں اور راہ گیروں کا جو کچھ مال پاتا ہے اسے لوٹ لیتا ہے۔ اسی ہفتہ میں ایک سوداگر کے آٹھ اونٹ مال سے لدے ہوئے لوٹ لئے گئے، اور خود یہ سوداگر اور تین آدمی مارے گئے"۔ قزاقی سے دھمکی اور دھمکی سے راہ داری کا محصول گویا قدرتی ارتقا ہے اور کبھی کبھی سب سے ابتدائی صورت کا عود کرنا، زمانہ حال تک سننے میں آجاتا ہے۔ بہرحال، اصلیت جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ اس طریقے کا رواج اتنا عام تھا کہ پیہم ممانعت اور معافی ناموں کے باوجود وہ برابر چلا آتا تھا۔ لوگ بھی حمل و نقل کے محصول دینے کے عادی تھے اور ان سے یہ امید نہ تھی کہ کوئی کارگر معارضہ کریں گے اگرچہ رسمی طور پہ ان محصولات کی ممانعت ہی کیوں نہ کردی گئی ہو۔[1]

ان حالات میں یہ ٹھیک بتانا ممکن نہیں کہ تجارتی مال پر کس قدر محصول دینا پڑتا تھا۔ بعض محصول جن کا ذکر ہم پڑھتے ہیں بجائے خود معتدل تھے مگر بعض بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ ایک مثال میں ہم عمصا فی گاڑی محصول دیکھتے ہیں تو دوسری صورت میں صـہ فی گاڑی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان رسوم و محاصل میں بہت کچھ فرق ہو سکتا تھا۔ لیکن اصلی خرابی یہ تھی کہ مطالبے کا ٹھیک علم نہ ہو سکتا تھا اور اس کی وصولی میں بڑی شدت کی جاتی تھی۔ سوداگر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ انہیں کسی خاص سفر کے دوران میں کتنا محصول ادا کرنا پڑے گا۔ لہذا جب تک نفع کی بہت ہی زیادہ امید نہ ہو جو ان سب نامعلوم مطالبات کو پورا کر دے، اس وقت تک مال کوئی لے کے نہ چلتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آخر میں سارے محصولات کا بار خریداروں ہی پر پڑتا تھا، تاہم وصولی کے طریقے میں جب تک بے اطمینانی کا یہ عنصر موجود تھا اس وقت تک لازماً تجارت میں رکاوٹ پیش آتی تھی، جس سے

خریدار و تاجر دونوں کا نقصان تھا[۱]

یہ لکھنا خلاف محل نہ ہوگا کہ کم سے کم بعض صورتوں میں راہ داری کے محاصل سے بالواسطہ خزانہ شاہی کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔ اگرچہ یہ براہ راست بادشاہی مداخل میں محسوب نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ راجہ دھتیا کی جو مثال اوپر نقل ہوئی اس سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں (شہزادہ خرم) نے راجہ کے وصول زر کے معاملہ میں اس لئے دخل دینا پسند کیا کہ اسی روپئے سے وہ خزانہ شاہی کو خراج ادا کرتا تھا۔ اور مورخ خافی خاں کے بعض اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاگیرداروں کے مقامی مطالبات کی بھی کسی حد تک یہی وجہ ہوتی تھیں۔ اس کا بیان ہے کہ سنہ ۱۶۶۰ء کے قحط میں اورنگ زیب نے راہ داری محاصل اور مختلف رسوم ترک کرنے کا حکم دیا لیکن عمال اور جاگیردار برابر انہیں وصول کرتے رہے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ بادشاہ کا پاس و لحاظ نہ کرتے تھے اور دوسرا یہ کہ
دو مال کے عہدہ دار غفلت و بے پرواہی یا فائدے کے لئے جاگیرداروں کی تنخواہوں میں سے ان محاصل کی رقوم، خلاف احکام، وضع کرتے رہے اور جاگیرداروں کو بہانہ مل گیا کہ جب یہ روپیہ ان کی تنخواہوں میں محسوب ہو رہا ہے تو وہ کیوں نہ راہ داری وغیرہ وصول کریں۔ بلکہ بعض نے تو اسے اور بڑھا دیا اور جب ان بدعنوانیوں کی سرکار کو اطلاع ہوئی تو خاطیوں کو سزا دی گئی۔ ...... لیکن تھوڑے دن بعد انہوں نے پھر اپنے منصب بحال کرائے اور اس طرح بہت سے محصولوں کو منسوخ کرنے کا جو حکم ہوا تھا، وہ گویا بے کار ہو گیا!!

اس عبارت میں کئی اصطلاحی چیزیں آگئی ہیں! جن کی شرح یہ ہے کہ

---

[۱] گجرات رپورٹ (ورق ۱۹) سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنہ ۱۶۲۸ء کے قریب احمد آباد کو دوسرے شہروں پر یہ خاص فوقیت حاصل تھی کہ مقامی محصول کم بھی تھے اور معین بھی کر دئے گئے تھے اور کیفیت نویس نے وہاں تجارت و صنعت کی ترقی کا یہی سبب قرار دیا ہے۔ غالباً دوسرے مقامات میں بھی کبھی کبھی ایسی ہی اچھی صورت ہو جاتی ہوگی لیکن یہ قاعدہ عام کے مستثنیات تھے!!

کسی منصب دار کو جو جاگیر ملتی تھی اس کی آمدنی سرکاری طور پر تخمینہ کر لی جاتی تھی اور گو وہ زیادہ وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن محکمے کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ زیادہ نہ لینے پائے اور اس غرض سے اہل محکمہ تنخواہ کا حساب رکھتے تھے کہ اگر جاگیر سے اُس نے زیادہ روپیہ وصول کیا ہے تو وہ تنخواہ میں محسوب کر لیا جائے۔ اب اگر کوئی جاگیردار راہداری وصول کرتا تو وہ رقم بھی ان تنخواہ کے کاغذات میں لکھ لی جاتی اور جاگیردار کو اس بناء پر یہ محصول لینے کا حق ہو جاتا تھا۔ اس معاملہ میں جاگیرداروں اور محاسبی کے اہلکاروں کی برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی اور فریقین جن امور میں پوری ذہانت و عیاری صرف کرتے تھے، انہی میں سے ایک یہ مد بھی تھی۔

خافی خاں نے اس بارے میں اور بھی رائے زنی کی ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ایک باخبر ہندوستانی آدمی کی رائیں ہیں[1] ان کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ

"راہ داری کو خصوصیت کے ساتھ ہر منصف مزاج اور حق پسند آدمی سخت تکلیف دہ اور مسافروں کے لئے ایذا رساں محصول سمجھتا ہے مگر اس کے ذریعے زر کثیر وصول ہوتا ہے اور ممالک محروسہ میں فوجدار و جاگیردار آج کل تاجروں غریبوں اور مفلس مسافروں تک سے پہلے کی نسبت بھی زیادہ روپیہ جور و جبر سے وصول کر لیتے ہیں۔ زمیندار بھی یہ دیکھ کر کہ تحقیق تفتیش نہیں ہوتی اپنی حدود میں راستوں پر اتنا روپیہ زبردستی وصول کرتے ہیں کہ اتنا شاہی عمال بھی نہیں لیتے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہ آگئی ہے کہ کارخانہ یا بندرگاہ سے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے سوداگری مال پر قیمت سے دگنے دام محصولات کی شکل میں ادا کرنے پڑتے ہیں محصلین اور زمینداروں کی شرارت

---

[1] خافی خاں کا تجربہ ہمارے پیش نظر عہد سے بعد کا تھا اور جہاں وہ زمانہ حاضرہ کا ذکر کرتا ہے تو غالباً اس کی مراد اٹھارھویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہے، جب کہ نظم و نسق میں ابتری بڑھ گئی تھی اور مقامی خرابیوں کی نگرانی کمزور ہو گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ خافی خاں کے وقت میں عہد شاہجہانی کی نسبت حالت اور بھی بدتر تھی مگر انتظام بعینہ وہی تھا۔

باب نہم

اور زیادہ تباہی سے ہزاروں مسافروں کا مال متاع، عزت اور جانیں برباد ہوتی ہیں"!

خافی خاں اکثر وقائع نگاروں کی طرح ایک خریدار مسافر کے نقطۂ نظر سے لکھتا ہے لیکن ولندیزیوں اور انگریزوں کے مکاتیب میں جس طرح حوالے آتے ہیں، ان سے تصدیق ہوتی ہے کہ محاصل کے اس پورے نظام کی خرابی کے بارے میں جو کچھ خافی خاں نے لکھا ہے وہ تاجروں کی رائے کے موافق ہے اور اس طریقے کے جواز میں بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ رعایا اسے برداشت کرتی تھی اور اس لئے وہ حکام کے حق میں آمدنی کی چیز تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تجارت اور صنعت پر جو دوسرے محصول تھے ان کی نسبت ہماری واقفیت بہت کم تفصیلی ہے۔ چھوٹے دکان داروں اور پیشہ وروں سے جو کچھ لیا جاتا تھا، اس کی شرح کے متعلق خواہی نہ خواہی قیاس ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ رواج کے مطابق قرار پا گئی ہوگی۔ لیکن کافی شہادتیں موجود ہیں جن کی بنا پر یہ کہنا حق بجانب ہے کہ کسی کاروبار میں نمایاں ترقی ہوتے ہی عموماً سرکار یا اس کے عمال کے مطالبات میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ سنہ ۱۶۳۳ء میں نیل کا اجارہ دیئے جانے کا جو قصہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس میں پیداوار پر عملاً ۳۳ فی صدی محصول عائد ہوتا تھا۔ کیونکہ کاشتکاروں کو [illegible] کی بجائے جو منڈی کی شرح تھی، اپنا مال [illegible] کے نرخ سے بیچنا پڑا۔ گجرات کا مقامی محصول ابتدا میں اس سے بھی زیادہ نظر آتا ہے کہ تقریباً [illegible] روپئے فی من کے نیل پر وہ [illegible] کے قریب نکلتا ہے لیکن اس کے متعلق یہ فرض کرنا قرین قیاس ہوگا کہ ابتدا میں مطالبہ بڑھا چڑھا کے مقرر کیا گیا تھا کہ گفتگو شروع کرنے میں سہولت ہو اور آخر میں جو رقم واقعی وصول کی گئی وہ غالباً کم تھی۔ اسی طرح شورے کی نسبت ہم پڑھتے ہیں کہ سنہ ۱۶۵۸ء میں اسے بادشاہی اجارے میں لے لیا گیا جب کہ اس کی برآمد وسیع پیمانے پر شروع ہی ہوئی تھی۔ اور دس سال پہلے بھی ایک ولندیزی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنس پر ایک جدید محصول عائد کر دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم میر جملہ کے ایک محصول کا بھی جو بنگالے میں ۲۹۲

لگایا گیا، ذکر کریں گے۔ ایک ولندیزی تحریر میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس صوبہ دار نے ڈھاکے کے سب غلہ بیچنے والوں کو جمع کیا اور ان سے پچاس ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے [1] میر جملہ کے، مع خدم وحشم ڈھاکے میں طویل قیام کے باعث ان لوگوں کو معمول سے دگنا نفع ملا تھا۔ ان تاجروں نے دس ہزار تک پیش کیے۔ اس پر وہ بے دردی سے پیٹے گئے۔ مگر کوڑے کھا کر بھی انھوں نے زیادہ دینے سے انکار کیا اور عذر کیا کہ ہم محض خوردہ فروش ہیں۔ تب ان کے دو سرگروہ پکڑ کے ہاتھیوں کے آگے ڈال دئے گئے اور جان کے خوف سے انہوں نے پچیس ہزار پر معاملہ کر لیا۔ اس کے بعد شہر کے ساہوکاروں نے تین لاکھ ادا کئے اور بظاہر ان کے معاملے میں اس قسم کی زبردستی کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ایسے واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا میرے نزدیک بالکل واجبی ہے کہ کاروبار کے فروغ پانے کی صورت میں لوگوں کو انوکھے مطالبات کئے جانے کا ایسا خوف رہتا تھا جو لازمی طور پر صنعت و حرفت یا تجارت کو وسیع پیمانہ پر چلانے سے مانع آتا تھا۔

مقامی محاصل کی بحث ختم کرنے سے قبل، چنگی، آبکاری اور محصول نمک کی تین مدوں کے متعلق چند کلمے لکھ دینے مناسب ہیں۔ کہ یہ محصول زمانہ حال میں کافی معروف ہیں۔ ہمارے ماخذوں میں چنگی اور راہ داری میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا اور عام لوگ بھی غالباً انہیں الگ نہ جانتے تھے۔ بہرایں ہمہ اتنا یقین ہے کہ بستی میں جو مال وہاں بکنے کے لئے آتا اس پر محصول لگا لیا جانا ایک مسلمہ آئین تھا۔ سولھویں صدی میں یہ محصول وجیانگر میں بخوبی متعارف تھے اور وہاں دروازوں پر روپیہ دئے بغیر کوئی چیز اندر نہ

---

[1] میر جملہ نے بنگالے میں جو شہرت حاصل کی، اس کا اندازہ داغ رجسٹر کے ایک خط کی عبارت مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۶۳ء سے ہوتا ہے جس میں وہ آخری دشمن یعنی موت سے اس کے مقابلے کا ذکر کر کے تحریر کیا ہے کہ "اور یہ اس شخص کا انجام ہے جو گمنامی سے بڑھا اور اس رتبے کو پہنچا کہ ممتاز ترین اشخاص میں اس کا شمار ہونے لگا اور وہ رعب داب اسے حاصل ہوا کہ اس کا آقا یعنی مغل اعظم تک ظاہراً اس سے خوف کرتا تھا لیکن اب اس کے مرنے کا کسی کو رنج نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ہر شخص اس کی موت سے بالکل خوش معلوم ہوتا ہے"

جا سکتی تھی، حتیٰ کہ سر پر جو بوجھ بار لوگ لے جاتے اس پر بھی محصول لے لیا جاتا تھا۔ اکبر کے "شہری آئین" میں بھی کوتوال کے محصول عائد کرنے کا اختیار تسلیم کیا ہے اور اس کی تعیین کی گئی ہے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد میں چنگی مقامی محصولات کے نظام کا جزو تھی اور غالباً اس کی شرح عمل میں حاکم کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی۔[1]

آب کاری کے کسی عام محصول کا وجود نہ تھا اور اس قسم کا محکمہ شریعت اسلامی کے خلاف ہوتا۔ شراب فروشی کی ممانعت پر جہانگیر کے زمانے میں سختی سے عمل نہیں ہوا لیکن اس کے جانشین کے عہد میں ہم انسداد کا حال پڑھتے ہیں۔ پیٹر منڈی اپنے رسالہ سنہ ۱۶۳۲ء میں شراب کی کشید اور فروخت پر سخت تاوان کا ذکر کرتا ہے۔ الہ آباد کے قریب چوری چھپے شراب مل جاتی تھی مگر آگے مشرق میں کسی قیمت پر بھی اس کی بہم رسانی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ اس کی صاف قدغن تھی اور بیچنے والے کو سزائے موت اور جس گھر میں پائی جائے، اس کو ڈھا دیا جاتا تھا۔[2] مگر یہی شخص لکھتا ہے کہ والی سورت نے تاڑ کے درختوں کا جن سے ایک قسم کی شراب نکلتی ہے، ٹھیکہ دے دیا تھا۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں اس نواح میں شراب کی کشید ایک پیشہ بن گئی تھی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو بادشاہ کے احکام سخت تھے لیکن ان کا نفاذ مقامی حکومت پر منحصر تھا اور مقامی عمال بعض صورتوں میں، جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی شراب کا محصول وصول کرتے تھے۔[3]

نمک کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ مغل سلاطین اس کا محصول لیتے تھے
لیکن اس کی شرح تحریر نہیں ہے سوائے پنجاب کی کانوں کے جہاں اکبر کے زمانہ میں
محصول اصل لاگت کے دو چند سے بھی خاصہ زیادہ تھا۔ یہ رقم لکھا ہے کہ دیوان کو
ادا کی جاتی تھی۔ جس کے معنی صاف نہیں ہیں۔ تاہم قیاس چاہتا ہے کہ اس سے
شاہی عمال مراد ہیں۔ راجپوتانے کے وسائل نمک ہمارے پیش نظر عہد میں، مقامی رئیسوں
کے تحت میں تھے۔ اور آئین اکبری میں ان کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ کچھ کی خلیج (= رن) سے ۲۹۴
جو نمک گجرات میں آتا تھا، وہ اگر سب نہیں تو اکثر حصہ مقامی رئیسوں کے علاقے سے
آتا اور وہی اس پر محصول لیتے تھے۔ بنگالے کے بادشاہی محاصل کی فہرست میں بعض

نمک کے محصول بھی درج ہیں لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ فہرستیں واقعی حالات سے بہت کم مطابقت رکھتی ہیں۔ غرض اجمالی طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ گو نمک پر محصول ضرور تھا مگر اس کا یکساں کوئی انتظام نہیں تھا اور یہ محصول عام طور پر بادشاہی ہونے کی بجائے مقامی یا صوبوں سے متعلق تھے۔ زمانہ حاضرہ کے میزانیہ ہند میں نمک کو اسی لئے امتیاز حاصل ہے کہ چنگی کے سوائے جو بعض بلدیات میں اب تک وصول کی جاتی ہے، ان کثیر التعداد محاصل میں جن سے پیش نظر عہد میں کوئی پیشہ یا حرفہ مشکل سے بچا ہوا ہوگا۔ آج کل صرف نمک کا محصول اس زمانے کی یادگار باقی رہ گیا ہے[عہ]

محصولوں کے علاوہ مقامی عمال نذرانوں، جرمانوں اور رشوتوں سے معقول آمدنی کما سکتے تھے۔ ان میں سے پہلی مد کسی مفصل بیان کی محتاج نہیں ہے۔ نذرانے دینے کی رسم عام اور لازمی تھی اور اس بارے میں گذشتہ باب میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ہر رتبے کے عہدہ داروں پر عائد صادق آتا ہے۔ رہے جرمانے تو ولندیزیوں کی تجارتی اطلاعیں اس بات کو صاف کر دیتی ہیں کہ جرمانے انہی عہدہ داروں کی جیب میں جاتے تھے۔ جنہوں نے جرمانے کئے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ آگرے کا ذکر کرتے ہیں پلسارٹ تحریر کرتا ہے کہ مجرموں کو سوائے اس کے کہ وہ مفلس ہوں، شاذ و نادر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ البتہ ان کی مال متاع صوبہ دار و کوتوال کے فائدے کے لئے ضبط کر لی جاتی تھی۔ اس کے آگے وہ ان لوگوں پر رحم و تاسف کا اظہار کرتا ہے جو ان بے دین، ناخدا ترس عہدہ داروں کے روبرو لائے جاتے، جن کی آنکھیں لالچ سے اندھی اور منہ اس طرح کھلے ہوئے جیسے شکار پر جھپٹتے وقت بھیڑئیے ہانپتے ہوں! اور غریبوں کی روٹی چھیننے کے لئے پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ہر شخص روپیہ کے واسطے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے کیونکہ

[عہ] مصنف نے اس موقع پر مبالغے یا غلط بیانی کی حد کر دی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کا یہ قول ہندوستان میں تو کوئی شخص جسے مقامی اور شاہی محاصل سے ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے باور نہیں کر سکتا۔ مترجم۔

زر نقد کے بغیر کوئی رحم یا خدا ترسی نہیں کی جا سکتی ہے"

اسی طرح گجرات رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں عام سزا جرمانے کی تھی اور یہ چھوٹے جرائم کے لیے نہیں بلکہ قتل، چوری، رہزنی جیسے سنگین جرائم کے واسطے بھی۔ کیونکہ جرمانے سب صوبہ دار کی مٹھی میں جاتے اور اگر ان مجرمین کو قتل کی سزا دی جاتی تو اس کی مٹھی گرم نہ ہو سکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ رشوت اور جرمانے میں بہت خفیف فرق رہ گیا تھا اور مذکورہ بالا کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قزاقوں کی ہتھیار بند ٹولیاں خود صوبہ دار کے اشارے سے بڑے بڑے شہروں کے آس پاس کثرت سے موجود رہتی تھیں اور صوبہ دار ایک طرف تو ان سے رشوت لیتے اور دوسری طرف پاسبانوں ۲۹۵ پر زیادہ خرچ کرنا نہ پڑتا اور یوں بھی بچت ہو جاتی تھی۔

شہر والوں کے معاملے میں بھی حکام کو بے باکی سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کا موقع تھا۔ یعنی فرضی الزام کا نتیجہ یا جرمانہ ہوتا یا رشوت اور قانون کو جنبش میں لانے کے لیے مخبروں کی کچھ کمی نہ تھی۔ جن کی بقول پلسارٹ، اگرے میں ایسی کثرت تھی جیسی مکھیوں کی۔ شرع اسلامی کے احکام پر اس وجہ سے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ قاضی جس کا کام قانون کی تعبیر کرنا تھا، عدالت میں بیٹھا ہی رہ جاتا اور عملاً صوبہ دار ہی جو چاہتا سو کرتا تھا۔ اور جیسا کہ اسی مبصر نے لکھا ہے "پاپا کو دین سے خارج کون کر سکتا ہے؟ صوبہ دار کے فیصلے میں دخل دینے کی مجال کس کو ہو سکتی ہے؟" مرافعے کا امکان موجود تھا اور ایک گزشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کوئی بہت ہی دولت مند آدمی جیسے پیرجی بوہرہ تھا، بادشاہ کے حضور میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ یہ ہمیں معلوم نہیں کہ پیرجی بوہرے کو اس موقع پر کتنا روپیہ خرچ کرنا پڑا، لیکن اس کی کامیابی سے یہ نتیجہ نکالنا احتیاط کے خلاف ہوگا کہ معمولی آمدنی کے لوگ مقامی حکام کی دست درازی سے بخوبی محفوظ رہ سکتے تھے۔ میرے دل کو تو صحیح نتیجہ، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زر ستانی میں عمال کو صرف ایسی بدنامی کے پہلو بچانے پڑتے تھے کہ اوپر سے مداخلت کی نوبت نہ آئے لیکن یہ کہ ان حدود کے اندر انہیں روپیہ ایسے طریقوں سے وصول کرنے کے

بہت کچھ مواقع حاصل تھے، جن کو زمانۂ حال میں رائے عامہ کبھی گوارہ نہ کریگی اور جو بلاشبہ اہل اقتصادیات کی نظر میں نقصان پہنچائے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

باب نہم کے مآخذ

فصل اوّل ۔ مغلوں کے مکمل مالی نظام کا کوئی ہمعصر بیان میرے علم میں نہیں ہے جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مواد مختلف وقائع میں منتشر اور سرکار زر اورنگ زیب میں ہے ۔ مالگزاری کی مدّات منوکی (دوم، ۵۱۴) نے وضاحت کے ساتھ درج کی ہیں گو اس کی فہرست میں بعض ایسے ابواب بھی ہیں، جو ہمارے پیش نظر عہد کے ختم ہونے پر اضافہ کیئے گئے تھے ۔ زر مالگزاری کی میزان کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری (ترجمہ دوم، ۱۱۵) اور بادشاہ نامہ ۔ دوم، ۱۰، ۱۷ ۔ دربار شاہی پر جو روپیہ خرچ ہوتا تھا، اس کی کیفیت آئین کے پہلے حصے میں تحریر ہے ۔ شاہجہاں کے عہد میں جو خرچ بڑھا، اس کو نمایاں طور پر الیٹ ۔ ہفتم، ۱۷۱ ر ۲ ۔ میں بیان کیا گیا ہے ۔ تنخواہوں کے موازنے آئین اکبری (اول، ۳۰۰) اور بادشاہ نامے (دوم ۔ ۱۷)، کے اقوال پر مبنی ہیں ۔ فاضل رقوم ایساں کرنے کے متعلق دیکھو سرکار زر آورنگ زیب ۔ اول، ۱۷۱ ۔ عہدہ داروں کے افلاس کا حال برنیر (۲۱۳) نے لکھا ہے ۔

جنوبی ممالک کے مالی نظام کے ماخذ باب ہشتم کے اخیر میں تحریر کر دیئے گئے ہیں ۔

فصل دوم ۔ سورت کی کروڑ گیری کے بارے میں، ملاحظہ ہو ہاکنس ارلی ٹریولز، ۱۷۱، پرچاس ۔ اوّل ۔ چہارم، ۲۲۴ ۔ اور تھی وےنسے نو ۔ ۷ ۔ بندرگاہوں کی باہمی رقابت کے لئے دیکھو رو ۔ ۴۵ و ۵۷ و ۸۲ ۔ اور انگلش فیکٹریز سوم، ۱۹۲ ۔ ہشتم، ۱۳۴ ۔ تانیروں کا بار بار ذکر آتا ہے ۔ مثالاً ملاحظہ ہو، لیٹرز ریسیوڈ ۲۹۶

چہارم ۸۷۔ فیکٹریز اوّل، ۱۳۷۔ دوم ۲۱۱ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو شورر (Schorer) ورق ۸۰؛ اصل مالیت سے زیادہ قیمت لگانے کا بھی اکثر ذکر آیا ہے اور جو مثالیں ہم نے متن میں نقل کی ہیں وہ انگلش فیکٹریز پنجم، ۲۴۴۔ لیٹرز ریسیوڈ چہارم، ۶۸۔ رو، ۱۸۲۔ اور داغ رجسٹر، جولائی ۱۶۴۱ء سے نقل کی ہیں۔

اوّل الذکر دو کتابوں ہی میں جبراً خرید فروخت کی مثالیں تحریر ہیں؛

سورت کی ٹکسال کا ذکر فیکٹریز، چہارم، پنجم اور آیندہ جلدوں میں ملتا ہے۔ راج محل کی بدعنوانیاں داغ رجسٹر۔ ستمبر ۱۶۶۳ء اور آیندہ سنین کے متعدد داخلوں میں تحریر ہیں؛ سلاطین مغل کا متروکات کے دعوے دار ہونیکا بیان پرچاس نے کیا ہے (اوّل۔ سوم، ۲۱۸ وغیرہ) نیز دیکھو رو۔ ۱۱۰۔ برنیر ۱۶۷۔ جہانگیر کے زمانے میں جو دستور تھا، اس کا حال پلسارٹ۔ مخطوطہ، ورق ۲۱۔ سے نقل کیا ہے۔ آصف خاں کی جاگیر کے بارے میں ملاحظہ ہو، داغ رجسٹر۔ ستمبر ۱۶۴۲ء۔ ایلیٹ۔ ہفتم، ۶۸۔ مین ریک، ہفتاد و یکم۔ اورنگ زیب کے طرز عمل کی نسبت، ایلیٹ۔ ہفتم۔ ۱۶۱، منوکی۔ دوم، ۴۱۵۔ تجارتی مکاتیب میں جو ذکر آگئے ہیں، ان کے لئے، انگلش فیکٹریز۔ دوم، وغیرہ وغیرہ؛

نذروں کے طریقے کا اکثر مصنفوں نے حال لکھا ہے۔ متن میں جو فقرے ہم نے نقل کئے ہیں، وہ مین ریک، شصت و چہارم، اور داغ رجسٹر (سورت)، اپریل ۱۶۴۳ء و جنوری و جون ۱۶۴۵ء میں درج ہیں۔ متفرق مداخل شاہی کے واسطے آئین اکبری۔ دوم کی جدولیں دیکھنی چاہئیں؛

فصل سوم۔ مالگزاری کے ساتھ جبوب و رسوم وصول کرنیکا حوالہ میرکارز اسٹڈیز ۱۹۴۔ میں موجود ہے۔ مچھلی پٹم کے مقامی رسوم کے لئے دیکھو ٹریپ ایشراز گورومنڈل دوم۔ اور رین ڈیل، پنجم، ۱۷۹۔ جہانگیر کا مقامی محاصل کو ممنوع قرار دینا، تزک اوّل، ۷۔ میں مذکور ہے؛ اورنگ زیب کے فرامین پر سرکارز ایڈمنسٹریشن، ۱۲۰۔ میں بحث کی گئی ہے۔ ان محاصل کا برابر لیا جانا بعد کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے مثلاً ٹیلرز ڈاکا، ۱۹۷۔ راہ داری کے بارے میں جن فقروں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ذیل کی کتابوں میں درج ہیں؛

بیٹرز ریسیوڈ - چہارم، ۷۹ - فیکٹریز - اوّل، ۸۸ - سوم وغیرہ -
داغ رجسٹر - فروری ۱۶۳۴ء مارچ و مئی ۱۶۴۱ء وغیرہ -

مغل حکام کے علاوہ مقامی رؤسا اور زمیندار وغیرہ جو محصول وصول کرلیتے تھے، اس کے لئے ملاحظہ ہو فیکٹریز - اوّل، ۳۳۱ - دوم - پنجم وغیرہ -

منڈی، دوم - ۱۱۱ و ۱۱۹ - تھمی وے نو، ۲۷۹ - منوکی - دوم، ۱۷۱ - لیٹرز ریسیوڈ پنجم، ۱۲۸ - خافی خاں کا بیان ایلیٹ ہفتم - ۲۴۸، ۲۴۷ سے نقل کیا گیا ہے -

رہے دوسرے محاصل، تو ان میں اجاروں کے متعلق ہم باب چہارم میں بحث کرچکے ہیں - شورے کے محصول کا ذکر فیکٹریز - دہم، ۱۵ - اور داغ رجسٹر - (کورومنڈل) اگست ۱۶۴۵ء میں آتا ہے - میر جملہ کے محاصل کی نسبت بھی ملاحظہ ہو یہی رجسٹر - نومبر ۱۶۶۱ء - شہری محصول یا چنگی کا حال مینول، ۲۶۴ و مابعدہا میں تحریر ہے - نیز ملاحظہ ہو آئین اکبری (ترجمہ - دوم ۴۲) - آبکاری کے ضوابط منڈی (دوم، ۳۲ و ۹۷ و ۱۴۴) نے لکھے ہیں اور نمک کے محصول کے لئے دیکھو آئین (دوم، ۲۴۲ و ۲۴۹ و ۳۱۵) - جرمانوں اور رشوتوں کے متعلق جو فقرے نقل کئے ہیں وہ پلسارٹ (مخطوطہ - ورق ۲۲ و ۲۴) اور گجرات رپورٹ (ورق ۲۰ و ۲۱) سے کئے ہیں -

بابِ دہم

خلاصہ اور خاتمہ

گذشتہ ابواب میں مَیں نے جو معلومات جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے کی اقتصادی حالت کے متعلق جمع ہو سکی، اس پر بحث کی۔ اب یہ باقی رہ گیا ہے کہ اس عہد میں جو تغیرات ہوئے ان کو جانچا جائے اور نفع نقصان کا ایک سرسری گوشوارہ تیار کیا جائے جس سے کسی حد تک اِن سوالات کا جواب مل سکے کہ آیا ہندوستان کی قومی آمدنی بڑھی یا گھٹ رہی تھی اور آیا دولت کی تقسیم زمانۂ حاضرہ کے معیارِ عدل کے مطابق ہوتی جاتی تھی یا خلاف؟ پہلی نظر میں تو اس عہد کی سب سے نمایاں شئے یہ ہے کہ بڑی بڑی تجارتی جماعتوں کے، جو ہالینڈ اور انگلستان میں مرتب ہوئیں، کارندے ہندوستان میں وارد ہوئے اور ملک کے سب سے زرخیز حصّوں تک ان کے قدم پہنچ گئے۔ لیکن زیادہ غور سے مطالعہ کیا جائے، تو گو ماہرِ اقتصادیات کو اِن واقعات کی آیندہ اہمیت تسلیم کرنی پڑیگی، تاہم اسے سب سے مقدم چیز انتظامی تغیّرات کو قرار دینا پڑے گا جو اس عہد میں رُونما ہوئے اور جنھوں نے تقسیم دولت کی خرابیوں کو، جو پہلے سے موجود تھیں، مزید تقویت دی اور اس طرح پیداوری کے پیشوں کو نمایاں اور روز افزوں

باب دہم

نقصان پہنچایا۔ ایک طرف تو ہندوستان کو یہ فائدہ ہوا کہ اُس سے تجارت کے عوامل پہلے کی نسبت زیادہ مستعد و کارآمد میسر آگئے۔ لیکن دوسری طرف اسے مفت خواری کی کثرت و شدت سے جو پہلے ہی کمائی کی قوتوں کو برباد کئے ڈالتی تھی، نقصان اٹھانا پڑا۔ پردیسیوں نے جو سہولتیں بہم پہنچادی تھیں، ان کی بدولت بعض مقامات اور بعض گروہ ضرور نفع میں رہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اندرونی اسباب کے اثر سے ملک برابر مفلس ہوتا گیا
۲۹۸ اور میری رائے میں، کوئی شبہ نہیں کہ نفع و نقصان کے گوشوارے کا آخری نتیجہ مخالف ہی نکلے گا۔

بیرونی عوامل میں سب سے اور کہیں زیادہ اہم ولندیزی کمپنی تھی انہی باحوصلہ تاجروں نے مشرقی ساحل ہند پر کاروبار کی ابتدا کی اور ہمارے پیش نظر زمانے کے اخیر تک انہی کا غلبہ رہا۔ یعنی مغرب میں بھی، جہاں انگریزوں کو سبقت کا فائدہ حاصل تھا، ولندیز بہت جلد اُن سے بازی لے گئے۔ ہندوستانی اغراض کے اعتبار سے ان دو حریفوں کا تجارت کے میدان میں آنا، یقیناً مفید مطلب ہوا۔ اور ہر چند انگریزوں نے وقتاً فوقتاً اس عہد میں نقصان اٹھائے جن کو پورا کرنے کے بعد بہت قلیل نفع اُن کے حصے میں آیا تاہم ہندوستان کی تجارت میں انکا قدم جما رہا اور یہ زیادہ تر انہی کی تگ و دو کا نتیجہ تھا کہ یہ ملک ولندیزوں کے تجارتی اجارے کے شکنجے میں پھنسنے سے بچ گیا جیسا کہ انھوں نے ایشیا کے بعض دوسرے اقطاع میں قائم کرلیا تھا۔

ہندوستان کی اس زمانے میں جو حالت تھی، وہ تجارت درآمد کی کسی وسیع ترقی کے مساعد نہ ہوسکتی تھی۔ عام رعایا تو اس قدر محتاج تھی کہ باہر کی جو اشیا اُن دنوں آسکتی تھیں، ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرسکتی تھی۔ متوسط طبقہ تعداد میں کم اور نمائشی کاموں میں زیادہ خرچ کرنے سے خائف تھا کہ کہیں عمّال کی حرص و آز کا شکار نہ ہو جائے رہی بادشاہ اور امرائے دربار کی خریداری تو وہ مقدار میں قلیل تھی اور اس کا انحصار زیادہ تر وقتی وضع یا دل کی موج پر تھا۔ بہرحال، باہر سے مال لانے والوں میں مقابلہ ہوتا تو ہندوستانی خریدار

فائدے میں رہتے اور اگر کہیں اجارہ قائم ہو جاتا تو خریداروں کا نقصان تھا۔ خود
ہندوستان سے جو مال دساور جاتا اس کی قیمت سونے چاندی میں وصول کی
جاتی تھی لیکن ان دھاتوں کی درآمد ملک کی مجموعی سمائی سے زیادہ نہ تھی اور
ان کی کھپت سے نرخِ اجناس کی عام اوسط میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا
اگرچہ بنگالے میں یکایک تجارت کی توسیع سے بازار گر کے اُسی کے قریب
آگیا جو سواحل پر عام طور سے نرخ تھا؛

رہی برآمد، تو ولندیزوں اور انگریزوں کی سرگرمیوں کا بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ
ہندوستان کے نیل، لٹھا، شورہ، خام ریشم اور بعض متفرق اشیا کے جو
بذات خود زیادہ اہم نہ تھیں، تیار کرنے والوں کے ہاتھ نئی اور وسیع منڈیاں
آگئیں۔ ہندوستانی تاجروں نے کوئی کارگر کوشش نہ کی تھی کہ ان منڈیوں تک ۲۹۹
مال پہنچایا جائے اور پرتگیزوں کی ایک صدی پہلے کی تگ و دَو کے نتائج بھی
محدود و مختصر تھے۔ دوسرے جاپان میں ہندوستانی ریشم اور مغربی یورپ میں
ہندوستان کے لٹھے اور شورے کی نکاسی، قطعاً ایک جدید تجارت تھی اور
اسی طرح یورپ میں نیل کا استعمال جس قدر اس زمانے میں زیادہ ہو گیا، اس
لحاظ سے اسے بھی جدید تجارت کے نام سے یاد کرنا بیجا نہو گا؛ اس کے
مقابلے میں بے شبہ کچھ روز کے لئے مرچ کی برآمد گھٹ گئی لیکن یہ خسارہ
نئی تجارت کے صرف ایک جزوِ قلیل کے مساوی تھا؛ مجموعی طور پر ہندوستان
کو جو نفع ہوا، وہ خاص خاص مقامات سے مختص تھا جہاں زائد مال کی بہم رسانی
ہو سکی، اور آبادی کے صرف چند گروہوں کو اس سے اچھی اُجرت پر مزدوری
مُیسّر آگئی۔ ان خاص مقامات کے نفع کو بلا مبالغہ بہت معقول بتا سکتے ہیں مگر
سارے ملک پر پھیلایا جائے تو اس کا مشکل سے کوئی نمایاں نفع ظاہر
ہو سکتا ہے؛

قیمتی دھاتوں کی ہندوستان میں پیہم مانگ دیکھکر فرنگی تاجروں کو
خواہی نخواہی ایشیائی ممالک میں مال ادھر سے اُدھر لے جانے میں بھی حصّہ لینا
پڑا۔ ممکن ہے کہ ان سرگرمیوں نے ہندوستان کی اشیا کے اقطاع میں برآمد کو

باب دہم

نسبتہً پہلے سے زیادہ بڑھا دیا ہو لیکن گو میرے خیال میں اس بات کا زیادہ قرینہ نہیں پایا جاتا، تاہم اس میں شک نہیں کہ فرنگی تاجروں کی اِس تگ و دَو سے جہازرانی کے پیشے میں بہت کچھ تغیرات رُونما ہوئے۔ اِن تغیرات کا سب سے زیادہ اثر پرتگیز مالکانِ جہاز پر پڑا کہ گذشتہ صدی میں انھیں جس قدر کام مل گیا تھا وہ بہت کچھ ہاتھ سے جاتا رہا مگر ہندوستانی مالکانِ جہاز بھی نقصان اٹھائے بغیر نہیں رہے اگرچہ یہ نقصان مختلف خطّوں میں کم و بیش اور غالباً گجرات میں سب سے زیادہ تھا۔ اسی کے ساتھ ہندوستان سے باہر مال بھیجنے والوں کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انھیں بہتر جہاز مل گئے جن کا کرایہ رقیبانہ سرگرمی کی بدولت بڑھنے نہ پاتا تھا؛

الغرض، فرنگیوں کی کوششوں کا فوری اثر مقامی اور جزوی ہوا اور اگر جہازسازوں یا مالکانِ جہاز یا کاشتکارانِ مرچ اُن کی وجہ سے نقصان میں رہے تو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ نیل اور کپاس کی کاشت کرنے والوں، شورہ اور ریشم تیار کرنے والوں اور جلاہوں کو، نیز خشکی پر مال لانے لیجانیوالوں اور باہر مال دساور بھیجنے والوں کو ان کے آنے سے بہت معقول فائدہ پہنچا اور مجموعی طور پر یہ گروہ، خسارہ اٹھانے والوں کی نسبت کہیں زیادہ باوقعت تھے۔ غرض ہندوستان کے فائدے ہی کا پلڑا جھکا ہوا تھا اگرچہ میری رائے میں یہ فائدہ اتنا کثیر نہ تھا کہ اس سے قومی آمدنی کی میزان میں
کوئی خاص اضافہ ہو جاتا؛ ۳۰۰

مزید برآں ایک نئی تجارتی تنظیم قائم ہونے سے بھی ہندوستان فائدے میں رہا کہ اس نے ہندوستان کی اجناس کو مغربی یورپ کی منڈیوں سے زیادہ قریب کر دیا اور ہمارے پیشِ نظر عہد کے آخر میں یہ بات عملاً یقینی ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہندوستان کو فروخت کرنا ہو، وہ لندن، پیرس اور ایمسٹرڈم کے بازار میں آجائے گا۔ اسی کے ساتھ کمپنیوں میں باہم جو رقابت تھی، وہ عموماً بیچنے والوں کو اچھے دام دلوا دیتی تھی۔ اس طرح بیرونی تعلقات قائم ہو جانے سے وقت کے وقت معقول نفع اور آیندہ زیادہ فائدے کی امید

بندھ گئی ہے؛

اس کے برعکس اندرونی طاقتیں جو عمل کر رہی تھیں، وہ تمام تر نقصان رساں تھا۔ ملک کی مختلف حکومتیں کاسبین سے اس قدر زیادہ مطالبات کرتی تھیں کہ اگر انہی ارباب بست وکشاد کو ملکی دولت کے تقسیم کرنے میں سب سے اہم عنصر قرار دیا جائے، تو مطلق مبالغہ نہ ہوگا۔ اجمالاً یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کے مطالبات خود کاسبینِ دولت کے پاس محض قوت لایموت کے علاوہ اگر کچھ باقی بھی چھوڑتے تھے تو وہ بہت کم ہوتا تھا ورنہ تمام فاضل روپیہ ایسی محنت یا جدت طرازی کے انعام میں لگا دیا جاتا تھا جو غیر مثمر کاموں میں خرچ ہوتی تھی۔ ہندوستان کے جنوب میں ہمارے عہد کے اوّل سے لے کے آخر تک نظم ونسق کا یہی رنگ رہا اور اس میں قابل تحریر تبدیلیاں بہت کم ہوئیں۔ یعنی کاسبین پر دباؤ برابر بڑھتا چلا گیا کیونکہ مقامی عمّال کو طرح طرح سے طمع اور قہری تحریک ہوتی تھی کہ آمدنی کا ہر ممکن ذریعہ تلاش کریں اور جو ذرائع پہلے سے موجود و متداول تھے ان پر زیادہ سے زیادہ مطالبہ بڑھاتے چلے جائیں۔ بہرحال، مجموعی طور پر یہ نظام غیر متغیر تھا اور ہمارے پیش نظر عہد کی ابتدا ہی میں اس کی شدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دباؤ میں کوئی خاص اضافہ کیا جاتا تو یا لوگ بھوکے مرنے لگتے یا بغاوت ہو جاتی ہے؛

برخلاف اس کے، شمال کے نظامِ اقتصادی میں واضح طور پر تغیر رونما ہوا۔ اکبر کے مالی آئین اگرچہ جدید معیار کی رو سے بہت سخت تھے، تاہم وہ خلافِ انصاف نہ تھے اور انکا عمل تباہ کن نہ تھا۔ مگر اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہ آئین قائم نہ رہ سکے اور پیداوار پر بلاواسطہ مطالبہ بہت زیادہ بڑھا دیا گیا اور اُدھر انتظامی طریقوں میں برابر انحطاط ہوتے رہنے سے یہاں کے حالات بھی

[ہ ۱] جو عجیب اور خوف انگیز نتائج لائق مصنف نے استخراج کئے ہیں، اُن سے بالواسطہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر سے قبل یا تو ہندوستان میں آبادی کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا تو سوائے چند کے باقی سب لوگ بھوکے مرتے تھے؛ مترجم

بابُ ۴

قریب قریب ویسے ہی ہوتے چلے گئے جیسے جنوب میں تھے ۔ ان تغیرات کا نتیجہ ہمعصر شواہد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کی سعی و محنت، مثمر کی بجائے غیر مثمر مشاغل میں صرف ہونے لگی ۔ یہ عمل لازماً روزافزوں خرابی کا باعث ہوا اور اس نصف صدی کی سب سے ممتاز اقتصادی حقیقت، میرے خیال میں یہی ہے ۔ تقریباً سارے ہندوستان میں یہی میلان تھا کہ پیداوری کی اُجرت کو گھٹاتے گھٹاتے ایسے نقطے پر پہنچا دیا جائے، جہاں اس میں کسی ترغیب و تشویق کی گنجائش باقی نہ رہے ۔ اور ساری کوشش و ذہانت اُس جد و جہد میں صرف کی جاوے جو دوسروں کی پیداوار سمیٹنے کے لئے جاری تھی ۔ اور اسطرح ملک کو دوالیہ بنانے کا سامان کیا جائے جیسا کہ بالآخر ہو کے رہا ۔

یہ ہیں وہ نتائج، جو زیر نظر شواہد سے مَیں نے استخراج کئے ہیں ۔ یہ سوال ابھی باقی رہتا ہے کہ آیا یہ بیان معقول طور پر مکمل بھی ہے یا نہیں ۔ یا بعض اہم تغیّرات ایسے نظر انداز ہو گئے، جن کی تحریری شہادت موجود نہیں ؟ جہاں تک پیداآوار اور حمل و نقل کے شعبوں کا تعلق ہے، اس سوال کا جواب یقین کے ساتھ دیا جا سکتا ہے ۔ ولندیزوں اور انگریزوں کی تجارتی کوششیں عملاً اس پورے میدان پر حاوی ہیں اور ان کے ماہرین نے ہر جنس اور ہر ذریعہ حمل و نقل کی پوری پوری تحقیقات اور بحث کی ہے جس میں لگے بندھے طریقوں کی پابندی نہیں کی گئی بلکہ کمال سرگرمی سے ہر طریقے اور تدبیر کو چھانا گیا ہے، جس کے ذریعے فائدے کا کوئی امکان تھا ۔ اور یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ ان تلاش کرنے والوں کی نظر سے کوئی اہم اور نئی اقتصادی صورت چھوٹ گئی ہو ۔ درآمدہ اشیا کی کھپت کے بارے میں بھی یہی جواب یقیناً درست ہے کہ یہ تجارت بیشتر بیرونی سوداگروں ہی کے ہاتھ میں آگئی تھی ۔ قیمتی دھاتوں کا استعمال کم کرنے کی غرض سے انھیں تجارت درآمد کو ہر ممکن طریقے سے بڑھانا پڑا ۔ اس سے جو کچھ قلیل نتائج ہمارے علم میں آئے، انہی کو یہ سمجھنا کہ پورے میدان پر حاوی ہیں، احتیاط کے خلاف نہ ہوگا ؟ اب صرف یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ خود ہندوستانی مال کی ہندوستان کے اندر کھپت میں کمی بیشی ہوئی ہو جو معرض تحریر میں نہیں آئی

انگریز اور ولندیز اندرونی بری تجارت میں اس وقت تک کوئی بڑا حصہ نہیں لے رہے تھے، اگرچہ وہ ساحلی تجارت کی اکثر شاخوں سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا ہوسکتا ہے کہ ایسے اندرونی تغیرات ہوئے ہوں، جو ان کی تحریر میں نہیں آئے لیکن اس قسم کے کسی بڑے تغیر کا قیاس کرنا، دشوار ہے۔ اس عہد کے وقائع اور رسائل میں مجھے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا اور معاشرت کے معیار میں بھی کسی ردوبدل کے آثار نہیں پائے جاتے۔ دوسرے لوگوں میں خرچ کرنے کی استطاعت بہرحال اس قدر کم تھی کہ ہمارا قیاس ایسے ہر امکان کے خلاف ہی جاتا ہے یہ تو ہم گمان کرسکتے ہیں کہ بعض جُلاہوں، شورہ سازوں یا نیل کاشت کرنیوالوں کی ایسی حیثیت ہوگئی کہ وہ پہلے سے زیادہ کھانے پینے یا لباس اور زیور پر کچھ زیادہ خرچ کرنے لگے لیکن ظنّیات کے میدان میں اس سے آگے قدم بڑھانے کی گنجائش نظر نہیں آتی ؎

بہرنوع، یہ واقعہ براہ راست شہادتوں سے ثابت ہے کہ معاشرت کا معیار پست اور لوگوں کو خرچ کرنے کی استطاعت بہت کم تھی۔ اور غالباً اس تحقیقات کو ختم کرنے کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ وہ اقتصادی نظام جس نے مذکورہ بالا نتائج پیدا کئے، اُسے محدود ترین شکل میں معائنہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اب، فرض کیجیے کہ ایک جماعت میں پانچ افراد تو ایسے ہیں جو اپنی کمائی سے پیٹ بھرتے ہیں اور ان کی آمدنی ایک دوسرے کے مساوی ہے، اور ان میں ایک چھٹا فرد ایسا ہے جو کچھ نہیں کماتا بلکہ صرف خرچ کرتا ہے اور اسے ہم پاسبان یا طفیلی کہہ سکتے ہیں۔ اس شخص کا پیٹ بھرنے کے لئے ظاہر ہے کہ دوسرے پانچوں افراد کو اپنی کمائی کا ایک چھٹا حصہ اسکے حوالے کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس مساوی تقسیم کی بجائے ہم عہدِ شاہجہاں کی مالگزاری کا حساب پھیلائیں، جس میں ہر کاسب کو ایک سُدس کی بجائے یک نصف حوالہ کرنا پڑتا تھا، تو اس صورت میں پاسبان یا طفیلی کی آمدنی کمانے والوں سے پانچ گنی ہو جائے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ اگر اس پاسبان یا طفیلی کی زندگی دوسرے اعتبارات سے بُری نہیں گزرتی، تو باقی

پانچ کمانے والے بھی یہی کوشش کریں گے کہ کسی طرح وہ اُس طفیلی کی جگہ لے لیں۔ اب اس مثالیہ جماعت کو تقریباً چالیس لاکھ سے ضرب دیجیے (یعنی دو ڈھائی کروڑ گھرانے فرض کیجیے، جو میرے خیال میں اُس زمانے میں ہندوستان کی تخمینی آبادی کا پیمانہ ہے) تو ہمارے پیش نظر عہد کے ہندوستان کا گویا اقتصادی ڈھانچ تیار ہو جائے گا؛[1] اس وقت کے مزارعین

۲۰۳ اور اہل حرفہ کی معاشرت قریب قریب ایک ہی سطح پر تھی اور گو ہنر مندی یا خوش نصیبی کے باعث انفرادی فرق کا ہونا لازمی امر ہے، تاہم یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ حدِ توسط سے جس قدر بیشی ہوگی اسی قدر کمی بھی ہوگی اور نظر برایں ہم جمہور اہل ہند کو یک رنگ خیال کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کاسبین کے مقابلے میں طفیلیوں کا تناسب صحت کے ساتھ متعین نہیں کیا جا سکتا لیکن جو تعداد میں نے فرض کی ہے وہ میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ پیش نظر عہد میں شہروں یا لشکروں کی تعداد میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا کیونکہ ایک مقام کی ترقی کے مقابل میں دوسری جگہ تنزل کی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ زراعت پیشہ تھا، اور اہل حرفہ کا تناسب بھی کچھ کم نہ ہوگا۔ نظر برایں صحتِ اعداد کی کوشش کئے بغیر، یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ نسبتہً کاسبین کی کثیر تعداد اپنی کل آمدنی کا نصف اقتصادی طفیلیوں یا آکلین کی نسبتہً قلیل تعداد کے نذر کر دیتی تھی۔ مگر یہ دوسرا گروہ یک رنگ نہ تھا بلکہ اس میں بڑے سے بڑے امیر سے لے کے، ذلیل غلام تک داخل تھے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے طفیلی اسی معیار پر زندگی بسر کرتے تھے جو عام کاسبین کا تھا۔ لہٰذا وہ بہت ہی قلیل جماعت تھی جو فاضل پیداوار خود لینے کی جد و جہد میں سرگرم کار رہتی تھی۔ اس طرح بہت کثیر آمدنی نہایت قلیل التعداد حریفوں میں

---

[1] ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے، تقریباً نو کاسبین کے مقابلے میں ایک طفیلی کا اوسط نکلتا ہے اور اسکا ہمارے مفروضہ تناسب ۵:۱ سے فرق ظاہر ہے۔

تقسیم ہوتی تھی اور چونکہ پس انداختہ سرمایہ مرتے ہی ضرور ضبطی میں آجاتا تھا اس واسطے جو کچھ حصہ ہاتھ آتا، وہ اسی قدر جلد خرچ کر دیا جاتا تھا۔ یہی اسباب تھے کہ ہندوستان کے امرا ایسی مسرفانہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے جسے دیکھکر باہر والے حیران رہ جاتے۔ اور اس طرح ملک کی فاضل آمدنی غیر مثمر کاموں میں برباد ہوتی رہتی تھی۔ ادنی درجے کے طفیلی، اگرچہ کاسبین کے ہم سطح زندگی بسر کرتے تھے، تاہم بعض اہم اعتبارات سے ان کی حالت بہت بہتر تھی۔ مثلاً اگر کبھی فصل خراب ہوجائے تو گو حبیر اسی کو غلہ گراں ملنے لگتا تھا لیکن کاشتکار کے شاید جورو بچوں تک کے بکنے کی نوبت آجاتی تھی۔ اور ہمارے پیش نظر عہد میں نظم و نسق میں جو تغیر واقع ہوا، اُس نے یہ فرق اس درجے تک بڑھا دیا کہ کاسبین کی زندگی بالکل جینے کے قابل نہیں رہی۔ محنت اور آفاتِ ارضی و سماوی سے کشمکش تو اُن کے حصے میں آتی اور کمائی بیشتر چند طفیلیوں کو عیش اڑانے کے لئے یا طفیلیوں ۴ کے ایک دوسرے بڑے گروہ کے کام آجاتی جو نسبتہً چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ نکھٹو آبادی عامتہً شہروں یا چھاونیوں میں رہتی تھی اور کمائی کرنیوالے زیادہ تر دیہات کے باشندے تھے۔ لہذا، ایک دوسرے پیرائے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے کا اقتصادی نظام شہری آبادی کو اصل مالیت سے کم قیمت پر اسباب معاشرت بہم پہنچانے کا باعث بن گیا تھا۔ فصل پر اجناس کی کثرت آج تک ہندوستان میں متعارف ہے جب کہ تناسب سے زیادہ پیداوار کو چند ہفتوں میں دکانداروں کے حوالے کر دینا پڑتا ہے تاکہ ادائے مالگزاری کے لئے زر نقد ہاتھ آجائے۔ ظاہر ہے کہ اس مجبوری میں بیچنے سے کاشتکاروں کو کم تر داموں پر قناعت کرنی پڑتی تھی اور جس زمانے کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، اس وقت ایسی افراطِ اجناس کا بار بار واقع ہونا یقینی[1] ہے کیونکہ پیداوار، آج کل کی نسبت زیادہ اور خریداری

---

[1] مالگزاری زر نقد میں ادا ہوتی یا غلے کی صورت میں، مذکورہ بالا بیان دونوں صورتوں میں

کم تھی اور ادھر مالگزاری ادا نہ کرنے کی صورت میں کہیں زیادہ سخت سزا پانے کا خوف رہتا تھا۔ غرض ہر فصل پر زر نقد کی فوری ضرورت پیش آتی اور بیوپاری جن کے پاس روپیہ ہوتا، من مانی قیمتوں پر اجناس خرید کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ خود ان بیوپاریوں کو ضروری تھا کہ آیندہ فصل تک روپے کی فراہمی کرلیں، اور چونکہ شہری آبادی نسبتۃً قلیل تھی، لہذا ان شہریوں کو کم قیمت پر پیداوار مل جاتی تھی حالانکہ اگر منڈی پر یہ قیود نہ ہوتیں تو انھیں زیادہ دام ادا کرنے پڑتے۔ ہندوستان کے شہروں میں اجناس خوردنی کی ارزانی منجملہ ان امور کے تھی جسے شروع ہی میں دیکھ دیکھ کر پردیسی نووارد حیرت میں رہ جاتے اور عموماً ملک کی زرخیزی کو اس ارزانی کا سبب قرار دیتے تھے۔ لیکن ہمیں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ طریق مالگزاری کا عمل بھی کم سے کم ایک اتنا ہی قوی سبب تھا کہ دیہات والوں کی کمائی کا ایک بڑا حصہ شہروں میں منتقل ہوجاتا تھا؛

اس قسم کا اقتصادی نظام تھا، جو ہمارے پیش نظر عہد کے آخر میں تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ اس زمانے کے پارچہ باف خود ننگے رہتے اور دوسروں کو لباس پہنانے کے لئے عرقریزی کرتے تھے۔ کسانوں کا اپنا پیٹ نہیں بھرتا تھا مگر قصبات اور شہروں کو کھلانے کے لئے اپنی جان ۳۰۵ پیلتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی، ہندوستان سونے چاندی کے بدل میں کارآمد اجناس فروخت کرتا تھا۔ یا، دوسرے لفظوں میں، روٹی دے کے پتھر لے لیتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ درست ہوگا۔ شاہی خزانے کو بہرحال چاندی درکار تھی۔ ممکن ہے بعض صوبوں میں غلہ جو مالگزاری میں ملتا، وہیں کی مقامی ضروریات کے لئے (بطور تنخواہ عہدہ داراں) چھوڑ دیا جاتا ہو، مگر اس کا زیادہ حصہ لامحالہ فروخت کردیا جاتا تھا کہ خزانے کو زر نقد ایصال کیا جاسکے۔ اور غلے کی خرید کے وقت بیوپاری لوگ اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھتے ہونگے؛ سرکاری طور پر خود کاشتکاروں سے مالگزاری زر نقد میں لینے کے احکام تھے لیکن غالباً مقامی مستثنیات برابر موجود رہیں؛

زن و مرد فصل بہ فصل فاقہ کشی کے کنارے زندگی بسر کرتے اور جب تک کھانے کو موجود رہے، خوش رہتے تھے۔ مگر جب خوراک بھی نہ ملے جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، تو پھر ان کی نجات بردہ فروش کے ہاتھ میں تھی اور یا مردم خواری، خودکشی، فاقہ کشی کی صورتیں باقی رہ جاتی تھیں۔ اس نظام سے گلوخلاصی کی ایک ہی شکل تھی کہ پیداوار میں اضافہ اور معاشرت کا معیار بلند ہو جائے۔ مگر نظم و نسق کے جو طریقے رائج تھے، انھوں نے اس راستے کو روک رکھا تھا، پیداوری کو جرم بنا دیا تھا۔ اور رعایا کے خرچ ذرا بھی بڑھنے کو مزید زرستانی اور تعدی کا نیا حیلہ سمجھ لیا تھا۔ جس عہد کا حال میں نے لکھا ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ان طریقوں میں اور توسیع اور شدت آتی گئی۔ آئندہ صدی کا قصہ اس نظام کی آخر میں بربادی اور پھر تبدریج تغیر کا قصہ ہے جس نے آگے چل کر ایک جدید اقتصادی نظام کا قائم ہونا ممکن بنا دیا۔

ضمیمہ الف ۳۰۷

ولندیزی اور انگریزی کمپنیاں

جو کتاب ہندوستان کی اقتصادی تاریخ سے بحث کرے، فرنگی تجارتی کمپنیوں کا آئین و انتظام اس کی حدود میں داخل نہیں ہے لیکن اس مضمون سے کچھ نہ کچھ واقفیت اس لئے درکار ہے کہ پیشِ نظر عہد کے تجارتی ماخذ، جو ان کمپنیوں کی تحریروں پر مشتمل ہیں، سمجھ میں آجائیں اور ان جزئیات سے شناسائی ہو جائے جن سے زمانۂ حال کے عام ناظرین غالباً بالکل ناآشنا ہوں گے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ گذشتہ تین صدی میں مختلف اصطلاحات کے معنی بدل گئے ہیں۔ خود لفظ کمپنی سن کر ذہن میں جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ درست نہیں اور حصہ داروں کا ذکر بھی بعض اعتبار سے غلط مفہوم سمجھا دیتا ہے۔ اسی طرح سرمایہ اور منافعے کے الفاظ بولنا بھی خدشے سے خالی نہیں ہے؎

ایک محدود ذمہ داری کے ساتھ مشترکہ سرمایے کی شرکت یا کمپنی کے وجود میں آتے آتے بہت دیر لگی۔ اور انگلستان میں یہ شے ہنوز زیادہ ترقی نہ کرنے پائی تھی جب کہ سنہ ۱۶۰۰ کے آخری دن "بعض قسمت آزما" ایک مشترکہ جماعت کی صورت میں شیرازہ بند ہو گئے جس کا مقصد یہ تھا کہ "شرق الہند سے

تجارت کی راہ نکالی جائے۔" اُن دنوں تجارتی کمپنیوں کے متعلق قوانین کا کوئی وجود نہ تھا، نہ طریق عمل کی صورتیں مسلم تھیں اور نہ حساب کتاب کے قواعد۔ اور ہر چند یہ کمپنی کوئی نرالی چیز نہ تھی تاہم زمانہ حال کے محاورے میں بھی اسے قسمت آزمائی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کی حقیقت یہ تھی کہ بعض سوداگروں نے ایک ایسی تجارت میں جس کا انھیں تجربہ نہ تھا، روپیہ جوکھوں میں ڈالنے یا توکل پر لگا دینے کا فیصلہ کیا اور بادشاہ کو درخواست دے کے اجازت نامہ جسے آجکل منشور کہیں گے، حاصل کر لیا اس کی رو سے وہ باضابطہ ایک مشترکہ جماعت بن گئے، ان کی کارروائیوں کے قواعد اور خاص خاص امتیازات منظور کئے گئے جن میں ایک مقررہ زمانے تک تجارت کا اجارہ بھی شامل تھا۔ سب سے پہلے جنھوں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا تھا، وہی شاہی اجازت نامے کی رو سے اصلی ارکان کمپنی قرار پا گئے لیکن یہ خصوصیت قائم نہیں رہی۔ جیسا کہ فرمان شاہی میں مذکور ہے کمپنی ایک جماعتِ رفقا بن گئی تھی اور اس کے ارکان اخوان یا احرار کہلاتے تھے۔ کمپنی کا داخلہ یا حرّیت، وراثت، خدمت یا ادائے زر نقد (جو تاوان کہلاتا تھا) کے مسلمہ طریقوں سے حاصل ہو جاتی تھی۔ شرکا، سرمایہ لگانے پر مجبور نہ تھے اور اس اعتبار سے کمپنی ان ارکان پر مشتمل تھی، جو اس کے کاموں میں حصہ لینے کے مجاز تھے، پابند نہ تھے[1]۔ ان میں قسمت آزما (یا سوداگر) کسی خاص وقت میں وہی شرکا سمجھے جاتے تھے، جنھوں نے روپیہ لگایا ہو مگر کمپنی کا سرمایہ مستقل نہ تھا اور جس روپے سے تجارت کی جاتی وہ اس کے شرکا کی تغیر پذیر جماعت کا ہوتا تھا۔ تغیر پذیر کا لفظ کہنا اس لئے درست ہے کہ یہ سوداگر اول اول خاص خاص مقاصد اور تھوڑے زمانے کے لئے

---

[1] کسی تجارتی کام کے لئے یہ لازم نہ تھا کہ جو شرکا یا احرار داخل ہیں، وہی حصہ لے سکیں مثلاً ۱۶۰۷ء میں دربار نے فیصلہ کیا کہ اگر چوتھے سفر بحری کے مصارف "پرانے قسمت آزما" فراہم نہ کر سکیں تو بادشاہی رعایا کا کوئی فرد بھی روپیہ دے کر شریک ہو سکتا ہے (کورٹ منٹس ۱۳ مئی ۱۶۰۷ء) اور ایسے روپیہ دینے والے غالباً آگے چل کے باقاعدہ احرار بنا لئے جاتے تھے۔

مقرر ہوتے تھے۔ ابتدا میں قسمت آزمائی صرف ایک بحری سفر کے لئے ہوا کرتی تھی۔ جتنا سرمایہ جمع ہوتا، وہ جہازوں اور مال کی خرید میں صرف کردیا جاتا۔ اور جب جہاز واپس آتے تو انھیں بیچ کے حساب ختم کردیا جاتا تھا۔ اس طریق پر یکے بعد دیگرے ۱۲ سفر کئے گئے۔ ہر ایک کا علیحدہ سرمایہ جمع ہوا اور ہر ایک میں حصہ لینے والوں کی جماعت علیحدہ مرتب ہوئی اور ہر سفر کے ختم پر جو کچھ منافع ہوا، وہ ان قسمت آزماؤں میں تقسیم کردیا گیا؛

مگر یہ علیحدہ علیحدہ بحری اسفار کا طریقہ نہایت دقت طلب ثابت ہوا کیونکہ، جیسا کہ باب دوم میں صراحت کی گئی ہے، ایشیائی ہنڈیوں کی حالت متقاضی تھی کہ گماشتے برسرموقع موجود رہیں اور جب اچھا وقت دیکھیں، اسوقت مال کی نکاسی کریں اور جہازوں کے آنے سے قبل مال جمع کر رکھیں۔ لہذا ۱۶۱۳ء میں ایک مشترکہ سرمایہ فراہم کیا گیا جس نے ۱۶۱۶ء تک سارے کاروبار کا بیڑا اٹھایا۔ اور اس کے بعد بھی ۱۶۴۰ء تک دو بار اسی قسم کے مشترکہ سرمائے فراہم ہوئے۔ اس آخرالذکر سال میں یہ تجارت انگریزوں کی نظر میں اتنی دلکش نہیں رہی جتنی شروع میں تھی۔ ولندیزی مقابلہ شدید اور کامیاب ہورہا تھا۔ منافع کم ہوگیا۔ شاہ چارلس اول نے ایک اور حریف جماعت کی ہمت افزائی کی جو کورٹین کی انجمن کے نام سے مشہور ہے۔ ادھر انگلستان کی سیاسی حالت ایسی تھی کہ طویل قسمت آزمائی کے کاموں میں روپیہ لگانا مناسب نہ معلوم ہوتا تھا، غرض نئے سرمایے کے واسطے کافی روپیہ مہیا نہ ہوسکا اور ۱۶۴۲ء میں پھر وہی واحد سفر (جسے اُن دنوں عام سفر کہنے لگے تھے) کا طریقہ شروع کیا گیا۔ اسی سال، آخری مہینوں میں ایک اور مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کی کوشش کی تھی مگر بہت ناکافی رقم جمع ہوئی۔ ۱۶۴۶ء میں پھر عام سفر کا بیڑا اٹھایا گیا اور ۱۶۵۰ء میں متحدہ سرمایہ مشترکہ ۳۰۹ میں بعض ایسے سوداگر بھی شریک ہوگئے جو اس وقت تک اس کمپنی سے الگ رہے تھے؛ مگر یہ سرمایہ بھی چند سال میں ختم ہوگیا۔ ۱۶۵۵ء میں چندہ

کافی نہ ملا اور کئی سال تک قریب قریب بے قید تجارت ہوتی رہی جس کے معنی یہ ہوئے کہ کمپنی کی بجائے بیوپار افراد کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ۱۶۵۷ء میں ایک تازہ فرمان شاہی ملا تو پھر سرمایہ جمع ہونے لگا اور جدید شرکت عامہ تقریباً ۷½ لاکھ پونڈ کے سرمایے سے شروع کی گئی جس میں سے آخر میں صرف نصف روپیہ کاروبار میں لگایا گیا۔ بخلاف سابق اس دفعہ غیر معین زمانے کے لئے تجارت کا بیڑا اٹھایا گیا تھا اور چونکہ اس مرتبہ لندن میں حصّوں کی باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی تھی، لہٰذا یہ مستقل کاروبار بن گیا اور رقم واپس لینے کی بجائے قسمت آزما چاہتے تو اپنے حصّے دوسروں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے اسطرح کمپنی کا سرمایہ بالحصص وجود میں آیا؛

کمپنی کا طریق کار ایسا تھا کہ ہمارے پیش نظر زمانے میں جو منافع اس نے تقسیم کیا ہو، اس کا صحت کے ساتھ حساب بتانا غیر ممکن ہے۔ جب ایک یا زیادہ جہاز ٹیمز میں آجاتے تو عام طور سے اسی وقت زرنقد یا بعض اوقات نیل، لٹھا وغیرہ اجناس کی صورت میں متعلقہ حصہ داروں میں اسے تقسیم کر دیا جاتا اور اس کے علاوہ بعد میں بھی مختلف اوقات میں تقسیمیں ہو سکتی تھیں بعض صورتوں میں ہمیں وہ مدّت بھی معلوم نہیں جس کے لئے سرمایہ فی الواقع کام میں لگایا گیا تھا۔ بایں ہمہ اتنا یقینی طور پر معلوم ہے کہ گو پہلے دس بارہ برس میں، جب تک علٰحدہ ایک ایک سفر کے ذریعے بیوپار ہوتا رہا، تو کمپنی کو بے حساب نہیں تو مزے مزے کے فائدے ضرور حاصل ہوئے مگر ابتدا میں مشترکہ سرمایے سے کام شروع کرتے ہی پہلی دفعہ نفع بہت کم رہ گیا، دوسری اور تیسری دفعہ کے سفر میں تقریباً کچھ ہاتھ نہ آیا اور چوتھی دفعہ نصف سرمایہ ہی ڈوب گیا۔ ان واقعات کی تفصیل جو کمپنی کے کاغذات میں مرقوم ہے

لہ میکفرسن اپنی ہسٹری اوف یوروپین کومرس (ص ۲۰،) میں لکھتا ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ بحری سفروں میں جو منافع ہوا وہ تخمیناً بیس فیصدی کے اندر تھا۔ مگر اسے مصنّف "مشکل سے جوکھوں کی کم سے کم قیمت" سمجھتا ہے؛

ضمیمہ الف

حسب ذیل ہے:۔

پہلے اور دوسرے سفر، آگے چل کے متحد ہو گئے اور ان سے ۹۵ فیصدی کے ابتدائی سرمایے پر پیشگی رقم مل گئی جسے اُس مدت پر تقسیم کر دیا گیا جسکے واسطے کل سرمایہ لگایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ نفع کی سالانہ شرح کا کل مدت پر ہی انحصار نہیں ہے بلکہ اس پر بھی کہ نفع ہم سرمائے کے واپس آجانے پر محسوب کرتے ہیں یا ہر تقسیم کے وقت جو نفع ملا، اس کے تناسب پر۔ اسی طرح اور بھی امور قابلِ لحاظ ہیں۔ بہر حال، تیسرے اور پانچویں سفر میں، کہ یہ بھی بالآخر متحد ہو گئے تھے، ۲۳۴ فیصدی نفع ملا۔ لیکن چوتھے میں کامل نقصان ہوا کہ جہازوں کو طوفان نے پھینک دیا۔ اور یہ حقیقت اوسط نفع نکالتے وقت، ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے آیندہ سات (یعنے چھٹے سے بارھویں تک) سفروں میں جو نفع تقسیم ہوا، اسکی مقدار ۱۲۰ تا ۲۲۰ فیصدی تھی۔ اس کے قابل اطمینان سمجھے جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے بعد پہلی مرتبہ جو مشترکہ سرمایہ جمع ہوا اس کی مقدار بہت زیادہ (یعنی ۲۱۰ چار لاکھ پونڈ) تھی؛ اس مقام سے نفع کا چڑھاؤ اترنا شروع ہوا کیونکہ ولندیزیوں سے کشمکش بڑھنے لگی تھی۔ پھر بھی اس شراکت کے تقریباً ۴ سال میں ۸۷½ فیصدی نفع دیا۔ لیکن دوسری شراکت سے صرف ۱۲½ اور تیسری سے ۳۵ فیصدی نفع ملا اور اگر زمانہ حال کے اصول پر انھیں جمع کر کے فی سال کا حساب لگائیے تو دو فیصدی کے قریب نفع نکلتا ہے؛ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ آیندہ قسمت آزمائی کے لئے سرمایہ جمع ہونے میں دشواریاں پیش آئیں اور چوتھی شراکت کی ناکامی نے انھیں اور بڑھا دیا کہ اس مرتبہ نصف سرمایہ ہی ڈوب گیا تھا۔ اور ہر چند شراکت متحدہ نے کچھ بہتر کامیابی پائی (کہ کل ۱۰۵ فیصدی کا نفع کمایا) تاہم یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۱۵ء سے ۱۶۵۵ء تک کمپنی فی الحقیقت کچھ کامیاب نہ تھی؛

ولندیزی کمپنی بعض اعتبار سے زمانہ حال کی کمپنی سے زیادہ مماثلت اور مطابقت رکھتی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں ابتدا ہی تقریباً ۵½ لاکھ پونڈ کی ایسی رقم تھی جسے خاصی طرح مستقل سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ

اپنے حصہ داروں کو جو روپیہ تقسیم کرتی تھی، وہ بھی زمانۂ حاضرہ کے منافع سے ضمیمہ ا
مشابہت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ امر کہ کبھی یہ منافع نقد، کبھی تمسک اور کبھی مصالحوں
کی صورت میں تقسیم ہوتا تھا، نفع کی ٹھیک شرح کا حساب کرتے وقت
پیش نظر رکھنا پڑے گا[1]۔ بایں ہمہ اس کمپنی کا نظام کچھ عجیب تھا۔ انتظامی جماعت
ایک معجون مرکب تھی جس کے معاملات میں حصہ داروں کو کوئی دخل نہ تھا۔
مختلف کارخانوں پر کمپنی مشتمل تھی لیکن اس اعتبار سے کہ ہر کارخانے کی کوٹھی
الگ الگ بڑی بندرگاہوں پر قائم تھی، یہ ایک دوسری سے علیحدہ اور بجائے خود
مستقل تھے۔ پھر ہر کوٹھی (یا چیمبر) کے الگ الگ ناظم ہوتے جو پہلی دفعہ تو
نامزد کردئے جاتے اور پھر جگہ خالی ہوتی تو خود ہی کسی کو نامزد کر دیتے جو صوبے
کی حکومت کی منظوری سے مقرر ہو جاتا۔ صدر جماعت سترہ اشخاص پر مشتمل تھی
جس میں ہر کارخانے سے مقررہ تعداد میں ارکان لے لئے جاتے تھے۔ انھیں
"ہفدہ ارکان" بھی کہا جاتا تھا۔ اس جماعت کے ہاتھ میں کمپنی کی حکمت عملی
تھی جس پر ہر بندرگاہ کی کوٹھی والے عمل درآمد کرتے تھے۔ مثلاً صدر جماعت
سالانہ بیڑے کی تعداد اور لوازم کا فیصلہ کرتی اور اس کا ایک حصہ مہیا کرنا ہر کوٹھی
کے ذمہ ہوتا تھا۔ یعنے جتنے جہاز طلب کئے جاتے، کوٹھی اسکا انتظام کرتی اور
جو کچھ مال یہ جہاز لاتے، انھیں فروخت کرنا بھی اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ اسطرح
عملاً کمپنی کا کاروبار کلیتہً ایک مخصوص گروہ کے قبضے میں تھا جو اپنی تعداد کی کمی
کو بہ اختیار خود پورا کرتا رہتا تھا۔ شاہی فرمان میں یہ بھی تحریر تھا کہ اگر صدر جماعت ۳۱۱
میں کوئی سنگین قضیہ پیدا ہو جائے تو اسے صدر حکومت میں پیش کیا جائے مگر
کمپنی کی تاریخ لکھنے والا اگر مجموعی طور پر یہ خیال ظاہر کرے کہ اس کے ناظم عملاً
بے قید و خود مختار تھے حصہ داروں کا کوئی دخل ہی نہ تھا اور حکومت کا دخل

---

[1] ابتدائی منشور کی رو سے حصہ داروں کو اختیار تھا کہ ہر سہ سالہ حساب کے بعد اپنا روپیہ واپس لے لیں۔ لیکن حصوں کی خرید و فروخت کے طریقے میں ترقی ہوئی اور عام طور پر حصے نفع سے بکنے لگے تو پھر یہ اختیار کچھ زیادہ اہم نہ رہا۔

ضمیمہ الف

محض برائے نام تھا، تو یہ قول کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کمپنی کے حسابات شائع تک نہ کئے جاتے تھے۔ ارکان یا حصہ داروں کے اس قسم کے جلسے بھی نہ ہوتے تھے جیسے انگریزی کمپنی کے اجلاس عام۔ اور کہا جاتا ہے کہ خود صدر جماعت کی کارروائیاں قلمبند نہ کی جاتی تھیں۔ اسی لئے کمپنی کے اصول اور وجوہِ عمل سے ہماری واقفیت ناقص ہے۔ آخر زمانے میں اسکے مالی معاملات مشکوک ہو گئے تھے اور معلوم ہوتا ہے بعض اوقات نفع اصل سرمایہ میں سے ادا کر دیا جاتا تھا۔ تاہم جہاں تک ہمارے پیش نظر زمانے کا تعلق ہے، یہ شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کہ ان ایام میں بھی ایسا ہوا ہو۔

ولندیز کمپنی کا ابتدائی زمانے میں یہ منافع جو وہ فی الواقع کماتی تھی، بہت زیادہ تھا۔ مختلف تحریروں میں جو رقوم دی گئی ہیں، وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتیں، تاہم سنہ ۱۶۰۵ سے سنہ ۱۶۰۹ تک + نفع کی اوسط کم از کم ۳۵ فیصدی ضرور تھی اور ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ رہی ہو۔ سنہ ۱۶۱۰ سے سنہ ۱۶۱۹ تک کمپنی کی آمدنی بیشتر مصالحے کے جزائر کا اجارہ لینے کی کشمکش میں خرچ ہوی۔ پھر بھی ان ایام میں اس کا نفع ۲۱ اور ایک دوسرے بیان کے مطابق ۲۸ فیصدی رہا۔ بعد کے پانچ عشروں میں، منافع کی اوسط، ۱۲ - ۲۰¾ - ۲۹ - ۱۸ اور ۱۴¾ فیصدی سالانہ رہی اور گو علیحدہ علیحدہ ہر سال کے نفع میں بہت کچھ کمی بیشی ہوتی تھی، بایں ہمہ اکثر سنین میں وہ نقد ادا ہوتا رہا۔ اور اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ اس پچاس برس کے بڑے حصے میں لندن کے ساہوکارے میں قرض کی شرح سود ۷ تا ۹ فیصدی تھی[1]، تو ولندیزوں کی یہ آمدنی قابل اطمینان کہی جاسکتی ہے مگر اس

---

[1] سنہ ۱۶۰۹ میں انگریزی کمپنی ۹ فی صدی یا کچھ کم پر قرض تلاش کر رہی تھی اور سنہ ۱۶۱۴ میں دس فی صدی پر اسے قرض ملتا تھا مگر آخر میں ۹ فی صدی پر اس نے لیا (کورٹ منٹس۔ فروری سنہ ۱۶۰۹۔ جنوری سنہ ۱۶۱۴) دس سال بعد اس نے سات اور آٹھ فیصدی اور سنہ ۱۶۳۵ میں ۶½ تا ۷ فیصدی شرح سود ادا کی (ایضاً۔ اگست سنہ ۱۶۲۴۔ و فروری سنہ ۱۶۳۵)۔

ضمیمہ

زیادہ کچھ کہنا درست نہ ہوگا۔ ولندیزی کمپنی کے بارے میں ایک اہم بات جو دلنشین رہنی چاہیے، وہ اس کا قومی ہونا ہے۔ اسے کئی پہلے کارخانوں کو ملاکر حکومت کے ایما سے قائم کیا گیا تھا ہر بڑی بندرگاہ کی طرف سے کمپنی کی صدر جماعت میں قائم مقام ہوتے تھے اور اسے یہ بھی اجازت دے دی گئی تھی کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ولندیزی حکومت کے نام سے عہد و پیمان کرلے۔ اور جب پہلا ۳۱۲ صدر ناظم (گورنر جنرل) مقرر کیا گیا تو اس کے اختیارات بہت کچھ ایک سرکاری عہدہ دار کے مماثل تھے اور ایشیائی معاملات میں اسے قریب قریب بالکل آزادی مل گئی تھی کہ جو حکمت عملی چاہے، اختیار کرے[1]۔ انگریزی اور ولندیزی حکومت کے مابین جو رسل و رسائل عرصۂ دراز تک ہوتے رہے، ان سے ان دونوں کمپنیوں کی حیثیت کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ سرکاری کاغذات کے مجلدات کے مطالعے سے جو خیال میں نے قائم کیا وہ یہ ہے کہ جیمس اول ایشیائی تجارت کی حفظ و حمایت کو ضروری تو سمجھتا تھا مگر یہ چیز اسکے نزدیک حکومت کے لوازم میں داخل نہ تھی۔ برخلاف اس کے، ہالینڈ کی ملکی مجلس اور تجارتی کمپنی اس طرح ملکر کام کرتی تھیں، گویا دونوں جماعت واحد کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ امبوے نا کے معاملے میں مجلس نے کمپنی کے عمال کے فعل کو مجرمانہ قرار دیا لیکن انکی سیاسی گفتگو کا اصلی مقصد یہ نہ تھا کہ انگریزوں کے مطالبات پورے کیے جائیں بلکہ یہ کہ جس طرح ہو، جو کچھ ہاتھ آگیا ہے، اسے نہ چھوڑا جائے اور اس میں انھیں جو کامیابی ہوئی، وہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ پھر یہ کہ انگریزی کمپنی کو اپنے

---

[1] لندن اور ہالینڈ میں وقتاً فوقتاً جو خط کتابت ہوئی، ان کی مثلوں سے ولندیزی کمپنی کے اقتدار و اختیارات کا صاف صاف پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ۱۶۲۲ء میں جبکہ انگریزی کمپنی اپنا کاروبار بند کر دینا چاہتی تھی تو ایک عام جلسے میں یہ عام رائے قلمبند کی گئی کہ ولندیزوں سے جو نقصان پہنچے ہیں انکی تلافی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی کیونکہ ہالینڈ کی حکومت کمپنی کے نظام سے ایسی مشترک اور متحد ہے کہ اگر کمپنی پر کوئی مقدمہ دائر کیا جائے تو خود حکومت مدعا علیہ بھی ہوگی اور وہی مقدمے کا فیصلہ بھی کریگی"۔ (کورٹ منٹس۔ ۲۰ جولائی ۱۶۲۲ء)

ضمیمہ الف

اسٹوآرٹ بادشاہوں سے امداد کے زبانی وعدے تو بے تکلف حاصل ہوسکتے تھے
مگر اس کے سوا اور کسی شئے کی امید نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں، ولندیز تاجر
اس یقین کے ساتھ کام کرتے تھے کہ انکی حکومت اُن کی پشت پر ہے اور انھوں
نے حکومت کے اندر جو طاقت حاصل کرلی ہے وہ اسے منقطع نہیں کرسکتی

ولندیزی تاجروں کا یہ رسوخ و مرتبہ ان کی تجارتی کامیابی کا ایک قوی
سبب تھا۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انھیں اپنے انگریز حریفوں پر یہ نمایاں فضیلت
تقدم زمانی، سرمایہ داری، حسنِ انتظام اور شاید بہتر قابلیت کا عملہ مقرر کرنے
کے باعث حاصل ہوئی تھی۔ انکا تقدم تو ظاہر ہے کہ ولندیز ایشیائی بازاروں
کا چھ سال کا تجربہ حاصل کرچکے تھے جب کہ انگریزی کمپنی کے پہلے جہاز جاوا پہنچے
اور ہر بندرگاہ میں جہاں انگریز محض اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوئے ولندیزوں
کو لوگ خریداروں کی حیثیت سے بخوبی جانتے پہچانتے تھے۔ مالی اعتبار سے
ایک معقول و مستقل سرمائے کا ہونا ولندیزوں کی قوت کا سبب تھا جس کا
فرق انگریزوں کے مقابلے میں کھلا ہوا ہے کہ انھیں ہر جداگانہ سفر کے لئے
چندے جمع کرنے پڑتے تھے اور اس طرح مصالحوں کے جزائر کی کشمکش
شروع ہوئی، تو ان کی یہ کمزوری نمایاں تھی۔ دوسرے ولندیزوں کو یہ بات،
جو اب بدیہی نظر آتی ہے، بہت جلد معلوم ہوگئی کہ مشرق میں ایک طاقتور مرکزی انتظام
ہونا ضروری ہے چنانچہ سنہ ۱۶۱۱ کے بعد کے کئی کٹھن برس میں اُن کی تگ و دو
جاوا کے صدر ناظم کے ماتحت ہوتی رہی حالانکہ انگریز گماشتے اور بحری سردار
جو اکثر مختلف الرائے ہوتے تھے، لندن سے کسی ہدایت و رہنمائی کی توقع
نہ رکھ سکتے تھے۔ ان سب وجوہ ترجیح پر مستزاد یہ کہ ان میں ایک صحیح معنی میں
بڑا آدمی، یعنی جان پیٹرس زون کوئن برسر اقتدار ہوگیا جو نہایت قابل اور
بے باک شخص تھا اور پہلے جاوا کے کارخانوں کا ناظم رہا اور پھر صدر ناظم کی
حیثیت سے، کہہ سکتے ہیں کہ تمام مشرقی سمندروں پر اس طرح چھایا رہا جسطرح ۱۴۳
ایک صدی پہلے البوکرک چھایا رہا تھا۔ اور ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ
ہوا کہ چھوٹتے ہی ولندیزوں کو مصالحوں کے جزائر اور مشرق اقصیٰ کی بلا شرکت

تجارت مل گئی جو بہت بڑی کامیابی تھی۔

پیش نظر عہد کے باقی حصے میں ان کی تجارتی کامیابی کا اہم سبب یہی اجارہ تھا۔ بٹاویہ کی مجلس بھی اس زمانے کی تحریروں سے صاف طور پہ نہایت مستعد جماعت نظر آتی ہے۔ تیو آن، امبوئے نا، پولی کٹ، سورت وغیرہ مرکزوں کے کارخانے براہ راست اسی جماعت کے تحت میں تھے اور گاہ بگاہ بٹاویہ کے ولندیز عہدہ دار جو معائنہ کرتے، وہ نظم و ضبط قائم رکھنے اور خرابیاں دُور کرنے میں بہت مفید ہوتا اور اسی کے ساتھ نفع رساں تجارت کے موقعے ڈھونڈنے میں توسیع و ترقی ہوتی تھی۔ انگریزوں کے کارخانے محدود حصۂ ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پہ دو برابر کی جماعتوں کے ہاتھ میں ان کی نگرانی ہوتی تھی جنکا مستقر سورت اور بنٹم تھا۔ ان میں اکثر باہم اختلاف ہو جاتا اور اس سے قبل کہ لندن سے کمپنی کے کارفرما اصلاح کر سکیں، کافی عرصہ مل جاتا تھا کہ یہ اختلاف سخت نقصان رساں بن جائے۔ ان انتظامی جماعتوں کا جو رعب اور اثر ماتحتوں پر تھا اسے میرے خیال میں بہت کمزور بتانا درست ہوگا۔ اور یہ کہنا مشکل سے مبالغہ سمجھا جائے گا کہ اگر ولندیز ایک باضابطہ منظم و متحد ٹولی بن کے کاروبار انجام دیتے تھے تو انگریزوں کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ زیادہ تر انفرادی قابلیت کا نتیجہ تھی۔ تین صدی گزرنے کے بعد آج ان دونوں کمپنیوں کے عمّال و ارکان کی لیاقت کا مقابلہ کرنا دشوار ہے لیکن ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے میرے ذہن میں جو تخیل قائم ہوا وہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ولندیزوں کا معیار قابلیت بلند تھا اگرچہ ظاہر ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا ہی اچھا نظم انگریزوں کو بھی میسر آتا تو وہ اتنا ہی بہتر کام نہ کر سکتے تھے۔

انگریزی تنظیم میں باضابطگی کا نہ ہونا، سب سے بڑھکر نیل کی تجارت سے عیاں ہے جس کا ہماری امثلہ میں بار بار ذکر آتا ہے اور ناظرین کو اسکے متعلق کچھ نہ کچھ سمجھانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں کمپنی کے گماشتے، اس کے نوکر تھے اور ان کے کام اور معلومات سے فائدہ اٹھانے کا کمپنی حق رکھتی تھی۔ اور جب یہ لوگ اپنا وقت اور محنت ذاتی نفع کمانے میں خرچ کرتے تو کمپنی

ضمیمہ الف

خسارے میں رہتی تھی۔ یہ لوگ جو انفرادی طور پر یا نج کا بیوپار کرنے سے کمپنی کے نقطۂ نظر سے چند قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ یعنی درآمد، برآمد اور مقامی تجارت۔ واپسی کے وقت گماشتوں کا کچھ مال یورپ لے جانا اور فروخت کرنا چنداں قابل اعتراض نہ تھا اور اس کی تھوڑی مقدار میں خاص خاص شرائط کے ساتھ باضابطہ اجازت بھی تھی۔ لیکن یہ لوگ اپنا کاروبار ان حدود میں محدود نہ رکھتے بلکہ صدہا من اجناس کمپنی کے جہازوں میں بھر لاتے جس کا بعض اوقات ۳۱۴ خود کمپنی کے نرخ پر اثر پڑتا تھا[1]۔ مگر کمپنی اس قسم کی بے ضابطہ حرکتوں پر حیرت انگیز نرمی سے کام لیتی اور ان اشخاص سے نامہ و پیام کر کے بعض اوقات تو ان کا لایا ہوا مال معقول قیمت پر خود خرید لیتی، کبھی صرف کرایہ جہاز طلب کرتی اور کبھی جرمانہ بھی کرتی جس کی مقدار خاطی کی سابقہ خدمات دیکھکر مقرر کی جاتی تھی۔ اور جس نے اجلاس عام کی روئدادوں کو مطالعہ کیا ہے، اُسے یہ سنکر کچھ بھی تعجب نہ ہوگا کہ یہ بے ضابطہ حرکتیں بالکل عام تھیں۔ حتیٰ کہ یہ ایک قسم کا بیوپار بن گیا تھا جس کے نفع میں یا تو کمپنی شریک ہو جاتی اور اگر گماشتے کی خدمات اچھی رہی ہیں، تو اس کا زیادہ حصہ اسی کی جیب میں رہتا تھا۔"

نج کی تجارتِ برآمد سے کمپنی کے دوسرے ملکوں میں کاروبار پر اثر پڑتا تھا مزید برآں، میرا خیال ہے کہ اسے کمپنی اس لئے اور بھی ناپسند کرتی تھی کہ یہ مال ایک نقد سرمایہ کا قائم مقام تھا جو بعد میں مقامی بیوپار کے کام آسکتا تھا[2]۔ باہر جانے والے گماشتوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ جنس

---

[1] مثال کے طور پر، کپتان ویڈل، ۴۰ ٹن (قدیم) وزن کا مال انگلستان لایا اور یہ اتنی مقدار تھی کہ سال بھر کے جہازوں میں وزن کی کل گنجائش کا معقول حصہ گھیر سکتی تھی"۔ (کورٹ منٹس۔ دسمبر ۱۶۲۶ء)۔

[2] جیسا کہ متن کتاب میں ہم لکھ آئے ہیں، نج کی تجارت کی سب سے اچھی شکل پارے کی برآمد تھی۔ ۱۶۳۰ء میں اس دھات کی قیمت صرف اسی لئے گراں

بیوپار کے سلسلے میں وہ جا رہے ہیں، اس میں خود بھی حصہ دار ہو جائیں جس کے فوائد ظاہر ہیں۔ لیکن نج کی تجارت اچھی طرح چل جاتی تو بعض اوقات معمولی حیثیت کا آدمی ایشیا سے اتنا روپیہ کما کر لاتا جو اُن دنوں بہت معقول سرمایہ سمجھا جاتا تھا۔ اس بیوپار میں محض خرید فروخت سے، مقامی ہنڈیوں پر اثر پڑنے کے باوجود، زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا مگر بعض گماشتے خود کمپنی کا روپیہ ذاتی کاروبا میں لگا دیتے۔ بعض کمپنی کے نام سے قرضے لے لیتے۔ بعض اوقات کمپنی کے جہاز پر نج کے تاجروں کا مال اِدھر اُدھر روانہ کر دیا جاتا۔ معاملات اس طرح کئے جاتے کہ فائدہ ہو تو اپنی جیب میں رہے اور خسارہ کمپنی کے حصے میں آئے۔ مقامی تاجروں سے خفیہ شراکت ٹھیرالی جاتی اور وہ اس معلومات اور فائدے سے بہرہ مند ہو جاتے جو ازروئے حق صرف کمپنی کا ہونا چاہیے تھا۔ غرض یہ تمام کاروبار لازماً اخلاق شکن تھا اور عمدہ انتظام کی صورت میں کبھی روا نہ رکھا جاتا۔ مگر ۱۶۳۴ء میں ایک تاجر بنتم کا صدر منتخب ہوا اور اس نے ان خرابیوں کو دور کرنیکے اختیارات مانگے تو یہ درخواست مسترد کر دی گئی اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے اقتدار سے "زیادہ سختی اور شدت کے ساتھ کام نہ لے"۔ اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تنخواہ اور مصارف جن کی کمپنی اجازت دیتی تھی، وہ بجائے خود قابل تاجروں کو انکی ملازمت پر ص ۲۰۱ مائل کرنیکے لئے کافی نہ تھے۔ لہذا نظمائے کمپنی تسلیم کرتے تھے کہ نج کی تجارت سے فائدہ اٹھانا بھی گویا ملازمت کی شرائط میں مقدر رہے۔ البتہ وہ کوشش کرتے تھے کہ ایسی تجارت کو جائز رکھنے کے باوجود، حدِ اعتدال کے اندر رکھیں مگر ظاہر ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

ولندیزی انتظام زیادہ باضابطہ تھا اور وہ ایسی رعایت جائز نہ رکھتا تھا اور جہاں تک مطبوعہ تحریروں سے اندازہ ہو سکتا ہے، کم سے کم ہمارے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لیگئی کہ جہاز کے ساتھ جو ملاح اور دوسرے اشخاص جا رہے تھے، انھوں نے بڑی بڑی مقداروں میں اسے اپنے ساتھ لیا تھا۔" (منٹس اکتوبر ۱۶۳۰ء)۔

ضمیمہ الف

پیش نظر عہد کے آخری سنین میں ولندیزوں کو یہ نقصان اٹھانا نہیں پڑتا تھا۔ رینال اٹھارھویں صدی کی تحریر میں، ولندیز سوداگروں کی دیانت اور کفایت کی بہت تعریف کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ ۱۶۰۵ء سے قبل ان میں سے ایک شخص بھی زیادہ متموّل نہ ہو سکا۔ لیکن اس تاریخ کے بعد اس کا بیان ہے کہ انہیں تعیّش اور خیانت بہت سرعت سے پھیلتی گئی۔ ہمعصر تحریروں سے بھی اتنا مترشح ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر برابر کشاکش ہوتی رہی اگرچہ نج کی تجارت کی قطعی ممانعت ۱۶۰۳ء سے کردی گئی تھی۔ بہت پہلے یعنی ۱۶۱۰ء ہی میں ہم نج کے مال کا پکڑا اور ضبط کیا جانا سنتے ہیں اور یہ ایسی سخت کارروائی تھی کہ میرے خیال میں اس زمانے میں انگریزی کمپنی کے ایشیائی عمّال نے کبھی نہ کی ہوگی۔ بیس سال بعد کی ہدایات سے جو ایمسٹرڈم سے روانہ کی گئیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خرابی بڑھتی جاتی تھی اور ہم ولندیز گماشتوں کو انگریزوں کے واسطے سے خرید و فروخت کرتے سنتے ہیں۔ ٹے ورنیر کا بیان ہے کہ ۱۶۴۰ء کے بعد سے یہ سلسلہ اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس سیّاح کی ولندیزوں سے نزاع تھی اور ممکن ہے کہ وہ اس خرابی کی وسعت بیان کرنے میں مبالغہ کرتا ہو۔ اسی کے ساتھ وہ اقرار کرتا ہے کہ بعض ایسی صورتوں میں بھاری بھاری تاوان عائد کئے گئے۔ ۱۶۵۲ء میں بٹاویہ کے ایک حکمنامے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رواج پھیلتا جاتا تھا کیونکہ اس میں مخبروں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ ضبط شدہ مال سے انھیں بھی حصہ دیا جائے گا۔ اور دو سال بعد ہم دو اعلیٰ عہدہ داروں کی نسبت سنتے ہیں کہ ان پر نج کی تجارت وسیع پیمانے پر کرنے کے باعث مقدمہ چلایا گیا اور ۱۶۶۴ء سے رسائل بٹاویہ کے مضامین سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مستقر پر یہ مسئلہ برابر زیر غور رہے۔ یہ روایات و قرائن بتاتے ہیں کہ ولندیز رفتہ رفتہ طمع میں گرفتار ہوتے جاتے تھے اور ۱۶۷۶ء میں نظمائے کمپنی کی طرف سے جو اعلان ہوا اس سے بھی یہی تصدیق ہوتی ہے۔ اس تحریر میں وہ اپنی سابقہ ممانعت کو دہراتے ہیں اور نج کی تجارت کے دستور کو "کمپنی کے جسم میں ناسور اور طاعون" قرار دیتے ہیں جو اس درجے مضر ہونے کے باوجود تمام

احکام و اعلانات کے باوجود، ہر جگہ موجود اور ترقی پر ہے۔

اس اعلان سے بھی یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ اب یہ رسم ولندیزی سوداگروں میں بھی پوری طرح پھیل گئی تھی اگرچہ رینال اور دوسری منقولہ بالا شہادتوں کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائی سنین میں انگریزوں کی نسبت ولندیزی کمپنی کو ایشیا میں کہیں بہتر ملازمین مل گئے تھے۔

۳۱۶ اس خانگی تجارت اور اس کاروبار میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے جو وہ فرنگی ایشیا میں کرتے تھے جن کا کمپنیوں کی ملازمت سے تعلق نہ تھا اور جو کبھی کبھی "نج کے تاجر" لکھے جاتے ہیں۔ مگر ان معدودے چند افراد کی تجارت ہمارے عہد میں کوئی خاص وقعت نہ رکھتی تھی۔ بٹاویہ اور دوسرے مقامات میں بے شبہ بعض آزاد ولندیز آباد ہو گئے تھے اور وہ بھی کاروبار کرتے تھے لیکن اس پر وہ کمپنی یا اس کی وہ شاخ جس کی بستی میں وہ آباد تھے، پوری نگرانی رکھتی تھی اور غالباً کمپنی کے حق میں وہ نقصان کی بجائے امداد و اعانت کا باعث ہوتے تھے۔ رہی انگریزی کمپنی، اسے آزاد انگریزوں سے سوائے ہمارے عہد کے آخری سنین کے پہلے اس قسم کی کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ البتہ ۱۶۵۵ء کے قریب جب چند سال تجارت بے قید ہوتی رہی، تو اس زمانے میں چند انگریز مشرقی ساحل پر آ بسے جو کمپنی کے براہ راست ماتحت نہ تھے اور ۱۶۵۸ء سے تجارتی مکاتیب میں انکا ذکر بھی رفتہ رفتہ ممتاز جگہ حاصل کرنے لگا۔

ضمیمہ الف کے مآخذ

سرمایہ مشترکہ کی تجارتی کمپنیوں کی تاریخ اسکوٹ نے لکھی ہے۔ انگریزی کمپنی کو سب سے پہلے جو شاہی منظوری ملی، اس کی نقلیں پرچاس (اول، سوم ۱۳۹) میں درج ہیں۔ بعد کی تاریخ کا بڑا مآخذ کورٹ منٹس (اجلاس عام کی رودادیں) ہیں۔ علیحدہ علیحدہ سفر میں جو دقتیں اور خرابیاں تھیں، انھیں منجملہ اور مصنفوں کے جورڈین (۳۰۴) نے تحریر کیا ہے۔ آخر میں سرمایہ بالتخصیص کا جمع ہونا انگلش فیکٹریز میں مرقوم ہے (نہم ۔ ۱۱۴) اسی کتاب کے ابتدائی اجزا کے دیباچوں میں کمپنی کی حیثیت کے خاص خاص پہلوؤں پر بحث کی ہے اور مالی نتائج نومبر ۱۶۵۴ء کے کورٹ منٹس میں تحریر ہیں؛

ولندیزی کمپنی کی تشکیل کے متعلق میں نے زیادہ تر فان ڈر چیز (Van der chijs) پر بھروسہ کیا جس نے باب دوازدہم میں پورا منشور نقل کیا ہے۔ فان ٹون کی کتاب میں (۶۱) اس کی عملی کیفیت لکھی ہے۔ منافع، رین ویل (مقدمہ کتاب) میں اور ابتدائی سنین کے متعلق قدرے اختلاف بیان کے ساتھ اینلز اوف کومرس (چہارم، ۴۸۸) میں درج ہیں اور ایڈمنڈسن (۲۴) نے ایک بڑے منافع کا ذکر کیا ہے جو ان دونوں میں تحریر نہیں ہے۔ صدر ناظم کے اختیارات کی تصریح کے احکام ڈرونگ (سوم ۔ ۱۳۰) نے نقل کئے ہیں۔ انگریزوں کے ساتھ مدت تک جو نامہ و پیام ہوتے رہے، ان کی کیفیت کیلنڈر۔ ایس۔ پی سے معلوم ہو سکتی ہے؛

ضمیمہ الف

نیل کی تجارت کی خرابیاں کورٹ منٹس اور انگلش فیکٹریز میں جا بہ جا موجود ہیں۔ رو کے بعض اقوال (۴۴۲) سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی قائم ہونے کے چند ہی سال بعد یہ رسم بدخوب مروج ہوگئی تھی۔ وہ معاملہ جس میں کمپنی نے صریحاً جوش و خروش کو ناپسند کیا کورٹ منٹس (جنوری سنہ ۱۶۳۴) میں ہے؛ ریناک کا قول ولندیزوں میں نیل کی تجارت کے متعلق اس کی کتاب کی پہلی جلد (۱۹۱) میں ہے؛ ابتدائی امتناعی احکام ڈزرونگ (سوم۔ ۲۰۶) میں ابتدائی ضبطی کی مثال ٹرپ اسٹراز کورومنڈل (۱۴۴) میں۔ سنہ ۱۶۳۲ کے احکام ہیگ ٹرنیس کرپٹس (دوم۔ ۹۵) میں۔ انگریزوں نے جو مدد کی وہ انگلش فیکٹریز (چہارم، ۱۲۶ وغیرہ، اور ٹیورنیر (اول، ۳۱۱۔ دوم، ۴۳) میں۔ بعد کی ہدایات ڈاغ رجسٹر (دسمبر سنہ ۱۶۵۳) وغیرہ میں ملاحظہ ہوں۔ ایسے تاجر جو انگریزی کمپنی کی ملازمت میں نہ تھے، انکا احوال فیکٹریز (دہم) اور بعد کے داخلوں میں تحریر ہے؛

ضمیمہ ب

ولندیزوں کی ابتدائی دساور یورپ کو

ڈاکٹر ٹرپ اسٹرا کا احوالِ کورومنڈل سنہ ۱۶۱۰ء تک جا کے منقطع ہوگیا ہے اور آگے کے چودہ سال میں ولندیزوں کی تجارتی سرگرمیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا تا آنکہ سنہ ۱۶۲۴ء سے رسائل بتاویہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس زمانے میں یورپ کو جو مال دساور بھیجا گیا' اس کا کچھ اندازہ ذیل کی فہرستوں سے ہوسکتا ہے جو ابھی تک ہالینڈ میں محفوظ ہیں اور مجھے ہیگ کے محافظ خانے سے ان کی عکسی تصاویر فراہم کردی گئیں قیمتیں گلڈر میں مرقوم ہیں۔ جو ۵/۲ روپیہ کے معادل ہے۔ میں نے کسرات کو چھوڑ دیا اور انگریزی پیمانوں میں لکھتے وقت مقداریں بھی سالم اعداد میں تحریر کی ہیں؛

۱- پہلی فہرست با مطلوبہ جہاز سیاہ ریچھ (Swarte Beer) کی ہے جو غالباً سنہ ۱۶-۱۶۱۵ء میں عراق عرب سے مال ہالینڈ لایا۔ (Kol...Portef O.)

خود فہرست مال کے پہلے صفحے پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ لیکن اندر ہر صفحے پر "سال سنہ ۱۶۱۶ء۔ عراق عرب" مرقوم ہے۔ جس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ پہنچنے کا سال ہے جو ہر صفحے کے اوپر ایمسٹرڈم میں درج کردیا گیا تھا۔ انگریزی تحریروں سے ہمیں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرا جہاز سفید ریچھ سنہ ۱۶۱۶ء میں

ضمیمہ ب

ہالینڈ جانے والا تھا (لیٹرز رسیوڈ۔ چہارم، ۳۴) اور بہت ممکن ہے کہ سیاہ ریچھ ۱۶۱۵ء کے اواخر میں روانہ ہوا ہو کہ اس سال میں انگریزی مکاتیب کسی جہاز کا جو ہالینڈ گیا، تذکرہ نہیں کرتے؛

مطلوبہ جہاز

مال	گٹھے	مقدار	قیمت گلڈروں میں
نیل	۴۵۰	۲۸۰۰ من = تخمیناً ۷۳۰۰۰ پونڈ	۲۳٫۹۹۲
تاگا	۱۵۵	۹۶۸ من = " ۲۵۰۰۰ "	۱۲٫۶۸۹
گنی کلاتھ (گاڑھا)	۶۶	۱۳۲۲ تھان = " ۶۶۰۰۰ گز	۷٫۷۷۸
بنگالہ "تفکیل" (نمونے)	۱	۱۳۵ " - لمبائی درج نہیں	۷۱۶
		میزان قیمت	۴۵٫۱۷۵
		+ باروانہ محصولات برآمد	۴٫۵۵۴
		کل لاگت	۴۹٫۷۲۹

۱۸ نیل اور تاگے کے گٹھے ۶½ من کے لگائے ہیں مگر من کا ٹھیک وزن درج نہیں۔ اس لیئے ہم نے عراق عرب کا عام من سمجھکر اس کا وزن ۲۶ پونڈ کے قریب محسوب کیا ہے جس سے ایک گٹھا ۱۶۲½ پونڈ کا ہوا۔ آیندہ مطلوبات میں جہاں وزن کی تصریح کی ہے فی گٹھا ۱۵۰ پونڈ ولندیزی لکھا ہے جو انگریزی ۱۶۳ پونڈ کے برابر ہوا۔ غرض یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہم نے عراق عرب کا جو معمولی من قرار دیا ہے، وہ درست ہے؛

گنی کلاتھ کے تھانوں کی لمبائی سو کوبی ڈوس یا ۷۰ گز لکھی ہے۔ اور ولندیزی گز ۰٫۶۸ میٹر کے مساوی ہوتا تھا۔ لہذا یہ کوبی ڈو ضرور ایک ہاتھ (= ۱۸ انچ) ہوگا نہ کہ سورت کا کوواڈ (جس کا ذکر ضمیمہ ڈ میں آگے آتا ہے)

ضمیمہ ب

"تفکیل" غالباً وہی کپڑے تھے جنھیں انگریزی میں "ٹپ سیل" لکھتے تھے[1] یہ ریشم اور سوت دونوں قسم کے کپڑے کے لئے بولا جاتا تھا اور اس نمونے کے گٹھے کی صحیح نوعیت مشکوک ہے۔

۲۔ فہرست مال جہاز سیاہ ریچھ جو عراق عرب سے ہالینڈ روانہ ہوا ۱۶۱۹ء۔

انگریزی تحریروں کی رو سے یہ جہاز مال بھر کے لے جانے کی غرض سے جولائی ۱۶۱۸ء میں عراق عرب آیا تھا (فیکٹریز۔ اول، ۴۱) اور بظاہر برسات کے بعد چل کے دوسرے سال ربیع میں ایمسٹرڈم پہنچا۔ تاریخ ۱۶۱۹ء اصل فہرست پر نہیں بلکہ ایک اور جگہ سرورق پر لکھی ہے جس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے ایمسٹرڈم میں درج کیا گیا تھا۔

مال	مقدار	قیمت گلڈروں میں
نیل	۶۹۳ گٹھے = تقریباً ۱,۱۳,۰۰۰ پونڈ وزن	۴۶,۸۳۲
موم	۱۳,۵۲۸ پونڈ = ,, ۱۴,۷۵۰ ,,	۳,۴۳۰
دارچینی	۴۸ گٹھے = ,, ۷,۸۰۰ ,,	۹۰۰
سہاگا	۸ ,, = ,, ۴,۲۰۰ ,,	۱۳۲۹
تاگا	۳۰ ,, = ,, ۴,۹۰۰ ,,	۱۵۴۸
گنی کلا تھ	۱۰,۴۰۶ تھان = ,, ۲,۴۶,۰۰۰ گز	۴۶,۵۸۳
بنگال کلا تھ	۱۸۰ ,, = (درج نہیں)	۶,۴۷۴
گنگھم	۲۹۴ ,, = ,,	۱۷۵۰
دوسرا کپڑا	۱۷۰ ,, = ,,	۳۵۵
قالین	۵۰ عدد ,,	۷۸۴
متفرق کپڑا	۵۰ تھان ,,	۵۹۶
		۱,۱۰,۴۹۲
	بھرت، باردانہ، محصول =	۱۱,۱۹۲
	مال کی کل لاگت	۱,۲۱,۶۸۴

---

[1] ممکن ہے یہ "تفصیل" کی خرابی ہو اور اس سے نمونے کے ٹکڑے مراد ہوں۔ مترجم

ضمیمہ ب ۳۱۹

مطلوبے میں میزان ۱،۱۲۲۰۰،۸۴ گلڈر لکھی ہے لیکن غالباً ایمسٹرڈم میں ۴ سو کے قریب رقوم کی غلطیاں حاشئے پر تحریر کردی گئی ہیں۔ یہ مال پہلے کی نسبت زیادہ وسیع علاقے سے حاصل کیا گیا تھا گو اس میں بھی بیشتر نیل، موٹا کپڑا، نمونے اور متفرق سامان بھرا تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ دار چینی، لنگا سے آئی اور سہاگا اور موم، بنگالے سے ؛

گنی کلاتھ کے تھان اس مرتبہ مقررہ طول کے نہ تھے بلکہ ہر گٹھے کا طول استہ (= ہاتھ) میں الگ الگ دیا گیا ہے جن کا میں نے گزوں میں حساب لگا لیا۔ ان کی قیمت بھی تھان کی بجائے فی سَتر استہ کے حساب سے تحریر ہے اگرچہ بہت سے تھان طول میں اتنے نہیں ہیں ؛

دوسرے کپڑوں کی لمبائی درج نہیں۔ لیکن "بنگال" نامی پارچہ بہت گراں قیمت ہوگا کہ فی تھان ۳۶ گلڈر میں پڑا حالانکہ گیگم کا نرخ ۵ تا ۷ گلڈر فی تھان سے زیادہ نہ تھا ؛

۲۔ فہرست مال جہاز ہیڈن بلک، جو مئی ۱۶۲۱ء میں عراق عرب سے ہالینڈ روانہ ہوا ؛ انگریزی تحریروں کی رو سے یہ مئی میں تقریباً بھر لیا گیا تھا (فیکٹریز۔ اول، ۲۵۴) تاریخ روانگی خود مطلوبے پر ثبت ہے ؛

مال	مقدار	قیمت گلڈروں میں
نیل	۴۵۲ گٹھے = تقریباً ۴۳،۹۰۰ پونڈ وزن	۳۱،۴۷۴
ہیرا	. . . .	۲۷،۰۹۴
گنی کلاتھ	۱۲۴۸ تھان = ۳۰۸،۷۵۰ گز	۵۷،۶۶۲
بنگال گیگم	۸۰ تھان (لمبائی درج نہیں)	۳۸۴
		۱۱۶،۶۱۶
	بھرت، باردانہ، محصول	۱۱،۸۷۷
	کل لاگت	۱۲۸،۴۹۴

ضمیمہ ب

یہ مال تمام و کمال مقامی تھا، سوائے ۸۰ تھان گنگم کے۔ گنی کلاتھ کی قیمتیں اسی طرح لگائی گئی تھیں جس طرح فہرست نمبر ۲ میں؛

۴۔ فہرست جہاز نائرڈین جو عراق عرب سے اکتوبر سنہ ۱۶۲۱ء میں ہالینڈ روانہ ہوا؛ یہ تاریخ مطلوبے پر ثبت ہے اور انگلش فیکٹریز کے داخلوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے (اول - ۲۹۷)؛

یہ تحریریں ظاہر کرتی ہیں کہ اس دفعہ زیادہ تر نمونے کا مال روانہ کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی مد مرچ کی تھی جو تگناپٹم کے بری راستے سے ملیبار سے ۳۲۰
منگائی گئی تھی؛

مال	مقدار	قیمت گلڈروں میں
مرچ	تخمیناً ۱,۵۶,۰۰۰ پونڈ وزن	۳۴,۴۵۷
شورہ	۴۷۵۰۰ ،،	۲,۹۶۴
شورہ صاف کیا ہوا	۸۷۰۰ ،،	۱,۱۷۰
ہیرا	....	۱۳۲۶
سہاگا	۶۵۰ پونڈ	۱۷۵
تاگا	۵۴۰۰ ،،	۲۳۹۰
گنی کلاتھ	۶۵۰۰۰ گز	۱۱۹۱۸
ہوڑی ،،	۹۰۰ تھان (لمبائی درج نہیں)	۳۱۵۴
بیتل ،،	۱۰۰ ،، = ۱۲۰۰ گز	۱۲۰۰
		۶۰۷۵۴
	متفرق مصارف اور اغلاط	۲۰۰۰
	کل مالیت	۶۲۷۵۴

ضمیمہ ب

مرچ کا نرخ "کافی گراں" تھا اور تجارت کی یہ شاخ ترقی نہ کر سکی۔ سوتی کپڑے میں موڑی (عمدہ قسم کا لٹھا) میرے خیال میں آزمایشی طور پر بھیجا گیا تھا لیکن فہرست میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔ بفتیل یا دکن کی ململ گراں قیمت تھی کہ فی گز ایک گلڈر کے حساب سے پڑی ؛

۵۔ فہرست ڈور ڈریخٹ جو غالباً ستمبر ۱۶۲۲ء میں عراق عرب سے روانہ ہوا۔ اس فہرست پر تاریخ درج نہیں لیکن قرائن سے اس کا یہ وہی سفر معلوم ہوتا ہے جس کا "انگلش فیکٹریز" (دوم - ۱۴۷) میں تذکرہ ہے۔ اس کے مال میں زیادہ تر مرچیں (ایک لاکھ ۸۰ ہزار پونڈ) نیل (۶۰ ہزار)، تاگا (۵۵ ہزار اور اچین سے دوبارہ بھیجی ہوئی مرچیں (۳۵ ہزار پونڈ) شامل تھیں۔ کپڑے میں ۳½ لاکھ گز گنی کلاتھ، پرکال (۲۰، ۲۰ تھان = تقریباً ۲۲ ہزار گز) اور دوسری قسم کے ۶ سو تھان تھے ؛

۶۔ جہاز اسکون ہوون۔ از عراق عرب۔ اکتوبر ۱۶۲۴ء ؛ فہرست پر اگست ۱۶۲۴ء کی تاریخ درج ہے لیکن اکتوبر میں ایک ضمیمہ بھی اضافہ کیا گیا۔ اِس جہاز میں مرچ نہ تھی لیکن نیل، شورہ، تاگا وغیرہ عام اشیا بھیجی گئی تھیں۔ کپڑے میں ایک لاکھ گز گنی کلاتھ، ۳۰ ہزار موڑی تقریباً ۳ ہزار پرکال اور اسی قدر سلیم پوری (یعنی معمولی لٹھے) کے تھان تھے ؛

سورت سے ۱۶۲۴ء و ۱۶۲۵ء میں براہ راست جو مال ہالینڈ بھیجا گیا ۳۲۱
اس کے مطلوبے بھی محفوظ ہیں اور یہ اس شعبۂ تجارت میں ولندیزوں کی
پہلی کوششیں تھیں ؛

۱۶۲۴ء۔ اس سال ابتدا میں دو جہاز ہالینڈ روانہ ہوئے جن کی دو دو فہرستیں محفوظ ہیں اور ایک ایک پر تاریخ موجود ہے ؛ ان کے مال میں بیشتر نیل، شورہ، اور تھوڑی مقدار میں تاگا، لاکھ، سہاگا وغیرہ شامل تھا۔ کپڑے میں گنی کلاتھ (۱۵۲۰) نناتھی (۹۲۴۰) مختلف بافتے وغیرہ

ضمیمہ ب

درج ہیں۔ گینی کلاتھ کے تھان حسبِ معمول کوئی ۳۰، ۳۷ گز لمبے تھے مگر ننتا سی کی ٹھیک نوعیت کا پتہ نہیں چلا البتہ تفصیلاتِ مندرجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تھان چھوٹا اور کم قیمت ہوتا تھا۔ مجھے گمان ہے کہ یہ یورپ کی بجائے افریقہ کے واسطے خریدا گیا ہوگا۔ بافتے ہر قسم اور مختلف طول کے تھے بعض گٹھوں پر "نمونے" اور بعض پر "ہالینڈ کے لئے" تحریر تھا۔ مجموعی طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ سوتی مال زیادہ تر افریقہ کے واسطے تھا اور مختلف گٹھے آزمائش کے طور پر دوسری منڈیوں کے واسطے روانہ کئے گئے تھے؛

سنہ ۱۶۲۵؛ اس سال بھی دو جہازوں کی فہرستیں ملتی ہیں۔ ان پر تاریخ درج نہیں مگر داغ رجسٹر کے ایک حاشیے (جون سنہ ۱۶۲۵) سے عیاں ہے کہ یہ فہرستیں ویسپ اور ڈوڈریخٹ کی ہیں جب کہ وہ سنہ مذکور کے ماہ اپریل میں ہرمز کی لڑائی میں حصہ لینے کے بعد ہالینڈ روانہ ہوئے (فیکٹریز۔ سوم۔ ۴۷) ان دونوں پر سب سے قیمتی مال ایران کا ریشم تھا جسے ولندیزوں کی کوشش کا پہلا ثمرہ سمجھنا چاہیئے۔ نیل اور شورے نے بہت سی جگہ لے رکھی تھی؛ ویسپ پر صرف ایک گٹھا سوتی پارچے کا تھا اور دوسرے جہاز پر ننتا سی وغیرہ کے کل ۸ ہزار تھان تھے۔ اگر میرا قیاس ننتا سی کے متعلق درست ہو، تو یہ چالان بھی گذشتہ سال کے مال کی طرح زیادہ تر افریقہ کے واسطے بھیجا گیا تھا اور صرف تھوڑے سے نمونے یورپ کے لئے تھے؛

ضمیمہ (ج)

سلطنتِ مغلیہ کی رقوم مالگزاری

سترھویں صدی کے وقائع نویس کبھی کبھی اپنی کتاب کے اخیر میں سلطنت مغلیہ کے صوبوں کی فہرست اور اپنے زمانے کا مالیہ درج کر دیتے ہیں۔ چند قلمی کتابیں جو دستور العمل کے نام سے یاد کی جاتی ہیں،[1] اور جن کے چند نسخے برٹش میوزیم میں "سرکاری ضوابط" کے زیر عنوان محفوظ ہیں،[2] ان میں بھی اس قسم کے اعداد ملتے ہیں۔ اِن ماخذوں سے میں نے مغلیہ صوبوں کا گوشوارہ مرتب کیا ہے۔ رقوم لاکھ لاکھ داموں میں تحریر ہیں اور پیش نظر زمانے میں ایک لاکھ دام ڈھائی ہزار روپے کے معادل ہوتے تھے۔[3]

مگر اس گوشوارے میں سلطنت کے سب صوبے داخل نہیں ہیں۔

ضمیمہ ج

اول، تو دکن کے صوبوں کا اس میں ذکر نہیں جہاں اُن دنوں سلطنت مغلیہ کی حدود وسیع ہو رہی تھیں ۔ اسی لیئے ان صوبوں کے نام اور وقتاً فوقتاً حدود بدلتی رہتی تھیں (دیکھو بادشاہ نامہ جلد دوم، ۱۰ تا ۱۴) اور جب تک ان انتظامات کی جزوی واقفیت نہ ہو، کسی خاص تاریخ میں ان کی رقوم مالگزاری چنداں کارآمد نہیں ہو سکتیں ؛ دوسرے اس گوشوارے سے بنگالہ بھی خارج ہے جس کے سلسلۂ اعداد کا قابل اطمینان آغاز نہیں ملا ۔ آئین اکبری میں اس صوبے کی مالگزاری میں کئی وسیع قطعات ایسے بھی شامل کر لیئے ہیں جو اورنگ زیب کے زمانے تک مغلوں کی عملداری سے باہر رہے ۔ لہذا گمان غالب یہ ہے کہ آئین اکبری کی مندرجہ رقم فتح سے پہلے کا سرکاری مطالبہ بتاتی ہے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ اکبر جس قدر رقم اپنے مقبوضۂ وقت علاقے سے مل جاتی اسی پر اکتفا کرتا تھا ۔ جہانگیر نے سنہ ۱۶۰۵ میں بندوبست کا حکم دیا لیکن اس کے نتائج کسی کتاب میں درج نہیں اور سنہ ۱۶۵۸ تک[۱] باضابطہ کسی تجدید ہونیکا ہمیں علم نہیں ؛

۴۴۴ سندھ کے صوبے کو میں نے اس لیئے خارج کر دیا کہ اس کی رقوم میں بعض بہت فحش غلطیاں معلوم ہوئیں اور اس قول سے آئین اکبری کی مندرجہ رقوم بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ؛

کابل، قندھار اور کشمیر کے صوبوں کو بھی جہاں اپنا اپنا علیحدہ طریق مالگزاری رائج تھا، میں نے نظر انداز کر دیا ہے جس کے بعد دس صوبے باقی رہتے ہیں جو اکبر کی سلطنت کا قلب تھے اور اس کے اخلاف بھی ان پر حکمرانی کرتے رہے ؛

---

[۱] جہانگیر کے احکام تزک میں موجود ہیں (اول - ۲۲) اور سنہ ۱۶۵۸ کی تجدید بندوبست پر اسکوتی نے بحث کی ہے (۲۴) ؛

ضمیمہ ج

سرکاری مالگزاری مختلف اوقات میں (لاکھ لاکھ داموں میں)

صوبہ	سنہ ۱۵۹۴ء اندازاً		عہد شاہجہانی				اورنگزیب
	ابتدائی	اصلاح شدہ	بوقت تخت نشینی	سنہ ۱۶۴۷ اندازاً	مابعد	مابعد	قبل سنہ ۱۶۶۸ء
	لاکھ (ا) کروڑ	(ب)	(ج)	(د)	(ہ)	(و)	(ز)
بہار	۲۲/۱۹	۲۲/۷۰	۳۱/۲۷	۴۰/۰۰	۳۹/۴۳	۳۹/۶۹	(۷۲/۱۸)
الہ آباد	۲۰/۸۳	۲۱/۰۰	۳۰/۷۰	۴۰/۰۰	۴۲/۴۳	۴۴/۹۶	۴۳/۶۷
اودھ	۲۰/۱۷	۲۰/۳۴	۲۳/۲۲	۳۰/۰۰	۲۷/۹۵	۳۱/۵۲	۳۲/۰۱
آگرہ	۵۶/۶۲	۵۴/۴۷	۸۲/۲۵	۹۰/۰۰	۸۶/۱۲	۱/۰۷/۱۹	۱/۰۵/۱۷
مالوہ	۲۴/۰۷	۲۳/۵۱	۲۸/۰۰	۴۰/۰۰	۴۰/۸۳	۳۸/۹۹	۴۲/۵۵
گجرات	۴۳/۶۸	۴۳/۲۷	۵۰/۶۴	۵۳/۰۰	۵۳/۶۵	۵۰/۷۰	۴۴/۰۱
اجمیر	۲۸/۸۴	۲۸/۳۴	۴۲/۰۵	۶۰/۰۰	۶۰/۲۹	۶۵/۱۲	۶۳/۶۹
دہلی	۶۰/۱۶	۵۹/۶۶	۶۵/۶۱	۱/۰۰/۰۰	۱/۲۲/۲۹	۱/۱۹/۳۵	۱/۱۶/۸۴
لاہور	۵۵/۹۵	۵۵/۹۱	۸۲/۵۰	۹۰/۰۰	۸۹/۳۰	۸۵/۴۷	۹۰/۷۰
ملتان	۱۵/۱۴	۱۴/۹۵	(۴۰/۰۰)	۲۸/۰۰	۲۱/۹۸	۲۱/۶۲	۲۴/۵۳
میزان	۳/۴۵/۶۵	۳/۴۴/۰۵	(۴/۷۶/۲۴)	۵/۷۱/۰۰	۵/۸۴/۲۷	۶/۰۴/۶۱	(۶/۳۵/۳۵)

(ف۔ قوسین میں جو اعداد ہیں وہ مشکوک ہیں جیسا کہ آگے تصریح کیگئی ہے انکی میزان بھی مشکوک ہے اور آگے کی عبارت میں اوسط بحساب فیصد نکالتے وقت اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔)

ان میں پہلا سلسلۂ اعداد (مندرجہ خانہ الف) براہ راست آئین اکبری سے نقل کیا ہے (مترجمہ انگریزی۔ جلد دوم)۔ یوپی ہسٹوریکل سوسائٹی کے رسالہ ۱۹۱۹ء کے مضمون میں میں نے بتایا ہے کہ ان اعداد میں بڑی بڑی غلطیاں رہ گئی ہیں جنھیں ایک عمل سے جسکی تفصیل مضمون میں درج ہے، دور کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کی اصلاح کے بعد جو اعداد جڑتے ہیں، انھیں یہاں خانہ ب میں لکھدیا ہے۔ لیکن گو ان سے خاص خاص اضلاع یا سرکاروں کی جمع میں نمایاں فرق پڑتا ہے، تاہم مجموعی طور پر صوبے کی میزان میں زیادہ فرق نہیں آتا۔ مگر متن میں جو اوسطیں نکالی ہیں وہ اسی خانے کے اعداد کی بنا پر ہیں؛

خانہ ج کے اعداد الیٹ کی تاریخ (ہفتم، ۱۳۸) سے لئے گئے ہیں۔ یہ مجالس السلاطین کے اعداد ہیں جو اپنے تاریخی نام کی رو سے سنہ ۱۶۲۸ میں

ضمیمہ ۲۲۴ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ ہے جس میں جہانگیر کے عہد تک کے حالات لکھے ہیں اور تاریخی حصہ شاہجہاں کی تخت نشینی پر ختم ہوتا ہے جس سنہ کی مولف نے مالگزاری تحریر کی ہے وہ کتاب میں درج نہیں لیکن یہ لازماً ۱۶۲۵ء سے پہلے کے اعداد ہیں اور سیاق سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ جہانگیر کے آخر زمانے کی مالگزاری تھی جو شاہجہاں کے ورثہ میں آئی۔ اس فہرست میں صوبہ ملتان کی مالگزاری علحدہ نہ تھی[1] بلکہ سندھ میں ملتان ٹھٹھہ اور بھکر کو ملا دیا تھا۔ اب خود سندھ کی مالگزاری دوسری تحریروں میں ناقابل اعتبار ہے لہذا اس کی کل چالیس کرور رقم میں سے میں طے نہیں کرسکا کہ ملتان کی کتنی ہوگی اسی لئے متن سے اس صوبے کو خارج کر دیا اور بیشی کا اوسط بتاتے وقت بھی اسکا حساب نہیں کیا۔

جیسا کہ میں نے متن کتاب میں صراحت کی ہے، فہرست میں حیرت انگیز اعداد ہیں تو آگرہ اور لاہور کے ہیں اور مجھے شبہ ہے کہ شاید دونوں یا ایک کا ابتدائی ہندسہ ۶ کی بجائے غلطی سے ۸ ہو گیا ہے اور اگر یہ اعداد رقموں میں تحریر ہوں تو ایسی سہو کتابت کا واقع ہو جانا معمولی بات ہے۔ مجھ سے اس شبہ کی کوئی جانچ نہ ہو سکی کیونکہ مجالس السلاطین کا انگلستان میں صرف ایک نسخہ مجھے ملا جو سر ہنری الیٹ کے لئے نقل کیا گیا اور اب برٹش میوزیم (Or 1903) میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں وہی رقم درج ہے جو الیٹ نے اپنے ترجمے میں لکھی ہے اور اصل کتاب میں رقموں کی بجائے عبارت میں اعداد لکھے ہیں۔ پھر بھی ممکن ہے کہ اصل نسخے میں یہ اعداد رقموں میں ہوں اور کاتب نے سر ہنری الیٹ کی سہولت کے لئے انھیں عبارت میں نقل کر دیا ہو۔ اس نسخے کا یہ آخری حصہ کتابت کی اغلاط سے مملو ہے اور اس لئے رقوم میں غلطی کا ہو جانا کچھ حیرت انگیز نہیں۔ بہرحال جب تک اصل نسخہ میسر نہ آئے جس کا اب کچھ حال معلوم نہیں، اس وقت تک کوئی صحت نہیں ہو سکتی۔ نسخے میں

---

[1] اچھا سا کہہ سکتے ہیں کہ شاید اس سال ملتان و سندھ کا ملا کر ٹھیکہ دے دیا گیا ہو۔

ایک اور امر یہ قابل بیان ہے کہ لاہور کی مالگزاری کے ساتھ حاصل کا لفظ لکھا ہے جو دوسرے صوبوں کے اعداد کے ساتھ نہیں ہے۔ اور عجب نہیں اس کا مطلب یہ ہو کہ لاہور کے اعداد دوسروں کی نسبت بعد کے ہیں۔ اسی کے ساتھ ممکن ہے کہ یہ محض سہو کتابت ہو۔

خانہ د کی رقوم عبدالحمید کے بادشاہ نامہ سے لی گئی ہیں (دوم-۷۱۰) دوسرے مولفوں کے برخلاف اس مولف نے سالم اعداد درج کئے ہیں اور ہر سال کی صحیح رقم لکھنے کی بجائے ایک عام اندازہ پیش کر دیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۶۴۷ء پر ختم ہوتی ہے اور آخر میں جو فہرست درج کی ہے اسے میں اسی سال یا دو ایک سال پہلے کی مالگزاری خیال کرتا ہوں۔ اس کتاب کی عبارت بہت قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ میزانیں درست ہیں اور مولف نے اپنے زمانے کی بیشی کی وجوہ بیان کرنے کی دردسری بھی گوارا کی ہے۔ اور گجرات و دکن کی مالگزاری میں اضافہ نہ ہونے کا سبب ۱۶۳۰-۳۲ء کا قحط قرار دیا ہے۔

۳۲۵ ہ اور و خانے کے اعداد برٹش میوزیم کے مخطوطات ۶۵۸۸ (Additional) ۱۶۷۹ اور ۱۸۴۲ (Oriental) سے لئے گئے ہیں، اگرچہ آخر الذکر میرے نزدیک ۱۶۷۹ء ہی کی نقل ہے جس میں بعض غلطیاں زیادہ ہوگئی ہیں۔ یہ سب نسخے "سرکاری ضوابط" کے زیر عنوان فہرست میں درج ہیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں زیادہ تر اٹھارھویں صدی میں بنگالے کے انگریز عمّال کے واسطے نقل کرائے گئے تھے۔ یہ شبہ کرنے کی بھی وجوہ ہیں کہ ان میں سے بعض میں، جہاں تک بنگالے کا تعلق ہے، عمداً تحریف کر دی گئی تھی، لیکن دوسرے اقطاع ملک کے بارے میں اس قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ ان مخطوطات میں جن سے میں نے کام لیا، اورنگزیب کے زمانے کی مالگزاری بلاتعیین سنہ درج ہے اور مقابلے کے لئے شاہجہاں کے عہد کی مالگزاری بھی دے دی گئی ہے لیکن بعض قرائن کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ یہ اول الذکر اعداد بھی شاہجہانی عہد کے آخری حصے کے ہونگے۔

ضمیمہ ج

بہر حال میں نے ان کو بہت سے مخطوطات دیکھکر منتخب کیا ہے، جن میں بیاض خالی چھوٹی ہوئی نہیں ہے نہ صریحی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور جو نسبتہ صاف پڑھے جاتے ہیں۔ یہ سب اعداد رقموں میں لکھے ہوئے ہیں؛

خانہ ز کے اعداد الیٹ کی تاریخ (ہفتم، ۱۶۴) سے نقل کیے ہیں یہ تاریخ عہد عالمگیر کے صرف دس برس کی ہے لہذا اسی زمانے کے کسی سنہ کے یہ اعداد ہونگے۔ سنہ کا تعین اس لئے بھی چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ یہ پہلے دو خانوں کے اعداد سے بہت کچھ مماثلت رکھتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں مالگزاری میں کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوئی البتہ صوبۂ بہار اس کلیے سے مستثنٰے ہے مگر پہلی اور بعد کی رقوم دیکھکر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ۲، کرور کی رقم مشکوک ہے۔ یہ رقم مرات جہاں نما کے مخطوطہ (انڈیا آفس۔ ۱۲۶ء) میں ہندسے یا رقم کی بجائے عبارت میں تحریر ہے لیکن اتنی بڑی بیشی کا سبب یا تو سہو کتابت ہے، یا ٹھیکے کے لئے خیالی رقم ہے جو بعد میں قائم نہ رہ سکی کیونکہ عہد اورنگزیب کی بعد کی فہرستوں میں بہار کی مالگزاری مجھے ۵۰ کرور سے زیادہ نہیں ملی۔ ایک امکان یہ ہے کہ اس مالگزاری میں عارضی طور پر وہ پہاڑی علاقہ بھی شامل تھا جو آگے چل کے گونڈوانہ کے نام سے علیحدہ درج ہونے لگا۔ بہر حال اس عدم تیقن کے باعث میں نے متن کتاب میں اس کی فی صد بیشی کا حساب نہیں کیا؛

آئین اکبری اور بعض مخطوطات میں جو میرے زیر مطالعہ رہے، معمولی عربی ہندسے لکھے ہیں جن کے پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ مگر بعد کے اعداد رقموں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں جن کا پتہ چلانا دشواری سے خالی نہیں۔ تاہم ۳۲۶ میرے زیر مطالعہ نسخوں میں کرور و لاکھ عموماً صاف لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں اور ہزارے اور سینکڑے اکثر بگڑے ہوئے اور زیادہ دقت سے پڑھے جاتے ہیں، سو ان کو میں نے نظر انداز کر دینا ہی مناسب خیال کیا۔ اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ لاکھ کے ہندسوں میں غلطی رہ گئی ہو مگر کروروں

اور اربوں کے حساب میں اس کا چنداں اندیشہ کرنا نہیں چاہیے ؛

بعض نسخوں میں مالگزاری دو یا تین ناموں سے درج ہے :- یعنی جمع دامی۔ حاصل کامل اور حاصل سنوات (یا حاصل عملی) یہ صریحاً اصطلاحی الفاظ ہیں اور بعض عنوانات سے اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حاصل روپے میں اور جمع دامی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دام یا تانبے کے سکے میں تحریر ہے۔ حاصل کامل کو عام طور پر "معیاری مالگزاری" لکھا گیا ہے اور حاصل سنوات یا عملی کو "حاضرہ مالگزاری" سمجھتے ہیں۔ مگر مجھے کسی ہمعصر تحریر میں ان اصطلاحات کی تعریف نہیں ملی۔ آئین اکبری سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مالگزاری چاندی میں نہیں بلکہ تانبے کے سکے میں لی جاتی تھی اگرچہ دونوں دھاتوں میں ادا کرنا جائز تھا۔ اب میرا مفروضہ یہ ہے کہ جمع دامی ہی اصلی مطالبہ تھا، جیسا کہ بعد کی کتابوں سے بخوبی مترشح ہوتا ہے اور حاصل اسی سے اخذ کیا جاتا تھا جس کے حساب کا تفصیلی طریقہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ مگر اس خیال کے ثبوت میں سوائے اس کے کوئی دلیل میں نہیں پیش کر سکتا کہ جمع دامی آخر تک غالباً تانبے میں وصول کی جاتی رہی جیسا کہ اکبر کے عہد میں لی جاتی تھی۔ بعد میں اسی کی بنیاد پر مطالبہ مالگزاری کو چاندی میں بدلا گیا اور اسی جمع سے وہ رقم چاندی کے سکے میں تحویل کر کے وضع کر دی جاتی تھی جو مقامی عمال کی تنخواہوں کے کام آتی تھی۔ دوسرے یہ کہ سب سے آخری نسخوں میں جو رقوم تانبے کے سکے میں درج ہیں وہ غالباً جمع دامی کے روپے میں تحویل ہونے کے ایک عرصے بعد دوبارہ داموں میں تبدیل کی گئی ہیں ؛

یہ سوال کہ حاصل کی حقیقت کیا ہے، حل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا اور غالباً بعض مخطوطات کے مطالعے سے حل بھی ہو سکے گا لیکن میرا مفروضہ قبول کرنے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور پیش نظر زمانے میں جمع دامی ہی کے حسابات سے کام چل جاتا ہے ؛

اس ضمیمے میں جو اعداد زیر بحث ہیں، ان میں سے بعض پر ٹامس نے ریونیوری سورسز اوف دی مغل ایمپائر” میں نظر ڈالی ہے اور مناسب ہوگا کہ

ضمیمہ ج ۳۲۷

میرے اور اس کے اعداد میں جو اختلافات ہیں، انھیں ظاہر کر دیا جائے۔ ایک فرق تو ظاہر ہے کہ ٹامس نے پوری سلطنت کے اعداد کو لیا ہے اور میں نے صرف چند صوبوں پر اکتفا کی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے شاہجہاں کی تخت نشینی اور بعد کے اعداد سے، جو میرے گوشوارے کے خانہ ھ، و اور ز میں درج ہیں، بحث نہیں کی ہے البتہ خانہ د کے اعداد لکھے ہیں اور وہ میرے اعداد کے مطابق ہیں۔ لیکن آگے چل کے وہ ۱۶۵۴ء یا برنیر کی مراجعت کے زمانے کے اعداد دیتا ہے جن سے میں نے کام نہیں لیا۔ اس سنہ کی فہرست مالگزاری برٹش میوزیم کے دو مخطوطوں میں درج ہے (ع۶۵۹۸ اور ع۶۵۹۹) لیکن دراصل وہ ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہیں اور دونوں میں دو دو فہرستیں دی گئی ہیں، جن میں سے پہلی کو ٹامس نے لے لیا اور دوسری کو محض "تصریحی" لکھ کے چھوڑ دیا ہے (حاشیہ صفحہ ۳۳، حالانکہ اس تفریق کی کوئی دلیل مجھے نہیں ملی اور میرے نزدیک یہ مابہ البحث بات ہے کہ متعلقہ سنہ کی فہرست کونسی ہے؟ پھر، خود اس سنہ کے متعلق گفتگو ہے کہ نسخے کے شروع میں اسے "حسب الحکم اورنگزیب (بالقابہ) سنہ جلوس ۳ ۱۰۶۵ھ" سے منسوب کیا ہے حالانکہ کسی تاریخ سے اس کا اتنے پہلے تخت نشین ہونا ثابت نہیں ہو سکتا اور عام طور پر اس کی بادشاہی شاہجہاں کی معزولی (واقع ۱۶۵۸ء) سے شروع ہوتی ہے۔ صحیح تاریخ جلوس جو بھی ہو اس نسخے کے ۱۶۵۴ء سے مطابق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا عنوانِ مذکور کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ دستور حسب الحکم شاہی مرتب ہوا اور جلوس عالمگیری کے تیسرے سال شائع ہوا۔ ایسے دستور میں بہت ممکن ہے کہ کئی سال بعد کے کسی سنہ کے اعداد درج ہوں۔ بے شبہ ان اعداد کو ۱۶۵۴ء سے منسوب کریں تو متن کتاب میں جو دعوے میں نے کیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں مالگزاری بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، اس کی تائید مزید بہم پہنچتی ہے لیکن اس کی تاریخ کے معتبر نہ ہونے سے میں نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

رہے برنیر کے اعداد، تو جب تک وہ پیرس میں چھپے، ان میں بہت سی

ضمیمہ ج

غلطیاں واقع ہونے کا ایسا قوی امکان ہے کہ میں انھیں اس پایۂ اعتبار کے قابل نہیں سمجھتا جو میرے دوسرے ماخذوں کو حاصل ہے۔ برنیر کی فہرست میں دس صوبوں کی مالگزاری ۶ ارب ۵ کروڑ ۷۷ لاکھ دام کے مساوی نکلتی ہے
جو میرے گوشوارے کے خانہ ز کے قریب قریب ہے لیکن مدات میں ۳۴۸
بہت سے نمایاں اختلافات ہیں، جن کے اندر کتابت یا میزان لگانے میں اغلاط کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اسی طرح تھے وے نو کے اعداد میں جنھیں درج فہرست کئے بغیر ٹامس نے صرف نقل کر دیا ہے، غلطی کا احتمال اس لئے اور بھی بڑھ گیا ہے کہ اس نے دام اور روپے کو پونڈ میں بدل کے لکھا ہے جس کی شرح تبادلہ غیر یقینی ہے۔ عام شرح تبادلہ کے حساب سے دیکھیے تو اس کی، دس صوبوں کی مالگزاری ۵ ارب ۹۱ کروڑ ۶۰ لاکھ دام جڑتی ہے لیکن اس کی مدات مندرجہ کو قبول کرنے میں بھی دشواری ہے جس کے اسباب اسی قسم کے سمجھنے چاہئیں جیسے برنیر کے معاملے میں بیان ہوئے۔ غرض احتیاط کا مقتضی یہ ہے کہ ان دو سیاحوں کے اعداد کو الگ رکھا جائے کیونکہ گو ان سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس عہد میں مالگزاری میں کس قدر بیشی ہو گئی تھی لیکن ان کی تفصیلات ایسی مشکوک ہیں کہ انھیں ہندوستان کے وقائع یا دوسرے تحریری ماخذوں کے پہلو بہ پہلو نہیں رکھا جا سکتا۔

ضمیمہ د

۳۲۹

ضمیمہ د

سکہ، اوزان اور پیمانے

پیش نظر عہد کی تجارتی تحریروں کے مطالعے میں ایک ادنیٰ دقت یہ بھی پیش آتی ہے کہ لکھنے والوں نے نہایت مختلف پیمانوں کا استعمال کیا ہے۔ اس سے روبراہی کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ وزن، پیمائش اور زر کا ایک معیار عام استعمال کے لئے مقرر کر لیا جائے اور میں نے اس کتاب میں ہر جگہ مغلیہ روپیہ، انگریزی پونڈ (برائے وزن) اور انگریزی گز ہی سے کام لیا ہے۔ اور اس ضمیمے میں، میں ان معیاروں کا دوسرے پیمانون سے مقابلہ کرونگا۔

سکہ

روپیے کی ساخت اِس عہد میں یکساں رہی۔ اس میں تقریباً ۱۷۵ گرین چاندی ہوتی تھی اور گویا ابتدا سے زمانۂ حاضرہ کے ۱۸۰ گرین کے روپیے کے مماثل تھا (جس میں ۱۶۵ گرین چاندی ہوتی ہے) مختلف ناموں کے روپیے ملک میں رائج تھے لیکن کسی خاص وقت کا سکہ رائج الوقت (جو چلنی کہلاتا تھا) معیار تسلیم کیا جاتا تھا اور پُرانے سکے (جو خزانہ کہلاتے) اور

ضمیمہ د

اسی طرح زیادہ گھسے ہوئے روپے بھی، حسب موقع کمی کے ساتھ لے لئے جاتے تھے۔ لندن اور ہندوستان کے مابین تبادلے کا تو ظاہر ہے کوئی بازار نہ تھا مگر حسابی اغراض کے واسطے انگریز گماشتے روپے کو اول اول ۲ ۱/۲ اور پھر ۲ ۱/۴ شلنگ کے برابر سمجھتے تھے۔ پیش نظر زمانے کی روپے کی قوت خرید کے بارے میں ہم باب پنجم میں بحث کر چکے ہیں۔

جہانگیر نے ایک روپیہ ضرب کرایا جو مروجہ روپے سے ۲۰ فیصدی زیادہ وزنی تھا اور ظاہرا اس کا مقصد یہ تھا کہ من میں جو بیشی ہوئی تھی، (اس کا ذکر آگے آتا ہے) سکہ بھی اس کے مطابق رہے۔ زمانۂ حال کے ذخیروں میں بھی یہ سکہ کہیں کہیں موجود ہے لیکن عام روپے کے مقابلے میں اسکی تعداد کم ہے اور اس تبدیلی کا کوئی مستقل اثر نہیں ہوا۔

۳۲۰ روپے کے علاوہ، عام طور پر جن سکوں سے واسطہ پڑتا، انکی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے مگر یہ بات گویا مقدر ہے کہ شرح تبادلہ میں کمی بیشی کے ساتھ ان کی قیمتوں میں بھی تغیر ہوتا رہتا تھا۔

نام	دھات	کہاں مستعمل ہوا	قیمت بحساب روپیہ
گلڈر یا فلورن	زرحسابی	ولندیزی حسابات اور تحریروں میں	۵/۶ روپیہ، معین
ریال (ہشتمن)	چاندی	ہسپانی سکہ۔ تمام ایشیا میں معروف تھا	۲ روپیہ
محمودی	״	جنوبی گجرات میں	شروع میں ۲/۵، پھر ۴/۹ روپیہ
دام یا پیسہ	تانبہ	سلطنت مغلیہ میں	״ ۱/۴۰ پھر بتدریج ۱/۳۰ ״
نیم دام یا پیسہ	״	״	״ ۱/۸۰ ״ ״ ۱/۶۰ ״
پگوڈا (جدید)	سونا	جنوبی ہند اور مشرقی ساحل پر	۳ سے بڑھتے بڑھتے ۳ ۱/۲ ״
پگوڈا (قدیم)	״	״	۴ روپیہ سے کم تھا۔ بڑھتے بڑھتے ۵ بلکہ زیادہ کا ہو گیا۔
فنم	״	״	مختلف! ان میں سے چند قسم کے فنم کا تجارتی تحریروں میں ذکر آتا ہے۔

ضمیمہ د

گلڈر (Guilder) یا گلڈن یا فلورن جسے اختصاراً حرف f سے ظاہر کرتے ہیں) ایشیا میں عام طور سے رائج نہ تھا لیکن ولندیز عموماً اسی میں حساب کتاب رکھتے تھے اور رسمی شرح کے لحاظ سے مقامی سکوں کو اسی میں بدل کر تحریر کرتے تھے۔ اسی لئے ہندوستان کا جہاں تک تعلق ہے، اسے زرِ حسابی کہنا درست ہوگا۔ ایک گلڈر میں ۲۰ اسٹی ور ہوتے تھے اور ولندیزوں نے روپے کی قیمت ۲۴ اسٹی ور معین کردی تھی۔ رسائل بٹاویہ کے داخلوں میں دونوں سکے لکھے ہیں اور ان سے بھی یہی شرح ثابت ہوتی ہے۔ گلڈروں کے اوپر سونے کا ٹن بھی ولندیزوں کے حسابات میں مذکور ہے مگر اسے بلفظ درست نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ ایک لاکھ گلڈر کے مرادف ہوتا تھا۔

ریال (ہشتمن)۔ ایشیا میں سب سے زیادہ مروّج فرنگی سکہ، ہسپانیہ کا ریال تھا جسے دو روپے کے برابر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جن اقطاع میں چاندی کا سکہ ضرب نہ ہوتا تھا، وہاں عارضی طور پہ اس کی قیمت میں بہت کچھ کمی بیشی ہو سکتی تھی۔

محمودی۔ خود مختار بادشاہی کے زمانے میں گجرات کا سب سے زیادہ مروج سکہ یہی تھا۔ اکبر نے فتح کے سال یعنی سنہ ۱۵۷۲-۷۳ء سے احمد آباد میں روپیہ ضرب کرانا شروع کیا لیکن سورت میں محمودی کچھ مدت بعد تک مسکوک ہوتی رہی۔ پھر وہاں یہ سلسلہ موقوف ہوا تو راجہ پرتاب سنگھ اپنے علاقہ بگلانہ
۴۲۱ کے قلعے ملہیر میں اسے ضرب کراتا رہا اور غالباً اس کے سوائے اور کہیں یہ سکہ مضروب نہ ہوتا تھا۔ (بگلانہ، تاپتی کے کچھ جنوب میں ہے) اس دارالضرب کا فنچ نے سنہ ۱۶۱۱ء میں ذکر کیا ہے اور سورت کے ایک خط مورخہ سنہ ۱۶۱۹ء میں بھی تذکرہ آتا ہے۔ سنہ ۱۶۲۲ء میں راجہ سے روپیہ بحفاظت منتقل کرنے کا وعدہ لیا گیا اور سنہ ۱۶۳۶ء تک یہاں سکہ ضرب ہوتا رہا۔ ہمارے پیش نظر عہد کے آغاز میں شمالی گجرات روپیہ اختیار کر چکا تھا مگر سورت و بڑوچ کے جنوبی شہروں میں محمودی ہی میں کاروبار ہوتے تھے اور انگریز گماشتے اپنے حسابات میں برابر یہی سکہ استعمال کرتے تھے۔ مبادلے کی شرح، ظاہر ہے

کہ اولتی بدلتی رہتی تھی، تاہم جن دنوں سورت میں انگریزی کوٹھی قائم ہوئی ہے، اس وقت معمولاً ۵ محمودی = ۲ روپیہ کا نرخ رہتا تھا۔ اور سنہ ۱۶۵۰ کے بعد تک یہی رہا اگرچہ محمودی کی قیمت چڑھنے لگی تھی اور کہیں کہیں ہم پڑھتے ہیں کہ $\frac{۴}{۹}$ روپیہ فی محمودی ہوگئی تھی۔ سورت کے حسابات کے بارے میں بھی شکایات سننے میں آتی ہیں کہ وہ اسی نسبت سے غلط ہیں۔ آخر اسی نرخ کو کمپنی نے سنہ ۱۶۵۱ میں تسلیم کیا اور روپے کی قیمت $\frac{۱}{۴}$ ۲ اور محمودی کی ایک شلنگ قرار دی ؛

دام اور نیم دام۔ ہمارے پیش نظر زمانے میں تانبے کے مختلف سکوں کے لئے پیسہ کا لفظ بولتے تھے۔ مگر دام ۳۲۴ گرین کا بڑا اسی سکہ تھا جسے اکبر نے اس نام سے موسوم کیا اور جس کی شرح مبادلہ ۴۰ دام فی روپیہ تھی۔ مگر شمالی ہندوستان میں اسے پیسہ بھی کہہ دیتے تھے اور "۳۰ پیسے کا سیر" کے زبان زد جملے میں بھی دام ہی مراد ہے کیونکہ اکبر نے سیر کا وزن ۳۰ دام قرار دیا تھا۔ بخلاف اس کے سورت میں پیسہ نیم دام یا ڈھیلے کو کہتے تھے اور ایک محمودی کے ۳۲ اور ایک روپے کے ۸۰ پیسے ہونے سے اس کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جو ہمارے عہد کی ابتدائی شرح تھی۔ یہ سکے کوئی قانونی قیمت نہ رکھتے تھے بلکہ ان کی قیمت دھات کے نرخ کے مطابق اصلی ہوتی تھی جس کی بحث ہم پانچویں باب میں لکھ آئے ہیں۔ لاہور اور کلکتے کے ذخیروں کی فہرستوں سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے۔ ان ہی سکوں کا وزن اورنگزیب کے زمانے تک یکساں رہا مگر پھر تانبے کی قیمت بڑھی تو اسے کم کردیا گیا ؛ یہ بھی لکھدینا مناسب ہوگا کہ روپے کی موجودہ تقسیم آنے اور پیسے میں مغربی اور شمالی ہندوستان کے اس زمانے کے حسابات میں جو اب تک محفوظ رہے کہیں نہیں نظر آتی بااینہمہ بنگالے اور بہار میں آنہ بطور زر حسابی عام طور سے مستعمل تھا گو اس کا کوئی الگ سکہ نہ ہوتا تھا ؛

پگوڈا۔ ہندوستانی سونے کے جس سکے کو ہن کہتے تھے، وہ فرنگیوں

ضمیمہ ۲ میں پگوڈا بولا جاتا تھا اور گولکنڈہ و بیجاپور کی سلطنتوں اور اسی طرح آگے جنوب کے ہندو علاقوں میں اسی کا رواج تھا۔ ہمارے پیش نظر عہد میں اسکی ۳۳۲ دو قسمیں قدیم و جدید کے نام سے معروف تھیں لیکن قدیم متروک الضرب تھے اور ان کی قیمت بھی کوئی مقرر نہ تھی اور جدید پگوڈا جو اس زمانے میں بھی ضرب ہوتے تھے، سونے کے وزن کے مطابق قیمت پاتے تھے۔

پگوڈا (جدید) یہ گولکنڈہ، بیجاپور اور ہندوؤں کی مختلف ٹکسالوں میں، نیز حکام کی اجازت سے ولندیزی اور انگریزی ٹکسالوں میں ضرب ہوتا تھا ۱۶۲۱ء میں نیا پگوڈا، ۱½ ریال ہسپانوی یا قریب قریب ۳ روپے کے ہم قیمت تھا۔ ۱۶۳۳ء میں ارم گاؤں کا پگوڈا جو یقیناً نیا تھا، تقریباً اسی شرح (۱⅗ ریال) سے لیا گیا گویا ۶ شلنگ ۸ پنس میں پڑا۔ لیکن چند سال بعد سے اسکی عام قیمت ۸ شلنگ ہوگئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے مقابلے میں سونا گران ہو رہا تھا۔ چونکہ کمپنی نے روپے کی قیمت ۲½ شلنگ اور پگوڈا کی ۸ شلنگ مقرر کردی تھی لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر عہد کی ابتدا میں نیا پگوڈا، ۳ روپے کے اور آخری عشرے میں ۳½ روپے کے معادل ہوگیا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، سونے کی یہ گرانی ہمارے عہد کے بعد بھی بتدریج بڑھتی رہی۔

پگوڈا (قدیم)۔ اس کی دھات کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلومات مجھے بہم نہ پہنچ سکیں لیکن اس بارے میں ہم ٹے ورنیر کا قول قابل یقین سمجھ سکتے ہیں جس نے جنوبی ہند کی سیاحت کے زمانے میں وسیع پیمانے پر خرید و فروخت کی اور جس سے اس معاملے میں غلطی کرنیکا احتمال کم ہے اُس کا بیان ہے کہ پرانے پگوڈا سلطنت وجیانگر کے باقیماندہ سکے تھے جن کی اصلی قیمت تو وہی تھی جو جدید پگوڈا کی، مگر بعض معاملات داد و ستد خاص کر ادائے مالگزاری انہی پرانے سکوں میں ہوا کرتی تھی لہذا ان کی اکثر ۴ پیسہ فی پگوڈا کے قریب قیمت بڑھ گئی تھی۔ ٹے ورنیر یہ بھی لکھتا ہے کہ اس زمانے کے بعض اوہام کی بنا پر ان پرانے سکوں کو پگھلانا ناجائز سمجھا

ضمیمہ د

جاتا تھا اور صراف سالانہ ایک رقم کثیر شاہ گولکنڈہ کو اس غرض سے دیتے تھے کہ انھیں پگھلا کے دوبارہ ضرب کرنے کے واسطے خزانے میں واپس نہ لیا جائے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اول تو بیشی قیمت اس قدیم سکے کے پگھلانے یا باہر بھیجنے سے مانع ہوگی دوسرے اتفاقی نقصانات سے اس کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹے گی تو جب تک مانگ وہی رہے گی اس وقت تک صرافوں کو برابر نفع ہوتا رہے گا اور قیمت بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں فی الواقع ان قدیم ہنوں کی قیمت نئے ہنوں کے معاوضے میں بڑھتی رہی حالانکہ خود جدید ہن (یا پگوڈا) بھی چاندی کے عوض میں گراں تر ہوگئے تھے۔ اسی لئے ۱۶۳۲ء میں سو پرانے سکوں کی قیمت مبادلہ ۱۲۵ نئے سکے تھی تو ۱۶۶۵ء میں بڑھکر ۱۴۵ ہوگئی[1]۔ اسی مناسبت سے انگریز سوداگروں نے ان قدیم و جدید سکوں کی قیمت بڑھا دی تھی لیکن ان کے نرخ میں بعض غلطیاں تھیں۔ البتہ مغلیہ سکے کے حساب سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عہد میں قدیم پگوڈے یا ہن کی قیمت مبادلہ للعہ سے بڑھکر صمہ ہر روپے سے بھی خاصی زیادہ ہوگئی تھی۔

اس سکے کے ساتھ چھوٹے سکے یا خوردہ رائج تھا اس کی شرحیں بہت مختلف رہتی تھیں۔ مثلاً سونے کا چھوٹا سکہ فنم مختلف زمانوں میں ۱۲، ۱۵، ۲۴ اور ۳۲ تک فی پگوڈا کے حساب سے ملتا تھا۔ اور اسی طرح تانبے کے سکوں کی قیمت میں بہت کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے ان سکوں کی ٹھیک قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ ان کا نرخ بھی ساتھ کے ساتھ نقل کیا جائے اور اس قسم کے اقوال کو ضروری ہے کہ متن سے ملا کر سمجھا جائے۔

---

[1] مدن پلی کے ایک خط مورخہ ۱۶۶۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مقامی عمال نے پرانے پگوڈا کا قریب قریب اجارہ لے لیا تھا اور اسی سکے میں مالگزاری دینے پر مجبور کرتے تھے جس سے مذکورہ بالا شرح بڑھکر ۱۷۰ جدید پگوڈا معادل ۱۰۰ قدیم ہوگئی تھی۔

ضمیمہ د

اوزان

ہمارے پیش نظر عہد میں ہندوستان میں اوزان کا کوئی عام اور مقررہ پیمانہ نہ تھا اور معیار کے لئے ہمیں خواہی نخواہی پونڈ اختیار کرنا پڑے گا جو انگریزی گماشتوں کے استعمال میں نہ تھا اور جس میں پیش نظر زمانے تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسری فرنگی قوموں کے مصنفوں نے جو لورے یا پونڈ کے لفظ استعمال کئے ہیں، ان میں اور انگریزی پونڈ میں امتیاز کرنا ضروری ہے کیونکہ ان کے اوزان میں اس پونڈ سے فرق اور بعض اوقات بہت بیشی ہوتی تھی۔ ان میں بھی سب سے زیادہ قابل لحاظ وہ پونڈ ہے جس کا ولندیزیوں کی تجارتی تحریروں میں ذکر آتا ہے[1]

ولندیزی پونڈ۔ ہالینڈ میں اُن دنوں کئی پونڈ رائج تھے اور کمپنی کے پہلے منشور میں یہ تصریح کردی گئی تھی کہ وہ سب مصالحے ایمسٹرڈم کے پونڈ کے حساب سے بیچے گی جو ۰ء۴۹۴ کیلوگرام[2] یا قریب قریب ۱ء۰۹ پونڈ کے برابر تھا۔ رسائل بتادیہ کے مذکورہ اوزان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں ولندیزی گماشتے اور اجناس کے واسطے بھی اسی پونڈ کا استعمال کرتے تھے۔ انھیں انگریزی پونڈ میں تحویل کرنے کے لئے ۹ فیصدی کا اضافہ کرنا پڑتا ہے لیکن سرسری تخمینے کے واسطے ایک عُشر کی بیشی سے کام چل جاتا ہے۔

---

[1] رسائل بتاویہ میں پونڈ کے لئے دو الگ الگ مختلف علامات استعمال کیگئی ہیں ان سے یہ دھوکا ہوتا ہے جیسا کہ خود مجھے ہوا کہ یہ مختلف اوزان کے پونڈ ہونگے لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں بلکہ دونوں کا مطلب ایک ہی وزن کے پونڈ سے ہے۔

[2] یہ وزن اسٹارنگ اور فان ویرن جن کی کتاب "پالٹ اینڈ یرے زنٹ میشرز....." سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ مجھے نہیں ملا اور اس حوالے کے لئے میں ڈاکٹر بی سوپ کا رہین منت ہوں۔

فرانسیسی لورے اُس زمانے میں ولندیزی پونڈ سے کچھ کم ہوتا تھا مگر ضمیمہ د
عام اندازے کے لیئے اس کا ہم وزن سمجھا جا سکتا ہے ؛

اس عہد میں ٹن کو وزن کا معیار بنانا مخدوش ہے ۔ ہمیشہ تو نہیں ۳۳۴
مگر عام طور پر یہ گنجائش جہاز کا پیمانہ ہے جو تقریباً ۶۰ مکعب فیٹ کے برابر ہوتا تھا۔[۱] کبھی کیفیت ولندیزی لاسٹ کی ہے جو ۱۲۰ مکعب فیٹ یا دو ٹن (گنجائش) کے مساوی تھا۔ مثلاً ایک جگہ ہم ۱۵۰ لاسٹ چاول کو ۴۷۲۲۰۰ پونڈ ولندیزی کے برابر تحریر دیکھتے ہیں جس سے ایک لاسٹ ۳۲۷۰ پونڈ کے مساوی ثابت ہوا مگر دوسری جگہ دوسری قسم کے چاول کا جو وزن درج ہے اس سے ایک لاسٹ ۳۷۵۰ پونڈ کے ہم وزن نکلتا ہے اور تیسری جگہ ایک لاسٹ مرچ کا وزن ۲۶۱۲ پونڈ کے مساوی مرقوم ہے ؛

کوانتال یا کنتال، ایک پرتگیزی وزن، تقریباً ۱۳۰ پونڈ کے برابر اور ایشیا میں عام طور پر رائج تھا ؛

ہندوستان میں سب سے مشہور معیارِ وزن من تھا جس کے ہر جگہ ۴۰ سیر ہوتے تھے لیکن سیر کا وزن بے حد مختلف تھا۔[۲] اکبر کے

---

[۱] ٹن سترھویں صدی کے دوران میں بتدریج فہرستِ اوزان میں شامل کیا گیا۔ درسی کتابوں میں اس کا ذکر صدی کے آخری سنین میں نظر آتا ہے ورنہ پہلے انمیں ہنڈرڈ ویٹ سے بڑا کوئی وزن مستعمل نہ تھا۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ سوداگروں نے اسے مستقل طور پر کب سے اختیار کیا مگر غالباً بازار میں رائج ہونے کے بعد ہی اسے درسی کتابوں میں داخل کیا گیا ہوگا۔ ممکن ہے کسی کسی عبارت میں یہ لوہے، سیسے یا اور کسی بھاری چیز کے واسطے استعمال ہوا ہو لیکن ہمارے پیش نظر عہد میں اس کا استعمال معمولاً پیمانے ہی کے معنی میں ہوتا تھا ؛

[۲] کہیں کہیں من ۳۹، ۴۱ یا ۴۲ سیر کے برابر بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خاص خاص اجناس کے بیع و شری میں تاجرانہ رعایتیں تھیں جیسی آجکل ۲½ فیصدی وغیرہ کٹوتی یا بڑھوتی کے نام سے قیمت میں کر دی جاتی ہیں۔

ضمیمہ د زمانے سے سلطنت مغلیہ میں من کو ایک باضابطہ حیثیت حاصل ہوئی اور سیر کا وزن داموں یا پیسوں کے حساب سے مقرر کردیا گیا۔ خود اکبری سیر کا وزن ۳۰ دام تھا اور اسی حساب سے من کا وزن ۱۲۰۰ دام یا تقریباً ۵۵½ پونڈ (= آجکل کے ۲۷ سیر) تھا جسے نصف ہنڈرڈ ویٹ سمجھ سکتے ہیں لیکن انگریز گماشتے اسے عموماً ۵۵ پونڈ لگاتے تھے اور کام چلانے کے لئے یہ ٹھیک بھی تھا۔ کیونکہ بیچنے والے جس دام سے سیر تولتے وہ اکثر گھسے ہوئے پیسے ہوتے تھے۔ ولندیزوں نے من کو اپنے ۵۰ پونڈ کے برابر قرار دے رکھا تھا جو ۵۴½ انگریزی پونڈ کے مساوی ہوا مگر یہ لوگ اکثر کسرات کو نظرانداز کردیتے تھے اس لئے میں گمان کرتا ہوں کہ انھوں نے جو معادل اوزان مقرر کئے تھے، ان میں فقط صحت کا اتنا زیادہ لحاظ نہ تھا جتنا عملی سہولت کا۔

۳۳۵ سنہ ۱۶۱۹ میں کسی سنیاسی نے جہانگیر سے کہہ دیا کہ ہندو شاستروں کی رو سے سیر کا وزن ۳۶ دام ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے فوراً اسی کو ساری سلطنت میں جاری کردیا۔ سنہ ۱۶۲۰ میں پٹنے کے من اور سنہ ۱۶۲۲ میں برہان پور کے سیر کا وزن (۳۶ پیسہ) پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکم کہاں کہاں تک نافذ ہوگیا تھا۔ اس حساب سے جہانگیری من کا وزن ۶۶ پونڈ ہوتا ہے اور بظاہر بنگالے میں یہی من شاہجہاں کے جدید معیار جاری کرنیکے بعد تک چلتا رہا کیونکہ ولندیزوں نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۶۳۶ میں ہگلی کا اور سنہ ۱۶۴۲ میں بالاسور کا من ۶۶ پونڈ کے قریب تھا۔ لیکن پیپلی کے بندرگاہ پر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ دوچار جگہ من کے ۶۰ سیر کا بھی ذکر آیا ہے مگر یہاں معلوم ہوتا ہے یہاں لکھنے والا کسی غیر معروف من کو اپنے مروجہ سیروں میں بیان کر رہا ہے مثلاً کوئی سوداگر جو گجرات کے من میں خرید و فروخت کرتا رہا ہو، اگر یہ کہے کہ اکبری من ۶۰ سیر کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے درست ہوگا کہ گجرات کا ۲۰ پیسے کا سیر حقیقت میں اکبری من کا ۱/۶۰ حصہ ہوتا تھا۔

۱۶۴۵؁ میں شاہجہانی من رائج ہو گیا تھا؛ منڈی نے ۱۶۳۲؁ میں پٹنے کے سیر کا وزن ۳۷ پیسہ بتایا ہے جو بہت ممکن ہے کہ جہانگیری ہو اور صرف ایک پیسہ اس میں تاجرانہ رعایت سے بڑھ گیا ہو یا ممکن ہے یہ محض مقامی وزن ہو مگر ۱۲ سال پہلے ہیوز نے اسی مقام کے سیر کا وزن ۳۰ اور ۳۴½ پیسہ تحریر کیا ہے جن میں پہلا اکبری سیر تھا؛

شاہجہاں کی نوبت آئی تو اس نے ۴۰ دام کا سیر رائج کیا جس سے من کا وزن قریب قریب ۷۴ پونڈ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک طور پر مجھے یہ تحریر نہیں ملی کہ یہ کس زمانہ میں شروع ہوا لیکن ایک ولندیزی قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۳۴؁ میں آگرے کا من ۶۶ پونڈ ولندیزی یا تقریباً ۷۴ پونڈ (انگریزی)، کا چلتا تھا۔ پیش نظر عہد کے باقی حصے میں ہم سندھ سے بنگالے تک مختلف مقامات میں اسی من کا چلن دیکھتے ہیں۔ تاہم اس کا استعمال عالمگیر نہ تھا اور اسے خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ نیل آگرے میں اکبری من ہی کے حساب سے خریدا جاتا رہا[1]۔ آخر میں یہ لکھ دینا مناسب ہو گا کہ آجکل کا معیاری من جو ۸۲ پونڈ سے کچھ زیادہ وزن کا ہوتا ہے، بالکل جدید ہے اور ہمارے پیش نظر عہد میں کوئی اسے نہ جانتا تھا؛

یہاں تک تو سلطنت مغلیہ کے من کا ذکر تھا۔ لیکن اب گجرات کی طرف آئیے تو وہاں ایک علیحدہ نظام اوزان رائج تھا۔ ہمارے عہد کی ابتدا میں وہاں دو من چلتے تھے۔ ان میں ایک تقریباً ۲۷ پونڈ کا اور دوسرا ۳۲½ پونڈ کا تھا۔ مگر بڑی خرید و فروخت سب اسی دوسرے

---

[1] ایک گماشتے نے ۱۶۵۵؁ کے خط میں کرم دانہ کی ایک خریداری کے متعلق لکھا ہے کہ ہمیں پہلے یقین دلایا گیا تھا کہ سیر ۳۶ پیسہ کا ہو گا مگر معلوم ہوا کہ وہ ۴۰ پیسے کا ہے اور پہلا وزن ۳ سال سے بدلا جا چکا ہے (انگلش فیکٹریز۔ دہم، ۸) اس سے معلوم ہوا کہ نیل ہی نہیں بلکہ آگرے کی منڈی میں دوسری اشیا بھی ۱۶۵۲؁ تک جہانگیری سیر کے حساب سے بکتی تھیں؛

من کے حساب سے ہوتی تھی اور اسے عام طور پر ۳۳ پونڈ کا سمجھتے اور سیر کو ۱۸ پیسے کا ہموزن لیتے تھے[1]۔ ولندیز اپنے پونڈ کے حساب سے اسے ۳۰ اور کبھی ½ ۳۰ پونڈ کا سمجھتے تھے اور ½ ۳۰ ہی میرے نزدیک زیادہ قرین صحت تھا، مگر ولندیز کسرات کو چھوڑ دینا ہی پسند کرتے تھے۔ بہر حال اس گجراتی سیر کو شاہجہاں نے ۱۸ کی بجائے ۲۰ پیسے کا کر دیا۔ میتھوولڈ نے اپنے روزنامچے میں اس تبدیلی کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"۱۲ فروری۔ (۱۶۳۶ء) بادشاہی فرمان سے اس مقام (= سورت) کا
۳۳۶ سیر جو پہلے ۱۸ پیسے کا تھا، اب ۲۰ پیسے کے ہموزن کر دیا گیا اور اسی حساب
سے دوسرے اوزان میں تبدیلی ہو گئی۔ احمد آباد میں یہ وزن سال بھر سے
زیادہ مدت سے رائج ہے اور اب یہاں کا من، جہانی من کے نصف کے
برابر ہو گیا جس کے ۴۰ سیر میں ہر سیر ۴۰ پیسے کا ہوتا ہے[2]۔"

دوسرے اوزان کی تبدیلی سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی حکم فی الواقع نافذ ہو گیا تھا اور اس زمانے سے گجرات کا من آئندہ برابر ۳۷ پونڈ انگریزی اور ½ ۳۴ پونڈ ولندیزی کے ہموزن مانا جاتا رہا۔ اسی لئے سورت کے گماشتے شاہجہانی من کو کبھی "دو منا" لکھتے ہیں جو گجراتی من کے حساب سے بالکل درست ہے۔

سورت کے جنوب میں، اور مشرقی ساحل پر مچھلی پٹم تک من کے وزن میں ظاہرا کوئی سرکاری مداخلت نہ ہوتی تھی اور وہ کم و بیش ۲۶ پونڈ کے مساوی تھا۔ چنانچہ نظام پٹم میں ۲۷، مچھلی پٹم اور کالی کٹ میں ۲۶، اور

---

[1] گجرات کا جو من نسبتاً چھوٹا تھا، وہ صریحاً جنوبی علاقے میں رائج تھا جس کا ساحل پر مروج ہونا آگے مذکور ہے۔

[2] داغ رجسٹر کے ایک داخلے مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۶۳۴ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد آباد میں سنہ مذکور تک پرانا من چلتا رہا لہذا ضروری ہے کہ اس شہر میں تغیر ۱۶۳۴-۳۵ کے موسم سرما میں ہوا ہو گا۔

ضمیمہ د دابھول، تنگاپٹم اور مدراس میں مہاسن کا وزن ۲۵ پونڈ تھا اور اس خطے میں کنڈی یا بہار عموماً ۲۰ من وزن کا ہوتا تھا؛

یہ بات قابل تحریر ہے کہ ایران میں جن اوزان کو من کہتے تھے وہ ان ہندوستانی منوں سے بہت کم ہوتے تھے۔ مثلاً تبریز میں من صرف ۶ پونڈ ۵ اونس کا اور اصفہان میں شاہی من یا بتمن ½۱۲ پونڈ کا رائج تھا۔ مگر ہندوستان کے دوسرے رخ ارکان میں ۶۴ پونڈ کا من چلتا تھا؛

القصہ ہندوستان کے منوں کی حسب ذیل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے:۔

نام	تخمینہ وزن بحساب پونڈ		وزن سیر بحساب دام	مروجہ	زمانہ
	انگریزی	ولندیزی			
اکبری من	۵۵	۵۰	۳۰	شمالی ہندوستان	ء سنہ ۱۶۱۹ تا
جہانگیری	۶۶	۶۰	۳۶	״	سنہ ۱۶۲۰ تا سنہ ۱۶۳۴ اگر بنگالے میں سنہ ۱۶۴۲ یا اور بعد تک۔
شاہجہانی (یا دومنا)	۴۷	۶۷ ۶۸	۴۰	״	سنہ ۱۶۳۴ کے قریب سے
گجراتی من قدیم	۳۳	۳۰ ½۳۰	۱۸	گجرات	سنہ ۱۶۳۴-۳۵ تک
״ ״ جدید	۳۷	½۳۴	۲۰	״	سنہ ۱۶۳۵ کے بعد سے
جنوبی من	۲۶ (ایک پونڈ کم یا زیادہ)	۲۴ (بہ تصریح مذکور)	۰۰	جنوبی ہندوستان اور مشرقی ساحل	ہمارے سارے عہد میں۔

سماٹرا اس کے اور مشرق میں جو چینی اوزان مروج تھے، انکے متعلق ۳۳۷

ضمیمہ د

کچھ واقفیت ہونا بھی مناسب ہے اگرچہ ان کے نام ملایائی تھے۔ ان میں سب سے بڑا پی کل' ۱۳۳ ۱/۳ پونڈ کا ہوتا جو سو کٹی کے برابر تھا اور دوسرا وزن ۱ ۱/۳ پونڈ کا ہوتا تھا۔ ان میں زیادہ اختلافات نہیں پائے جاتے تاہم مصالحوں کی تجارت کے ذکر میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جزیرہ بندا کا کٹی تقریباً ۶ پونڈ کا تھا اور جوز و جوتری اسی بٹ سے وزن کئے جاتے تھے؛

گنجائش کے پیمانے (مکیال)

اس عہد کی تحریروں میں کوئی ہندوستانی پیمانہ گنجائش نمایاں نہیں ہے اور اس عنوان کے تحت ہمیں صرف یہ امر مکرر جتادینا کافی ہے کہ ٹن سے مراد عموماً وہ مقدار مال ہوتی تھی جو تقریباً ۶۰ مکعب فیٹ جگہ گھیرتی ہو اور اسی طرح لاسٹ' ۱۲۰ مکعب فیٹ کا پیمانہ گنجائش تھا؛

طول ناپنے کے پیمانے

گز۔ کوواڈ۔ ہستا؛ پیش نظر عہد میں کوئی ہندوستانی پیمانہ ایسا نہ تھا جسے معیار بنایا جا سکے لہذا انگریزی گز کو اختیار کرنا پڑے گا جس میں اس زمانے میں کوئی تغیر نہیں ہوا؛ شمالی ہندوستان میں طول ناپنے کے جو پیمانے مروج تھے' انھیں گز کہتے تھے۔ ان میں باہم بڑا اختلاف تھا اکبر نے ان سب کو ایک معیار پر لانے کی کوشش کی اور الٰہی گز کو رواج دیا جو ابوالفضل کی بیان کردہ جزئیات کی رو سے ۳۱ انچ کے قریب لمبا ہونا چاہئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے عملاً یہ ۳۲ انچ سے بھی کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ اس گز کا شمالی ہند میں رواج تھا لیکن ہر جگہ اسی کو استعمال نہ کرتے تھے دوسرے جہانگیر نے سیر و من میں اضافہ کیا تو اسی کے ساتھ گز کو بھی ۲۰ فیصدی بڑھا دیا اور سنہ ۱۶۲۰ء میں ہم ہٹتے ہیں اس ۴۰ انچ کے گز کا رواج دیکھتے ہیں لیکن اس کے متعلق مجھے اتنی کم شہادتیں ملی ہیں کہ اس کے

رواج عام کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ ۱۶۴۶ء کے قریب شاہجہاں نے آگرے کے گز میں خفیف سی کمی کی کہ اسے لاہوری معیار کے مطابق بنا دیا جائے۔ پیش نظر عہد میں اور کسی تغیر کا مجھے علم نہیں اور ۱۶۴۷ء میں آگرے کا گز تو ۳۲ انچ کے قریب ہی لمبا ہوتا تھا۔

گجرات میں دو پیمانے استعمال میں تھے۔ ایک ذرا زیادہ طویل تھا جو سورت میں اونی کپڑا ناپنے کے کام میں لاتے تھے اگرچہ احمد آباد میں اس کام کے لئے عموماً الٰہی گز ہی استعمال ہوتا تھا۔ البتہ سوتی پارچے کے واسطے ایک چھوٹا پیمانہ، ۳/۴ گز سے کچھ ہی کم کا ہوتا تھا جو مغربی ساحل پر ہر جگہ استعمال میں تھا۔ بایں ہمہ ہر گز کی تقسیم ۱۶ گرہ یا ۲۴ تسوج ہی میں کی جاتی تھی اور ان دونوں کا ذکر تجارتی مکاتیب میں آتا ہے۔

مغربی ساحل پر پرتگیز اپنا کوواڈو استعمال کرتے تھے جو کیوبٹ کے مرادف تھا، اور جسے انگریزوں نے بگاڑ کے کوواڈ، کووٹ وغیرہ کرلیا تھا۔ ہندوستان کے ہر گز کو پرتگیز اسی پیمانے میں بدل لیتے تھے اور جہاں تک گجرات کے کپڑے کی تجارت کا تعلق ہے انکے اس کوواڈو کو تقریباً ۳/۴ گز (نمبری) کے برابر سمجھنا خلاف احتیاط نہ ہوگا۔ مگر سندھ کے ۱۷ کواڈو گجرات کے ۳/۴ ۲۰ کواڈو کے برابر بتائے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں یہ پرتگیزی پیمانہ الٰہی گز کے مرادف مستعمل تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ آگرے کے الٰہی گز کو بھی پرتگیز اپنے کواڈو ہی کے نام سے یاد کرتے تھے اگرچہ یہ بات بالکل صاف نہیں ہے۔ البتہ پٹنے میں انھوں نے جہانگیری کواڈو کو ۴۰ انچ کے قریب رکھا تھا جسکا ذکر اوپر آچکا ہے۔

مشرقی ساحل پر خاص ہندوستانی پیمانہ ہاتھ مروج تھا جسے انگریز ہستا اور ولندیزی تاجر استا لکھتے ہیں۔ وہ کوواڈ کا استعمال عام طور پر کرتے ہیں مگر اس علاقے میں یہ بھی ہستا ہی کے مرادف ہے اور ضمیمہ ب میں اس کی ایک مثال جہاں ۱۰۰ کوبیڈو ۶۷ ولندیزی گز کے برابر

ضمیمہ د

لگائے گئے ہیں، ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔ دوسری مثالوں سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

الغرض، عملاً ہندوستان میں اُن دنوں قابل ذکر پیمانے یہ تھے:۔

مشرقی ساحل پر .... ہتا (یا کوواڈ) = تقریباً ۱۸ انچ
گجرات میں .... کوواڈ = 〃 ۲۷ انچ
سندھ میں .... 〃 (یا الٰہی گز) = تقریباً ۳۲ انچ
شمالی ہندوستان میں .... الٰہی گز (یا کوواڈ) = 〃 〃 انچ
〃 .... جہانگیری گز (〃 〃) = 〃 ۴۰ انچ

یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ کہاں کہاں رائج ہوا مگر زیادہ عرصے اس کا رواج نہیں رہا۔

کوڑی اور تھان: کپڑے کی لین دین عموماً گز کی بجائے کوڑی (بیس تھان) یا تھان کے حساب سے ہوا کرتی تھی۔ اور مقدار تجارت کا اندازہ کرنے کے لئے مناسب ہے کہ تھان کی عام لمبائی کا اندازہ پیش نظر ہو۔ گجرات کے لٹھوں کے متعلق جو یورپ دساور جاتے تھے، یہ اندازہ خاصی صحت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ صرف چند مشہور قسم کا کپڑا ہوتا تھا اور جُلاہے اپنے دل کی خوشی سے جو کمی بیشی کر دیتے تھے وہ بھی گزوں کی بجائے صرف انچوں کا فرق پیدا کرتی تھی۔ بہرحال ان میں سے بعض قسموں کا معیاری طول حسب ذیل تھا:۔

گجراتی بافتے .... ایک تھان = ۱۴ تا ۱۵ گز
〃 دھوتی .... 〃 〃 تقریباً ۱۲ گز
سامانے کا سمیانو .... 〃 〃 〃 ۱۰ گز
سندھ کا جُوڑی .... 〃 〃 ۱۲ اور ۱۵ گز کے درمیان
آگرے کا مرکولی .... 〃 〃 تقریباً ۱۵ گز

اودھ کے دریا بادی کپڑے کا طول ٹھیک طور پر کہیں تحریر نہیں ملا مگر

ضمیمہ د

سنہ ۱۶۶۲ میں انگریزی کمپنی نے اسی نمونے کے مطابق گجرات میں کپڑا بنوایا تو تھان کا طول ۱۳ تا ۱۴ اور عرض ۳/۴ گز مقرر کیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ سورت سے جو کپڑا دساور جاتا اس کے تھان عام طور پر ۱۵ گز سے نیچے ہوتے تھے اور ان میں دھوتی، جوڑی وغیرہ کی جتنی تعداد زیادہ ہوتی اسی قدر یہ کمی زیادہ ہوتی تھی۔ اس طرح ایک لاکھ تھان تخمیناً ۱۲ ۱/۲ لاکھ سے ۱۵ لاکھ گز تک کپڑے کے برابر ہونگے۔ لیکن آگرے کی گزی کے معاملے میں یہ تخمینہ درست نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کا ایک تھان ۴۰ گز اور اس سے بھی زیادہ لمبا بُنا جاتا تھا۔ مگر اس قسم کے کپڑے کا جہاز جانا کہیں تحریر نہیں ہے اور گزی کی یورپ کو برآمد میں کوئی خاص ترقی کبھی نہیں ہوئی؛ مشرقی ساحل کی تجارت برآمد میں زیادہ اینچ پینچ نہ تھے۔ وہاں سے جو گاڑھا یا موٹا لٹھا یورپ جاتا اس کا تھان گزی کی مثل عموماً ۳۵، ۴۰ گز لمبا ہوتا تھا۔ سنہ ۱۶۵۷ میں جو مطلوبہ روانہ ہوا، اس پر کمپنی نے شکایت لکھی کہ طول اکثر صورتوں میں ۳۶ گز سے کم ہے۔ اور آیندہ سال ہدایت کی کہ ۳۷، ۳۸ گز کا تھان آنا چاہئے تاکہ اسی حساب سے تخمینہ کیا جا سکے۔ اسی خط میں یہ بھی ذکر ہے کہ تسلیم پوری تھان، ۱۶ = موڑی، تقریباً ۹۔ پرکال، تقریباً ۸۔ اور سفید گنگھم کا تھان تقریباً ۲۱ گز کا سمجھا جا سکتا ہے؛

شمالی افریقہ کو جو کپڑا دساور جاتا تھا، اس میں زیادہ تر عامے کا کپڑا ہوتا جس کا تھان شاید بالاوسط ۱۲ گز کا قرار دے سکتے ہیں۔ گنی آنا جانے والا کپڑا طول میں اس سے بہت کم تھا چنانچہ "نیگرو کلاوٹ" کا تھان صرف ۴ گز کا ہوتا گو اس کی قسم "لانگ کلاتھ" ہی ہوتی اور اسے کیوبٹ کے حساب سے

---

[1] سنہ ۱۶۳۹ کے گاڑھے (لانگ کلاتھ) کی ایک فہرست میں تھانوں کی تعداد کے ساتھ طول بھی کوواڈ میں درج ہے اور اس سے ایک تھان کی لمبائی ۶۲ ۱/۲ تا ۷۲ کوواڈ نکلتی ہے، جو بحساب نصف گز فی کوواڈ ۳۱ ۱/۴ تا ۳۶ گز (نمبری) کے برابر ہوئے۔ گویا پہلی قسم معیاری تھان سے کم اور باقی اس کے قریب تھیں؛

ضمیمہ د

فہرستوں میں درج کیا جاتا تھا؛ سماٹرا، جاوا اور آگے مشرق میں جو کپڑے دساور جاتے ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ تحریری شواہد سے جو ہمیں میسر آتے ہیں، اِن کی اوسطِ طول کا اندازہ ممکن نہیں۔ ان میں سے بعض عام کپڑے کے تھان، لٹھے کے تھان کے برابر ہوتے جس کا طول اوپر بیان ہوا، دو چار زیادہ لمبے مگر زیادہ تر بہت چھوٹے ہوتے اور ان کی لمبائی ۸ گز سے لے کے اتنی کم ہوتی تھی کہ انھیں رومال (یا دستی)، کہنا درست ہوگا۔ غالباً ان جنوب کی طرف جانے والے تھانوں کی لمبائی کا اوسط ۱۵ گز سے بہت کم تھا، اگرچہ یہ ٹھیک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کتنا کم تھا؛

گٹھے، گٹھر وغیرہ

ہمارے زمانے کی تجارت کا بڑا حصہ گٹھوں، بوروں وغیرہ میں تحریر ہے لہذا ان کے وزن کا صحیح اندازہ پیش کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ جن گٹھوں کا معیاری یا اوسط وزن مجھے تحریر ملا وہ حسب ذیل ہیں اگرچہ ان میں سے بعض میں کپڑے یا ٹاٹ کا وزن بھی شامل ہے جس کا قیاساً اندازہ کرسکتے ہیں:-

جنس	مقام	گٹھے کی مقدار	وسائل حمل ونقل	کیفیت
نیل	آگرہ	۲۲۰ پونڈ	اونٹ	(انگریزی بیان)
"	"	۲۳۰-۲۴۰ "	"	(ولندیزی ")
"	گجرات	۱۴۸ "	مذکور نہیں	(انگریزی ")
"	"	۱۴۵-۱۵۵ "	"	(ولندیزی ")
شکر	"	۲۹۶ "	"	"
شورہ	"	۲۹۵ "	"	"
ریشم	بنگالہ	۱۴۳ "	"	"

ضمیمہ د

جنس	مقام	گٹھے کی مقدار	وسائل حمل ونقل	کیفیت
تاگا	کورومنڈل	۱۶۵ پونڈ	مذکور نہیں	(ولندیزی بیان)
"	سورت	۱۸۸ "	"	"
سوتی پارچہ	آگرہ	۱۱۰ تھان لٹھا	بھینسا	"
"	گجرات	۱۰۰ " بافتہ	مذکور نہیں	"
"	"	۲۰۰ " بیرامی	"	"
"	مشرقی ساحل	۲۵ " لانگ کلاتھ (۳۶ گز)	"	"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گٹھے کا کا چھوٹا بڑا ہونا حسب سہولت ہوتا تھا اور ساحل پر جب مال کو باندھتے تو وزن اسی قدر رکھتے کہ کلوں کی مدد کے بغیر جو زمانۂ حال کی ایجاد ہیں، اٹھانا بٹھانا ممکن ہو۔ اوپر شکر اور شورے کے گٹھوں کا وزن میرے خیال میں محض تخمینہ ہے اور یہ کسی صورت سے ۳۰۰ پونڈ سے زیادہ بھاری نہ ہو سکتے تھے بلکہ تاگے وغیرہ زیادہ جگہ گھیرنے والے مال کے معاملے میں بہت کم وزن کے ہوتے تھے، اسی طرح تری راستوں سے جو مال آتا، وہ ذریعہ حمل ونقل کے مناسب حال باندھا جاتا تھا۔ اور معمول یہ تھا کہ دو گٹھے ایک اونٹ یا بیل پر اِدھر اُدھر بار کردئے جاتے تھے۔ بیل پر اکثر ۳۰۰ پونڈ مال بار کرتے[1] اور گجرات

[1] ٹے ورنیر (اول، ۳۹) بیل کے بار کا اندازہ ۳۰۰ تا ۳۵۰ لورے لگاتا ہے، مُنڈی، ۲۸۰ پونڈ اور ایک جگہ ۴ من لکھتا ہے جو جہانگیری ہوگا یا شاہجہانی (یعنی ۲۶۵ پونڈ یا ۲۹۶ پونڈ) اس نے من کا وزن ۱۶ گیلن یا "لندن کے دو بشل" بتایا ہے مگر میں ٹھیک نہ سمجھ سکا کہ اس سے کونسا وزن مراد ہے۔ اُس زمانے میں گیہوں تولنے کا معمولی گیلن ½۸ پونڈ ٹرائے، یا تقریباً ۷ پونڈ (حاضرہ)

ضمیمہ د ۳۴۱ کا نیل اور بنگالے کا ریشم اسی کے مطابق وزن کے گٹھوں میں بھیجا جاتا تھا۔ آگرے کا نیل ۵۰۰ پونڈ فی شتر کے حساب سے اونٹوں کے ذریعے بھیجا جاتا اور اسکے گٹھے بھی نیم شتر بار کے برابر بتائے گئے ہیں؛ بہر حال، بحری حمل و نقل میں، یہ قیاس قرین عقل نظر آتا ہے کہ گٹھے کا وزن ۱۵۰ پونڈ اور جب اونٹوں سے کام لیا جائے تو تقریباً ۲۵۰ پونڈ وزنی ہوتا تھا لیکن جہازوں میں لادتے وقت انہی کو بڑے گٹھوں میں باندھ لیتے جن کا وزن زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ پونڈ (فی گٹھا) ہوتا تھا۔ سوتی مال کا جہاں وزن مذکور نہیں ہے، وہاں یہ لکھا ہے کہ ایک گٹھے میں ہزار تا ڈیڑھ ہزار گز لٹھا ہوتا تھا؛

جو گٹھے ہندوستان کے باہر باندھے جاتے ان میں سے صرف مرچ اور جائفل کے گٹھے قابل ذکر ہیں۔ مرچ کا گٹھا بنتم میں تقریباً ۶۲ پونڈ کا اور جائفل بہت مختلف الاوزان ہوتا تھا جس کی حد رسائی بتاویہ کی تفصیلی اطلاعات سے ۱۲۰ تا ۱۴۰ پونڈ معلوم ہوتی ہے؛

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے برابر ہوتا تھا جس سے ایک ہندوستانی من ۱۱۲ پونڈ کے مساوی ہوا۔ نظر بریں یا تو مصنف نے انگریزی وزن استعمال کیا ہے اور یا حساب میں غلطی کھائی ہے (انگریزی اوزان برائے غلہ وغیرہ کے واسطے ملاحظہ ہو سر سی ایم واٹسن کی کتاب (British weights and measures) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۱۰ء) شمالی ہندوستان میں بیل کا بار ابھی تک رسماً ۴ من (یا کوئی ۳۳۰ پونڈ) سمجھا جاتا ہے؛

ضمیمہ دؔ کے ماخذ

(اس ضمیمہ کے مباحث میں عموماً تحریری مکاتیب کے ضمنی اقوال سے مدد لی ہے اور یہ اتنے کثیر ہیں کہ میں نے انکی تفصیلی فہرست دینے کی کوشش نہیں کی۔ مگر امید ہے کہ جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں، ان کے لئے ذیل کے ماخذوں کا حوالہ دینا کافی ہوگا ؎)

سکہ ؎ روپے کے لئے دیکھو آئین اکبری (ترجمہ۔ اوّل، ۱۶ تا ۳۵) اور مختلف مضروبات کی ہیتی کے لئے، انگلش فیکٹریز، اوّل، ۱۳۳ وغیرہ ؎ جہانگیر کے بڑے روپے کا ذکر پلسارٹ نے کیا ہے (۱۱) مگر ان کے متعلق فرانسیسی ترجمہ بالکل صحیح نہیں ہے ؎

گلڈر کی مساوی قیمتوں کے لئے، ملاحظہ ہو داغ رجسٹر ۲۱ جون ۱۶۳۴؁ء وغیرہ۔ ریال کے لئے فیکٹریز، اوّل ۸ وغیرہ ؎ ملہیر کی ٹکسال کا اسی کتاب (اوّل، ۹۱ وغیرہ) اور پرچاس نے ذکر کیا ہے (اول۔ چہارم، ۴۲۴) اور محمودی کے واسطے ملاحظہ ہو لیٹرز ریسیوڈ، اوّل، ۳۴۔ فیکٹریز ششم، ۹۱ وغیرہ اور کورٹ منٹس، ۹ مئی ۱۶۵۱؁ء ؎

مغلوں کے مسی سکّوں کے متعلق دیکھو آئین اکبری (اول، ۳۱)، گجراتی پیسے کے لئے، لیٹرز ریسیوڈ، اول، ۳۳۔ فیکٹریز، اوّل، ۲۶۹ اور آنے کے بارے میں، ایضاً، ۱۹۴ و ششم، ۳۱۶ ؎

پگوڈا پر ہوبسن جوبسن میں بحث کی ہے۔ ان کی قیمت میں کمی بیشی کے لئے

ضمیمہ د

ملاحظہ ہو فیکٹریز ۔ اوّل، ۲۶۲ وغیرہ ۔ اور کورٹ منٹس، ۹ مئی ۱۶۵۱ء ۔ گیوڑا قدیم کا ذکر بھی اسی کتاب میں جا بہ جا آیا ہے ۔ نیز دیکھو ٹے ورنیر، دوم، ۹۰ ۔ فنچ اور غوروے کے لئے ملاحظہ ہو ہوبسن جوبسن ۔ باورے، ۱۱۴ ۔ شورر ؛

اوزان ؛ ولندیزی کمپنی کے ایمسٹرڈم کا پونڈ اختیار کرنے کا ذکر شاہی نشور کے دفعہ ۴۰ میں درج ہے جسے "وان ڈرشیر" میں چھاپا گیا ہے (۱۲) لورے پرل گرانڈ سیکلوپیڈیا میں بحث آئی ہے ؛ جہازی ٹن پریں انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر کے ضمیمہ د میں بحث کر چکا ہوں اس کے استعمال کا داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں سے اندازہ کیا گیا ہے ؛

اکبری من کے لئے دیکھو میری مذکورہ بالا کتاب، ۵۳ ۔ پرچاس (اول سوم، ۲۱۸) داغ رجسٹر، ۲۱ جون ۱۶۳۴ء ۔ جہانگیر نے جو تبدیلی کی اس کا اپنی تزک میں ذکر کرتا ہے (دوم ۔ ۱۰۸) اس کا من، فیکٹریز (اول، ۱۹۹) پلسارٹ (۱۱) داغ رجسٹر، ۸؍ فروری ۱۶۳۴ء وغیرہ میں مذکور ہے پیپلی کے من کی تبدیلی، فیکٹریز (ہفتم، ۲۷۲) میں تحریر ہے اور پٹنے کے اوزان کے لئے بھی ملاحظہ ہو، ایضاً (اوّل، ۱۹۳) اور منڈی، دوم، ۱۵۶ ۔ شاہجہانی من کا سب سے پہلا ذکر مجھے داغ رجسٹر (۳۱؍ اکتوبر ۱۶۳۴ء) میں ملا اور نیل کی لین دین میں اکبری من کا جاری رہنا، ٹے ورنیر (اول، ۳۸) اور فیکٹریز (ہفتم، ۸۴ وغیرہ) میں مذکور ہے ؛

گجراتی من کے لئے دیکھو لیٹرز رسیوڈ ۔ اوّل، ۳۴ وغیرہ ۔ فیکٹریز اول، ۶۰ ۔ داغ رجسٹر ۔ ۱۴؍ مئی ۱۶۳۳ء ۔ اور میتھوولڈ جس کمی بیشی کا ذکر لکھا ہے، وہ بھی فیکٹریز (پنجم، ۱۵۶) میں ہے ۔ جنوبی من کا ذکر شورر کی مختلف عبارات میں آیا ہے، نیز فیکٹریز (اول، ۱۵۳ وغیرہ) اور لیٹرز رسیوڈ (اول، ۳۱۹) میں کنڈی کے لئے ملاحظہ ہو، فیکٹریز، اول، ۲۶۲ وغیرہ ایرانی ہنوں کے اوزان، لیٹرز رسیوڈ (پنجم، ۱۹۴ وغیرہ) میں بیان کئے گئے ہیں ۔ ارکان کے من، داغ رجسٹر، ۶؍ فروری ۱۶۳۶ء میں اور چینی اوزان کے لئے ملاحظہ ہو ہوبسن جوبسن، عنوان "کیٹی" داغ رجسٹر ۔ وغیرہ ۔ اور بنڈا کیٹی کے لئے ایضاً

ضمیمہ د

اور پرچاس (اول - سوم، ۲۰۳)؛

پیمانے، گز کے لئے ملاحظہ ہو آئین اکبری، (دوم - ۵۸ - ۶۱) فیکٹریز اول، ۱۹۲ وغیرہ۔ گجراتی پیمانے، ایضاً، لیٹرز، اول، ۴۳ میں مذکور ہیں سندھ اور مشرقی ساحل کے لئے، ایضاً، ایضاً اور پرچاس (اول - چہارم ۲۹۱) داغ رجسٹر - ۱۳ر فروری ۱۶۳۷ء ماسٹر - اول، ۲۷۲، ملاحظہ ہو۔ تھانوں کے طول کے بارے میں دیکھو لیٹرز رسیوڈ اور فیکٹریز - مختلف مجلدات جس میں بافتے وغیرہ اقسام کے کپڑوں کا الگ الگ ذکر موجود ہے۔

لانگ کلاتھ، شمالی افریقہ اور گنی آنا کے کپڑوں کا ان کتابوں کے علاوہ، لیٹربک، دوم، ۱۳ و ۱۹۶ - داغ رجسٹر ۱۳ر فروری ۱۶۳۷ء اور مختلف ولندیزی فہرست ہائے مال میں حال ملتا ہے۔ ایشیائی تجارت کے لئے جتنے بڑے تھانوں کی ضرورت ہوتی تھی اس کے واسطے ملاحظہ ہو، فیکٹریز اور داغ رجسٹر ۱۵ر مارچ ۱۶۳۷ء وغیرہ؛

گٹھے وغیرہ۔ گٹھوں کی ضخامت کے حوالے الگ الگ ملتے ہیں آگرے کے نیل کے لئے ملاحظہ ہو، فیکٹریز - ہفتم، ۸۴ - داغ رجسٹر ۲۰ر مئی ۱۶۴۱ء وغیرہ اور گجرات کے نیل اور شکر، شورہ، ریشم، سوتی مال وغیرہ کے گٹھوں کا ذکر داغ رجسٹر کے مختلف داخلوں میں آیا ہے۔ لدو جانوروں کے بارے میں ملاحظہ ہو فیکٹریز - اول، ۷۳ - دوم، ۱۲۳؛ ۴۴۳

مرچ کے بوروں کے متعلق دیکھو، پرچاس (اول - سوم - ۱۶۱) داغ رجسٹر ۱۲ر اگست ۱۶۳۱ء - جائفل کے بوروں کے لئے، ایضاً، ستمبر ۱۶۲۵ء اور بعد کے کئی داخلے؛

ضمیمہ

فہرست ماخذ ۳۴۴

آگرہ اکاونٹس (Agra Accounts) ۔ آگرے کے ولندیزی کارخانے کے حالات سنہ ۱۶۳۷ء تا سنہ ۱۶۳۹ء ۔ (ہیگ کے سرکاری محافظ خانے میں محفوظ ہے) ۔

آئین اکبری ۔ از ابوالفضل علامی ۔ مترجمہ بلوخ مین و جیرٹ ۔ (اصل و ترجمہ انگریزی) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۔

اکبر نامہ ۔ ایضاً ۔ مترجمہ بیورج ۔ مطبوعہ " "

البوکرک ۔ سوانح البوکرک ۔ بزبان پرتگالی ۔ مطبوعہ بار سوم، لزبن سنہ ۱۷۷۴ء ۔

اسکولی ۔ بنگالے کی مالگزاری کی ابتدائی تاریخ اور پانچویں کیفیت بابت سنہ ۱۸۱۲ء ۔ بقلم اسکولی ۔ مطبوعہ اوکسفورڈ سنہ ۱۹۱۷ء ۔

بادشاہ نامہ ۔ از عبدالحمید لاہوری ۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۔

بینز ۔ "ہسٹری اوف دی کاٹن مینو فیکچر ان گریٹ برٹین" از ایڈورڈ بینز لندن سنہ ۱۸۳۵ء ۔

باربوسا۔ مقالہ ڈوارٹ باربوسا۔ مترجمہ لونگ ورتھ ڈیمز برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی۔ (اصل پرتگالی متن لزبن کی رائل اکیڈیمی نے شائع کیا ہے)؛

ہیربرٹ۔ "ٹریولز" از ہیربرٹ۔ لندن ۱۶۷۷ء وغیرہ۔

بیگن اینڈ وورٹ گینگ (Begin ende Voortgangh......) ایمسٹرڈم ۱۶۴۶ء؛

بونیر۔ سفرنامہ سلطنت مغلیہ۔ ترجمہ انگریزی۔ مطبوعہ کانسٹیبل، لندن ۱۸۹۱ء؛ ۳۴۵

باورے۔ "اے جیوگریفیکل اکاونٹ اوف دی کنٹریز راؤنڈ دی بے اوف بنگال"۔ از ٹی باورے۔ بہ تصحیح و تدوین سر رچرڈ ٹیمپل برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

کیلنڈر۔ ایس۔ پی (Calandar of State Papers)۔ سلسلہ مستعمرات۔ شرق الہند، وغیرہ ۱۵۱۶ء تا ۱۶۳۴ء۔ مرتبہ ای، سینس بری۔ لندن ۱۸۶۲ء وغیرہ؛

کیمبرج موڈرن ہسٹری۔ جلد اوّل تا چہارم۔ کیمبرج ۱۹۰۲ء؛

کیمپوس۔ "ہسٹری اوف دی پورچوگیز اِن بنگال"۔ از جے، جے، اے، کیمپوس۔ کلکتہ ۱۹۱۹ء؛

کیس ٹین ہیڈا (Castenheda) بزبان پرتگالی۔ تاریخ فتوحات ہند از ایف، ایل، کیس ٹین ہیڈا۔ لزبن ۱۸۳۳ء؛

کوریا۔ پرتگالی۔ حالات ممالک ہند از جی، کوریا۔ لزبن ۱۸۵۸ء وغیرہ

کورٹ منٹس۔ (۱) ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس انتظامی کی رودادوں کی فہرست۔ مرتبہ ای، بی، سینس بری۔ اوکسفورڈ ۱۹۰۷ء وغیرہ؛

(۲) قلمی مجموعے، محفوظ انڈیا آفس؛ ڈینورس نے داخلوں کی تاریخیں کتاب میں درج کی ہیں جن سے فہرست اور مخطوطات دونوں کا پتہ چل سکتا ہے)؛

کوٹو۔ "ڈ ایشیا" از ڈی، ڈ کوٹو۔ لزبن ۱۷۷۸ء وغیرہ۔

ضمیمہ

کننگ ہیم۔ "گروتھ اوف انگلش انڈسٹری اینڈ کومرس" از ڈبلیو کننگ ہیم۔ طبع سوم، لندن سنہ ۱۹۰۳ء۔

داغ رجسٹر۔ (Dagh Register Gehouden int Casteel Batavia) ولندیزی حکام کا سرکاری کتابچہ یا رسالہ۔ سنہ ۱۶۲۴ تا سنہ ۱۶۸۱۔ مطبوعہ بٹاویہ و ہیگ، سنہ ۱۸۹۶ تا سنہ ۱۹۱۹۔ چند مجلدات مختلف فصلوں میں مرتب کی ہیں لیکن عموماً صرف تاریخ، منقولہ عبارت کا پتہ چلانے کے لئے کافی ہے۔

ڈل گیڈو۔ فہرست ممالک ایشیا۔ از ایس، آر، ڈل گیڈو۔ کوامبرا، سنہ ۱۹۱۹ تا سنہ ۱۹۲۱۔

ڈینلنیر۔ "دی ارلی انگلش کاٹن انڈسٹری" از جی، ڈبلیو، ڈینلنیر۔ مانچسٹر، سنہ ۱۹۲۰ء۔

ڈین ورز۔ "دی پورچگیز اِن انڈیا"۔ از ایف، سی، ڈین ورز۔ لندن، سنہ ۱۸۹۴ء۔

ڈژونگ۔ (De Opkomst ... Oost-Indie by J. K. J. de Jonge) ایمسٹرڈم و ہیگ، سنہ ۱۸۶۲ وغیرہ۔

ڈلیٹ۔ (De Imperid Magni Mogolis) از J. de Laet۔ لائیڈن، سنہ ۱۸۶۲ وغیرہ۔

دلاویل۔ سفرنامہ (Pietro della Valle) مدوّنہ ای، گرے برائے ہیکلوئٹ سوسائٹی۔

۳۴۶ ڈچ اِن ملیبار۔ حکومت مدراس کی سرکاری تحریروں کے اقتباسات۔ ولندیزی تحریریں ۱۳ بابت احوال ولندیزان در مدراس۔ مدراس، سنہ ۱۹۱۱ء۔

ارلی ٹریولز۔ (Early travels in India) مدوّنہ ڈبلیو، فوسٹر۔ اوکسفورڈ، سنہ ۱۹۲۱۔ (فچ، فنیچ، ہاکنس وغیرہ کے سفرنامے شامل ہیں)۔

ایڈمنڈسن۔ "ہسٹری اوف ہالینڈ"۔ از جی، ایڈمنڈسن۔ کیمبرج، سنہ ۱۹۲۲ء۔

اِلیئاس۔ (Het Voorspel ... Oorlog) از جے، ای، الیئاس۔ ہیگ، سنہ ۱۹۲۰ء۔

الیٹ - تاریخ ہندوستان - مرتبہ از کاغذات سر ایچ، ایم، الیٹ لندن سنہ ۱۸۶۷-۷۷ء؛

انگلش فیکٹریز (یا صرف فیکٹریز) (English Factories in India) مرتبہ ڈبلیو، فوسٹر - اوکسفورڈ سنہ ۱۹۰۶ وغیرہ - سنہ ۱۹۱۸ سے کتاب کی تقسیم بہ اعتبار سنین کی گئی ہے - (میں نے مجلدات کے نشان کا حوالہ دیا ہے)؛

اتھیرج - "رپورٹ آون پاسٹ فیمنز ان دی بومبے پریسیڈنسی" مرتبہ اے، ٹی، اتھیرج - بمبئی سنہ ۱۸۶۸ء؛

فیکٹری ریکارڈز (دیکھو "انڈیا آفس ریکارڈز"، فاریا یا سوسا - "دی پورچوگیز انڈیا" از (M. de Faria y Sousa) - مترجمہ جے، اسٹی ونز - لندن سنہ ۱۶۹۵ء؛

فرسٹ لیٹر بک - ناظم و شرکت تاجران شرق الہند کا دفتر مکاتیب از سنہ ۱۶۰۰ تا سنہ ۱۶۱۹ء - لندن سنہ ۱۸۹۳ء؛ (مطبوعہ کتاب کے سرورق پر پورا نام یہ (The First letter book of the East India Company): درج ہے:

فیئر - "مشرقی ہندوستان اور ایران کے تازہ حالات" از جے فیئر مدوّنہ کروک برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

گجرات رپورٹ - گجرات کی مختلف منڈیوں کے حالات - قلمی جسمیں ولندیزوں نے سنہ ۱۶۳ سے ماقبل کی کیفیت تحریر کی ہے - ذخیرہ ڈی ژونگ ہیگ؛

ہیگ ریکارڈز - اس سے ہیگ کے سرکاری محافظ خانے کی وہ مطبوعات مراد ہیں جن میں بیرونی مقبوضات کے متعلق قدیم تحریریں شائع کی گئی ہیں؛

ہیگ ٹرینس کرپٹس - ولندیزی تحریروں کی نقولیں جو "Transcripts from archives at the Hague" کے نام سے انڈیا آفس میں محفوظ ہیں - میں نے ان کی تین قسمیں کردی ہیں - اوّل: "لیٹرز فرام دی ایسٹ" دوم: "لیٹرز فرام دی ڈچ کمپنی ٹو دی ایسٹ" - سوم: "لیٹرز فرام دی گورنر جنرل ٹو ہز سب اورڈی نیٹس"؛

ضمیمہ

مے ۔ (De rebus laponicis....) از جون مے ۔ اینٹ ورپ، سنہ ۱۶۰۵ء؛

۳۴۷ ہوبسن جوبسن ۔ ہندوستانی الفاظ اور جملوں کی فرہنگ، جو انگریزی میں بولے جانے لگے ہیں ۔ طبع جدید ۔ مدوّنہ ڈبلیو، کروک ۔ لندن سنہ ۱۹۰۳ء؛

ہوُٹ مین ۔ (De eerste schipvaart ....de Houtman) راس امید کے گرد سے ولندیزوں کے پہلے بحری سفر کے حالات ۱۹۱۵ء ۔

امپیریل گزیٹیر ۔ (Imperial Gazetteer of India) اوکسفورڈ، سنہ ۱۹۰۸ء؛

انڈیا آفس ریکارڈز ۔ فوسٹر کی "گائیڈ" میں ان تحریروں کا تفصیلی حال درج ہے ۔ جن سلسلوں سے میں نے کام لیا ہے وہ

"Original correspondence,"

"Court Minutes"

"Factory Records" اور

"Letter Books"

موسوم ہیں، جن کی تفصیلی کیفیت اِس گائڈ مطبوعہ لندن، سنہ ۱۹۱۹ء میں موجود ہے؛

جورڈین یا ژوردین ۔ شرق الہند کے بحری سفر کا حال از جون جورڈین ۔ مدوّنہ فوسٹر برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

جرنل اے، ایس، بی ۔ رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۔ کلکتہ ۔

جرنل آر، اے، ایس ۔ رسالہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ ۔

لیٹرز ریسیوڈ (Letters received by the East India Company from its servants 1602-17) مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۹۶-۱۹۰۱ء؛

ین شوٹن ۔ سفر نامہ ین شوٹن جانب شرق الہند ۔ ترجمہ انگریزی تصحیح کردہ برنل و ٹیل برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛ (میں نے اصل ولندیزی کتاب سے بھی کام لیا ہے اور میرے حوالے اصل و ترجمہ دونوں سے متعلق ہیں)؛

لزبن ٹرنیس کرپٹس ۔ پرتگیزی تحریروں کی نقول اور ترجمہ محفوظ انڈیا آفس ۔

ضمیمہ

میں نے سب حوالے ترجموں کے دئے ہیں اور یہ سلسلہ “Books of the Monsoons” موسوم ہے؛

مجالس السلاطین۔ اس کے اقتباسات ایلیٹ کی تاریخ میں ہیں۔ مجھے صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں مل سکا (۱۹۰۳ء)؛

من ڈل سلو۔ مشرق الہند کے بحری سفر اور سیاحتیں۔ از جے' اے' ڈ من دل سلو۔ مترجمہ جون ڈیویز طبع دوم' لندن سنہ ۱۶۶۹ء۔ (اصل کتاب میں نے نہیں دیکھی۔ ترجمے میں تدوین کرنے والوں نے بہت کچھ خود بڑھا دیا ہے! اسکے رتبۂ استناد پر ونسنٹ اسمتھ نے ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے رسالہ اپریل سنہ ۱۹۱۵ء میں بحث کی ہے)؛

مین بریک۔ اصل سیاحت نامے تک میری دسترس نہ ہوئی۔ میں نے جو حوالے دئے ہیں وہ اس کے بعض ابواب کے ترجمے سے متعلق ہیں جنھیں سر ای' میک لیگن نے رسالہ پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی' بابتہ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا؛

۳۴۸ منوکی یا منوچی' (Storia do Mogar) از این' منوکی' مترجمہ ڈبلیو' اروِن۔ لندن سنہ ۱۹۰۷ء؛

ماسٹر۔ اسٹرینشام ماسٹر کے روزنامچے سنہ ۱۶۷۵ء تا سنہ ۱۶۸۰ء۔ مدوّنہ سر رچرڈ ٹیمپل۔ لندن سنہ ۱۹۱۱ء؛

میتھولڈ (Relations of the Kingdom of Golconda and other neighbouring Nations) تصنیف ڈبلیو میتھولڈ (Methwold) مطبوعہ پرچاس۔ طبع چہارم۔ لندن سنہ ۱۶۲۶ء؛

مڈلٹن۔ ”سر ہنری ڈلٹن کا بحری سفر تا بنتم و جزائر ملکا“ مدوّنہ کورنے۔ برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

منڈی۔ ”سفرنامہ پیٹر منڈی' ممالک یورپ و ایشیا سنہ ۱۶۰۸ء تا سنہ ۱۶۶۷ء“ مدوّنہ سر آر' ٹیمپل۔ برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

اوِنگ ٹن۔ سنہ ۱۶۸۹ء میں بحری سفر تا سورت۔ از جے' اوونگٹن۔

ضمیمہ ج

لندن، سنہ ۱۶۹۶ء؛

پلسارٹ۔ آگرے کی معاشرت، تحریر سنہ ۱۶۲۶ء از ایف، پلسارٹ (Pelsort) ولندیز کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں کی اطلاع کے لیے، اس کا فرانسیسی ترجمہ تھے وی نو کے مجموعے میں چھپا تھا۔ مگر جگہ جگہ سے غلط ہے اور بہت مختصر کردیا گیا ہے۔ میں نے اصل قلمی مسودے کی عکسی تصویروں پر بھروسہ کیا؛

پرچاس۔ (Purchas. His Pilgrims) طبع دوم، ہیک لوئٹ سوسائٹی گلاسگو، سنہ ۱۹۰۵ء؛

پیارڈ (The voyage of Francois Payard of Laval to the East Indies) مترجمہ و مدونہ اے، گرے۔ برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

رینال۔ "مشرق و غرب الہند میں فرنگیوں کی تجارت اور بستیوں کی فلسفیانہ اور سیاسی تاریخ" مترجمہ از فرانسیسی بقلم جے، جسٹامونڈ۔ اڈن برا، سنہ ۱۷۷۶ء؛

ریالیہ۔ (Register oPde........Batavia) الائیڈن و ہیگ۔ سنہ ۱۸۸۲-۸۵ء؛

رین ویل۔ (Recueil des voyages............Rouen) بیگن اینڈ وورٹ گینگ کا مترجمہ بعض اضافوں کے ساتھ۔

رو۔ سر تامس رو کی سفارت سنہ ۱۶۱۵ء تا سنہ ۱۶۱۹ء مدونہ فوسٹر برائے ہیک لوئٹ سوسائٹی؛

سرکار۔ مغل ایڈمنسٹریشن۔ } از جادوناتھ سرکار۔
اورنگ زیب۔ } مطبوعہ کلکتہ۔
شیواجی۔
اسٹڈیز۔

شورر۔ (Cort Verhael....) ساحل کوروَمنڈل کے قلمی حالات جو سنہ ۱۶۱۶ء میں ہالینڈ پہنچے تھے۔ (محافظ خانہ ہیگ)؛

ضمیمہ د

اسکوٹ - (Contitution and Finance......Stock
Companies to 1720) از ڈبلیو، آر، اسکوٹ - کیمبرج. سنہ ۱۹۱۰ء؛
سوئل - (A Forgotten Empire. by R. Sewell) لندن، سنہ ۱۹۰۰ء؛
اسمتھ کا ”اکبر دی گریٹ مغل“ - طبع دوم، اوکسفورڈ، سنہ ۱۹۱۹ء؛
ٹےورنیر - سفرنامہ - مدوّنہ وی، بال - لندن سنہ ۱۸۸۹ء؛
ٹیلرز ڈاکا - ”خطط و اعداد ڈھاکا“ از ڈاکٹر جے، ٹیلر - کلکتہ سنہ ۱۸۴۰ء؛
ٹرپ اسٹراز کورومنڈل - ”حالات ساحل کورومنڈل“ از
〃 سورت ایچ ٹرپ اسٹرا - گرونن جن، سنہ ۱۹۱۱
ایضاً (سورت - عرب - ایران) مطبوعہ
ہیگ، سنہ ۱۹۱۸ء؛
تھے وے نو - (Les Voyages....Thevenot..) ایمسٹرڈم، سنہ ۱۷۲۷ء
(اس مصنف کے دوسرے مجموعہ اسفار کے لئے دیکھو بذیل پلسارٹ)۔
ٹامس - ”سلطنت مغلیہ کے مداخل“ از ای، ٹامس - لندن سنہ ۱۸۷۱ء؛
تنزک - تزک جہانگیری - مترجمہ اے، روجرس - مدوّنہ بیورج،
برائے ہیگ لوئٹ سوسائٹی - لندن، سنہ ۱۹۰۹-۱۳ء؛
ولن ٹجن (Oud en. . . Indien. F Valentijn) ایمسٹرڈم سنہ ۱۷۲۴-۲۶ء
فان ڈرچیز (Geschiedenis ....Compagnie by J. A. Van
der Chijs) طبع دوم - لائےڈن سنہ ۱۸۷۵ء؛
فان ڈیرژک - (zes Jaren....Van Berchem by L. C. D
Van Dijk) امسٹرڈم - سنہ ۱۸۵۸ء؛
فان لون - ”جمہوریہ ولندیزی کا خاتمہ“ از (H. W. Van Loon)
لندن، سنہ ۱۹۱۳ء؛
فان ٹوسٹ (Generale Beschrijvinge....by j van Twist)
ایمسٹرڈم، سنہ ۱۶۴۸ء؛
وہائٹ وے - ”دی رائز اوف دی پورچوگیز پاور ان انڈیا“ از

ضمیمہ آر، ایس، وہائیٹ وے۔ لنڈن، ۱۸۹۹ء

تمت الکتاب

صحت نامۂ معاشی حالات ہند

از اکبر تا اورنگ زیب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
(دیباچہ) ۱	۸	ساتھ	ساتھ	۳۷۰	۸	فرض کے	فرض کرکے
۱	۳	جبروجولہ	جبروجور	۳۷۵	۷	دوروٹ گانگ	دورٹ گانگ
۵۸	۸	برودھ	بڑودہ	۳۸۵	۱۸	حکومب	حکومت
۱۰۳	حاشیہ	جلد سوم	باب سوم	۴۰۳	۸	شہارت	شہادت
۱۴۵	۵ حاشیہ	بادکرنا	یادکرنا	〃	۹	انیں	انمیں
۱۶۵	۱۰	گمسنٹے	گھسٹنے	۴۱۱	حاشیہ سطر ۲	۱۶۳ء	۱۶۶۳ء
۱۷۴	۲۲	(Kintb dge)	(Kintb dge)	۴۱۳	۱۸	اظہار کتا ہے	اظہار کرتا ہے
				۴۲۹	۷	گو	کو
۱۸۵	۱۸	لناڑنا	لتاڑنا	۴۴۲	۱۳	ٹے وریز	ٹے ورنیر
۲۲۱	حاشیہ ۱	" "	("Virji Vora"),	۴۴۸	۱۶	...و۴۶ک۲	...و۴۶و۲
۳۰۲	۱۵	پیڑیاں	پیٹریاں	۴۶۸	حاشیہ ۲ سطر ۱	پالٹ اینڈ	پاسٹ اینڈ
۳۰۵	۲۲	ہیٹرمنڈی	پیٹرمنڈی				
۳۶۹	۲۵	بھی	تھی	۴۹۱	۱۶	۱۷۲۴-۲۶	۱۷۲۴-۳۶

تمت

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No 456822
Date 24-5-03
SRINAGAR